دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
نومبر 2022
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول
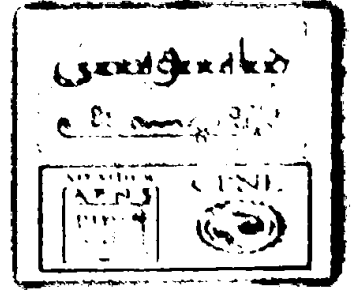
مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 52 • شمارہ 11 • نومبر 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 150 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من......السلامُ علیکم!

نومبر 2022ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ پوری کائنات میں ایک عمل ہے جو تسلسل ... جاری ہے......یعنی تبدیلی کا عمل...... وقت و حالات ایسے پلٹا کھاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے......گزرے وقتوں کی بات ہے۔ جب سلطنتِ برطانیہ کا پرچم برِصغیر کی سرزمین پر سایہ فگن ہوتا تھا۔ ان کے شاہانہ......متکبرانہ دورِ حکومت میں کلب میں کسی کالے آدمی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ آج گوروں کے اپنے دیس میں انہی کی سرزمین پر ان کے ایوانِ خاص میں سفید فام کی جگہ ایک سیاہ فام بڑے کروفر سے براجمان ہے۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہے اور دیکھنے والوں کے لیے عبرت کا مقام بھی۔ اور شاید اسی کو حقیقی جمہوریت کہتے ہیں جہاں اقربا پروری کے بجائے انسانی شرافت......نجابت......صداقت و سچائی اور ایمان داری جیت جاتی ہے......جس کے نتیجے میں کبھی کوئی پاکستانی میئر بنتا ہے......اور کبھی کوئی ہندو وزیراعظم کا عہدہ حاصل کر لیتا ہے۔ کاش کہ اسی طرح کی حقیقی جمہوریت کی ایک جھلک ہمارے ملک میں بھی نظر آئے......جہاں ہر روز طاقت و اقتدار کے حصول کے لیے الزام تراشیوں کا ایک نیا پینڈورا بکس کھلتا ہے...... ایک نئی کہانی شروع ہو جاتی ہے......وقت کو چلتے رہنا ہے......تیزی سے گزرتا وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا......مہلت کو کافی جانتے ہوئے تخریبی کے بجائے تعمیرِ نو کے کاموں پر توجہ دی جائے......اسی میں ہماری بھلائی اور بقا ہے۔ آیئے اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون کس ہتھیار سے لیس ہے۔

لاہور سے راحیلہ بھٹی کے تند و تیز وار ”امید تو نہیں تھی کہ میرا تبصرہ لگے گا لیکن آپ نے ساری تلخ و شیریں باتیں شائع کر کے میرا مان بڑھا دیا۔ یہ جاسوسی سے محبت ہی ہے جس کی وجہ کبھی کچھ سخت بول دیتی ہوں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اپنے من پسند جاسوسی میں کوئی کمی برداشت نہیں ہوتی۔ جاسوسی کے ستمبر اور اکتوبر کے شمارے دس دن کے وقفے سے ملے اور سچی بات ہے پہلی بار یہ تاخیر بُری نہیں لگی۔ سیلاب سے ہمارے جو بہن بھائی متاثر ہوئے، خدا اپنا رحم فرمائے اور انہیں اپنی امان میں رکھے۔ ہم جتنی جیسی مدد کر سکتے تھے، وہ کی ہے لیکن پرائیویٹ رضا کاروں سے ہٹ کر کہیں حکومتی اقدام دیکھنے کو نہیں ملے۔ ستمبر کا ٹائٹل بہت بُرا تھا جبکہ اکتوبر ٹائٹل اچھا تھا لیکن اتنا اچھا بھی نہیں تھا کہ اس کی تعریف کرنی پڑے۔ ظفر صاحب سے گزارش ہے کہ ٹائٹل پر اتنا بڑا نام لکھنے کے بجائے ایسا کام پیش کریں جو اُن کی پہچان بنے۔ اداریہ بہت پیارا لکھا ہوا تھا۔ ایک ایک لفظ میرے نبیؐ کی محبت ڈوبا ہوا تھا جس نے روح کو سُرور بخشا۔ پشاور کی ایمان علی پندرہ روپے کی جاسوسی کی باتیں سنا رہی تھیں جو اَب ڈیڑھ سو کا ہو چکا۔ صائمہ حیدر اس بار بھی نامعلوم مقام سے آئیں، کسی جاسوس سے کہہ کر ان کے شہر کا ہی پتا چلا لیتے۔ (وہ خود بتانے آگئی ہیں) بینا راجپوت، محمد اقبال اور نگاہِ حسیب کے تبصرے اچھے لگے۔ اکتوبر کی پہلی کہانی سے پہلے اگست ستمبر کی پہلی کہانی کی تعریف کر لوں۔ امجد رئیس بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی کہانی پڑھیں اور مایوسی ہو۔ خونی محافظ بھی زبردست تھی، انہیں ہر ماہ جاسوسی کا حصہ بنایا کریں۔ یعقوب بھٹی نے فتح یاب لکھ کر کمال کیا۔ دشمنوں کی کچھار میں گھس کر لڑتے ہوئے الپس نے خوب تباہی پھیلائی۔ انجام بہت دکھ دینے والا تھا اس لیے پسند نہیں آیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کتنے ہی ایسے جانباز وطن کی حفاظت کرتے قربان ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان کا نام و نشان تک پتا نہیں چلتا۔ فاطمہ حسام کی صبر آزما نے خوب صبر آزمایا لیکن اینڈ شکر ہے اچھا تھا۔ بے سمت اس ماہ کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہوتی لیکن اس کا انجام ہی بے سمت نکلا۔ اے آر راجپوت کی مخبر بھی اچھی رہی۔ دہر کے حوالے سے تو اپنے پچھلے تجزیے کی معافی چاہتی ہوں۔ یہ کہانی اس قسط میں کہیں سے بھی سست اور پھسپھسی نہیں لگی۔ حسام بٹ صاحب نے کہانی کو خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا اور قسط ایسی سچویشن میں اینڈ کی ہے کہ ابھی سے اگلے ماہ کے جاسوسی کا انتظار ہے۔ عمران قریشی کی محاذ پسند نہیں آئی۔ کوئی اتنا بے وقوف کیسے ہو سکتا ہے کہ پاگلوں کی طرح اٹھ کر امریکا چلا جائے اور پھر پستول کی نوک پر واپس بھی آ جائے۔ چٹے بٹے اچھی تھی۔ شعلہ زن کی یہ قسط بہت عجیب سی لگی۔ یہ قسط پڑھ کر لگا جیسے روبینہ رشید کے قلم میں جان ہی نہیں رہی (اچھا حیرت ہے) حالانکہ پچھلی قسط بڑے سنسنی خیز انداز میں ختم

ہوئی تھی۔ کم ہمت پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ایسے بزدل مردوں سے جان ہی چھڑا لینی چاہیے جو بروقت فیصلہ کر کے کسی کی حفاظت کرنے کے اہل نہ ہوں۔ جوابا پڑھ کر سر درد ہو گیا۔ انجل بھٹی کو پہلی بار پڑھا لیکن قاتل سلاخیں اچھی کہانی لگی۔ انڈیا کا پس منظر تھا لیکن سب کردار اپنے ملک جیسے ہی لگے۔ سرجن جیسے سیریل کلر کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا لیکن جتنی سلاخیں اس کے بیٹے کے جسم میں گھسی تھیں اگر فرسٹ ایڈ اسے مل بھی جاتی پھر بھی وہ نہ بچتا۔ فاروق انجم کی خودفریبی میں کرداروں کو انتہائی ذہین دکھایا گیا لیکن آخر میں پکڑے وہ ایسے گئے کہ غربت کے مارے اپنا فون استعمال کرنے کے بجائے واردات والے گھر کا فون استعمال کرتے رہے۔ اب یہ غربت تھی یا احمقانہ بے وقوفی اس کا تو رائٹر کو ہی پتا ہو گا۔ میں بس یہی کہوں گی کہ مزہ نہیں آیا۔ اتنے سینئر رائٹر ہو کر بھی ایسی پھیکا نا کہانی لکھ دی جبکہ ان کے مقابلے میں انجل بھٹی کی پہلی کہانی ہی مضبوط قلم کاری کا نتیجہ لگی۔

رحیم یار خان سے ماورا عالمگیر کا شکریہ! ''ستمبر کا جاسوسی 20 تاریخ کو اور اکتوبر کا بارہ تاریخ کو ملا۔ مجھے بہت بے چینی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا پھر سوچا کہ ہم صرف جاسوسی کے نہ ملنے پر بے چین ہیں مگر اسی ملک میں ہمارے ایسے بہن بھائی بھی موجود ہیں جو سڑک کنارے بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں، سیلاب نے تو آنکھوں سے زندگی کی رمق ہی چھین لی ہے۔ بہت گہرا سانحہ ہے جو مدتوں اپنی گرفت میں رکھے گا۔ مجھے صرف ایک دن کا ہی وقت مل سکا ہے اس لیے زیادہ کہانیاں نہیں پڑھ سکی ہوں۔ یعقوب بھٹی صاحب کی فتح یاب ایک بہت دلچسپ کہانی تھی کیونکہ آج کل ہمارے ملک میں ہر جگہ ہی ہیکر ہیکر ہو رہا ہے تو ایسے میں ہیکر والی کہانی پڑھنا مزید دلچسپ رہا۔ صبر آزما ایک بہت مزے کی کہانی تھی۔ مجھے شک تھا سلیم پر اور آخر میں وہی مشکوک نکلا۔ بے سمت بھی اچھی تھی مگر تھوڑی تشنگی رہی، مطلب جیسے جسٹن کو مصنف نے کہانی میں ڈالا، اس کا کوئی مقصد ہونا چاہیے تھا۔ تھوڑا پُراسرار انداز تھا جسٹن کا اور روم نمبر 14 کا مگر اس کی وضاحت نہ ہو سکی۔ مخبر بھی جاسوسی کی طرز پر مبنی اچھی کہانی تھی۔ چھٹے بٹے میں جس طرح سارجنٹ اندھا دھند یقین کرتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ واقعی اس کو ریٹائرمنٹ مل جانا چاہیے یا پھر شاید اس نے دانستہ نظر چرائی ہے..... کم ہمت میں جس طرح جیک بت بن کر کھڑا رہتا ہے، مجھے لیلیٰ سے بھی زیادہ غصہ آیا آخر یہ آدمی پولیس میں کیا کام کر رہا تھا۔ زہرا بتول نے بہت دلچسپ لکھا۔ شاکر کی ایکٹنگ اور پلاننگ اچھی تھی مگر آخر میں جب وہ آفس میں زبردستی گھستا ہے، وہ بہترین تھا۔ قاتل سلاخیں بہترین رہی کیونکہ قاتل پکڑائی نہیں دے رہا تھا تو مکمل سسپنس والا ماحول بنا ہوا تھا جس سے دلچسپی قائم رہی آخر تک۔ اس کے ساتھ ہی میں ستمبر کے جاسوسی کی کچھ کہانیوں پر لازمی تبصرہ کروں گی۔ اسما قادری کی کہانی موت کے بعد بہت اچھی تھی۔ کہانی کا نام بھی بہت موزوں تھا کیونکہ ہانیہ پر سب کچھ اس کے والد کی موت کے بعد کھلتا ہے۔ کہانی کا موضوع بھی اچھا تھا۔ اسما بہت اچھا لکھا آپ نے شکریہ۔ دہر بھی اچھی جا رہی ہے اور آج کل کا ہاٹ ایشو (دل گردوں والا) اس میں شامل کر کے اویرنیس دی جا رہی ہے جو کہ ایک بہت اچھی بات ہے۔ میرا خیال ہے اس پر بار بار بات کرنی چاہیے آگاہی کے لیے۔ شعلہ زن میں کریم نے تو کمال کر دیا اکتوبر والی قسط ابھی نہیں پڑھی۔ نکتہ چینی میں ایمان کی بیتی باتیں بہت اچھی لگیں اور حیرانی ہوئی، جاسوسی 15 روپے کا تھا۔ ایمان علی آپ کا شکریہ میرے تبصرے پر پسندیدگی کے لیے۔ سب کے تبصرے اچھے رہے۔ اوور آل جاسوسی کی ساری کہانیاں جاسوسی سے بھری ہوئی اور دلچسپ رہیں مگر اسما قادری، زویا صفوان اور طاہر جاوید نہیں تھے تو تشنگی رہ ہی جاتی ہے۔'' (انتظار...... میں کوفت نہیں لطف بھی پوشیدہ ہے)

راولپنڈی سے صائمہ حیدر کا مشورہ ''عرض کر دوں کہ میں راولپنڈی سے چھپنی نکتہ چینی میں حاضر ہوتی ہوں۔ نامعلوم مقام سے معلوم مقام ہونے کے بعد شمارے کی طرف آتے ہیں جو کہ اس دفعہ جلدی مل گیا۔ سرورق خوب صورت لگا، آج کل اتنے سبز انسان کہاں نظر آتے ہیں۔ بی بی بہت حسین لگیں۔ آرٹسٹ صاحب یہ سرورق کی ہر خاتون کی ایک آنکھ پر بال کیوں ڈال دیتے ہیں، شاید میری طرح ان سے بھی آنکھیں ایک جیسی نہیں بنتیں۔ (ہاہاہا، ہو سکتا ہے) محفل کی ابتدا ایک پاک ہستی کے ذکر سے ہوئی۔ بس ایک حسرت ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں سنت کی پیروی کریں جس طرح بارہ ربیع الاول منائی جا رہی ہے، اس سے پرہیز کیا جائے۔ تبصرے سب بہت اچھے لگے۔ فتح یاب بہت پسند آئی۔ اللہ دنیا کے سب مظلوموں کے لیے بہت آسانیاں کرے، یہی گمنام مجاہد قوم کی دولت ہوتے ہیں۔ فاطمہ حسام صاحبہ نے حب الوطنی پر لکھا اور خوب لکھا۔ بے سمت میں تجسس کا عنصر تو کم تھا لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی کردار بُرا نہ لگے چاہے وہ چور ہو یا پھر قاتل۔ مخبر ابتدا میں بہت دلچسپ لگ رہی تھی، آج کل پلاسٹک سرجری کافی کم ہو رہی ہے، مجھے لگا کہ کچھ میڈیکل سے متعلق ہو گا۔ کہانی اچھی تھی لیکن راجپوت صاحب سے گزارش ہے کہ کچھ میڈیکل ریلیٹڈ مسٹری بھی لکھیں۔ محاذ میں مرکزی کردار کچھ خوش قسمت نہیں تھا کیونکہ اگر قسمت ساتھ دے رہی ہو تو خراب فیصلوں کے نتائج بھی اچھے نکل

آتے ہیں۔اس کو دونوں قریبی لوگوں نے ہی دھوکا دیا۔سیر ینا راض صاحبہ کے سارجنٹ صاحب چوروں کی ٹولی کے ہاتھوں دھوکا کھا گئے۔اس کہانی پر اگر فلم بنے تو بہت دلچسپ ہو گی۔کم ہمت کے آخری جملے بہت مزیدار تھے۔آنکھوں سے گولی مارنا اس سے پہلے ہمیشہ رومانوی پس منظر میں ہی سنا تھا۔میرے خیال سے لیلیٰ کی ناراضگی جائز تھی۔زہرا بتول صاحبہ کی کہانی میں نادرہ کو نیکی کا صلہ مل گیا۔یہ کہنا مشکل ہے کہ ہیرو ادا کار اچھا تھا یا منصوبہ ساز۔سرورق کے رنگ بہت پسند آئے۔محمد فاروق انجم کی کہانی بھی اچھی لگی۔سرورق کے رنگ بھرپور تجسس لیے ہوئے تھے۔بہت معذرت لیکن دہر بہت اچھی نہیں لگ رہی البتہ شعلہ زن پسند آرہی ہے۔روبینہ صاحبہ مستقل مزاجی سے مستقل اچھا لکھتی ہیں۔زدیا صفوان کی کمی محسوس ہوئی۔امید ہے اگلی بار ان کی تحریر پڑھنے کو ملے گی۔ایک ناقص مشورہ ہے کہ کوشش کریں اگر جاسوسی کے پرانے شماروں میں چھپی ہوئی کہانیاں دوبارہ سے شائع کی جائیں، مجھے یقین ہے پڑھنے والوں کو اچھا لگے گا۔(دیکھتے ہیں آپ کے دوسرے ساتھی کیا کہتے ہیں) آخر میں سب پڑھنے والوں کے لیے نیک خواہشات اور بہت سی دعائیں۔

اسلام آباد سے بینا راجپوت کی رائے ”اس بار ادارے نے بالکل بھی انتظار نہ کرواتے ہوئے شمارہ وقت پر بھیج دیا تھا۔اعصاب شکن سرورق دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ آخر ظفر صاحب قارئین سے نہ جانے کون سے جنم کا بدلہ لے رہے ہیں؟ یہی سب سوچتے نکتہ چینی کی محفل میں پہنچی تو پشاور سے ایمان علی کو اپنے محبت نامے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ان کا محبت کا فلسفہ اپنی جگہ ٹھیک ہو گا مگر ایک بات سے میں بالکل متفق نہیں ہوں کہ قیمت کے بڑھنے اور صفحات کے کم ہونے پر قارئین کی محبت کم ہو جاتی ہے یا بائیکاٹ کر دیتے ہیں تو ایسا ہرگز نہیں۔بات صرف اتنی ہے کہ مہنگائی کی جو شورش پاکستان میں برپا ہے، اس میں اکثریت کو مہینہ بھر کے اخراجات کو آمدن کے اندر پورا کرنا مشکل ہو رہا ہے تو مہنگے ڈائجسٹ والی عیاشی کوئی کیونکر افورڈ کر سکے گا؟ سچی بات ہے مہنگائی نے محبتوں کے معیار بھی بدل ڈالے ہیں۔(درست کہہ رہی ہیں) ہمارے بچپن کے ادوار حقیقتاً بہت محبت اور انسانیت بھرے تھے۔محمد اقبال صاحب کا تبصرہ کافی پسند آیا اور اپنی خاص الخاص سہیلی نگاہ حسیب کو طویل مدت کے بعد محفل میں شامل دیکھ کر خوشی ہوئی۔اس بار یعقوب بھٹی صاحب کی اوائل صفحات پر موجودگی نے مجبور کیا کہ شروعات فتح یاب سے ہی کی جائے۔ہمیشہ کی طرح ایکشن سے بھرپور کہانی کے تانوں بانوں نے آغاز سے اختتام تک اپنے ساتھ باندھے رکھا۔فتح یاب اسرائیلی بربریت کی ترجمانی کرتی ایک عمدہ کاوش تھی۔بین الاقوامی تنظیموں، ان کی سازشوں اور کام کرنے کے طریقوں پر بھٹی صاحب کی خاص دلچسپی اور اپ ٹو ڈیٹ معلومات ان کی کہانیوں میں جابجا نظر آتی ہیں اس لیے کہانی بور نہیں کرتی۔مذکورہ کہانی بھی بہترین اٹھان سے آگے بڑھتی رہی بس ایس اور اسپائیڈر گرلز خصوصاً اینی کے انجام نے افسردہ کر دیا مگر شاید یہی منطقی انجام بنتا تھا۔کیونکہ ایس اور اس کی ٹیم تو ساری کشتیاں جلا کر اس مشن پر آئی تھی۔انگریزی ادب سے درآمد شدہ سیر ینا راض کی چٹنے بڑے مزیدار تھی۔میبل فرینک اور ان کی شاطر آنٹی آئرین نے سارجنٹ ڈونووین جیسے پُرخلوص بندے کو خوب بیوقوف بنایا۔آج کل دنیا کا چلن ہی ایسا ہو چکا ہے۔کسی کے اخلاص کی قدر نہیں رہی۔لوگ بس اپنے فائدے کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔عائشہ نصیر کی کم ہمت ٹھیک تھی۔صحیح وقت پر درست فیصلہ کرنا بے حد اہمیت رکھتا ہے۔بعض اوقات انسان وقت پر فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا اور یہی کم ہمتی اسے ہیرو سے زیرو کر دیتی ہے۔کچھ ایسا ہی جیک کے ساتھ ہوا۔لیلیٰ کے سامنے ہیرو بننے کے چانس پر اس کی کمزور قوتِ فیصلہ غالب آ گئی۔عمران قریشی کی محاذ دلچسپ تھی اور انجام ہمیشہ کی طرح چونکا دینے والا تھا جو اُن کی تحریر کا خاصہ ہوتا ہے۔حمزہ جیسے خود غرض اور مفاد پرستوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔چھٹانک بھر کی لڑکی سہانا نے اسے اچھا ناچ نچایا اور وہ کاٹھ کے الو کی طرح ناچتا بھی رہا۔عمران صاحب بہت خوب۔عکس فاطمہ کی بے سمت اچھی لگی۔بعض اوقات زندگی کی بقا کے لیے بے سمت سفر کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے۔پیٹریشیا نے اپنے پھوہڑ اور اجڈ پن کی وجہ سے پروفیسر ایڈ وائلڈ جیسے نفیس طبیعت شخص کی زندگی تباہ کر رکھی تھی۔اس قید سے نجات کے لیے پروفیسر کا فرار ہونا بالکل جائز تھا۔پیٹریشیا نے آخر وقت میں اسے کاموں میں الجھانے کی کوشش کر کے خود اپنی موت کو دعوت دی۔گو شمارے نے بور نہیں کیا مگر مواد غیر معمولی دلچسپی کا باعث بھی نہیں تھا۔مجموعی طور پر اکتوبر کا جاسوسی اوسط درجے کی کہانیوں پر مشتمل تھا۔“ (اپنی اپنی پسند ہے...... مگر کچھ کہانیاں اول درجے کی بھی تھیں)

ملتان سے محمد حسنین کے حملے ”میں جاسوسی کو بھول جاؤں، یہ ممکن نہیں اور جاسوسی والے مجھے بھول جائیں یہ میں ہونے نہیں دوں گا۔(اچھا، کیسے؟) پچھلے دو ماہ سے حاضری نہیں لگی اور مجھے ایسی فیلنگ آنے لگی کہ آپ مجھے بھولنے لگے ہیں سو میں پھر سے آ گیا۔(واہ کیا بروقت فیلنگ ہے) ستمبر کا جاسوسی اس بار معمول سے بہت لیٹ ملا اور اس میں اپنا تبصرہ غائب دیکھ کر افسوس ہوا،

بہر حال یہ افسوس اس وقت خوشی میں بدل گیا جب اکتوبر کا جاسوسی ایک ہفتے بعد ہی مل گیا۔ تبصرہ بھی لیٹ ہی بھیج رہا ہوں تو بس تھوڑے لکھے کو بہت جانیں اور چینی نکتہ چینی میں حاضری لگوا دیں۔ خوش رنگ حسینہ ماتھا ٹیڑھا کیے ٹیڑھی نظروں، سوری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس نے دوسری آنکھ چھپائی ہے مجھے تو لگتا ہے کہ کہیں بھینگی نہ ہو۔ جتنی نظر آ رہی، اس کی خوب صورتی میں کوئی دو رائے نہیں ہیں شاید اسی لیے مصور صاحب ہر دو ماہ بعد اسے ہی جاسوسی کے ٹائٹل پر پینٹ کر دیتے ہیں۔ حسینہ کے بالوں سے کسی جوں کے مانند نمودار ہونے والے گرین مین کی حالتِ زار پر خوب ہنسی آئی البتہ اوپری کونے میں سے جھانکتی گن کی موجودگی سمجھ سے باہر تھی۔ اداریہ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ پشاور کی ایمان علی کی بے شرط محبت والی باتیں پسند آئیں لیکن وہ کیا ہے کہ جب رسالے اتنے سستے تھے تو تب رنگ بھی تین ہوتے تھے، قسط وار بھی گرداب، للکار ہوتی تھیں اور ہر ایک دو ماہ بعد بہترین انگریزی ناول کا ترجمہ بھی آ جاتا تھا۔ نامعلوم مقام کی صائمہ کا تبصرہ اچھا لگا۔ محمد اقبال واقعی کوئی باریک چشمہ لگا کر کہانیاں پڑھتے ہیں لیکن میں تو صرف سن گلاسز ہی لگاتا ہوں۔ بینا راجپوت، میں تو پوری کوشش کرتا ہوں کہ ہر ماہ حاضری لگے لیکن یہ بات انہیں بری نہ لگے جو کئی ماہ بعد تبصرے لکھتے اور انہیں جگہ نہیں ملتی۔ نگاہ حسیب اور ارسلان بدر نے خوب صورت تبصرے پیش کیے۔ کوٹری کی حمیرا رفیق کی منظر کشی بھی دلچسپ رہی۔ ابتدائی صفحات پر اس بار یعقوب بھٹی نے اپنے قلم کا شاہکار پیش کیا۔ لمبے عرصے بعد ان کی بھرپور آمد نے دل خوش کر دیا۔ اگلی تحریر کا بے صبری سے انتظار ہے۔ الیس کا کردار سب سے اعلیٰ تھا۔ اس کی موت پر بڑا افسوس ہوا۔ نئی سلسلے وار کہانی دہر کا تعارفی نوٹ بڑا دھانسو ہے اور اسے پڑھ کر لگتا کہ کہانی بھی لاجواب ہوگی۔ حسام بٹ اچھا لکھ رہے ہیں لیکن لمبے چوڑے مکالمے بور کر دیتے ہیں۔ اس بار ہیرو جے پی کو فلسفی سے ایکشن میں لائے ہیں تو ہمیں بھی پڑھنے میں مزہ آیا۔ شعلہ زن نے اس بار شدید مایوس کیا۔ پچھلی اقساط کی شاندار پرفارمنس کے بعد یہ قسط یکلخت ہی نیچے آن گری ہے۔ پچھلی قسط سے کوئی تال میل نظر نہیں آیا۔ سارہ اپنے بابا کی لوکیشن پہلے ہی موبائل پر حاصل کر چکی تھی لیکن دھماکے کے بعد اسے ہوش ہی نہیں رہا۔ دھماکا کرنے والے لڑکے امجد اور پرویز تھے لیکن اسپتال میں امجد کسی خالد کو پکارتا رہا۔ غرض یہ کہ لگا ہی نہیں کہ روبینہ رشید نے یہ قسط لکھی ہو۔ بالکل مزہ نہیں آیا۔ ایسا لگتا ہے کہ روبینہ رشید صاحبہ شاید کہانی کو بھرپور وقت نہیں دے پا رہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی اجمل بھٹی نے قاتل سلاخیں کے نام سے لکھی۔ پڑوسی ملک کے پس منظر میں معاشرتی برائیوں کا احاطہ کرتی ایک اچھی تحریر تھی لیکن را کے ایجنٹ کا ایسا ذہنی مریض ہونا سمجھ سے باہر تھا۔ اجمل بھٹی کی پہلی کہانی کو البتہ ایک بہترین کوشش کہا جا سکتا ہے۔ خود فریبی محمد فاروق انجم کی.... جانب سے ایک اچھی تحریر پیش کرنے کی بھرپور کوشش تھی۔ مجھے اس کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ پڑھنے کے بعد یہ ختم ہوگئی۔ آج کے دور میں کون لینڈ لائن فون استعمال کرتا ہے، وہ بھی واردات کے دوران۔ اکتوبر کا بہترین اور لاجواب کہانیوں پر مشتمل شمارہ پیش کرنے پر شکریہ قبول کریں۔ مختصر کہانیوں پر تبصرہ رہ گیا لیکن ابھی نہ بھیجا تو میرا تبصرہ چینی نکتہ چینی سے رہ جائے گا۔ اگلے ماہ پھر حاضری ہوگی۔'' (بہت نوازش)

کراچی سے محمد اقبال کے مزے ''اکتوبر کا جاسوسی ہاتھ آیا تو سارے دن کی کوفت دومنٹ میں غائب ہوگئی۔ لائٹ کلر ٹائٹل، اوپر کے کونے پر بدصورت سی انگلیوں میں خوفناک ریوالور، درمیان میں حسینہ اپنی زلفوں سے ایک آنکھ چھپائے کھلے منہ سے خرگوش کی طرح دو دانت نکالے ہوئے تھی۔ نیچے ایک کونے پر چھوٹے قد کے صاحب اَن دیکھی طاقت سے خوف زدہ انداز میں پیچھے کی طرف گر رہے تھے۔ فہرست دیکھ کر مایوسی ہوئی، ہمارے فیورٹ رائٹرز میں سے کوئی ایک نام بھی نہیں تھا۔ مختصر سے اداریے میں ہمارے پیارے نبیؐ کی شخصیت کو عمدگی سے بیان کیا گیا۔ پہلے نمبر پر پشاور سے ایمان علی موجود تھیں۔ یقین کیجیے ان کا خط پڑھ کر بہت مزہ آیا اور ہم بھی بیتے دنوں میں پہنچ گئے۔ پندرہ روپے والے دور کی باتیں اب خواب جیسی لگتی ہیں۔ بینا راجپوت نے عمدہ خط لکھا خاص طور پر جس طرح راجپوت صاحب کی رقابت کا ذکر کیا مزہ آ گیا۔ چھوٹے سے شہر کوٹری کی حمیرا رفیق کا مختصر خط اچھا لگا۔ کراچی سے ارسلان بدر کا شکوہ بہت جاندار تھا۔ کہانیوں پر تبصرہ بہت شاندار تھا اور باقی حالات پر تجزیہ نگاری بھی عمدہ تھی۔ نہ جانے کیوں اتنے اچھے تبصرہ نگار کے خطوط شائع نہیں ہو پائے، امید ہے آئندہ ارسلان بدر کو شکوہ نہیں ہوگا۔ محفل میں ایک اچھے تبصرہ نگار کا مستقل اضافہ ہو جائے گا۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں فتح یاب سے شروع کیا۔ یعقوب بھٹی نے فتح یاب سے ہمیں بھی فتح کر لیا۔ یہ بھی

اطلاع

تمام مصنفین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مسترد شدہ کہانیاں محفوظ رکھنا ادارے کے لیے ممکن نہیں ہے۔
اس لیے کہانیوں کی نقول وہ اپنے پاس رکھیں کیونکہ مسترد کہانیاں تلف کر دی جاتی ہیں۔

میرے فیورٹ رائٹرز کی لسٹ میں آ گئے ہیں، بہترین کہانی ترتیب دی۔ الپس نے دشمنوں کے دانت جس طرح کھٹے کیے مزہ آ گیا، میرا مزاج بھی کچھ اسی طرح کا ہے، دشمنوں کے نرغے میں رہتے ہوئے جو ہیرو اپنا کام کر رہا ہوتا ہے، مجھے بہت متاثر کرتا ہے۔ روبینہ رشید کی شعلہ زن میں کہانی کی ہیروئن کے بھرپور ایکشن میں آنے کا انتظار ہے، اس قسط میں نئے کردار شمشیر کو داخل کیا گیا ہے، آخر تک وہی چھایا رہا اب آگے دیکھتے ہیں کہ گرفتار ملزمان کو کس طرح ہینڈل کرتا ہے۔ خود پسند ابراہام کوئی خاص پرفارمنس نہیں دے پا رہا۔ حسام بٹ کی دہر بھی مناسب جا رہی ہے۔ ہیرو جاسم استنبول پہنچ کر کیا گل کھلاتا ہے، اس کا انتظار ہے۔ اس قسط میں ناجیہ کے لیے ڈیوڈ نے کالی بلی کا جو ڈائیلاگ بولا ہے، اس نے بہت مزہ دیا۔ فاروق انجم کی خودفریبی مناسب کہانی تھی۔ عمران قریشی کی محاذ بہت اچھی لگی۔ فاطمہ حسام کی صبر آزما مناسب تھی، اجمل بھٹی میرے لیے نیا نام ہے، سرورق کے لیے اچھی تحریر پیش کی۔‘‘

تلمیہ سے آیت نور کے انداز ے’’دو ماہ کے بعد پھر حاضر ہوئی ہوں۔ دل تو کرتا ہے لکھنے کا مگر مصروفیات اور وقت اجازت نہیں دیتا، خیر سرورق اچھا ہے۔ حسینہ مہ جبینہ بے چاری خیالوں میں گم ہے اور اسے پتا ہی نہیں ہے کہ اس کے جھمکے میں ایک بے چارہ میسنہ سا آدمی اٹک گیا ہے لیکن حسینہ اپنے خیال سے باہر نکلے گی تو ہی دیکھے گی نا۔ ویسے دیکھنے میں اور سننے میں تو یہ ہی آتا ہے کہ دل حسینہ کے جھمکے میں اٹکتا ہے مگر یہاں تو پورا آدمی ہی جھمکے میں اٹکا ہوا ہے۔ خیر سرورق اچھا لگ رہا ہے اور حسینہ کے بالوں کے اوپر ہی اس گانے پر پورا اتر رہا ہے کہ لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالما یہ الگ بات ہے ریوالور والے ہاتھ کو یہ خدشہ ہے کہ کہیں حسینہ کے بالوں میں جوئیں ہی نا ہوں اس لیے وہ بے چارہ ریوالور استعمال کر رہا ہے۔ چلیں بات ہو جائے اداریے کی تو تمام باتوں سے متفق ہوں۔ بیشک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری انسانیت اور پوری کائنات کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہیں اور ان کی تعلیمات پر عمل کر کے ہی ہم ہدایت پا سکتے ہیں۔ تبصروں میں سب کے ہی تبصرے تحسین لائق تھے مگر ایمان علی کو پڑھ کے بہت اچھا لگا اور خوشی بھی ہوئی کہ اتنی پرانی قاری نے خط لکھا بہت خوب، اب آتی رہیے گا۔ یعقوب بھٹی کی کہانی فتح یاب بہت بہترین اور عمدہ کہانی ثابت ہوئی۔ شروع میں تو ایسا لگ رہا تھا کہ کہانی محبوب کی بیوفائی پر ہوگی مگر کہانی نے جس طرح پلٹا کھایا، وہ حیران کن تھا۔ بیشک یہ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ الپس کی موت پر بہت دکھ ہوا۔ لیکن الپس جاتے جاتے دشمنوں کا ناقابلِ فراموش نقصان کر گیا بہت خوب۔ صبر آزما...... فاطمہ حسام کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں کیونکہ ابھی پڑھنے لگی ہوں جاسوسی رسالہ تو کچھ پتا نہیں ہے۔ اچھا لکھتی ہیں۔ یہ کہانی بھی بہت پسند آئی لیکن شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سلیم ملک کچھ نہ کچھ گڑبڑ کر رہا ہے۔ لوگ کیسے کیسے روپ چڑھائے رکھتے ہیں اور جب ان کا اصل چہرہ سامنے آتا تو بندہ دم بخود رہ جاتا ہے۔ اسی طرح کہانی میں بھی ہوا۔ بظاہر سادہ اور معصوم نظر آنے والا عارف جو کہ ایک مصنف ہے، وہ کہانی کے آخر میں کس روپ میں جلوہ گر ہوا، یہ پڑھ کر حیرانگی تو نہیں تعجب ضرور ہوا۔ بے سمت بھی اچھی کہانی تھی ویسے زیادہ تر دیکھنے میں یہ ہی آتا ہے کہ مرد کو ایسی بیوی پسند نہیں ہوتی جو آگے سے زبان چلائے اور اگر غصیلی بھی ہو تو پھر تو اللہ ہی حافظ ہے۔ ایڈ نے صحیح فیصلہ کیا مگر اپنی بیوی کو ہی ٹھکانے لگا دیا، کچھ صحیح نہیں لگا۔ اے آر راجپوت کی مخبر اچھی کہانی تھی لیکن اُلجھی ہوئی سی تھی، اچھا لکھتے ہیں مگر زیادہ تر کہانیاں اُلجھی ہوئی سی ہوتی ہیں یا شاید مجھے لگتی ہیں۔ مخبر بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ معاشرے کے سیاہ اور گھن کی طرح چاٹتے ہوئے عناصر کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا بہت خوب۔ محاذ، عمران قریشی کی کہانی بھی تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں نا کہ اپنے مطلب کے لیے کسی کی بھی زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ کم ہمت مختصر سی کہانی تھی مگر اچھا لگا پڑھ کر۔ اس کے علاوہ جوابا زہرا بتول کی کہانی بھی اچھی تھی۔ زہرا بتول کا نام پڑھا پڑھا سا لگ رہا ہے۔ بہرحال اچھی کہانی تھی‘ شاکر نے عمدہ اداکاری کے جوہر دکھائے۔ سرورق کی پہلی کہانی قاتل سلاخیں...... بہت ہی دلچسپ اور سسپنس لیے ہوئے تھی۔ پہلا پیراگراف تو بہت ہی دلکشی لیے ہوا تھا...... شروع میں تو سچ میں اس منظر میں کھو ہی گئی تھی، بہت ہی عمدہ منظر نگاری کی گئی تھی۔ اور پھر شروع ہوئی سنسنی خیز اور تھرل سے بھرپور کہانی جس نے آخر تک اپنے حصار میں لیے رکھا اور کہانی میں جن منفی پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا، بلاشبہ وہ تمام برائیاں ہمارے معاشرے میں بھی بڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پل پل بدلتی صورت حال اور تجسس سے بھرپور کہانی لگی۔ بہت عمدہ طریقے سے لکھاری نے کہانی کو پیش کیا جس کے لیے وہ داد کے مستحق ہیں۔ سرورق کی دوسری کہانی خودفریبی بھی اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب رہی۔ خاور کی حد سے بڑی ہوئی خود اعتمادی اس کو ہی لے ڈوبی...... بس جو سجاد کو کچھ پُراسرار سا دکھایا گیا وہ نہ بھی دکھاتے تو بھی کہانی اچھی لگتی۔ دہر حسام بٹ کی کہانی اس ماہ فلمی ٹچ لیے ہوئے تھی۔ میں پڑھتے ہوئے سوچ ہی رہی تھی کہ اس ناجیہ کو کوئی اغوا ہی نہ کر لے اور دوسرے ہی پل وہ خدشہ درست ثابت ہوا اور ناجیہ بیگم منظر سے غائب...... اسی طرح دوسری کچھ جگہ پر بھی ہوا...... خیر اس سب کے باوجود کہانی اچھی لگی۔ شعلہ زن نہیں پڑھی ابھی تو اس کے لیے معذرت۔‘‘

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

شہزاد احمد، کراچی۔ غزالہ وحید، لاہور۔ راحیل علی، کراچی۔ عاتکہ کامران، حیدرآباد۔

احمد سلیم سلیمی

موت کا بے تابانہ رقص دیکھنے والوں کو یومِ حساب کی جھلک اپنی یاد دلا دیتی ہے... فطرت کے لگائے زخموں کا مداوا خود فطرت کر دیتی ہے... مگر انسانوں کے دیے گئے بدترین زخموں سے فطرت چُور ہو جاتی ہے... جس کے ناتواں کاندھے اپنی وادیوں میں بسے دکھوں سے چُور باشندوں کے لیے اپنی بانہیں وا رکھتی ہے... مشفق ماں اور مہربان دوست کی طرح... مگر اس کے مضمحل ہاتھ کب تک زخم خوردہ اور شکستہ انسانوں کو سہار سکیں گے... قدرت کی صناعی کا لازوال شاہکار اس وادی کی صورت میں ایک انعام تھا... جسے چند فطرت دشمن عناصر نے اپنا نشانہ بنایا ہوا تھا... ایسے خوں خوار ماحول میں اس کی آمد کسی بہار کے جھونکے کے مانند تھی... وادی کے مقامی جنگلات کو منہ زور درندوں سے بچانے کی کوششوں میں سرگرداں ایک جوشیلے نوجوان کی زندگی کی کٹھن آزمائشیں...

خطروں میں گھری محبت اور فطرت کی لازوال داستاں......

مادو پور وادی میں شام اُتر آئی تھی۔ سفیدہ، شہتوت اور خوبانی کے اونچے اونچے پیڑوں کے نیچے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ یہ وادی بلند پہاڑوں کے دامن میں، ڈھلوانی علاقے میں تھی۔ کہیں کھلے کھیت تھے اور کہیں ایک ہی جگہ بہت سے مکان بنے ہوئے تھے۔ وادی میں درختوں کی بہتات تھی، کہیں سرسبز ٹیلے موجود تھے۔ پھر ایک طرف خشک چٹیل پہاڑ تھے۔

مادو پور کے درمیان ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں سے ضروریاتِ زندگی کی بہت سی چیزیں مل جاتی تھیں۔ جو نہیں ملتی تھیں، ان کے لیے طویل فاصلہ طے کر کے آگے جانا پڑتا ہے۔

شام کے ایسے پہر مادو پور کے ایک بلند سے ٹیلے پر بنے گیسٹ ہاؤس کے پورچ میں ایک سرکاری گاڑی آ کر رکی تھی۔ گاڑی میں تین افراد تھے۔ دو مرد اور ایک نوجوان عورت...... ایک مرد جو گاڑی چلا رہا تھا وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ دوسرا مرد ایک نوجوان تھا۔

اس کا نام سلمان احمد تھا۔ وہ جنگلی حیات کے سرکاری محکمے میں افسر تھا۔ ساتھ میں اس کی بیوی حنا تھی۔ جبکہ ادھیڑ عمر کا آدمی ان کا ڈرائیور بھی تھا اور خدمت گار بھی۔ وہ سب ضلعی ہیڈ کوارٹر سے تقریباً دو گھنٹے کا پہاڑی سفر طے کر

کے یہاں پہنچے تھے۔ بہت عرصہ پہلے سڑک پر تارکول بچھایا گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بہت شکستہ ہوگئی تھی۔ پھر کسی حکومت کو توفیق نہیں ہوئی کہ اس پر نیا تارکول بچھائے۔

مادو پور کے پہاڑوں پر ایک خاص ہرن پایا جاتا تھا۔ اس کی نسل معدوم ہوتی جارہی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ غیر قانونی طور پر اس نایاب ہرن کا شکار تھا۔ آئے دن سوشل میڈیا پر اس کے شکار کی خبریں اور تصویریں گردش کرتی رہتی تھیں۔ وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ کے خلاف عام لوگ، سماجی تنظیمیں بھی شدید غم و غصے کا اظہار کررہی تھیں۔ ایسے میں سلمان احمد کو محکمے کی طرف سے یہ ذمّے داری دے کر بھیجا گیا تھا کہ وہاں کی صورت حال کا قریب سے جائزہ لے۔ جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے محکمے کے ساتھ ساتھ، مقامی سطح پر جو عوامی تنظیم بنی ہوئی ہے، ان کے اشتراک سے کوئی موزوں لائحہ عمل مرتب کر کے ان شکایات کا ازالہ کرنے کی کوشش کرنی تھی۔

مادو پور میں محکمۂ جنگلات اور جنگلی حیات کا دفتر موجود تھا۔ افسروں کی سہولت کے لیے ایک پُرفضا مقام پر گیسٹ ہاؤس بھی بنا ہوا تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤس بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ وہاں سے دور تک وادی کسی خوب صورت تصویر کی طرح نظر آتی تھی۔

ان کی شادی ایک سال قبل ہوئی تھی۔ اتفاق سے تین دن بعد ہی ان کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ ان کا ارادہ شہر میں ہی بھرپور طریقے سے اسے منانے کا تھا مگر سرکاری طور پر سلمان احمد کو ایک ہفتے کے لیے مادو پور جانے کا حکم ہوا تو حنا بہت مایوس ہوئی۔ بہت خونی معرکوں، دشواریوں اور تکالیف کے بعد ان کی شادی ممکن ہوسکی تھی۔ وہ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ شاندار طریقے سے منانا چاہتے تھے...... لیکن سرکاری حکم نامے نے ان کے سارے جوش کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا تھا۔

تین بیڈ رومز کے گیسٹ ہاؤس کی وہ عمارت اس وقت خالی تھی۔ ان تینوں کے علاوہ گیسٹ ہاؤس میں ایک ملازم تھا۔ وہ چوکیدار تھا اور خانساماں بھی......

☆☆☆

اگلی صبح سلمان اپنی سرکاری ذمے داریاں نبھانے جنگلی حیات کے دفتر چلا گیا۔ اس نے جاتے ہوئے بتایا تھا کہ کوشش کرے گا وہاں سے جلدی فارغ ہوکر آئے۔ پھر کہیں گھومنے جائیں گے۔ وہ یہاں پہلی دفعہ آئی تھی.... سلمان نے بتایا تھا کہ مادو پور کی وادی حسنِ فطرت کا حسین مرقع تھی۔

یہاں جھیلیں تھیں، سرسبز باغ تھے، دریا کنارے کا خوب صورت سماں تھا۔ سب سے بڑھ کر آزادی تھی۔ ایسی آزادی جس کے لیے وہ پورے ایک سال سے ترسے ہوئے تھے۔ ان کے دل کی زمین پر جب سے محبتوں کے پھول کھلے تھے، انہیں نفرت، دشمنی اور پریشان حالی کے کانٹوں میں گھسیٹا گیا تھا۔ بہت دکھ اٹھانے کے بعد اب کہیں جا کر انہیں آسودگی نصیب ہوئی تھی۔ ایسے میں مادو پور کی وادی میں وہ پچھلے سارے غم بھلا کے سکون کے چند دن گزارنا چاہتے تھے۔

حنا گیسٹ ہاؤس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس طرف وادی کے عقبی حصے میں گہری کھائیاں تھیں۔ جن میں پاپلر، کیکر اور اخروٹ کے بہت سے پیڑ تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی بلند و بالا خشک اور چٹیل پہاڑ تھے۔ ان کی چوٹیوں پر کہیں کہیں گزشتہ سردیوں کی برف اب بھی موجود تھی۔ صبح دم کی نکھری دھوپ ان برفیلی چوٹیوں سے لپٹ کر روشن روشن سرگوشیاں کررہی تھی۔ اب موسم بدل رہا تھا۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ ایسے میں نئی سردیوں کی برف پھر ان پہاڑوں پر جمنے والی تھی۔

حنا گیسٹ ہاؤس کی اس کھڑکی سے باہر یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اسی دم بہت سے پرندے، ڈار کی شکل میں دور سے اُڑتے ہوئے آکر وادی کی ان گہری کھائیوں میں موجود بلند پیڑوں میں غائب ہوگئے۔ وہ ان پرندوں کی طرف دیکھتی رہی۔ آزاد فضاؤں میں ان کی اُڑان سے اس کی سوچ کے طیور بھی جیسے پرواز کرتے ہوئے پیچھے جانے لگے۔ وہ اس کھڑکی سے باہر دیکھتے دیکھتے سفر طے کرتے ہوئے ایک سال پیچھے چلی گئی۔ جب اس کی زندگی کی پُرسکون جھیل میں طغیانی آگئی تھی۔

ایک سال پہلے وہ یہاں سے بہت دور اپنے گاؤں میں تھی۔ یہ گاؤں نانگا پربت کے دامن میں واقع تھا۔ ان کے گاؤں کے قریب ہی بہت بڑا گلیشیر تھا۔ جو اوپر نانگا پربت کے برف زاروں سے ٹوٹ کر نیچے آیا تھا۔ پھر وہاں سے پگھلتا ہوا پہاڑی نالے کی صورت میں نشیب کی طرف بہتا تھا۔ وہاں نشیب کی آبادیوں کو سیراب کرتا ہوا دریائے سندھ میں جاملتا تھا۔

گاؤں کے مغرب کی جانب پہاڑوں پر گھنے جنگلوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں صنوبر، دیودار اور شاہ بلوط کے درخت کثرت سے تھے۔ گاؤں کی آبادی چالیس پچاس گھرانوں پر مشتمل تھی۔ لوگوں کے مزاج اور بود و باش میں سخت قبائلی رسوم و رواج کے اثرات موجود تھے۔ اللہ، نبیؐ

اور مولوی کے بعد ان کے رسوم ورواج کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

حنا ابھی دس سال کی تھی کہ گاؤں سے نکل کر بڑے شہر میں آگئی۔ وادی پر پھیلے پہاڑوں سے نیچے بہت فاصلے پر جہاں شاہراہ قراقرم تھی۔ جس پہ دو گھنٹے کے مزید سفر کے بعد ضلع کے شہر چلاس پہنچتے تھے۔ یہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ وہاں حنا کا چچا سرکاری ملازم تھا۔ اسے سرکاری مکان بھی ملا ہوا تھا۔ گاؤں میں پرائمری اسکول تھا۔ حنا نے اپنے گاؤں میں پانچویں تک پڑھا تو وہاں کی ہر لڑکی کی طرح اس کا بھی تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کیونکہ ان علاقوں میں بچیوں کو پڑھانے کا رواج اول تو نہیں تھا۔ اگر کسی نے پڑھا یا بھی تو واجبی سا' پرائمری اسکول تھا۔ جس میں ایک مولوی صاحب کو سرکار نے استاد بھرتی کیا تھا۔ وہ بچوں اور بچیوں کو ابتدائی کلاسیں پڑھاتا تھا۔ کل ملا کر بیس بائیس طلبا ہوتے تھے۔ اس لیے مولوی صاحب کے لیے کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ بعد میں بچے بچیوں کی تعداد بڑھ گئی تو حکومت نے قریبی علاقے کے ایک پڑھے لکھے جوان کو استاد بھرتی کر کے وہاں بھیج دیا تھا۔

پانچویں تک پڑھ کے حنا بھی عام لڑکیوں کی طرح گھر بیٹھ جاتی مگر اس کے ابا نے روایت توڑ دی۔ اسے چلاس شہر میں موجود اپنے بھائی کے پاس بھیج دیا۔ وہاں لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا۔ گاؤں میں بڑے بھائی اور اس کے گھر والوں نے بہت غم و غصے کا اظہار کیا۔ اس کے پیچھے ایک طرف یہ حسد تھا کہ ان کی بچیاں پانچویں تک بھی پڑھی نہیں تھیں۔ دوسری... بات یہ کہ حنا بڑے تایا کے بیٹے جمشید سے منسوب تھی۔ حنا کی پیدائش کے چند دن بعد ہی تایا نے اپنے پانچ سال کے بیٹے کے ساتھ اس کا رشتہ پکا کر دیا تھا۔ وہاں کے رواج اور خاندانی روایات کے مطابق اس کے ابا کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس وجہ سے بھی حنا کو چلاس بھیجنے کے فیصلے پر انہوں نے انا کا مسئلہ بنا کر خوب باتیں سنائیں لیکن حنا کا باپ پورے اعتماد اور حوصلے سے ان کے آگے ڈٹ گیا۔

حنا کا باپ عنایت خان علاقے کا نمبر دار تھا۔ قبائلی علاقوں میں یہ بڑے دبدبے والا منصب ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے جرگوں اور فیصلوں میں نمبر دار کا اہم کردار ہوتا ہے۔ ایسے میں اسے اپنی بات منوانے میں دوسروں کی نسبت آسانی ہوتی تھی۔ اس نے اپنے بڑے بھائی اور اس کے گھر والوں کو بھی پورے اعتماد سے منوایا۔

اب وہ دسویں پاس کر چکی تھی اور آگے بھی پڑھنا چاہتی تھی مگر پورے دیامر میں لڑکیوں کا کالج موجود نہیں تھا۔ اس کے لیے وہاں سے بہت دور بڑے شہر جانا پڑتا تھا۔ لیکن عنایت خان کے لیے اب ممکن نہیں تھا کہ اتنا بڑا قدم اٹھالے۔ اس سے آگے پڑھانے میں درپیش مسائل کا سامنا کرنے کی اب اس میں بھی ہمت نہیں تھی۔ حنا نے بہت احتجاج کیا۔ چلاس والے چچا کی بیٹی کا بھی حوالہ دیا۔ جس نے اس کے ساتھ میٹرک پاس کیا تھا۔ اب وہ آگے پڑھنے گلگت جانے والی تھی۔ مگر نمبر دار عنایت کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”زیادہ ضد مت کرو۔ میں نے پہلے ہی علاقے کے رواج کے برعکس تمہیں دسویں تک پڑھایا ہے۔ تمہارے تایا اور اس کے گھر والوں کی باتوں کا سامنا کیا۔ اب گلگت جا کر کالج میں پڑھنے کا خیال دل سے نکال دو۔“

اس کا رشتہ پیدائش کے ابتدائی دنوں میں ہی تایا کے بیٹے جمشید سے طے ہوا تھا۔ جمشید کی تعلیم تو بس واجبی سی تھی۔ اس نے پانچویں تک پڑھا تھا۔ اس کے بعد شہر جا کر چھوٹے موٹے دھندے کرتا رہا تھا۔ پھر گاؤں آ کر لکڑیوں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس کا پورا گروہ تھا۔ جنگل سے غیر قانونی طور پر تعمیراتی لکڑی کاٹ کے لاتے تھے اور چوری چھپے شہر لے جا کر بیچ دیتے تھے۔

حنا میٹرک کے بعد گاؤں واپس آگئی تو سب کو خیال آیا کہ اب اس کی شادی ہونی چاہیے۔ بڑے تایا کے گھر والوں کی طرف سے بھی ایسا پیغام آ گیا۔ پھر سرگوشیاں ابھریں۔ بند دروازوں کے پیچھے چپکے چپکے فیصلے ہونے لگے۔ پھر بات پکی ہو گئی کہ آنے والی سردیاں ختم ہوتے ہی حنا اور جمشید کی شادی کر دی جائے گی۔

حنا نہایت دل کش خدوخال کی لڑکی تھی۔ گندمی چہرے پر اماوس سی سیاہ آنکھیں اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتی تھیں۔ جبکہ جمشید عام سی شکل وصورت اور کھردرے لب و لہجے کے ساتھ اس کے جوڑ کا بالکل نہیں لگتا تھا۔

وہ اپنے دل میں جمشید کے لیے ذرا سا بھی پیار پیدا نہیں کر سکی تھی۔ وہاں کے رواج کے مطابق وہ بہت کم ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے۔ کبھی عید یا پھر خاندان میں کوئی شادی ہو تو ایک آدھ جھلک دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس کبھی کبھار کی ملاقات کے بعد اس کے دل میں ناگواری اور دکھ کے بادل چھا جاتے تھے۔ وہ نرم و نازک تھی۔ بہت ہی دل کش تھی۔ تھلچون جیسی وادی کی عام لڑکیوں سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ مگر بڑوں کے فیصلے کے مطابق جمشید جیسے کم رُو اور جسیم مرد کی شریک حیات بننے والی تھی۔

☆☆☆

وہ بڑی دیر سے گیسٹ ہاؤس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے مناظر میں اُلجھی ہوئی تھیں مگر وہ تصور کی رتھ پہ بیٹھ کر سیکڑوں میل دور اپنی وادی میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں اس کا بچپن، بھری جوانی کا سہانا موسم اور پھر جبر، بغاوت اور کسی کو پانے کی خاطر آگ کا دریا پار کرنے کا ہولناک عرصہ گزرا تھا۔

اس کا تصور ماضی کے کچھ مزید اوراق پلٹ دیتا لیکن اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک نے اسے حال میں لوٹا دیا۔ اس کے دل و دماغ پر ماضی کا ہولناک آسیب اس طرح چھایا ہوا تھا کہ اس ذرا سی دستک سے اس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ بہت دور آ کر بھی پرانے اندیشوں نے اسے اندر سے لرزا دیا تھا۔ وہ آواز دے کر پوچھنا چاہتی تھی۔ اسی وقت کمرے کے باہر سے سلمان کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے دروازہ کھولنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس نے طمانیت بھری سانس لی۔ پھر تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سلمان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے آنے میں دیر تو نہیں ہوئی نا؟ میں وقت سے پہلے ہی دفتر کا کام چھوڑ کر آیا ہوں۔“

وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ ”نہیں، آپ وقت پر آئے ہیں۔ مگر کیا کروں اکیلے میں مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اب بھی آپ نے دستک دی تو میں بُری طرح ڈر گئی تھی۔“

سلمان احمد اسے سے لپٹاتے ہوئے محبت سے بولا۔ ”میں نے تم سے اتنی دفعہ کہا ہے اب ماضی کو بھول جاؤ۔ ان بے رحم موسموں سے ہم بہت دور آ گئے ہیں۔ اس پورے سال میں ہم نے جو دکھ اٹھائے ہیں اب اللہ کا شکر ہے ان کے سائے ہمارے اوپر سے ہٹ گئے ہیں۔“

وہ اس کے سینے سے لگ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ ”ہم دونوں نے بہت مشکل حالات کا سامنا کیا ہے۔ اب بھی میرے اندر اتنا حوصلہ ہے کہ دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آپ کے ساتھ کھڑی رہوں۔ بس کبھی کبھی ایک خوف سا مسلط ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں آپ سے بچھڑ جاؤں گی۔“

”ایسی باتیں دماغ میں مت لاؤ میری جان! مشکل دنوں سے گزر کر ہم آئے ہیں۔ ہماری محبت نے دشمنوں کو شکست دے دی تھی اب آئندہ بھی ہماری محبت کی طاقت ہمیں جدا ہونے سے بچائے گی۔“

اسی وقت سلمان کا ڈرائیور شعبان دستک دے کر اندر آیا۔ ”سر! گاڑی پورچ میں کھڑی کر دی ہے۔ آپ چاہیں تو باہر گھومنے جا سکتے ہیں۔“

سلمان بولا۔ ”چچا! ہم دس منٹ میں باہر آتے ہیں۔“ پھر حنا سے مخاطب ہوا۔ ”حنا! تم تیار ہو جاؤ۔ باہر گھومنے جاتے ہیں۔ مادو پور کسی شاعر کے خیال کی طرح حسین ہے۔ تم بہت لطف اٹھاؤ گی۔“

☆☆☆

حنا کو وہ شام کبھی نہیں بھولتی تھی جب گاؤں کے قریب کے جنگل سے شدید فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ دیامر کی ان وادیوں میں فائرنگ کی آواز کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ قبائلی تمدن کی حامل ان وادیوں میں بندوق کا استعمال مردوں کے لیے فخر کی بات تھی۔ اپنی طاقت کے اظہار کے لیے، مخالفوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے بندوق کو بہت اہمیت حاصل تھی۔

بندوق کلچر کا ایک بھیانک پہلو بھی تھا۔ اس کا عام استعمال محض نمائش کے لیے نہیں ہوتا تھا بلکہ معمولی معمولی جھگڑوں کا انجام بھی اکثر آتشیں ہتھیاروں کے بے دریغ استعمال پر ہوتا تھا۔ پھر انتقام کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو نسل در نسل چلتا، کئی قیمتی جانوں کو اس کی بھینٹ چڑھاتا تھا۔

اس شام تھلیچون کے قریب کے گاؤں سے بلند ہوتی فائرنگ کی آواز نے گاؤں میں خوف اور سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ سب دھڑکتے دلوں اور خوف بھری نظروں سے کسی افسوس ناک خبر کے منتظر تھے۔

حنا کا ابا گھر میں نہیں تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ جنگل میں فائرنگ لکڑی کے اسمگلرز اور محکمۂ جنگلات کے عملے کے بیچ ہوئی تھی۔ مخبر کی رپورٹ پر محکمے کے اعلیٰ افسران نے اپنی فورس کے ساتھ اچانک چھاپا مارا تھا۔ ٹمبر مافیا کے کارندوں نے خود کو بچانے کے لیے فاریسٹ فورس پر فائرنگ شروع کی تھی۔ فاریسٹ فورس بھی ہتھیاروں سے لیس تھی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر فائرنگ ہونے لگی۔ لکڑی کے اسمگلر بلندی پر تھے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے پہاڑوں اور جنگلوں میں غائب ہو گئے۔ اس فائرنگ سے کسی کی جان نہیں گئی تھی مگر محکمۂ جنگلات کے ایک افسر کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔

اس کے ابا نے بتایا کہ وہ زخمی فاریسٹ افسر اس وقت ان کے مہمان خانے میں موجود ہے۔ اسے فوری طبی امداد دی گئی تھی۔ کل صبح اسے شہر کے اسپتال میں منتقل کیا جائے گا۔

گاؤں سے شہر جانے کے لیے کوئی سڑک نہیں تھی۔ دو گھنٹے کے پہاڑی سفر کے بعد شاہراہ قراقرم پہنچ پاتے تھے۔

وہاں سے گاڑی کے ذریعے آگے کا سفر ممکن ہوتا تھا۔ گاؤں اور آس پاس کی وادیوں کے لوگ اکثر یہ سفر پیدل ہی کرتے تھے۔ کسی ہنگامی صورتِ حال میں گھوڑے یا خچر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ فاریسٹ افسر زخمی ہونے کی وجہ سے گھوڑے پر سوار ہونے کے قابل نہیں تھا اس لیے اسے مناسب طبّی امداد دے کے نمبردار عنایت کے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔

ان کے رہائشی مکان سے ذرا ہٹ کے دو کمرے الگ سے بنے ہوئے تھے۔ عنایت خان سے ملنے شہر سے یا دوسرے علاقے سے مہمان آتے تھے۔ وہ اسی مہمان خانے میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس نے اپنی بیوی اور حنا سے کہا کہ زخمی افسر کے لیے دیسی مرغی کا شوربہ تیار کرلیں۔ دیگر مہمانوں کے لیے بھی کھانا بنائیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود آئے گا یا کسی اور کو بھیج دے گا۔ یہ بتا کے وہ جانے لگا پھر پلٹ کر بولا۔

''سب کہتے ہیں جمشید بھی ان میں شامل تھا جنہوں نے فاریسٹ افسر اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کی تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ غیر قانونی لکڑی کاٹنے کے علاوہ محکمے کے اعلیٰ افسر کو زخمی کرنے کا جرم بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ آج نہیں تو کل ضرور گرفتار ہوگا۔ حکومت سے ٹکر لے کر وہ بچ نہیں سکے گا۔''

حنا پہلے سے ہی جانتی تھی، اس کا منگیتر جمشید لکڑی کی اسمگلنگ کا کام کرتا تھا۔ اس کے دل میں جمشید کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا مگر بزرگوں نے ناتا جوڑ دیا تھا۔ اس حوالے سے ابا نے جب جمشید کے ملوث ہونے کی بات بتائی تو وہ فکرمند ہو گئی۔

حنا کے دو بھائی تھے۔ اس سے بڑا بھائی وہاں سے بہت دور ایبٹ آباد کے ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ سب سے چھوٹا گاؤں میں ہی پانچویں کا طالب علم تھا۔

ماں بیٹی نے مل کر کھانا اور زخمی افسر کے لیے شوربہ تیار کیا۔ بڑی دیر انتظار کیا۔ مہمان خانے سے نمبردار عنایت خود آیا نہ کسی اور کو بھیجا۔ مہمان خانہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ رہائشی مکان سے متصل ان کے دو کھیت تھے۔ ان کے آخر میں الگ سے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس وقت رات کا ابتدائی پہر تھا۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دور دور پھیلے گھروں کے اندر سو واٹ کے بلب جل رہے تھے جن کی روشنی بس مکان کے احاطے تک محدود تھی۔

حنا کا بھائی ابھی کم سن تھا۔ اتنا سارا کھانا اکیلے لے جانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ جب بہت دیر ہوگئی تو ماں کے کہنے پر وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ کھانا لے کر مہمان خانے کی طرف گئی۔ دروازے کے پاس چچا فقیر اللہ نظر آیا۔ وہ ہاتھ میں بالٹی لیے مہمان خانے سے باہر نکل رہا تھا۔ چچا فقیر اللہ ان کا دور پار رشتہ دار تھا۔ نمبردار عنایت خان کا خدمت گار تھا۔ مہمان خانے کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان کے کھیتوں کی نگرانی کرتا تھا۔ جس کے عوض نمبردار عنایت اسے اناج اور دیگر ضرورت کی چیزیں فراہم کرتا تھا۔

حنا اور اس کے بھائی کو دیکھ کر وہ بولا۔ ''حنا بیٹی! اچھا ہوا تم کھانا لے کر آ گئیں۔ نمبردار صاحب نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ گھر سے کھانا لے کر آؤں۔ لیکن مہمان خانے میں اتنا مصروف رہا کہ آنے میں دیر ہوگئی تھی۔''

حنا بولی۔ ''چچا فقیر! ابا اندر موجود نہیں ہیں؟''

وہ بولا۔ ''نمبردار صاحب اور باقی مہمان تمہارے تایا کے گھر گئے ہیں۔ وہاں جرگے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ وہ..... تمہیں علم ہوگا جمشید بھی اس مسئلے میں ملوث ہے۔ ابھی کچھ دیر میں واپس آنے والے ہیں۔ تم یہ کھانا اندر رکھ دو۔ میں سامنے کنویں سے پانی لے کر ابھی آتا ہوں۔''

حنا جھجکتی ہوئی مہمان خانے میں داخل ہوگئی۔ بیرونی دروازے کے سامنے چھوٹا سا آنگن تھا۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی کی چھت کا برآمدہ تھا۔ وہاں ایک سیدھ میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ برآمدے میں بلب جل رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی کھلے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ حنا نے اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا برآمدے میں موجود ٹیبل پر رکھ دیا۔ پھر بھائی کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف جانے کے لیے مڑی۔ اسی وقت ساتھ والے کمرے سے کسی کی آواز سنائی دی۔ اس آواز میں تکلیف بھی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا کون ہے؟ اندر آ جائے۔ اسے پانی دے دے۔

حنا نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ چچا فقیر اللہ پانی لے کر نہیں آیا تھا۔ پانی کا کنواں ان کے مکان اور مہمان خانے کے درمیان بنا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی واپسی میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ حنا اک ذرا ہچکچائی۔ پھر ہمت سے کام لیا۔ کمرے کے دروازے کے پاس آ گئی۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔ اس نیم وا دروازے کے بالکل سامنے پلنگ موجود تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جھانک کر دیکھا۔ پلنگ پر ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں موجود بلب کی روشنی میں وہ سینے تک چادر اوڑھے نیم دراز تھا۔ حنا کا خیال تھا وہ زخمی افسر کوئی عمر رسیدہ شخص ہوگا۔ مگر وہ تو بڑا بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ لیکن اُجلی پیشانی اور گہری آنکھوں کے ساتھ وہ نوجوان جیسے باندھ لیتا تھا۔

حنا ایک ثانیے کو یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ زخمی افسر بھی بڑی محویت اور حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹا کے اسے یوں گھور رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

حنا ایک دم ہوش میں آ گئی۔ مجوب سی ہو کر بھائی کو اشارہ کیا۔ بھائی نے کمرے کے ایک کونے میں رکھی تپائی پر موجود جگ میں سے گلاس میں پانی ڈال کر زخمی افسر کو دیا۔ اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے زخمی افسر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ بہت نرمی سے مسکرایا۔ بہت پیار سے بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ اسی وقت چچا فقیر اللہ بھی بالٹی میں پانی بھر کے لے آیا۔ کمرے سے متصل باتھ روم میں بالٹی چھوڑ کے باہر آیا۔ پھر کہا۔ ”سر! آپ کے لیے نمبر دار صاحب کے گھر سے کھانا آیا ہے۔ آپ ابھی کھائیں گے یا باقی مہمانوں کا انتظار کریں گے؟“

زخمی افسر نے ایک بار پھر پلٹ کر حنا کی طرف دیکھا۔ وہ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر واپس جانے لگی تھی۔ اسی وقت زخمی افسر کی آواز سنائی دی۔ ”تم نمبر دار صاحب کی بیٹی ہو؟“

حنا کے بڑھتے قدم تھم گئے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بس دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولا۔ ”میری وجہ سے تمہیں تکلیف اٹھانی پڑی۔ تمہارا شکریہ!“

حنا شرم بھی، گھبراہٹ بھی محسوس کر رہی تھی۔ جس سماج کی وہ لڑکی تھی اس میں کسی غیر مرد کی طرف دیکھنا بھی انتہائی معیوب بات تھی۔ وہ خواب کی کیفیت میں بولی۔ ”آپ زخمی حالت میں ہمارے گھر آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی کا ہاتھ تھام کر مہمان خانے سے باہر آ گئی۔ وہاں رات کا اندھیرا پہرا دیے کھڑا تھا۔ دو کھیت دور اُن کے رہائشی مکان میں جلتے بلب میں اتنی سکت نہیں تھی کہ دونوں مکانوں کے بیچ راستے کو بھی روشن کر سکے۔ مگر حنا کو اس اندھیرے میں کسی روشن چاند کی طرح زخمی افسر کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی کشش اور گفتگو کی نرمی، حنا کے دل میں میٹھی میٹھی گدگدی کر رہی تھی۔

کھیتوں کے بیچ پگ ڈنڈی پہ چلتے ہوئے وہ بار بار پلٹ کر مہمان خانے کی طرف دیکھتی جا رہی تھی جیسے وہ وہاں سے پکارے گا۔ اس کا دل اچانک لڑکھڑانے لگا تھا، وہ نہیں جانتی تھی یہ کس طرح سنبھل پائے گا۔

پتا نہیں وہ ایسا چاہتی بھی تھی کہ نہیں۔ یہ تو آنے والے وقت میں معلوم ہوتا کہ دل جو پہلی بار لڑکھڑایا تھا یہ زندگی کی کتنی ہی ٹھوکروں کا پیش خیمہ ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

حنا اور سلمان احمد تیار ہو کر گیسٹ ہاؤس کے کمرے سے باہر آئے۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ مادو پور میں صبح اور شام کے وقت خنکی کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ اس وقت بھری دوپہر تھی۔ دھوپ کی گرمی گیسٹ ہاؤس کے کھلے لان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی کومل سی حدت بدن میں اتر کر ایک خوش گوار تاثر چھوڑ رہی تھی۔

ان کے خدمت گار شعبان علی نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شعبان علی ویسے تو محکمۂ جنگلات کا ملازم تھا مگر اپنی شرافت اور اخلاص سے سلمان کو اتنا متاثر کیا تھا، ایک طویل عرصے سے وہ گھر کے فرد کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا۔

گیسٹ ہاؤس کے بائیں جانب ایک کچا راستہ مزید بلند ہوتا ہوا پہاڑوں کے اندر چلا جاتا تھا۔ وہاں ایک تنگ سی وادی کے درمیان سے پہاڑی نالا گزرتا تھا۔ ایک پتلی سی کچی سڑک اس نالے کے ساتھ ساتھ بل کھاتی کچھ دور ایک جھیل تک جاتی تھی۔ جھیل سے آگے سڑک موجود نہیں تھی۔ سلمان اس وقت حنا کو لے کر اسی جھیل کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں خشک پہاڑ تھے۔ سڑک سے نیچے نالے کے ساتھ سفیدے، کیکر اور شہتوت کے درخت تھے۔ کہیں کہیں سرسبز گھاس تھی۔ جہاں بکریاں اور گائیں چر رہی تھیں۔ دور دور کچے مکان بنے ہوئے تھے۔

ایک گھنٹے سے کم وقت میں وہ جھیل کے پاس پہنچ گئے۔ سڑک کے اختتام پر ٹیلے سے بنے ہوئے تھے۔ ان ٹیلوں کی دوسری جانب لمبائی میں پھیلی وہ جھیل تھی۔ اس کے تین طرف پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں کے اندر موجود گلیشیئر سے پگھل کر اس جھیل میں پانی جمع ہوتا تھا۔ وہاں سے نالے کی شکل میں نشیب کی طرف بہتے ہوئے مادو پور اور اس سے متصل آبادیوں کو سیراب کرتا تھا۔

جھیل کے پاس کئی ہٹس اور چھوٹے ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاح جھیل کے آس پاس کی گھاس اور ہموار جگہ پر موجود تھے۔ اس وقت ان کی تعداد کم تھی۔ وہ سب یہاں کے خوب صورت منظر اور خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ دونوں بھی اس جنت نگاہ منظر کا حصہ بن گئے۔ حنا اس جھیل کے پاس آ کے بہت سکون اور مسرت

محسوس کر رہی تھی۔ گزرے سال نے اسے اندر سے اتنا شکستہ کر دیا تھا کہ وہ سکون اور خوشیاں بھول گئی تھی۔ بہت دفعہ زندگی سے بھی مایوس ہو گئی تھی۔

وہ دونوں بڑی دیر نیلے پانیوں کی اس نظر فریب جھیل کنارے بیٹھے رہے۔ شعبان علی ان کے لیے ایک ریسٹورنٹ سے چپس اور پکوڑوں کے ساتھ چائے لے آیا۔ ان کے ساتھ چائے پینے میں وہ بھی شریک ہوا۔

بہت دیر بعد جب سورج بلند پہاڑوں کے پیچھے غروب ہونے لگا تو ماحول میں ٹھنڈک بھی بڑھ گئی تب وہ واپس ہوئے۔ واپسی میں ایک جگہ سڑک بلاک تھی۔ اوپر سے پہاڑی تودہ ٹوٹ کر نیچے سڑک پر آ گرا تھا۔ وقتی طور پر سڑک گاڑیوں کے لیے بند ہو گئی تھی۔ ایک بلڈوزر سڑک پر سے ملبا صاف کر رہا تھا۔ جھیل کی طرف آنے والی اور واپس جانے والی گاڑیاں وہاں کھڑی تھیں۔ ان کی گاڑی بھی اس بلاک کی جگہ پر رک گئی۔ شعبان علی گاڑی سے اتر کر راستے کا قریب سے جائزہ لینے چلا گیا۔ وہ دونوں گاڑی میں ہی بیٹھے راستہ کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔

حنا پچھلی سیٹ پر تھی۔ اچانک ہی وہ چونک اٹھی۔ خوف سے اس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ بلاک والی جگہ کے پاس بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ اس جگہ سے فاصلہ پچاس ساٹھ میٹر کے قریب تھا۔ لوگوں کے چہرے زیادہ واضح بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ حنا کو ان میں سے ایک آدمی کا چہرہ مانوس سا لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا اس شخص کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا۔ اپنا چہرہ چادر میں آدھا چھپایا۔ پھر غور سے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دم حنا کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ اسے پہچان گئی تھی۔ اور یہ احساس بڑا ہی ہولناک تھا۔

وہ شخص تھلچون کا رہائشی تھا۔ اس کا نام جمدر تھا۔ اس کے سابقہ منگیتر جمشید کا قریبی ساتھی تھا۔ ایک سال تک اس کی زندگی میں جتنا زہر گھل گیا تھا، اس میں اُس شخص کا بھی ہاتھ رہا تھا۔ حنا اور سلمان لحہ لحہ کانٹوں سے اُلجھتے، قدم قدم پہ گھات لگائے بیٹھے ستم گروں سے ٹکراتے، صبحِ نو کی تلاش میں یہاں تک آ گئے تھے۔ مادو پور کی وادی، تھلچون سے بہت دور تھی۔ زمینی فاصلے کے علاوہ مسلکی فاصلے بھی ان دونوں علاقوں کے بیچ حائل تھے۔ برسوں تک مسلکی فسادات پھوٹتے رہے تھے۔ تھلچون اور مادو پور والے دو متحارب مسالک سے وابستہ تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی طرف بہت کم آتے جاتے تھے۔ ان دونوں کو یہاں آتے ہوئے آزادی اور راحت کا احساس اس لیے بھی ہوا تھا کہ تھلچون والوں کے لیے یہ وادی عام گزرگاہ نہیں تھی۔ مگر جمدر نامی شخص کی جھلک نے حنا کو اندر سے لرزا دیا تھا۔

اس نے ایک دم شیشہ بند کر دیا۔ سلمان نے اس کی اچانک بدلتی کیفیت بھانپ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“

وہ متفکر لہجے میں بولی۔ ”سلمان! ابھی سامنے میں نے تھلچون کے ایک آدمی کو دیکھا ہے۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

وہ بے نیازی سے بولا۔ ”اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے اس نے ہمیں نہیں دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ تھلچون کا ہر شخص تو ہمارا دشمن نہیں ہے۔“

وہ سہمے انداز میں بولی۔ ”وہ کوئی عام شخص نہیں۔ جمشید کا قریبی ساتھی جمدر ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے۔ پتا نہیں وہ یہاں کیوں آیا ہے؟“

سلمان نے اس کے اشارے پر بلاک کے پاس موجود لوگوں میں اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ نظر نہیں آیا۔ شاید لوگوں کی بھیڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

وہ دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ ”تم پریشان مت ہو۔ جمدر کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ وہ یہاں موجود ہے تو ضروری نہیں ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ وہ کسی اپنے کام سے آیا ہوگا۔“

حنا گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں یہاں آ کر بہت مطمئن تھی۔ کھلی اور آزاد فضاؤں کا احساس بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس کم بخت کی وجہ سے اب سکون پھر غارت ہو جائے گا۔“

اسی دوران میں راستے کا ملبا ہٹا دیا گیا تھا۔ رکی ہوئی گاڑیاں گزرنے لگیں۔ شعبان علی نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی کے شیشے سیاہ تھے۔ باہر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ بلاک کے قریب جا کے سلمان نے بھی جمدر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ گھورتی ہوئی نظروں سے ان کی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ نہ جانے حنا کے دل میں پوشیدہ خوف کا اثر تھا کہ جمدر کے قریب سے گزرتے ہوئے، اس کی گھورتی ہوئی نظریں گاڑی پر جمی دیکھ کر اسے یوں لگا تھا جیسے جمدر جانتا ہے اس گاڑی کے اندر وہ دونوں موجود ہیں۔ اب وہ آگے اپنے آقاؤں کو اطلاع دے گا۔ ان کی زندگی کے پُرسکون دن پھر سے ختم ہوں گے۔ درد کے وہ فاصلے جو طویل ہو گئے تھے، اب پھر سے سمٹ جائیں گے۔

انہیں پھر سے آگ کے دریا سے گزرنا ہوگا......

☆☆☆

مہمان خانے میں موجود وہ زخمی افسر محکمۂ جنگلات کا ڈسٹرکٹ فاریسٹ افسر سلمان احمد تھا۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے امتحان پاس کر کے چھ مہینے قبل ہی اس کی تقرری ہوئی تھی۔ اس کا تعلق ایک دوسرے ضلع استور سے تھا۔ اپائنٹمنٹ کے بعد اس کی پوسٹنگ ضلع دیامر میں ہوئی تھی۔ اسی ضلعے کے ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں تھلچون میں لکڑی کے اسمگلروں سے فائرنگ کے تبادلے میں وہ زخمی ہوا تھا۔

گلگت بلتستان میں سب سے زیادہ جنگلات اسی ضلع میں پائے جاتے ہیں۔ یہ پورا علاقہ مختلف نالا جات میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر نالے کے اندر چیڑ، دیودار اور صنوبر کے درخت بکثرت موجود ہیں۔ اس خطے کی سماجی اور جغرافیائی صورتِ حال ایسی ہے کہ اکثر معاملات میں حکومتی اثر و نفوذ بے عمل ہو جاتا ہے۔ قبائلی تمدن کی حامل ان وادیوں میں بسنے والے لوگ ہتھیاروں کے استعمال اور جنگلات کی کٹائی کے حوالے سے بہت بدنام ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے ایک حد تک اپنی عمل داری کا بھرم قائم رکھ سکتے ہیں۔

قانون کی گرفت کم زور ہونے کی وجہ سے ہی دیامر کے ان علاقوں میں جنگلات بے دردی سے کاٹے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ حکومتی اداروں کی کوششیں اپنی جگہ جاری رہتی تھیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے حکومتی اداروں اور مقامی سماجی تنظیموں کے اشتراک سے جنگلات کے تحفظ کی کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ جنگلات کی کٹائی کے لیے سخت شرائط رکھی گئی تھیں۔ ان شرائط اور قوانین سے رُوگردانی کرنے والوں کے لیے سزائیں تجویز کی گئی تھیں۔

ان اقدامات کی وجہ سے صورتِ حال کچھ بہتر ہوئی تھی۔ پہلے جس طرح آزادی اور بے خوفی سے قیمتی درخت کاٹے جاتے تھے اس میں کمی آئی تھی۔ اس کے باوجود لالچی اور بدعنوان عناصر چوری چھپے قیمتی درخت کاٹ دیتے تھے۔ محکمے کے بھی بے ایمان افسر اور چھوٹے ملازم اس میں ملوث ہوتے تھے۔

سلمان احمد کی پہلی ہی تعیناتی اس ضلع میں ہوئی تو ابتدائی چند ہفتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہاں ٹمبر مافیا کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ ایک شریف اور مضبوط خاندانی پس منظر تھا۔ ہر نوجوان افسر کی طرح اس کے اندر بھی کچھ کر دکھانے کا عزم اور جذبہ تھا۔ آفس جوائن کرنے کے ابتدائی چند دنوں میں ہی اس نے مختلف نالا جات اور جنگلات کا دورہ کیا تھا۔ وہاں کے فاریسٹ گارڈز اور دیگر عملے کو جمع کر کے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ایک درخت بھی کٹ گیا تو ایک مہینے کی تنخواہ کاٹ دی جائے گی۔ ماتحت عملے نے اس کے سامنے یقین دلایا آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ جنگلات کی کٹائی کا سدِ باب کرنے میں وہ سب اس کے شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔

اس کی غیر موجودگی میں وہ سب اس کا مذاق اُڑانے لگے۔ طنزیہ فقرے کسنے لگے کہ نیا افسر ہے، گرم خون ہے۔ فرض شناسی کا بھوت سوار ہے۔ اس لیے ایسے بھاشن دے رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد سارا نشہ اتر جائے گا۔ ٹمبر مافیا کے بڑے بڑے اژدہے پھن پھیلا کر جب اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے یا پھر بڑے بڑے نوٹوں اور نوازشات سے اس کی جیب گرم کریں گے تب سارا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ ویسے بھی ان دور دراز جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں یہ نوجوان افسر، اپنی فرض شناسی کا ڈھول پیٹنے، روز روز کب آسکتا ہے؟ کوئی شکایت کرنی ہے یا رپورٹ فائل کرنی ہے، یہ ہمارا ہی کام ہے۔ سب اچھا کی لوریاں سناتے رہیں گے تو کچھ ہی عرصے بعد یہ جذباتی افسر بھی، اپنے پیش رو افسروں کی طرح، اپنے دفتر کے پُرتعیش ماحول میں خوش فہمی کی نیند سویا رہے گا۔''

تھلچون کے بارے میں بہت شکایات موصول ہوئی تھیں۔ وہاں کے جنگلوں میں دیودار اور شاہ بلوط کے اعلیٰ قسم کے درخت پائے جاتے تھے۔ ان قیمتی درختوں کی کٹائی بے دردی سے ہو رہی تھی۔ سلمان احمد نے ایک ہفتہ پہلے بھی اس وادی کا دورہ کیا تھا۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ شاہراہِ قراقرم سے ایک کچی سڑک بلند ہوتی ہوئی پانچ چھ کلومیٹر تک جاتی تھی۔ وہاں سے آگے سڑک نہیں تھی۔ پہاڑوں کے اندر تین چار فٹ کی پگ ڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ جہاں دو گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد تھلچون تک پہنچ جاتے تھے۔ گھوڑے اور خچر بھی سفر کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

ایک ہفتہ پہلے دورہ کر کے اس نے تھلچون میں متعین محکمۂ جنگلات کے عملے کو خوب سخت سست کہا تھا۔ آئندہ ان کی غفلت پر سخت تادیبی اقدامات کی دھمکی دی تھی۔

اب ایک ہفتے بعد مخبروں کی اطلاع پر اس نے اچانک چھاپا مارا تھا۔ اپنے ساتھ فاریسٹ فورس کو بھی شامل کیا تھا۔ اگرچہ یہ کارروائی انہوں نے خفیہ اطلاع پر کی تھی لیکن ٹمبر مافیا کے کارندوں کو ان کی آمد کی اطلاع فوراً مل گئی تھی۔ سلمان احمد جب اپنے عملے کے ساتھ جنگل میں داخل ہوا تو انہوں نے

مزاحمت کی۔ درخت کاٹنے کے لیے جو بڑی بڑی آریاں تھیں، وہ ایک طرف رکھ دیں اور کلاشنکوف ہاتھوں میں اٹھا لیں۔ سرکاری ٹیم کی پیش قدمی روکنے کے لیے انہوں نے فائرنگ شروع کردی۔

سلمان احمد اور اس کے ساتھی بھی مسلح تھے۔ ادھر سے بھی جوابی فائرنگ کی گئی۔ گھنے جنگل میں موٹے موٹے تنوں کی اوٹ سے دونوں فریق ایک دوسرے پر فائرنگ کرتے رہے۔ ٹمبر مافیا کے کارندے پسپا ہوتے ہوئے پہاڑوں میں کہیں غائب ہوگئے۔ اس دوران سلمان احمد کی ٹانگ پر گولی لگ گئی۔ اس کا عملہ اسے سہارا دے کر نیچے آبادی میں لے آیا۔ وہاں نمبردار عنایت خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی مدد کے لیے فوراً سامنے آیا۔ کھلچون میں ایک ڈسپنسری موجود تھی۔ اس میں ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ خوش قسمتی سے گولی نے ہڈی کو متاثر نہیں کیا تھا۔ گھٹنے سے ذرا اوپر گوشت میں لگ کر پار ہوئی تھی۔ ڈسپنسری سے ابتدائی علاج کے بعد نمبردار اسے اپنے مہمان خانے لے آیا تھا۔ وہیں پر اس کی ملاقات حنا سے ہوئی تھی۔

اس پہلی ہی ملاقات میں گاؤں کی اُس بھولی سی اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی نے اس فاریسٹ افسر کے دل کی دنیا کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

حنا کے تایا شفاعت خان کے مہمان خانے کا ماحول بڑا گرم تھا۔ شفاعت خان سب کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ محکمۂ جنگلات کے کارندے جن میں سلمان احمد کا معاون افسر بھی تھا، اس پر سخت دباؤ ڈال رہے تھے۔ حنا کا ابا نمبردار عنایت بھی سرکاری عملے کی طرف داری کررہا تھا۔ وہ نمبردار ہونے کے علاوہ جنگلات کے تحفظ کے لیے قائم کی گئی سماجی تنظیم کا چیئرمین بھی تھا۔ اس وجہ سے وہ اپنے ہونے والے داماد کی طرف داری سے قاصر تھا۔

اس نے شفاعت خان سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''بڑے بھیا! کئی لوگوں نے گواہی دی ہے جمشید اس گروہ کا سرغنہ تھا جس نے فائرنگ کی ہے۔ انہوں نے جنگلات کی غیر قانونی کٹائی کے علاوہ محکمے کے افسر کو زخمی کرنے کا بھی جرم کیا ہے۔ ایسے میں جمشید کا فرار ہونا دانشمندی نہیں۔ وہ زیادہ دیر بھاگ نہیں سکے گا اس لیے بہتر ہے وہ خود کو پیش کردے۔''

شفاعت خان بولا۔ ''اسے معلوم ہے اس سے جرم سرزد ہوا ہے۔ اسے یہ خوف ہوگا اگر پکڑا گیا تو جیل ہوگی اس لیے بھاگ گیا ہے۔''

عنایت خان نے کہا۔ ''اس کا بھاگ جانا مسئلے کا حل نہیں۔ آپ کو معلوم ہے سردیاں سر پر ہیں۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں کہاں کہاں دربدر بھٹکتا پھرے گا۔ اس کے علاوہ پانچ چھ مہینے بعد اس کی اور حنا کی شادی بھی ہونے والی ہے۔ آپ سوچیں اگر وہ فرار کی زندگی گزارتا رہا تو شادی کیسے ممکن ہوگی؟''

بڑا بھائی فکرمندی سے بولا۔ ''گرفتاری دے کر بھی تو وہ لمبے عرصے کے لیے اندر چلا جائے گا۔ شادی اپنے وقت پر پھر بھی نہیں ہوسکے گی۔ کیا تمہاری پولیس اور عدالت اسے آسانی سے چھوڑے گی؟''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میری بات ہوئی ہے سلمان صاحب سے۔ وہ بہت مہربان اور رحم دل افسر ہیں۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ اس بات پر راضی ہوگئے ہیں کہ یہ معاملہ پولیس اور عدالت تک نہیں جائے گا۔ جرگے کے ذریعے ہی اس کا تصفیہ کیا جائے گا۔ بس جمشید جرگے کے سامنے حاضر ہوجائے۔ اپنے کیے کی معافی مانگے، آئندہ ایسا نہ کرنے کا پکے کاغذ پر لکھ کر دے دے تو اس کا سارا قصور معاف کردیا جائے گا۔''

سلمان احمد کا معاون افسر بولا۔ ''دیکھو چچا! سلمان صاحب جیسا ہمدرد افسر کہیں نہیں ملے گا۔ نمبردار صاحب نے جب انہیں بتایا کہ جمشید ان کا ہونے والا داماد ہے، چند مہینے بعد شادی ہونے والی ہے تب انہوں نے سب معاف کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ بس شرط یہ ہے وہ سب کے سامنے پیش ہوجائے۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کسی طرح اپنے بیٹے کو پیغام پہنچائیں کہ وہ واپس آجائے۔ یہ اُس کے لیے اچھا ہوگا۔ دوسری صورت میں ہم ہیڈکوارٹر سے مزید فورس لے کر اس کا پیچھا کرنے پہ مجبور ہوں گے۔''

جرگے کے باقی افراد بھی یہی رائے پیش کرنے لگے۔

شفاعت خان کچھ بڑی حیثیت کا بندہ نہیں تھا۔ زمینداری کرتا تھا۔ بہت سی بکریاں پال رکھی تھیں۔ ان کا دودھ اور گھی شہر میں بیچ کر گھریلو ضروریات پوری کرتا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ کچھ زیادہ کمانے کے چکر میں ٹمبر مافیا کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ پہلے بھی کئی بار تعمیراتی لکڑی شہر لے جاتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ کبھی مال ضبط ہوا تھا کبھی کچھ دے دلا کر خود کو اور مال کو بھی بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس بار کم بختی سے سرکاری عملے پر گولیاں بھی چلائی تھیں۔ افسر کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ اب آسانی سے جان نہیں چھوٹ سکتی تھی۔ لیکن زخمی افسر نے کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جرگے کے سامنے پیش

ہونے کی شرط پر اُس کی جان عذاب سے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔

شفاعت خان نے نمبر دار بھائی اور سرکاری عملے کے سامنے وعدہ کیا کہ فوراً جمشید کے پیچھے آدمی بھیج دے گا۔ اسے تلاش کروا کے جرگے کے سامنے پیش ہونے پر مجبور کرے گا۔

☆☆☆

پہاڑ پر وہ ایک مسطح چٹان تھی۔ اس کے ساتھ ہی غار کا ایک دہانہ نظر آ رہا تھا۔ چٹان کے اوپر کچھ پتھر رکھ کر اوٹ سی بنائی گئی تھی۔ ایک شخص آنکھوں سے دوربین لگائے اس آڑ سے نیچے دور دور تک دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔۔۔۔ دوربین کے طاقت ور لینس میں بہت نیچے جہاں جنگل چھدرا تھا، وہاں دو آدمی نظر آ رہے تھے۔ ایک کے کندھے پر بندوق تھی۔ وہ یہاں وہاں دیکھتے ہوئے بلندی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

دوربین سے دیکھنے والا آدمی جمشید کا ساتھی جمدر تھا۔ اس نے ایک دم اضطراری انداز میں چلّا کر کہا۔ ''جمشید خان! ہوشیار ہو جاؤ۔ لگتا ہے دشمن اس طرف آ رہے ہیں۔''

مسطح چٹان کے ساتھ جو غار تھا، اس کے اندر اک ذرا ہلچل مچی۔ پھر اس کے دہانے پر یکے بعد دیگرے تین آدمی نمودار ہوئے۔ ان سب کے پاس ہتھیار موجود تھے۔ وہ جمشید اور اس کے مفرور ساتھی تھے۔ ٹھلچون میں سرکاری عملے پر فائرنگ کر کے یہاں آ کے چھپ گئے تھے۔ جمشید نے لپک کر اپنے ساتھی کے ہاتھ سے دوربین چھین لی۔ نشیب میں جہاں اس کے ساتھی نے اشارہ کیا تھا، اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے دوربین کو زوم کر لیا۔ ان آنے والوں کے چہروں کو فوکس کر لیا۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ان کے چہرے واضح نہیں ہو رہے تھے۔ لباس اور حلیے سے وہ مقامی لگ رہے تھے۔ اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو پوزیشن سنبھالنے کی ہدایت کی۔ خود بھی کلاشنکوف کو تیار حالت میں رکھ کر دوربین سے ان آنے والوں کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب وہ دونوں آدمی اتنے قریب آ گئے کہ ان کے چہرے واضح ہو سکیں، جمشید نے ان کو پہچان لیا۔ وہ ٹھلچون کے ہی رہنے والے تھے۔ ایک اس کا ماموں زاد بھائی اکبر تھا۔ دوسرا محلے کا ایک نوجوان تھا۔ آنے والے ان دونوں افراد سے اسے بہ ظاہر کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آنے والے دشمن نہیں۔''

کچھ دیر بعد وہ دونوں افراد ان کے قریب پہنچ گئے۔ تقریباً سو قدم کے فاصلے پر آئے تھے کہ جمشید نے بلندی سے چیخ کر کہا۔ ''اکبر! وہیں رک جاؤ۔ پہلے یقین دلاؤ تم کسی بُری نیت سے نہیں آئے ہو؟''

اکبر نامی نوجوان وہیں سے چلّا کر بولا۔ ''جمشید! ہم تمہارے دشمن نہیں۔ تمہارے ابا کا اہم پیغام لے کر آئے ہیں۔''

جمشید نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''ابا نے کیا پیغام بھیجا ہے؟ اگر ہتھیار ڈال کے گرفتاری دینے کی بات ہے تو ادھر سے ہی واپس چلے جاؤ۔ ان جنگلوں اور پہاڑوں میں مفرور بن کر رہنا مجھے قبول ہے، پولیس کو گرفتاری دے کر ذلیل و خوار ہونا بالکل گوارا نہیں۔''

''جمشید! ہمیں قریب آنے دو۔ تمہارے لیے اچھی خبر ہے۔ ہم پر بھروسا کرو۔''

جمشید نے کچھ دیر سوچا۔ اپنے ساتھیوں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ پھر پتھروں کی اوٹ سے نکل کر چٹان پر کھڑا ہو گیا۔ دونوں آدمی اس کے قریب آ گئے۔ پھر اسی مسطح چٹان پر بیٹھ گئے۔

اکبر نے جرگے کی ساری کارروائی اسے سنائی۔ اُس کا خیال تھا جسے گولی لگی ہے، وہ مر گیا ہوگا۔ لیکن اکبر کی زبانی اس کے معمولی زخمی ہونے کی خبر سن کر اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ جرگے نے جو فیصلہ سنایا تھا، وہ بڑی دیر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ساتھیوں سے بھی طویل مشورہ کیا۔ اس کے لیے یہ بات حوصلے کا باعث تھی کہ اس کے ابا اور نمبر دار چاچا چاہتے تھے وہ جرگے کے سامنے پیش ہو جائے۔ اسے پولیس کیس بننے نہ دے۔ زخمی افسر اسی بنیاد پر اسے معاف کرنے کے لیے راضی ہوا تھا۔

جرگے کے آگے پیش ہونا اس کے لیے پریشان کن نہیں تھا اسے اندیشہ پولیس سے تھا۔ وہ جانتا تھا پولیس کے پاس کیس چلا گیا تو اس کی زندگی عذاب بن جائے گی۔ ایک طویل عرصہ جیل میں سڑنے کے علاوہ عدالتوں کے چکر کاٹنے میں گزر جائے گا۔ اب جبکہ جرگے کے مطابق فیصلہ ہونے والا تھا تو یہ اس کے لیے قابلِ قبول تھا۔

شام سے پہلے پہلے وہ سب پہاڑ سے اتر کر جنگل میں سے ہوتے ہوئے ٹھلچون کی طرف آنے لگے۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ آدھی رات کے وقت ٹھلچون پہنچ گئے۔

☆☆☆

نانگا پربت کی برف پوش چوٹیوں پر سے دھوپ نیچے اترنے لگی تھی۔ پہاڑیوں، وادیوں اور بلند دیالا درختوں سے

ہوتی ہوئی ٹھلچون میں پھیل گئی تھی۔ نانگا پربت کے دامن میں بکھری ان وادیوں میں گرمیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ دھوپ ہو تو بھی اس کی حدت زیادہ نہیں ہوتی۔

یہ اکتوبر کے ابتدائی دنوں کی ایک خوش ادا صبح تھی۔ دھوپ کے رُوپ چاروں اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود خنکی کا احساس بھی تھا۔ لوگ گھروں سے نکل کر کھیتوں میں اور دیگر کاموں میں مصروف ہونے لگے تھے۔ شہری تمدن سے بہت دور، پہاڑوں میں گھری ٹھلچون وادی میں ایک نئے دن کا آغاز ہو گیا تھا۔

حنا بہت سویرے اپنی ماں کے ساتھ بیدار ہوئی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد، مہمان خانے میں موجود مہمانوں کے لیے ماں کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے کئی بار اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ مہمان خانے کے کمرے میں موجود زخمی افسر کا خیال آتے ہی اس کا دھیان بھٹک جاتا تھا۔ پراٹھے بناتے بناتے وہ کئی بار کہیں کھو سی گئی تھی۔ چونک کر ہوش میں آنے تک پراٹھے جگہ جگہ سے جل گئے تھے۔

اس سے پہلے ابا مہمان خانے سے آ کر بتا چکا تھا کہ رات جرگے نے جمشید کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اس فیصلے میں بنیادی کردار محکمے کے افسر سلمان صاحب کا ہے جنہوں نے یہ جان کر کہ جمشید اس کا بھتیجا ہے اور چند مہینوں بعد اس کی بیٹی سے شادی ہونے والی ہے، اسے معاف کر دیا تھا۔ جمشید کے پہاڑوں سے واپس آنے اور اسے معاف کیے جانے کی خبر سے حنا کے دل میں کوئی لہر نہیں اٹھی تھی۔ جب ابا نے اس زخمی افسر کے مہربان رویے کی تعریف کی تو اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کر یہ خواہش کر رہا تھا کہ سب اس فاریسٹ افسر کی تعریف کریں۔ اسی کا تذکرہ کریں۔

اب ناشتا تیار کرتے ہوئے حنا اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رات اس سے بس ادھوری سی، چند ثانیوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس ذرا سی دیر کی ملاقات نے اس کے خاموش دل میں برسوں کی شناسائی کا احساس جگا دیا تھا۔

ماں بیٹی نے ناشتا تیار کیا۔ دیسی گھی، مکھن اور اُبلے انڈوں کے ساتھ پراٹھے بنا کے چھوٹے بھائی کو مہمان خانے میں بھیج دیا۔ ذرا دیر بعد چچا فقیر اللہ آ گیا۔

حنا کے جی میں آیا چچا فقیر اللہ کے ساتھ وہ خود بھی جائے۔ اس کمرے کے دروازے کے پاس جا کر بس ایک نظر اس زخمی افسر کو دیکھ لے۔ مگر وہ بس ایسا سوچ کر، ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

مہمان خانہ پچھلی جانب تھا۔ وہاں سے باتوں کی آوازیں تو کبھی کبھار سنائی دیتی تھیں مگر وہاں موجود لوگ نظر نہیں آتے تھے۔ انہیں دیکھنے کے لیے باہر کھیتوں میں جانا ہوتا تھا یا پھر چھت پر چڑھ کر دیکھا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے مہمان خانے کی طرف سے اونچی آواز میں بولنے کی آوازیں سنیں۔ اس کا دھیان اُدھر ہی تھا۔ رات ابا نے بتایا تھا صبح زخمی افسر واپس جانے والا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا شاید زخمی افسر کو رخصت کیا جا رہا ہو۔ یہ سوچ کر بے اختیار اس کے قدم لکڑی کے زینوں کی طرف چل پڑے۔ ماں سے آنکھ بچا کر وہ چھت پر آ گئی۔ وہاں سے دیکھا مہمان خانے سے کئی لوگ باہر نکل رہے تھے۔ ان میں اکثر لوگ مقامی تھے۔ کچھ سرکاری کارندے بھی تھے۔

حنا چھت کی منڈیر کے پاس جا کے، خود کو اوٹ میں رکھ کر اچک اچک کر مہمان خانے کے داخلی دروازے کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ اب لوگ باہر نکل کر اس راستے پر چل پڑے تھے جو اس کے بڑے ابا شفاعت خان کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ اس کا ابا عنایت خان بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ وہ مقصودِ نگاہ مگر نظر نہیں آ رہا تھا۔

حنا نے کچھ اور انتظار کیا۔ مہمان خانے سے اور کوئی شخص نہ نکلا۔ اسی وقت ایک خیال سے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کہیں وہ زخمی افسر مہمان خانے میں اکیلا تو نہیں؟ یہ لوگ جو باہر نکلے ہیں اسے رخصت کرنے نہیں بلکہ جمشید کے معاملے کو نمٹانے اس کے بڑے ابا کے گھر کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں؟ اگر زخمی افسر مہمان خانے میں موجود ہے تو میں خالی برتن لینے کے بہانے جا سکتی ہوں۔

یہ سوچ کر وہ تیزی سے چھت سے نیچے اتر آئی۔ چھوٹا بھائی اسکول جانے کی تیاری کر رہا تھا اسے ساتھ لے کر مہمان خانے کے دروازے پہ آ گئی۔ لکڑی کے کھلے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے ذرا دھیمی آواز میں چچا فقیر اللہ کا نام لے کر پکارا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ برآمدے میں موجود دونوں کمروں میں سے زخمی افسر والے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر، دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ اس کمرے کے دروازے کے سامنے آ گئی۔ چھوٹے بھائی کو آگے کیا۔ اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے زخمی افسر بیڈ پہ نیم دراز نظر آیا۔ سر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھ کے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ آہٹ پا کے اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر جھٹکے سے سیدھا

ہو کر بیٹھ گیا۔
حنا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”چچا فقیر اللہ کدھر ہیں؟ میں خالی برتن لینے آئی ہوں۔“
وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی کمرے میں موجود تھا۔ مجھے کچھ بتا کر نہیں گیا ہے۔ یہ سامنے ٹیبل پر تمہارے برتن رکھے ہیں۔ اندر آ کر لے جاؤ۔“
وہ گھبرائی سی، بھائی کو ساتھ لے کر کمرے کے ایک طرف تپائی پر رکھے برتن اٹھانے لگی۔ اسی وقت زخمی افسر کی آواز کانوں میں پڑی۔ ”تم نمبر دار صاحب کی بیٹی ہو نا؟ جمشید کی تمہارے ساتھ شادی ہونے والی ہے؟“
حنا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس سے مخاطب تھا۔
وہ سر جھکا کر بولی۔ ”جی ہاں۔“
اس نے کہا۔ ”تم جانتی ہو نا اس نے کتنا غلط کام کیا ہے؟ مجھے معلوم ہے وہ آئندہ بھی اس سے باز نہیں آئے گا۔“
وہ آہستہ سے بولی۔ ”آپ بہت اچھے ہیں۔ اس کی برائی کے باوجود اسے معاف کر رہے ہیں۔“
سلمان دھیرے سے ہنسا پھر نرم نرم نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ تو نہیں جانتا کہ کتنا اچھا ہوں۔ مگر نمبر دار صاحب کے گھر کے طعام کھا کے، مجھے اچھا نہیں لگا کہ انہیں کوئی دکھ دے دوں۔ ان کے ساتھ نمک حرامی کروں۔ رات تمہارے جانے کے بعد میں نے فقیر اللہ سے تم سب کے بارے میں پوچھا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی تم نے میٹرک تک پڑھا ہے۔“
”جی سر! یہ سب میرے ابا کی وجہ سے ہوا ہے۔ خاندان بھر کے لوگوں سے اور بڑے ابا کے گھر والوں سے مقابلہ کر کے انہوں نے مجھے پڑھایا ہے۔“ وہ جھکی جھکی نظروں کے ساتھ بولی۔
”جمشید بھی مان گیا تھا؟“
”پہلے تو بہت منع کیا تھا بعد میں ابا نے سب منوا لیا۔“
فاریسٹ افسر سے بات کرتے ہوئے اسے اچھا لگ رہا تھا، خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔
سلمان زیرِ لب مسکرا کر بولا۔ ”میں جمشید کو معاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے عدالت تک لے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن تمہارے ساتھ رشتے کا علم ہوا تو اسے معاف کر دیا پھر جرگے کو فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا۔“
ذرا سے فاصلے پر موجود اس زخمی افسر کی آنکھوں سے پھوٹتے شبنمی جذبوں سے وہ ہولے ہولے بھیگ رہی تھی۔ اس کی باتیں بھی، نگاہوں کی ریشمی گھاتیں بھی بہت نرمی سے دل میں اتر رہی تھیں۔ اب مزید رکنے کا یارا نہیں تھا۔ بھائی کے ساتھ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کے بولی۔ ”سر! آپ کا زخم اب کیسا ہے؟ ابا بتا رہے تھے آپ واپس جا رہے ہیں؟“
وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ میں اپنے دفتر والوں کے لیے سر ہوں۔ میرا نام سلمان احمد ہے۔ میں تمہارا نام بھی جان گیا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کا شکر ہے گولی نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ جو زخم ہے، اس کا علاج تمہارے گاؤں کی ڈسپنسری سے ہی ہوا ہے۔ تیسری بات یہ کہ میں آج واپس نہیں جا رہا ہوں۔ تین گھنٹے کا پہاڑی سفر گھوڑے پہ کرنا تھا۔ یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا اس لیے میں نے آگے اپنے بڑے افسروں سے ہیلی کاپٹر کی بات کی ہے۔ آرمی والوں کا ہیلی کاپٹر کچھ غیر ملکی مہمانوں کو لے کر کل نانگا پربت کی طرف آ رہا ہے۔ واپس جاتے ہوئے مجھے بھی لے جائے گا۔ چلو اچھا ہوا اس بہانے ایک دن مزید تمہارے ہاتھوں کے پکے ہوئے کھانے کھاؤں گا۔“
حنا کا دل اندر سے جھوم اٹھا۔ قدم بھی جھومنے کے انداز میں اٹھنے لگے۔ وہ برتن اور بھائی کو ساتھ لے کر کمرے کے دروازے سے نکل رہی تھی، اسی وقت چچا فقیر اللہ سامنے سے آ گیا۔
اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”حنا بیٹی تم کیوں آئی ہو؟ میں خود ہی برتن لے کے آنے والا تھا۔“
اس نے کہا۔ ”آپ نے بہت دیر لگا دی تھی چچا! میں نے سوچا آپ کہیں کام سے گئے ہوں گے اس لیے خود آ گئی تھی۔“
وہ سرد سے لہجے میں بولا۔ ”مہمان آج بھی موجود ہیں۔ کھانا لینے میں خود آؤں گا۔ تم مت آ جانا۔ نمبر دار صاحب غصہ ہوں گے۔“
حنا جانتی تھی ان علاقوں میں عورت کا کسی غیر مرد سے ملنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر قتل بھی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں سمجھتی تھی ایسی کون سی طاقت تھی جو اسے کشاں کشاں اجنبی افسر کے پاس لے گئی تھی۔ وہ بہت بھولی تھی۔ موبائل، ٹیلی وژن اور فاسٹ میڈیا کی چکاچوند سے بہت دور اس پہاڑی ماحول میں اس کا دل اور دماغ کسی کثافت سے پاک تھے۔ سلمان احمد کی طرف مائل ہونا، اس کے بارے میں سوچنا، اس کے لیے ایک غیر اختیاری عمل تھا۔

☆☆☆

پہاڑی علاقوں میں موسم بدلتے دیر نہیں لگتی۔ مادو پور

میں دن کے وقت موسم صاف تھا۔ سلمان احمد اور حنا جھیل کی سیر سے واپس آئے تب بھی دور دور تک بادلوں کا نشان نہیں تھا مگر رات کے وقت، نہ جانے کب آسمان کا مزاج بدل گیا۔ بڑی ہی گڑگڑاہٹوں کے بعد بارش شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ صبح تک جاری رہا۔ سلمان کا آفس جانا ضروری تھا۔ ان دونوں نے اکٹھے ناشتا کیا۔ گول دیواروں والے ڈائننگ ہال کی مخروطی کھڑکیوں کے باہر بارش اب بھی برس رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے کھلے لان میں سرو، سیب اور خوبانی کے پیڑوں سے بارش کا پانی تیزی سے ٹپک رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوکر سلمان احمد دفتر روانہ ہوا۔ حنا نے لاکھ اسے منع کیا۔ تیز بارش کا عذر پیش کر کے روکا۔ مگر سلمان نے اس کی بات نہیں مانی۔ جنگل اور جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے بنائی گئی کمیٹی کی آج اس کے ساتھ اہم میٹنگ تھی۔ اس کمیٹی میں سرکاری افسر بھی تھے، عوامی نمائندے بھی شامل تھے۔ اس لیے سلمان احمد نے تیز بارش کے باوجود دفتر جانے کا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔ وہ شعبان علی کے ساتھ چلا گیا۔

حنا اپنے کمرے میں آگئی۔ اس فاریسٹ ریسٹ ہاؤس میں ڈش کے ذریعے ٹی وی چلتا تھا۔ وہ کچھ دیر ٹی وی دیکھتی رہی۔ پھر بے دلی سے اسے بند کر کے کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہاں سے وادی کی پچھلی طرف کی کھائیاں، اونچے اونچے درخت اور ان کے آخر میں خشک پہاڑ سر اٹھائے نظر آتے تھے۔

اس اثنا میں بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ ذرا دیر بعد موسم میں ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی۔ مادو پور کے آسمان پر چھائے بادلوں میں سے سورج کو کوئی راستہ مل گیا۔ اس کی ہلکی ہلکی کرنیں، بھیگی بھیگی وادی میں شبنمی روشنی پھیلانے لگیں۔ کچھ ہی دیر بعد یہ دھوپ تیز ہوگئی۔ حنا خود کو کمرے تک محدود نہ رکھ سکی۔ ریسٹ ہاؤس کے تین طرف کشادہ لان تھا۔ جو احاطے کی تقریباً چھ فٹ دیوار کے اندر تھا۔ چوتھی جانب ریسٹ ہاؤس کی عمارت تھی۔

حنا باہر لان میں نکل کر، اس کی بھیگی بھیگی گھاس پر ہلکے ہلکے قدموں سے چلنے لگی۔ پاؤں کے نیچے پانی کی نمی تھی۔ سر پر بادلوں سے اُبھرتی دھوپ تھی۔ بارش کے بعد کی یہ دھوپ بدن میں نرم نرم ہاتھوں سے جیسے گدگدی کر رہی تھی۔ کل جھیل سے آتے ہوئے راستے میں کھلچون کے جمدر کو دیکھ کر، وہ رات بھر پریشان رہی تھی۔ سلمان احمد کے حوصلہ دینے پر وہ مطمئن ہوگئی تھی مگر خفیف سی خلش اب بھی باقی تھی۔ اس وقت کھلے لان کی روپہلی دھوپ میں اس پر ایک بے خود کر دینے والی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

اسی وقت ریسٹ ہاؤس کا خانساماں اس کے پاس آگیا۔

”بیگم صاحبہ! میں گوشت لینے بازار جارہا ہوں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتائیں؟“

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ”چچا! آپ بھی جائیں گے تو ریسٹ ہاؤس میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ مجھے خوف آرہا ہے۔ آپ نہ جائیں۔ سلمان صاحب آجائیں تو لے آئیے گا گوشت۔“

بوڑھا خانساماں ہنسا۔ ”بیٹی! ہماری وادی کے لوگ بہت محبت کرنے والے ہیں۔ یہ کسی کو تنگ نہیں کرتے۔ آپ رات کے وقت بھی اکیلی رہیں گی تو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ آپ سکون سے دھوپ کے مزے لیں۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔“

خانساماں یہ کہہ کر ریسٹ ہاؤس سے باہر چلا گیا۔ حنا اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ وہ مادو پور کے لوگوں سے خوف زدہ نہیں۔ اس نے اپنے گاؤں کے ایک چھوٹے شیطان کو یہاں دیکھ لیا تھا جس نے ماضی میں ایک بڑے شیطان کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو جہنم بنایا تھا۔

خانساماں کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر کھلے لان کی چمکیلی دھوپ میں چہل قدمی کرتی رہی۔ پھر اس کی پتھریلی روش پہ چلتی ہوئی احاطے کی دیوار کے قریب سے ہوتی ہوئی اندر کمرے کی طرف آنے لگی۔ اسی وقت کوئی چیز زور سے آکر اس کے سینے سے ٹکرائی۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ اس کے قدموں کے پاس مرغی کا کٹا ہوا سر پڑا تھا۔ جس میں سے تازہ خون اُبل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ابھی ابھی گردن کاٹ کر اس کی طرف پھینکا گیا تھا۔ اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون کے دھبے پڑے تھے۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔

ریسٹ ہاؤس کے اندر کوئی موجود نہیں تھا۔ یہ باہر سے احاطے کی چھ فٹ کی دیوار پر سے کسی نے تاک کر اس کا نشانہ لے کر پھینکا تھا۔ وہ ذری ڈری سی، بھاری قدموں کے ساتھ اندر کمرے کی طرف آنے لگی۔ اسی وقت دھپ سے کوئی چیز آکر اس کے سامنے بھیگی گھاس پر گر پڑی۔ رات بھر کی بارش کا کچھ پانی اب بھی لان میں موجود تھا۔ اس چیز کے گرنے سے پانی کے بہت سے چھینٹے حنا تک بھی پہنچے تھے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ ایک درمیانی سائز کی مرغی کا سر کٹا دھڑ سامنے گیلی گھاس پہ نظر آرہا

تھا۔ اس میں سے اُبلتے خون سے گھاس میں موجود پانی بھی سرخ ہو رہا تھا۔

خوف سے حنا کا بدن سنسنانے لگا۔ ایک اضطراری عمل کے طور پر وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ مرغی کا کٹا ہوا سر اور دھڑ، بے شک عام حالات میں کسی بھی طور پر ڈراؤنا عمل نہیں ہوتا۔ مگر جس طرح کے اس کے ماہ و سال گزر رہے تھے پھر کل جھیل سے آتے ہوئے جمشید کا ساتھی جمدرا سے نظر آیا تھا، اس تناظر میں یہ چھوٹا سا واقعہ اس کے لیے نہایت ہیبت ناک تھا۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، دربدری اور پریشان حالی کے جس آسیب سے وہ نکل آئی تھی اب پھر سے وہ سلسلہ جانکاہ شروع ہو گیا تھا۔

وہ خوف سے کانپتی دیر تک کمرے میں بند پڑی رہی۔ خانساماں ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مین گیٹ اس نے جاتے ہوئے باہر سے بند کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ان دیکھے دشمن کے خوف سے وہ بند کمرے کے اندر بھی لرز رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں فون کی سہولت موجود نہیں تھی۔ مادو پور میں ابھی کوئی موبائل نیٹ ورک بھی کام نہیں کرتا تھا۔ اس لیے سلمان سے رابطے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

کافی دیر بعد اس کے کانوں میں اپنی گاڑی کی مانوس آواز سنائی دی۔ اس نے جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سسکیاں بھرتی ہوئی تیزی سے جا کر سلمان احمد سے چمٹ گئی۔ وہ حیران پریشان اسے سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”ارے حنا! کیا ہوا؟ تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟ اور یہ تم رو بھی رہی ہو، آخر ماجرا کیا ہے؟“

شعبان علی بھی گاڑی لاک کر کے قریب آ گیا تھا۔ حنا سہمے سہمے انداز میں سلمان کو بتانے لگی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ سلمان نے اس کے ساتھ جا کے مرغی کا کٹا ہوا سر اور دھڑ بھی دیکھا۔ کئی طرح کی پریشانیوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل کر دیکھا۔ احاطے کی دیوار سے باہر کھلے کھیت اور شہتوت کے درخت تھے۔ کچھ فاصلے پر دو چار گھر بنے ہوئے تھے۔ اس کے پوچھنے پر خانساماں نے بتا دیا کہ ان گھروں میں مقامی لوگ رہتے ہیں۔ وہ بڑے شریف ہیں۔ پہلے کبھی انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے۔ سلمان کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس حرکت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟ وہ بھی ایسے وقت میں جب حنا ان میں اکیلی چہل قدمی کر رہی تھی۔

کیا یہ کوئی اتفاق تھا یا جان بوجھ کر ایسا کیا گیا تھا؟ اس کے ذہن میں یہ سوچ بھی سرسراتی رہی کہ کیا ایسا کر کے انہیں کوئی پیغام دیا جا رہا تھا؟

ان دونوں کے دل و دماغ میں یہی اندیشہ کروٹیں لینے لگا کہ ماضی کا آسیب ان کے تعاقب میں یہاں تک آ گیا ہے۔ ایک سال تک جس کی ستم گری نے ان دونوں کو بے حال کر دیا تھا۔ کیا وہ بے رحم موسم پھر لوٹ آئے ہیں؟ کیا انہیں دشمنوں کے دست بُرد سے بچنے کے لیے ایک بار پھر بے تحاشا بھاگنا پڑے گا؟

☆☆☆

وہ مہمان خانے سے خالی برتن لے کر واپس آئی تو ماں نے بھی سخت لہجے میں سرزنش کی۔ جوان جہان لڑکی کا یوں سر اٹھا کے کسی غیر مرد کے پاس جانا اس علاقے کی روایات کے منافی تھا۔

حنا علاقے کی روایات سے، وہاں کی تہذیبی اقدار سے واقف تھی مگر فاریسٹ آفیسر میں خدا جانے کیسی کشش تھی کہ اسے معاشرتی رویوں کی شدت پسندی کے خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ دو دفعہ برتن لینے اس کے کمرے میں گئی تھی۔ اب مزید ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ فقیر اللہ چچا نے بھی واضح انداز میں اس کی آمد کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ کر منع کیا تھا۔ اب ماں بھی تنبیہ کر رہی تھی۔

اس دن وہ سخت بے قرار رہی۔ یہ سلمان کا تھلچون میں آخری دن تھا۔ کل صبح اس کے لیے آرمی کا ہیلی کاپٹر آنے والا تھا۔ پھر وہ چلا جائے گا۔ اس کے بعد نہ جانے کب وہ مہمان بن کر آئے گا؟ کیا اس سے پھر بھی ملاقات ہو سکے گی؟

دوپہر اور شام کے وقت فقیر اللہ چچا خود ہی آ گیا تھا۔ ان کا تیار کردہ کھانا لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد خالی برتن بھی وہی لے کر آیا تھا۔ حنا دعائیں ہی مانگتی رہ گئی کہ وہ کہیں کام سے باہر چلا جائے اور کھانا لے کر وہ خود جائے۔ اس سے آخری بار ہم کلام ہو سکے۔ لیکن اس کی مراد پوری نہ ہوئی۔ چچا فقیر اللہ نے بھی جیسے قسم کھائی تھی کہ حنا کے لیے کوئی بہانہ نہیں چھوڑے گا۔

اس رات ابا بہت مطمئن اور خوش تھا۔ مہمان خانے سے آ کر وہ یہ بتا گیا تھا کہ جمشید کو بلانے دو آدمی پہاڑوں کی طرف گئے ہیں۔ اسے لے کر رات کسی وقت گاؤں میں پہنچنے والے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ سلمان احمد شہید واپس نہیں گئے تھے۔ اب جمشید ان کے سامنے حاضر ہو کر اپنے کیے کی معافی مانگے گا اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد کرے گا۔

اپنے دل کی بے چین دھڑکنوں سے سرگوشیاں کرتے کرتے وہ رات گئے تک جاگتی رہی۔ اس مانوس اجنبی کے

بارے میں سوچتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر اس کے کانوں میں مہمان خانے کی طرف سے آتی آوازوں کا شور سنائی دیا۔ کچھ لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بات سنائی نہیں دے رہی تھی محض آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

اچانک اس کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا۔ ابا نے بتایا تھا کہ جمشید کی تلاش میں گاؤں کے لوگ گئے تھے۔ ممکن ہے اس وقت جمشید اور اس کے ساتھی واپس آگئے ہوں۔ اس کے جی میں آیا باہر نکل کر دیکھ لے۔ لیکن ہمت نہ کر سکی۔ وہ کمرے میں اکیلی نہیں تھی۔ اس کی امی اور چھوٹا بھائی بھی اپنے بستر میں سوئے ہوئے تھے۔ اس لیے دھڑکتے دل کو دل نشیں جذبات کی تھپکیاں دے دے کر خود بھی سو گئی۔

صبح کے وقت ماں نے اسے جگایا۔ نماز سے فارغ ہو کر دونوں باورچی خانے میں آگئی تھیں۔ اسی وقت مہمان خانے سے نمبردار عنایت خان بھی آگیا۔ حنا کی ماں کے استفسار پر اس نے بتایا کہ آدھی رات کے وقت جمشید اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آگیا تھا۔ اس نے جرگے کے سامنے اپنے ساتھیوں سمیت معافی مانگی تھی۔ آئندہ کے لیے جنگلات کی غیر قانونی کٹائی سے باز آنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ سلمان نے نہ صرف اسے معاف کیا تھا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اپنے محکمے میں اس کی ملازمت کی سفارش کرے گا۔

حنا کی ماں فاریسٹ افسر کو دعائیں دینے لگی۔ جمشید کے ساتھ جو بھلائی کی گئی تھی، شاید عام حالات میں اس کی ماں زیادہ خوش نہ ہوتی مگر اب وہ حنا کا مستقبل تھا۔ ایسے میں بیٹی کے شوہر کا محفوظ اور خوش حال مستقبل اس کے لیے مسرتوں کا باعث تھا۔

ابا کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹی مہمانوں کے لیے روایتی انداز کے پراٹھے، گھی، مکھن اور دیسی انڈوں کا ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

سورج طلوع ہو گیا تھا۔ دھوپ کی سنہری کرنیں نانگا پربت کی برفیلی چوٹیوں سے لپٹ کر سرگوشیاں کرنے لگی تھیں۔ اتنے میں فقیر اللہ چچا بھی مہمانوں کے لیے ناشتا لے جانے پہنچ گیا۔

حنا نے اپنے حصے کا کام سچے جذبوں سے سرانجام دیا تھا۔ فاریسٹ افسر آج آخری دفعہ ان کا مہمان تھا۔ اس لیے اس نے ایک ایک چیز جی جان سے تیار کی تھی۔ وہ جانتی تھی یہ ناشتا بارہ پندرہ افراد کے لیے تیار ہو رہا تھا لیکن اسے باقی افراد

خوب! تو صاحب زادے کیبل کار میں پہاڑوں کی سیر کو گئے تھے!

سے کوئی غرض نہیں تھی۔ یہ بات اس کے لیے اہم تھی کہ سلمان ان میں شامل تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی ان پراٹھوں اور انڈوں میں سے سلمان احمد کے حصے کا کونسا ہے۔ اس لیے وہ یہ سب چیزیں اس پیار سے بنا رہی تھی جیسے بس وہی ان کا مہمان ہے۔

اس نے بڑے سے تھال میں تمام ناشتا سجایا۔ صندوق سے صاف سوتی چادر نکال کے اس کے اوپر ڈال دی۔ فقیر اللہ چچا یہ خوان اٹھا کے مہمان خانے کی طرف چلا گیا۔

مہمانوں سے فارغ ہو کر ماں بیٹی نے ناشتا کیا۔ چھوٹے بھائی کو اسکول بھیج دیا۔ پھر مال مویشیوں کے لیے چارا ڈال دیا۔ اس وقت تک سورج بلند ہو کر سر کے اوپر آگیا تھا۔ حنا بظاہر گھر کے کاموں میں جتی ہوئی تھی مگر اس کا سارا دھیان مہمان خانے کی طرف تھا۔ اس کا دل دھڑکتے ہوئے اس لمحے کی گھڑیاں گن رہا تھا جب سلمان احمد رخصت ہو جائے گا۔ وہ اس وقت رخصت کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس دوران وہ کئی بار ماں سے آنکھ بچا کر چھت پر گئی تھی۔ منڈیر کی چھوٹی سی دیوار کی اوٹ سے، اپنی بے تاب نظروں سے جھانک کر دیکھا تھا۔ مہمان خانے سے باتوں کی آوازیں سنائی دی تھیں مگر ایسی کوئی ہلچل دکھائی نہیں دی تھی

جس سے ان کے رخصت ہونے کا پتا چلتا اس لیے وہ چھت سے اتر آئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کے کانوں نے شور سنا۔ یہ ہیلی کاپٹر کا شور تھا جو تھلچون کے چھوٹے سے آسمان پر کہیں پرواز کرتا ہوا قریب آرہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ رضائی کا غلاف سینے میں مصروف تھی۔ حنا دبے قدموں باہر آئی پھر لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے چھت پہ آئی۔ منڈیر کے پاس چھوٹی سی دیوار کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ مہمان خانے کے دروازے کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں سے اکثر تھلچون کے باشندے تھے۔ اس نے اپنے بڑے ابا کو، اپنے ابا کو اور جمشید کو بھی دیکھا۔ پھر اس کی نگاہوں کی رہ گزر پہ کہکشاں سی در آئی۔ فاریسٹ افسر کو دو آدمی سہارا دے کر باہر لارہے تھے۔ حنا یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ جذبوں کی پوری شدت سے اس کی صورت کو دل کے آئینے میں اتارتی رہی۔

حنا جانتی تھی کچھ فاصلے پر پولو گراؤنڈ ہے۔ وہاں ہیلی کاپٹر اترتا تھا۔ اکثر غیر ملکی مہمان یا پھر حکومت کے افسران یہاں چکور کا شکار کرنے آتے تھے تو ہیلی کاپٹر انہیں لے کر اس پولو گراؤنڈ میں اترتا تھا۔

وہ اُچک اُچک کر آخری جھلک تک سلمان احمد کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد ایک بجھی بجھی سی سانس لے کر، بوجھل دل کے ساتھ چھت پر سے نیچے اتر آئی۔ پھر شدید بے دلی کے ساتھ اپنے گھریلو کاموں میں مصروف ہوگئی۔

کچھ دیر بعد چچا فقیر اللہ جھوٹے برتن لے کر آگیا۔ اس نے صندوق سے دھانی رنگ کی صاف چادر نکال کے خوان کے اوپر ڈالی تھی۔ اس نے چادر کھول کے برتن الگ کیے۔ چادر پہ گھی کے داغ لگ گئے تھے۔ وہ یہ داغ دھونے کے لیے پانی کے حوض کے پاس گئی۔ چادر پر لگے داغ دھورہی تھی اسی وقت اس کی نظر چادر کے کونے پر پڑی۔ وہاں بال پین سے کچھ لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس نے چونک کر غور سے دیکھا۔ کالی روشنائی والے بال پین سے لکھا ہوا تھا۔

''مہمان خانے کی الماری میں ایک خاکی رنگ کا لفافہ ہے۔ تمہارے لیے۔''

حنا حیرت سے اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، ان الفاظ کا مخاطب کوئی اور نہیں۔ یہ سلمان احمد نے اس کے لیے لکھا ہے۔

وہ تیز تیز چلتی ہوئی گھر کے احاطے سے باہر آئی۔ مہمان خانے کی طرف خاموشی تھی۔ شاید سارے مہمان جا چکے تھے۔ اسی وقت اس کا ابا گھر کی طرف آتا نظر آیا۔ وہ قریب آیا تو حنا بولی۔ ''ابا! مہمان خانے سے مہمان گئے ہیں تو کیا اس کی صفائی کرلوں میں؟''

ابا بولا۔ ''میں مہمان کو رخصت کرنے پولو گراؤنڈ تک گیا تھا۔ فقیر اللہ موجود ہوگا۔ تم رکو میں جا کر دیکھتا ہوں اور لوگ بھی ہیں یا نہیں؟''

ابا مہمان خانے کی طرف گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے باہر نکل کر آواز دی۔ ''حنا بیٹی! تم کچھ دیر بعد آجاؤ۔ ابھی گاؤں کے کچھ لوگ اندر موجود ہیں۔ ان کے جانے کے بعد صفائی کرلینا۔''

حنا خوف اور تجسس کے ملے جلے خیالات کے ساتھ گھر میں آئی۔ بڑی دیر کے صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر ابا نے آکر بتادیا اب مہمان خانہ خالی ہے۔ وہ جیسے اُڑتی ہوئی وہاں پہنچی۔ جانے والا اب موجود نہیں تھا مگر اس کی یادوں کی پرچھائیاں کسی خاکی لفافے میں بند اس کی راہ تک رہی تھیں۔

اس نے تیزی سے الماری کھول کے دیکھا۔ ایک لالٹین، چند پیالیوں اور ایک ریڈیو سیٹ کے علاوہ چند اور عام سی چیزوں کے درمیان اسے خاکی لفافہ نظر آیا۔ لفافہ اٹھا کے بے تابی سے کھولا۔ اندر سے ایک رقعہ برآمد ہوا۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں تنہا تھی۔ بیرونی دروازہ اس نے بند کرلیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ رقعہ پڑھنا شروع کیا۔

''مجھے یقین ہے یہ خط تم تک پہنچ جائے گا۔ مجھے یہ خوف نہیں کہ کسی اور کے ہاتھ لگ جائے گا۔ کیونکہ یہاں اکثر لوگ ان پڑھ ہیں۔ فقیر اللہ اور تمہارے ابا عنایت خان سے بھی کوئی خطرہ نہیں۔ وجہ تم جانتی ہو۔ وہ بھی پڑھ نہیں سکتے...... حنا! تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ پڑھی لکھی ہو۔ خوب صورت ہو مگر تمہارا مستقبل ایک نہایت بُرے شخص کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جمشید خان نے بہ ظاہر مجھ سے معافی مانگی ہے مگر میں جانتا ہوں وہ اس دھندے سے باز نہیں آئے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے وہ اکیلا نہیں۔ آگے کوہستان اور مانسہرہ کے بڑے بڑے لکڑی کے اسمگلر اس کی پشت پر موجود ہیں۔ اس بار صرف تمہاری وجہ سے اسے معاف کیا ہے۔ پتا ہے کیوں؟ کل رات پہلی بار جب تم کھانا لے کر کمرے میں آئی تھیں۔ اس سے ذرا پہلے میں سویا ہوا تھا۔ میں نے خواب میں تمہیں دیکھا تھا۔ حیران ہوگئیں نا! چلو میں بتادیتا ہوں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ نانگا پربت کے دامن کی ایک وادی میں، میں ایک چشمے کے

پاس بیٹھا ہوں۔ ہر طرف رنگ رنگ کے جنگلی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ایسے خواب ناک ماحول میں تم میرے سامنے آگئیں۔ تمہارے ہاتھوں میں پھولوں کا ٹوکرا ہے۔ تم یہ ٹوکرا میری طرف بڑھاتی ہو۔ اسی وقت میری نظر ٹوکرے میں موجود سانپ پر پڑتی ہے۔ وہ پھن باہر نکالے پھنکار رہا ہوتا ہے۔ تم بہت دکھی لہجے میں کہتی ہو۔ ''مجھے اس سانپ سے نجات دلاؤ۔ یہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

میں سانپ والا ٹوکرا تم سے لینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہوں تبھی وہ سانپ مجھے ڈستا ہے۔ میرے ساتھ تم بھی زور سے چیختی ہو۔ اسی وقت میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں بڑی دیر آنکھیں بند کر کے خواب کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران تم کمرے میں آگئیں۔ میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا تھا مگر خواب میں تمہاری شبیہ اتنی واضح تھی کہ جب تم میرے سامنے آئیں تو ایک دم تمہیں پہچان لیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ ان دو دنوں میں تمہارے بارے میں جان بھی گیا۔

''حنا! میں اس خواب کی بنیاد پر یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ میں تمہارا نجات دہندہ ہوں۔ میں ایسا بھی نہیں کہتا کہ جمشید کی بداعمالیوں کا زہر تمہاری زندگی عذاب بنا دے گا۔ مگر ایک بات سچے دل سے کہہ دیتا ہوں تم میرے لیے بہت خاص بن گئی ہو۔ میں جانتا ہوں تمہارے علاقے کے رواج بہت سخت ہیں۔ کسی غیر مرد سے بات کرنا یا اس سے ملنا بھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے آنے والی سردیوں کی برف پگھلنے کے بعد تمہاری شادی جمشید سے کر دی جائے گی۔'' اس سب کے باوجود میرا دل تمہاری طلب سے باز نہیں آ رہا۔''

''میں ایک مہینے سے کم وقت میں تھلچون پھر آؤں گا۔ خصوصی طور پر تمہارے مہمان خانے میں رات گزاروں گا۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ بھی ہے تو مجھے ملنے ضرور آنا۔''

حنا نے دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ وہ خط پورا پڑھ لیا۔ پھر کئی بار اسے پڑھتی رہی۔ سلمان احمد کے خط کا ایک ایک لفظ کسی جنگلی پھول کی طرح اس کے بدن سے ٹکراتا رہا۔ نرم نرم ضربوں کی طرح دل میں اتر کر اسے ہولے ہولے لرزاتا رہا۔ عجیب ملے جلے جذبات کی آنچ سے اس کا جسم سلگتا رہا۔ ان جذبات میں فخر و انبساط بھی تھا۔ بے رحم موسموں کا خوف بھی تھا۔ جذبۂ عشق کی ابتدائی کیفیتوں کا دبا دبا جوش بھی تھا۔

☆☆☆

شاہراہِ قراقرم جسے کے کے ایچ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا بشام سے لے کر گلگت تک کا حصہ تقریباً ساڑھے تین سو کلو میٹر فاصلے پر مشتمل ہے۔ یہ سارا علاقہ پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ قراقرم ہائی وے ان پہاڑوں کے اندر بل کھاتی ہوئی گزرتی ہے۔ دریائے سندھ اس کے پہلو بہ پہلو گہرائی میں بہتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس کے دونوں طرف بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ یہ پہاڑ کہیں خشک اور چٹیل ہیں کہیں جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اکثر یہ جنگلات کے کے ایچ سے ہٹ کر پہاڑوں کے اندر موجود متعدد نالا جات میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اتنے وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں کہ گلگت بلتستان کے ستر فیصد جنگلات ضلع دیامر میں موجود ہیں۔ یہ المیہ ہے مگر سب سے زیادہ بے دردی سے جنگلات کی کٹائی، اسی ضلع کی مختلف وادیوں میں ہوتی ہے۔ ان علاقوں کے جغرافیائی اور سماجی خدوخال ایسے ہیں کہ حکومتی اثر و نفوذ کا یہاں بہت کم عمل دخل رہتا ہے۔ عام لوگوں سے لے کر ٹمبر مافیا کے بااثر افراد تک ان علاقوں میں موجود چیڑ، دیودار اور صنوبر کے درختوں کو ایندھن اور تعمیراتی مقاصد کے لیے اندھا دھند کاٹتے رہتے ہیں۔

گلگت بلتستان کے ضلع دیامر کی حدود سے آگے کوہستان کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ وہاں کے خان اور ملک ایک طرح سے اپنے اپنے علاقوں کے حکمران ہوتے ہیں۔ پہاڑوں کے اندر بکھری ان وادیوں میں انہی کا قانون، حکم اور انہی کا فیصلہ قابلِ قبول ہوتا ہے۔

اس وقت کوہستان کے ایک علاقے سمرال کے ملک امین شیر کے مہمان خانے میں آٹھ دس لوگ بیٹھے تھے۔ ملک امین شیر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ پچاس سے زیادہ عمر کا بارعب شخص تھا۔ چہرے پہ گھنی داڑھی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں نے منہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں سفاکی اور مکاری صاف جھلک رہی تھی۔

اس کے سامنے بیٹھے لوگوں میں جمشید خان بھی تھا۔ تھلچون میں فاریسٹ افسر سلمان سے مڈبھیڑ کے آٹھ دس دن بعد اپنے ساتھی جمدر کے ساتھ سمرال آیا تھا۔ وہ ملک امین شیر کا طفیلی تھا۔ برسوں سے اس کے لیے کام کرتا تھا۔ ملک امین شیر صوبائی اسمبلی کا ممبر رہ چکا تھا۔ اس دفعہ وہ ہار گیا تھا۔ اس کے باوجود بہت اوپر تک اس کے تعلقات تھے۔ وہ ان تعلقات کو استعمال کر کے پرمٹ حاصل کرتا تھا۔ پھر ٹرک بھر بھر کے آگے بڑے شہروں میں مہنگے داموں لکڑیاں فروخت کرتا تھا۔ اس کا مال لاہور کراچی تک جاتا تھا۔ نیچے سے اوپر تک، سب

کو ان کا حصہ پہنچایا تھا۔
جمشید نے تھلچون کا سارا واقعہ اس کے سامنے بیان کیا تھا۔ فاریسٹ افسر سلمان احمد کی فرض شناسی اور ایمان داری سے اس کے دھندے کو جو جھٹکا لگا تھا، اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔
ملک امین شیر اُس کی بات سن کر بڑی دیر مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا۔ پھر زیرلب ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے نوجوان افسر شروع میں مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ابھی تازہ تازہ افسر لگنے کا جوش ہے۔ گرم گرم جذبات ہیں۔ چند مہینوں میں پٹری پہ آجائے گا۔ خود اس کے محکمے کے لوگ اس کی ہوا نکال دیں گے۔ بس تم انتظار کرو۔ اگر چند مہینوں میں ٹھیک نہیں ہوا تو ہمیں خوب آتا ہے ایسے مہم جُو افسروں کا قبلہ درست کرانا۔''
جمشید فدویانہ لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میں جانتا ہوں آپ بڑے طاقت ور اور با اثر ہیں۔ میں نے بڑے بڑوں کو آپ کے دروازے پر ناک رگڑتے دیکھا ہے۔ اس جیسے کل کے لونڈے افسر کی تو کچھ حیثیت ہی نہیں۔ مگر ایک مسئلہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے ادھر اسلام آباد کی ایک پارٹی سے ڈیلنگ ہوئی ہے۔ آدھی پیمنٹ بھی وصول کر لی ہے۔ اس پارٹی کو تھلچون کے جنگلات کا دیودار اس مہینے کے آخر تک لازمی پہنچانا ہے۔ ورنہ ڈیل منسوخ ہوگی۔ رقم بھی واپس کرنی ہوگی۔ میرے پاس صرف دو ہفتے ہیں۔''
ملک امین شیر گہری نظروں سے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جمشید خان! تھلچون کے حالات تم بہتر جانتے ہو۔ وہ افسر ہر وقت تمہارے علاقے میں فاریسٹ گارڈ کی طرح ڈیوٹی نہیں دیتا۔ وہاں سے بہت دور چلاس کے ایک دفتر میں بیٹھا رہتا ہے۔ ظاہر ہے اس تک خبریں تمہارے علاقے کے ہی لوگ پہنچاتے ہیں۔ تم ان لوگوں پر نظر رکھو۔ دھن سے بھی دھونس سے بھی انہیں مٹھی میں رکھو۔ افسر تک خبریں پہنچنے مت دو۔ میرے بندے بھی لے جاؤ۔ تیزی سے مطلوبہ لکڑی کاٹ کے نیچے سڑک تک پہنچا دو۔ اس سے آگے کے کے ایچ کے ذریعے اسلام آباد پہنچانے کی ذمے داری مجھ پر چھوڑ دو۔''
جمشید فکرمندی سے بولا۔ ''ملک صاحب! ایسا کرنا اتنا آسان نہیں۔ فاریسٹ گارڈ یا مخبر سے زیادہ خطرہ نہیں۔ اصل مسئلہ میرے چچا نمبردار عنایت خان ہیں۔ وہ علاقے میں جنگلات کے تحفظ کے لیے بنائی گئی کمیٹی کا چیئرمین ہیں۔ چھ مہینے بعد ان کی بیٹی سے میری شادی ہونے والی ہے۔ میرے لیے سب سے بڑا خطرہ وہی ہیں۔ اس فاریسٹ افسر کی طرح ان کے دماغ میں بھی ایمانداری اور جنگلات سے وفاداری کا خناس سمایا ہوا ہے۔ انہیں کسی طرح معلوم ہوا تو سب سے پہلے گریبان وہی پکڑیں گے۔ مجھے تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ اپنی بیٹی سے ہونے والا رشتہ بھی ختم کر دیں گے۔''
ملک امین شیر نے کہا۔ ''اپنے نقصان کی فکر بھی ہے، ہونے والے سُسر سے خوف بھی ہے۔ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''
''ملک صاحب! میں چاہتا ہوں آپ کے بندے خفیہ طریقے سے وہاں جنگل میں جائیں۔ میں ان کے لیے راستے ہموار کر کے تھلچون سے نکل کر چند دن کے لیے گلگت چلا جاؤں گا۔ تاکہ کسی کو جنگل میں ہماری کارروائی کی خبر ہو تو بھی میرا نام نہ آئے۔ اس دوران آپ کے بندے لکڑی کاٹ کے نالے کے ذریعے نیچے سڑک تک پہنچائیں گے۔''
ملک امین شیر گھورتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم خود سامنے نہیں آنا چاہتے ہو تمہارے لیے قانونی اور خاندانی مسائل ہیں مگر تم راستے کیسے ہموار کرو گے؟ چلو مان لیا تم فاریسٹ گارڈز کو خرید و گے۔ یہ بھی مانتا ہوں مقامی کمیٹی کے چند ممبروں کو بھی خاموش کرا دو گے۔ لیکن اپنے چچا نمبردار عنایت کا کیا علاج کرو گے؟ اس کے ساتھ دو چار بندے اور بھی اس جیسے پاگل ہوں گے۔ انہیں کیسے راضی کرو گے؟''
وہ بے بسی سے بولا۔ ''نمبردار چچا میرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ اسے نگل بھی نہیں سکتا، اگلنا بھی مشکل ہے۔ آپ ہی کوئی راستہ بتائیں ملک صاحب!''
ملک امین شیر بھاری آواز میں بولا۔ ''میرا راستہ بہت سیدھا ہے جمشید خان! میرا یہ اصول رہا ہے جو نا قابلِ گزر دیوار بن جائے، اسے گرا دیتا ہوں۔ تم نے اپنے نمبردار چچا کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اس کا حل یہی ہے کہ اسے راستے سے ہٹا دو۔''
جمشید خان اندر سے لرز اٹھا۔ ملک امین شیر جیسے سفاک شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اپنے فائدے کے لیے انسانی جانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل دینے والا شخص اسے یہی مشورہ دے سکتا تھا۔ لیکن ابھی اس کے اندر اتنی حیوانیت نہیں اتری تھی۔
اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں ملک صاحب! میں ابھی اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس ایک راستہ ہے۔ گلگت میں میرا ایک اور چچا بھی ہے۔ وہاں ایک دفتر میں ملازم ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گلگت میں ہی رہتا ہے۔ میں شہر جا کر اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے عمر میں تھوڑا ہی بڑا

ہے۔اس سے اچھی دوستی ہے۔میں اس کے ذریعے کوئی بہانہ کر کے نمبر دار چچا کو شہر بلواتا ہوں۔یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔وہ اکثر گلگت جاتے رہتے ہیں۔اس دفعہ چھوٹے بھائی کی خصوصی دعوت پر جائیں گے۔اگر وہ گلگت گئے تو پیچھے لوگوں کو سنبھالنا بہت آسان ہے۔پھر آپ کے بندے بھی شامل ہوں تو نمبر دار چچا کے واپس آنے تک ہم بہت سی لکڑی آگے منتقل کر سکتے ہیں۔‘‘

ملک امین شیر کچھ دیر سوچتا رہا۔پھر بولا۔’’برخوردار! تم بہت سی دولت کمانا چاہتے ہو لیکن رشتوں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ ہمارے دھندے میں جب تک جذبات کی قربانی نہ دی جائے، مال کمانا آسان نہیں ہوتا۔خیر، تم نے جو راستہ سوچا ہے، ممکن ہے اس کے مطابق کام مکمل ہو۔یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔تمہارے خاندان کے بزرگ اس میں ملوث ہیں۔اس لیے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کروں گا۔تمہیں جب ضرورت پڑی میں حاضر ہوں۔ملک امین شیر اپنے ساتھیوں کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔‘‘

☆☆☆

حنا کا اضطراب بہت بڑھ گیا تھا۔مادو پور کے گیسٹ ہاؤس میں یہ دوسرا دن تھا۔شہر سے روانہ ہوتے ہوئے ان کا خیال تھا چند دن اس دور دراز وادی میں سکون سے گزاریں گے مگر دوسرے دن ہی ان کا سکون برباد ہو گیا تھا۔سلمان احمد نے اگرچہ اس کا خوف دور کرانے کے لیے اسے ایک اتفاقی واقعہ قرار دیا تھا لیکن حنا کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔اس کا دل نہیں مان رہا تھا وہ اس بہ ظاہر معمولی واقعے کو بہت شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

سلمان بھی اندیشوں میں گھر گیا تھا۔یقین نہ کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن اس واقعے کے بارے میں زیادہ سوچنے لگا تھا۔وہ کم ہمت نہیں تھا۔ایک بااثر اور طاقت ور خاندان کا فرد تھا۔ذہنی اور جسمانی طور پر بھی مضبوط تھا۔اس نے ایک سال سے زیادہ اپنے اور حنا کے تحفظ کے لیے دشمنوں کا بہت جی داری سے مقابلہ کیا تھا۔جمشید اور اس کے حواریوں کا دیامر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بہت بہادری سے سامنا کیا تھا لیکن وہاں سے بہت دور مادو پور جیسی پُرامن وادی میں ان جیسے حالات کی توقع بالکل نہیں تھی۔

اگلی صبح سلمان احمد دفتر جانے کے لیے تیار ہوا تو حنا نے اسے بہت روکا۔اس نے اصرار کے ساتھ کہا کہ مادو پور سے واپس چلتے ہیں۔آفس کی ذمے داری بھاڑ میں جائے۔اپنے بڑے افسروں سے صاف صاف کہہ دیں کہ دشمنوں نے پھر سے ان کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔

سلمان اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔’’حنا! اب اتنا بھی پریشان مت ہو۔ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔مادو پور ایسا علاقہ نہیں کہ دشمنوں کے جی میں جو آئے، کریں۔یہ بہت پُرامن اور محفوظ وادی ہے۔یہاں کی پولیس بہت فعال اور منظم ہے۔ہمیں نقصان پہنچاتے ہوئے دشمنوں کو سو بار سوچنا پڑے گا۔‘‘

حنا کو اطمینان نہیں ہوا۔’’سلمان! پلیز میری بات مانیں۔خدانخواستہ ہمیں کچھ ہو جائے اور اس کے بعد پولیس جتنی بھی پھرتی دکھائے، کچھ فائدہ نہیں۔اس لیے شہر واپس چلے جاتے ہیں۔وہاں آپ کی فیملی ہے۔یار دوست ہیں۔سب کی موجودگی میں تحفظ کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔‘‘

سلمان پیار سے اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔’’دیکھو حنا! آج کا دن بھی صبر کر لو۔میرا آفس جانا بہت ضروری ہے۔آج مقامی آبادی کے بہت اہم افراد کے ساتھ ضروری میٹنگ ہے۔اس کے علاوہ وائلڈ لائف نیشنل پارک کا ایک مختصر سا معائنہ ہے۔میں جلدی سے یہ دونوں کام نمٹا کے آؤں گا۔وعدہ کرتا ہوں کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔‘‘

حنا بادلِ ناخواستہ راضی ہوئی۔ساتھ ساتھ اس نے تاکید کی کہ اپنا پسٹل ضرور ساتھ لے جائے۔یہ 9 ایم ایم پسٹل سلمان نے ایک سال پہلے دیامر میں دشمنوں سے معرکہ آرائی کے دوران لیا تھا۔اس کا لائسنس بھی بنوایا تھا۔وہ اکثر پسٹل اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

وہ شعبان علی کے ساتھ وائلڈ لائف کے دفتر روانہ ہوا۔حنا دھڑکتے دل کے ساتھ گیسٹ ہاؤس کے گیٹ سے باہر گاڑی نکلنے تک اسے دیکھتی رہی۔دل کی گہرائیوں سے اس کی سلامتی اور تحفظ کی دعائیں مانگتی رہی۔

گیسٹ ہاؤس کے ملازم کو سلمان نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ حنا کو تنہا چھوڑ کے باہر نہ جائے۔ان کے واپس آنے تک اس کے آس پاس ہی موجود رہے۔

سلمان احمد نے دفتر پہنچ کے پہلے کچھ ضروری امور نمٹائے۔پھر شیڈول کے مطابق جنگلی حیات کی مقامی تنظیم کے افراد کے ساتھ میٹنگ کی۔یہ میٹنگ دوپہر تک جاری رہی۔اس کے بعد وائلڈ لائف نیشنل پارک کے دورے کے لیے روانہ ہوا۔یہ پارک آبادی سے کچھ فاصلے پر بنا ہوا تھا۔تقریباً سو ایکڑ رقبے پر مشتمل اس پارک میں مادو پور اور آس پاس کے پہاڑوں اور جنگلوں میں پائے جانے والے نایاب جانور پالے جاتے تھے۔یہاں انہیں قدرتی ماحول فراہم کر کے

crossbreeding کرائی جاتی تھی۔ ان جانوروں میں مارکوپولوشیپ، مارخور اور خوش گاؤ قابلِ ذکر تھے۔

یہ پارک پہاڑ کے دامن میں ایک ڈھلوانی قطعۂ زمین پر تھا۔ یہاں درخت تھے، گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ کہیں ٹیلے تھے، کہیں چٹانیں۔ پہاڑوں کے اندر چشموں سے پھوٹ کر بہنے والی ندیاں بھی تھیں۔ ان کا پانی کہیں تیزی سے نشیب میں بہتا تھا کہیں بڑے گڑھوں میں داخل ہو کر تالاب اور چھوٹی جھیلوں کا منظر پیش کرتا تھا۔ جنگلی جانور ان کے آس پاس گھاس چرتے ہوئے اور پانی پیتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

اس نے تقریباً ایک گھنٹا جنگلی حیات کے اس پارک میں گزارا۔ کراس بریڈنگ (نسل کشی) کے لیے جن جانوروں کو خصوصی طور پر پالا جا رہا تھا، ان کی صحت، خوراک اور کارکردگی کا معائنہ کیا۔ ان کی دیکھ بھال پر مامور عملے کو کچھ ہدایات دیں۔

وہ چاہتا تھا آج سارے اہم امور نمٹا لے تاکہ حنا سے کیے وعدے کے مطابق کل شہر واپس روانہ ہوسکیں۔ اس لیے آفس میں میٹنگ کے بعد گیسٹ ہاؤس واپس جانے کے بجائے اس پارک کا بھی دورہ کیا تھا۔ ورنہ پارک کا معائنہ اگلے دن کے شیڈول میں شامل تھا۔ پارک کے معائنے سے فارغ ہوئے تو مقامی تنظیم کے صدر نے بصد اصرار ان سب کی اپنے گھر دعوت کی۔ سلمان نے ایک آدھ دفعہ منع کیا مگر ان کا خلوص اور مہمان نوازی دیکھ کر راضی ہوگیا۔

تنظیم کے صدر کا گھر پارک کے عقب میں ایک چھوٹی سی بستی میں تھا۔ وہ سب تین گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کے گھر گئے۔ وہاں کھانے سے فارغ ہونے تک سہ پہر کے چار بج گئے۔ واپس گیسٹ ہاؤس پہنچنے تک ایک گھنٹے سے زیادہ لگ سکتا تھا۔

سلمان کا دھیان بہت دفعہ حنا کی طرف گیا۔ سرکاری امور نمٹاتے ہوئے وہ مسلسل پریشان کن خیالات کے گھیرے میں رہا تھا۔ اسے اطمینان بھی تھا، ان کے دشمن ایسی جرأت نہیں کرسکیں گے۔ یہ ٹھلچون کا جنگل نہیں، بادو پور کی مہذب وادی ہے جہاں کا معاشرہ، قانون کا دائرہ بھی ٹھلچون سے زیادہ بہتر ہے۔

واپسی میں دو گاڑیاں پیچھے رک گئی تھیں۔ ایک گاڑی تنظیم کے صدر کی تھی، دوسری گاڑی میں دفتر کا عملہ تھا جنہیں سلمان نے ایک دوسرے کام کی ذمے داری سونپی تھی۔ ان کا سفر وائلڈ لائف پارک تک آکے ختم ہوا تھا۔ اس سے آگے گیسٹ ہاؤس تک سلمان احمد اور شعبان علی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ راستے میں پہاڑی علاقہ زیادہ تھا۔ کہیں کہیں چھوٹی آبادیاں تھیں۔ اکثر جگہ درخت اور اونچے نیچے کھیت بنے ہوئے تھے۔ جن میں مکئی، آلو اور مٹر کی فصل کاشت کی جاتی تھی۔ اس میں سے گزرتی سڑک کچی اور ناہموار تھی۔ وائلڈ لائف پارک کے پاس جا کے سڑک ختم ہوتی تھی، راستے میں آبادی بھی زیادہ نہیں تھی اس لیے بہت کم گاڑیاں اس پر سے گزرتی تھیں۔

شعبان علی شکستہ سڑک پہ کم رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ سلمان احمد بظاہر شیشوں سے باہر مناظر دیکھ رہا تھا لیکن اس کا دھیان حنا کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس نے جلدی آنے کا وعدہ کیا تھا مگر اندیشہ تھا کہ گیسٹ ہاؤس پہنچنے تک شام ہوجائے گی۔ حنا ناراض بھی ہوگی، اتنی تاخیر کی وجہ سے پریشان بھی ہوگی۔ اس علاقے میں موبائل نیٹ ورک ابھی شروع نہیں ہوا تھا اس لیے اسے دیر سے آنے کی خبر بھی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں اس کے دماغ میں سرسراتی رہیں۔ اس نے شعبان علی کو گاڑی مزید تیز چلانے کی ہدایت کی۔

یکایک اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ تڑتڑاتڑ ایک دم فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ اس ویران پہاڑی علاقے میں فائرنگ کی آواز ایک ہولناک صوتی تاثر کے ساتھ اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اضطراری طور پر ایک لمحے کو خوف نے اسے جکڑ لیا تھا، دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھالا۔۔۔ پچھلے ایک سال کی پُرخطر اور اعصاب شکن جدوجہد، بلک جھپکتے دماغ میں لہرائی تھی۔ اس نے اپنے حواس کو بیدار رکھا۔ کئی ایک گولیاں گاڑی کی باڈی سے ٹکرائی تھیں۔ ایک طرف کا شیشہ بھی چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ شاید پیچھے کا ایک ٹائر بھی ان کی زد میں آگیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ہچکولے کھانے لگی تھی۔

اس نے پلک جھپکنے میں ڈیش بورڈ سے اپنا پسٹل نکالا ساتھ ہی چیخ کر ڈرائیور سے کہا۔ ''گاڑی چھوڑ کے کود جاؤ!''

اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ کھول کے باہر چھلانگ لگادی۔ سڑک کے ساتھ ڈھلوانی زمین تھی۔ اس پر گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ بڑے چھوٹے پتھر بھی تھے۔ سلمان لڑھکتا ہوا جھاڑیوں اور پتھروں سے ٹکراتا ہوا نشیب کی طرف جانے لگا۔ فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی۔ کئی گولیاں اس کے آس پاس زمین میں پیوست ہوگئی تھیں۔ ایک گولی بالکل کان کے ساتھ مس کرتی ہوئی، اپنے راستے میں آنے والے سر کے بالوں کو جلاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے

کانپ گیا تھا۔ ایک سرد سی لہر پورے بدن میں دوڑ گئی تھی۔ دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند گولیاں آ کے پتھر سے ٹکرائیں پھر خاموشی چھا گئی۔ چند ہی ثانیوں بعد سڑک پر دوسری طرف گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ سلمان کا دل دھک سے رہ گیا۔ شعبان علی سڑک پہ ہی رہ گیا تھا۔ اس کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ اس نے اضطراری طور پر ہاتھ بلند کر کے سڑک کی طرف چند سنگل فائر کیے۔ دشمن نظر نہیں آ رہا تھا مگر اسے خبردار کرنے کے لیے کہ وہ بھی مسلح ہے، اس نے گولیاں چلائی تھیں۔

اس کی فائرنگ کے جواب میں دوسری طرف سے بھی ایک پورا برسٹ آیا۔ گولیاں اس بڑے سے پتھر سے ٹکرا کر چنگاریاں پیدا کرتی ہوئی، اچٹتی ہوئی اس کے آس پاس زمین میں لگنے لگیں۔ یہ فائرنگ اس کے قریب کسی جگہ سے ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گیا دشمن ایک سے زیادہ ہیں۔ سڑک پر بھی ہیں اور ڈھلوانی زمین پر بھی اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس کے پاس فالتو گولیاں نہیں تھیں۔ اس کے ۱۹ ایم ایم پسٹل کے میگزین میں دس گولیاں تھیں۔ اسے بہت احتیاط سے ان دس گولیوں سے دشمن کا مقابلہ کرنا تھا۔ اسے شعبان علی کی بھی فکر تھی۔ نیچے کودتے ہوئے سلمان احمد نے آخری مرتبہ دیکھا تھا کہ اس نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ دشمن بھی سڑک پہ موجود تھے۔ یہ سوچ کے سلمان کا دل ڈوب سا جاتا تھا۔

اس نے پتھر کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ سڑک پر ایک شخص کا ہیولا نظر آیا۔ اس نے کالے رنگ کی چادر سے جسم اور سر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ آنکھوں تک چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ شخص جھک کر تیز تیز چلتا ہوا اس طرف جا رہا تھا جہاں گاڑی سے ان دونوں نے چھلانگ لگائی تھی۔ اس شخص کو دیکھ کر سلمان کے دماغ نے چیخ کر کہا کہ شعبان علی کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ نہتا بھی تھا۔ یہ سوچ کر وہ ایک دم مضطرب ہو گیا۔ اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ جس پتھر کے پیچھے وہ دبکا بیٹھا تھا، اس سے چار پانچ قدموں کے فاصلے پر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جو اوپر سڑک تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اللہ کا نام لیا۔ ایک طویل جست لگا کے جھاڑیوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس وقت فائرنگ رکی ہوئی تھی۔ شاید دشمن اس کی جگہ کا اندازہ لگانے کے لیے اسے تلاش کر رہے تھے۔ یہ جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ اس میں چھپا کوئی شخص آسانی سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔

وہ جھاڑیوں کے اندر سے رینگتا ہوا بہت احتیاط سے سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد وہ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ اسے سڑک کا وہ حصہ دکھائی دیا جہاں ان کی گاڑی پہاڑ سے ٹکرا کے ایک طرف جھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک پتھر کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ کالے رنگ کی چادر میں چھپا شخص گاڑی سے کچھ فاصلے پر پسٹل تانے کھڑا تھا۔

اسی وقت سلمان احمد کی چھٹی حس نے احساس دلایا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ڈھلوانی جگہ کوئی موجود ہے۔ اس نے چونک کر تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ تقریباً پچاس گز دور ایک شخص ہاتھ پاؤں کے بل گھسٹتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سلمان پتھر کی اوٹ میں تھا، آس پاس جھاڑیاں بھی تھیں۔ بہ ظاہر وہ محفوظ تھا لیکن دشمن کو اس کی پوزیشن کا علم ہوا تھا اس لیے وہ قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلمان احمد کے لیے یہ بہت نازک مرحلہ تھا۔ اس کی طرف بڑھنے والے شخص کو روکنا بھی تھا۔ سڑک پر موجود دشمن سے شعبان علی کو بھی بچانا تھا۔ اس نے پلٹ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ وہ شخص گاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس کے اندر جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

سلمان احمد کے پاس اب مزید دیر کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے خود کو پتھر کی آڑ میں رکھتے ہوئے اپنے قابل اعتبار جرمن ساختہ ۱۹ ایم ایم پسٹل سے نشانہ باندھا۔ پھر ہونٹ بھینچ کر تقریباً سو فٹ دور سڑک پر موجود دشمن کی پشت کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ پہاڑوں میں فائرنگ کی بازگشت کے ساتھ ہی دشمن کے چیخنے کی آواز بلند ہوئی۔ عین اسی لمحے سامنے ڈھلوانی زمین پر اس کی طرف بڑھتے ہوئے دشمن نے جوابی کارروائی کی۔ اس کی آٹومیٹک رائفل بہت خوف ناک طریقے سے گرجی تھی۔ کتنی ہی گولیاں سلمان کے آس پاس اور سامنے پتھروں سے ٹکرا کر اور جھاڑیوں کی پتلی شاخوں کو توڑ کر زمین میں پیوست ہو گئی تھیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بڑے سے پتھر کے پیچھے تھا ورنہ محض جھاڑیوں کی آڑ اسے محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔

اس کی طرف بڑھتے دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کے دو فائر کیے۔ اب اس کے پاس صرف تین گولیاں بچی تھیں۔ اتنا اسے اندازہ ہوا تھا کہ دشمنوں کی تعداد دو سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک سڑک پر زخمی حالت میں تھا دوسرا تقریباً چالیس گز دور اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہی شخص اس کے لیے خطرہ تھا۔ تسلی کی بات یہ تھی وہ خود ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں تھا۔

اسی دوران دشمن کی طرف سے چند فائر مزید ہوئے۔ سلمان پتھر سے چپک کر خاموش بیٹھا رہا۔ چند ثانیے بعد اس کے کانوں نے سرسراہٹ سنی۔ اس نے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ دشمن ایک پتھر کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے دوسرے پتھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کے دو گولیاں چلائیں۔ اس شخص کی حرکت تیز تھی یا پھر اس کی قسمت اچھی تھی کہ کوئی گولی اسے نہیں لگی۔ وہ ایک دم چھلانگ لگا کے پتھر کے پیچھے ہو گیا۔ سلمان نے انتظار کیا کہ وہ شخص جوابی فائر کرے گا۔ اس نے خود کو پتھر کی اوٹ میں کر لیا لیکن دوسری طرف بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح بھاری گزر رہا تھا۔ اس پہاڑی علاقے میں بڑی دیر تک گولیوں کی آوازیں گونجتی رہی تھیں۔ اب ایک خوف ناک سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ اس کے کان کسی سرسراہٹ یا آہٹ کی آواز سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بہت چوکنا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی اس کے کان بھی دشمن کی کسی حرکت پر لگے ہوئے تھے۔

اچانک اس خاموش ماحول میں کسی جیپ کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ اس نے چونک کر پلٹ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ دور مادو پور کی طرف سے آنے والے راستے پر ایک پرانے ماڈل کی جیپ دکھائی دی۔ وہ ایک ٹیلے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آرہی تھی۔ جیپ کے پچھلے حصے کی چھت نہیں تھی۔ صرف لوہے کا جنگلا تھا۔ چار پانچ افراد جنگلے کے سہارے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر سلمان کو جیسے نیا حوصلہ مل گیا۔ اس نے سر گھما کے اس طرف دیکھا جدھر دشمن چھپا ہوا تھا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ اس نے کچھ انتظار کیا پھر ایک پتھر اٹھا کے اس طرف زور سے اچھال دیا۔ پتھر کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے سوا کوئی ہلچل محسوس نہ ہوئی۔

اس دوران وہ جیپ حادثے کی جگہ سے کچھ فاصلے پر آکر رک گئی تھی۔ پیچھے کھڑے افراد چھلانگیں لگا کے جیپ سے نیچے اترے تھے۔ فرنٹ سیٹ سے بھی دو افراد نکل کر ان کے ساتھ کھڑے تھے۔

سلمان کے سامنے موجود دشمن کی طرف سے بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسے خیال آیا شاید اس کی گولیاں ختم ہوئی ہوں یا پھر جیپ کو دیکھ کر اس نے بھاگنے میں عافیت محسوس کی ہو۔ اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ خاموشی دشمن کی کوئی چال نہ ہو۔ اسے دھوکا دے کر نشانہ بنانا چاہتا ہوگا۔

اس کے پسٹل میں صرف ایک گولی بچی تھی۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا دشمن کی طرف اندازے سے یہ گولی بھی فائر کرے تا کہ اس کے ردعمل کا اندازہ ہو سکے۔ پھر خیال آیا پتا نہیں کب دشمن سے سامنا ہو۔ اسے آخری لمحے تک بچا کے رکھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ پتھر کی اوٹ سے نکل کر رینگنے کے انداز میں سڑک کی طرف بڑھا۔ جھاڑیوں اور پتھروں کو آڑ بناتا وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ اس کے کان اور اس کی آنکھیں دشمن کی طرف سے غافل نہیں تھیں۔ وہ کسی بھی لمحے دشمن کی طرف سے فائرنگ کی توقع کر رہا تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں سے دیکھا کچھ فاصلے پر ایک دشمن اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اس کے آس پاس بہت سا خون پھیلا ہوا تھا۔ اس کی گاڑی بھی پہاڑ کے ساتھ لگی ہوئی ترچھی حالت میں پڑی تھی۔

وہاں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پہ وہ جیپ آکر رک گئی تھی۔ اس میں موجود افراد باہر نکل کر اس طرف دیکھ رہے تھے۔ سلمان احمد نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ ہلا کر انہیں اشارہ کیا۔ وہ لوگ ہچکچاتے ہوئے اس کی طرف آنے لگے۔ وہ گاڑی کے پاس آکے رک گیا۔ گاڑی خالی تھی۔ شعبان علی اس میں نہیں تھا۔ زخمی دشمن بے حس و حرکت تھا۔ گولی اس کے کندھے پہ لگی تھی۔ سلمان احمد نے اسے سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ کھل گیا تھا لیکن پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ حلیے سے اور چہرے کے خطوط سے وہ مقامی باشندہ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ سلمان نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ اس کا سینہ بہت دھیرے دھڑک رہا تھا۔ اس کی نبض بھی ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔

اسی وقت وہ چونک پڑا۔ کسی کے کراہنے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ زخمی دشمن کو چھوڑ کے وہ تیزی سے کھڑا ہوا۔ کراہنے کی آواز سڑک کے ساتھ پہاڑ کے اندر ایک کھوہ سے آرہی تھی۔ وہ لپک کر آواز کی سمت بڑھا۔ وہاں شعبان علی ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی ٹانگ خون سے سرخ تھی۔ وہ شدید تکلیف کی حالت میں اپنی ٹانگ تھامے کراہ رہا تھا۔

سلمان نے اسے سہارا دے کر کھوہ سے باہر نکالا۔ اس کی حالت دیکھ کر بہت طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ وہ زخمی تھا مگر اس کی جان کو خطرہ نہیں تھا۔

اس دوران جیپ کے افراد قریب آگئے۔ وہ مقامی لوگ تھے۔ سلمان احمد نے انہیں مختصراً ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ افراد حیرت اور تاسف سے اس کی بات سنتے رہے۔ زخمی دشمن کو وہ بھی نہیں جانتے تھے۔

اس کی گاڑی ناکارہ ہو گئی تھی۔ وہ لوگ سلمان کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے اپنی جیپ میں انہیں مادو پور لے

جانے پر تیار تھے۔ ان افراد کی مدد سے سلمان نے شعبان علی اور زخمی دشمن کو جیپ میں ڈالا۔ جیپ کی سیٹیں نہیں تھیں..... دونوں زخمیوں کو جیپ کے فرش پر لٹا دیا۔ جیپ میں ایک چادر موجود تھی اسے پھاڑ کے دونوں کے زخموں کو کس کے باندھ دیا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے سے کم وقت میں وہ مادو پور پہنچ گئے۔ دونوں زخمیوں کو ان افراد کے ساتھ اسپتال کی طرف بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ خود تھانے کا پتا پوچھ کر اس طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اس کے جی میں آیا کہ پہلے گیسٹ ہاؤس جائے۔ حنا کی خیریت پوچھ لے لیکن دماغ نے رہنمائی کی کہ پولیس کارروائی پہلے ضروری ہے۔ بعد میں گیسٹ ہاؤس جا کر حنا کی تسلی کرا دے گا۔

☆☆☆

حنا نے جب سے فاریسٹ افسر سلمان کا خط پڑھا تھا، اس کا سکون لٹ گیا تھا۔ دل میں البیلے موسم اتر آئے تھے۔ کبھی جذبات کی رم جھم میں وہ بھیگ جاتی، کبھی نرم گرم محسوسات کی دھوپ میں سلگ سی جاتی۔ نگاہوں کی رہ گزر پر نانگا پربت کی گل پوش وادیوں کا سارا حسن سمٹ آتا تھا۔ اس نے لکھا تھا ایک مہینے بعد وہ آئے گا۔ اب یہ انتظار اس کی سانسوں کے لیے آزار بن گیا تھا۔

اسے یقین تھا وہ اپنے وعدے کے مطابق ضرور آئے گا۔ یہ خوف بھی تھا اس سے ملاقات آسان نہیں ہوگی۔ ایک پابند ماحول میں کسی جوان مرد سے اس کی ملاقات بہت سے فتنے جگا سکتی تھی۔ سماجی رویّے اپنی جگہ، جمشید بھی کچھ کم برہم مزاج نہیں تھا۔ اس کا بابا نمبر دار عنایت خان تو بیٹی کی لغزش درگزر کر سکتا تھا مگر جمشید کو بھنک بھی پڑی تو قیامت بپا کر دیتا۔

وہ نادان نہیں تھی۔ بہت سمجھدار اور پڑھی لکھی تھی۔ فاریسٹ افسر سے متعلق دل میں جو جذبات پیدا ہوئے تھے، ان سے دل میں گدگدی بھی ہو رہی تھی۔ اسی تعلق کی بنیاد پر پیش آنے والے حالات کے بارے میں سوچ کر دل میں ہول بھی اٹھ رہے تھے۔

دن گزرتے گئے۔ انتظار کی کیفیت جنوں آمیز ہوتی گئی۔ آنکھیں کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے صحرا بن گئیں۔ مسافر کسی ریگزار میں رستہ گم کر دے، پانی ختم ہو جائے تو خشک ریت سراب بن جاتی ہے۔ حنا بھی فاریسٹ افسر کی راہ تکتے تکتے جیسے سرابوں میں بھٹکنے لگی تھی۔

جمشید کوہستان کے علاقے سُرال سے واپس آ گیا تھا۔ وہاں کے ملک امین شیر نے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ تھلچون کے جنگلوں سے قیمتی لکڑی کی کٹائی کے راستے میں اس کا چچا نمبر دار عنایت سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اسے کسی طرح راستے سے ہٹانا تھا مگر راستے سے ہٹانے کے ملک امین شیر کے قاتل فارمولے کو اس نے یکسر مسترد کیا تھا۔ اس کے بجائے کسی بہانے کچھ دنوں کے لیے گلگت بھجوانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے ایک دن وہ گلگت چلا گیا۔

گلگت میں نمبر دار عنایت کا چھوٹا بھائی کفایت خان رہتا تھا۔ اس کا جمشید سے بہت خاص تعلق تھا۔ جمشید سے عمر میں چند ہی برس بڑا تھا۔ ویسے تو ان دونوں میں چچا بھتیجے کا رشتہ تھا مگر عمر کے کم فرق کی وجہ سے وہ بے تکلف دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ وہ گلگت آتا تو اسی کے پاس ٹھہرتا تھا۔

اس دفعہ بھی وہ سیدھا کفایت کے پاس پہنچ گیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں الگ کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے ساتھ گفتگو بھی کر رہے تھے۔ کفایت نے اس کے کاروبار کے بارے میں پوچھا۔ جمشید اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے جھٹ سے رونی صورت بنا کر بتا دیا کہ مشکلات بہت بڑھ گئی ہیں۔ حکومت نے بہت سختی کی ہوئی ہے۔ خاص کر تھلچون کی طرف درختوں کی کٹائی پر سخت پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس وجہ سے بہت سا مال پھنسا ہوا ہے۔

کفایت نے کہا۔ ’’حکومت کی طرف سے پابندی تو پچھلے کئی سالوں سے رہی ہے۔ اس کے باوجود تم اپنا مال نکال لیتے تھے۔ اس دفعہ ایسی کیا غیر معمولی پابندی لگ گئی ہے جو تو اتنا پریشان ہے؟‘‘

جمشید بولا۔ ’’تم درست کہتے ہو سختی کے باوجود میں مال آگے پہنچا دیتا تھا۔ لیکن اس دفعہ میرے لیے نمبر دار چچا بڑا مسئلہ بن گئے ہیں۔ نئے فاریسٹ افسر نے نمبر دار چچا کو مقامی تحفظ جنگل کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا ہے۔ چچا کے مزاج کو آپ بہتر جانتے ہیں۔ وہ کٹ مریں گے مگر اپنے قول سے نہیں پھریں گے۔ نیا فاریسٹ افسر اور چچا مل کر ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔ تم جانتے ہو پچھلے دنوں میں بڑی مشکل سے بچ گیا تھا۔ اب تو اتنا مشکوک ہو گیا ہوں کہ سارا دھندا چوپٹ ہو گیا ہے۔‘‘

کفایت کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ’’بڑے بھیا کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ بہت ہی سخت مزاج اور اصول پرست ہیں۔ ان کا جنگل کمیٹی کا چیئرمین بن جانا تمہارے لیے بُرا شگون ہے۔ اب تم نے کیا سوچا ہے؟ دھندا چھوڑ دو گے یا پھر دوسرے جنگل کا رخ کرو

گے؟''

جمشید نے کہا۔ ''میں یہ دھندا چھوڑ نہیں سکتا۔ اسلام آباد کی ایک پارٹی سے دس لاکھ ایڈوانس لے چکا ہوں۔ دو ہفتوں کے اندر اسے مطلوبہ لکڑی پہنچانی ہے۔ کسی دوسرے جنگل کا رخ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام آباد کی پارٹی نے ہمارے کھلچون کے دیودار کی ڈیمانڈ کی ہے۔ میں انہیں دھوکے میں نہیں رکھ سکتا۔''

کفایت گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''تم نے کیا سوچا ہے؟ بڑے بھیا تمہاری بات مان لیں گے؟ کھلچون کے دیودار کاٹنے کی اجازت دیں گے؟''

جمشید مایوسی سے بولا۔ ''کبھی نہیں۔ ان سے ایسی امید بالکل نہیں رکھی جا سکتی لیکن میرے دماغ میں ایک آئیڈیا ہے۔ جس کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم نمبردار چچا کو کچھ دنوں کے لیے گلگت بلاؤ۔ ظاہر ہے ان کی طرف سے انکار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک راستہ ہے۔ پچھلے دنوں ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ تم اسی بہانے انہیں گلگت بلاؤ۔ ایک ہفتے تک یہاں اُلجھائے رکھو۔ میرے بندوں کے لیے اتنے دن بہت ہیں۔ اس عرصے میں وہ جنگل سے لکڑی کاٹ کے نالے تک پہنچائیں گے۔ وہاں سے آگے معاملہ آسان ہے۔''

کفایت کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں بڑے بھیا کو یہاں مصروف رکھوں گا مگر صرف ایک اُن کی بات تو نہیں۔ جنگلات کا دیگر عملہ ہے۔ تحفظِ جنگلات کمیٹی کے دوسرے ممبر ہیں۔ ان کا کیا کرو گے؟''

''ان سب سے نمٹنا آسان ہے۔ میری بات بھی ہوئی ہے۔ کسی کو دھمکی سے کسی کو دولت سے خاموش کرایا ہے۔ بس نمبردار چچا راستے سے ہٹ جائیں۔ ان کے سوا کوئی دوسری رکاوٹ نہیں۔''

کفایت خان نے اسے یقین دلایا کہ اس کے منصوبے کے مطابق بڑے بھیا کو گلگت بلائے گا۔ علاج کے بہانے چند دن مصروف رکھے گا۔

☆☆☆

ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ فاریسٹ افسر وعدے کے مطابق کھلچون نہیں آیا تھا۔ حنا اب اس کی طرف سے مایوس ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کے دل کو تسلی دی تھی کہ اس نے جذبات میں آ کر آنے کی بات تو کی تھی مگر شہر کے ہنگاموں میں سب کچھ بھول گیا ہوگا۔ چلو اچھا ہوا۔ اس کا میرا کیا جوڑ۔ میں تو صرف خواب دیکھ سکتی ہوں۔ تعبیر کی تدبیر ناممکن ہے۔

انہی دنوں اس کا ابا شہر چلا گیا۔ گلگت سے چچا کفایت نے بہت اصرار کر کے بلایا تھا۔ اس کے بلڈ پریشر کا حوالہ دے کر علاج معالجے کا بتایا تھا۔ ابا نے تین دنوں کا کہا تھا مگر ایک ہفتہ ہوا، وہ واپس نہیں آیا۔ ابا کی غیر موجودگی میں اُن کا مہمان خانہ بھی سونا پڑا تھا۔

حنا ہر صبح مہمان خانے کی صفائی کرتی تھی۔ ہر روز سورج، نانگا پربت کی برفیلی چوٹیوں پر سنہری کرنیں اتار کر آگے بڑھتا تھا۔ پھر شام کو کھلچون کے پہاڑوں کے اوپر جنگل کے پیچھے کہیں غروب ہو جاتا تھا۔ حنا مہمان خانے کی صفائی کے بعد بڑی دیر تک اپنی بے قرار آنکھیں راستے پر بچھائے فاریسٹ افسر کی راہ دیکھا کرتی۔ سورج تو ہر دن طلوع ہوتا رہا مگر دل کا آسمان گہرے بادلوں میں ڈھکا رہا۔

پھر ایک شام جب سورج ... بلند پہاڑوں کے پیچھے چھپنے کی تیاری کر رہا تھا، اس کے دل کا سورج طلوع ہو گیا۔ جس کی آمد سے وہ مایوس ہو گئی تھی وہ اس شام مہمان خانے کی رونق بن کر پہنچ گیا۔

خبر سن کر اس کا دل بے اختیار دھک دھک کرنے لگا۔ کانوں کی لویں جذبوں کی حدت سے تپنے لگیں۔ جس کے لیے آنکھیں صحرا بن گئی تھیں اب کہیں جا کے بادل برسنے کو آئے تھے۔

چچا فقیر اللہ نے مرغ ذبح کیا۔ حنا اور اس کی امی کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ عشاء کی نماز کے بعد چچا فقیر اللہ کھانا لینے آ گیا۔ حنا نے پہلے کی طرح صندوق سے صاف چادر نکالی۔ اس میں کھانا لپیٹ کر مہمان خانے میں بھجوا دیا۔

کچھ دیر بعد چچا فقیر اللہ جھوٹے برتن لے کر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں سے برتن لے کر وہ کچن میں آ گئی۔ دل کہہ رہا تھا چادر کے اندر کچھ ہے۔ کیا ہے اسے جاننے کے لیے اس نے بے تابی سے چادر کی گرہ کھولی۔ یکایک اس کا دل اچھل کر جیسے منہ میں آ گیا۔ سالن کے ڈونگے میں ایک پیلے رنگ کا کاغذ تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ اس نے جھپٹ کر کاغذ اٹھایا۔ پھر اسے کھول کر دھڑکتے دل سے پڑھنے لگی۔

تین چار سطروں میں سلمان احمد نے لکھا تھا۔

''حنا! میں حسبِ وعدہ آ گیا ہوں۔ اپنے پیچھے بہت سے کام چھوڑ کے آیا ہوں۔ دفتر کی ذمے داریاں ہر دن زنجیر بن جاتی تھیں لیکن تم کو ایک بار دیکھنے کی تمنا سب پر حاوی ہو گئی۔ میں صبح نو بجے فقیر اللہ اور اپنے معاون کو کسی کام سے باہر بھیج دوں گا۔ تم کچھ وقت نکال کے آ سکو گی نا؟ میں تمہارا منتظر رہوں گا۔''

چند جملوں پہ مشتمل یہ پیغام پڑھ کے اُس کی نس نس میں جیسے بے خودی دوڑنے لگی۔ وہ ہواؤں میں اُڑنے لگی۔ گاؤں میں لوگ جلد ہی سو جاتے ہیں۔ اس کی ماں اور بھائی بھی کمرے میں ایک طرف سوئے ہوئے تھے لیکن اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ فاریسٹ افسر کے خط کا ایک ایک لفظ اس کے بدن کی چٹکیاں لیتا رہا۔ وہ کانپتی، گہری گہری سانسیں لیتی، خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتی طویل رات کاٹنے کے جتن کرتی رہی۔ بہت رات گزرنے کے بعد کہیں جا کے اسے نیند آئی۔

صبح ماں نے اسے جگایا۔ ہمیشہ ایک ہی آواز پر وہ جاگ جاتی تھی۔ اس رات خیالوں کی سیج پہ وہ کسی کی نرم گرم صحبت میں گم رہی تھی اس لیے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے ماں نے کئی بار آوازیں دی تھیں تب جا کر وہ بیدار ہوئی تھی۔ اس کا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ آئینے میں دیکھا تو آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کو ان سرخ آنکھوں کی گہرائی میں کسی کی شوخ نظروں کا عکس محسوس کیا۔ دوسرے لمحے ایک حیا آلود مسکراہٹ کے ساتھ اپنی نظریں جھکا لیں۔ ٹھنڈے پانی سے خوب چہرے اور آنکھوں کو دھولیا۔ پہاڑوں پر سے دھوپ نیچے اتر آئی تھی۔ وہ ہاتھ منہ دھو کے باورچی خانے میں آئی۔ ماں مہمانوں کے لیے ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

وہ بظاہر ماں کے ساتھ ناشتے کی چیزیں تیار کر رہی تھی مگر دل ہی دل میں سلمان سے ملنے کا حوصلہ پیدا کر رہی تھی۔ اس سے ملنے کی سرخوشی بھی تھی، پُرہول وسوسوں کی سرگوشی بھی تھی۔

ناشتا تیار ہو گیا تو چھوٹا بھائی جا کر چچا فقیر اللہ کو بلا لایا۔ حنا نے پہلے کی طرح صاف چادر میں ناشتے کا خوان باندھا۔ چچا فقیر اللہ ناشتا لے جانے لگا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”چچا! مہمان کب تک رہے گا؟“

اس نے کہا۔ ”آج یہاں سے جا رہا ہے۔ ایک دن جنگلات کے دفتر میں ٹھہرے گا۔ اگلے دن شہر واپسی ہے۔“

”یہاں سے کیوں جا رہے ہیں وہ؟ کیا ہماری خدمت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا

”ارے نہیں حنا بیٹی! سلمان صاحب تو بہت خوش ہوتے ہیں یہاں۔ اصل میں نمبردار صاحب کے نہ ہونے سے وہ بے آرامی محسوس کر رہے تھے۔“

حنا کے دل میں احتجاجی صدا بلند ہوئی۔ ”ایک تو ابا گلگت جا کر واپس آنا بھول گئے ہیں۔ اب دیکھیں نا تین دن کا بتایا تھا ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ پتا نہیں گلگت میں اتنے دن کیا کر رہے ہیں۔ چچا! آپ ایک کام کریں نا۔ فاریسٹ کے دفتر سے ابا کو فون کر کے پتا کریں کب تک واپس آ رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”حنا بیٹی! میں نے رات کو ہی سلمان صاحب کے کہنے پر گلگت فون کیا تھا۔ نمبردار صاحب کے پاس تو موبائل موجود نہیں۔ تمہارے چچا کفایت سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ ابھی چند ٹیسٹ باقی ہیں۔ دو ایک دن مزید لگیں گے۔“

وہ مایوس ہو گئی۔ اس کی امی تشویش سے بولی۔ ”بھائی فقیر اللہ! حنا کے ابا خیریت سے ہیں نا۔ کس طرح کے ٹیسٹ کی بات کر رہا تھا کفایت؟“

”میں نے پوچھا تھا۔ کفایت نے بتایا کہ تشویش کی بات نہیں۔ بس ڈاکٹروں نے خون کے کچھ ٹیسٹ کا بتایا ہے۔ میں نے نمبردار صاحب سے بات کرنا چاہا لیکن کفایت نے کہا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے بات نہیں کر سکا ان سے۔“

چچا فقیر اللہ ناشتا لے کر چلا گیا۔ حنا دھک دھک کرتے دل کے ساتھ گھڑیاں گننے لگی۔ چھوٹا بھائی اسکول چلا گیا۔ ماں کے پاس کرنے کے لیے گھر کے کام بہت پڑے تھے۔ وہ ان میں مصروف ہو گئی۔

مقررہ وقت قریب آیا تو حنا چھت پر آئی۔ مہمان خانے کی طرف بنی چھوٹی سی دیوار کی اوٹ سے اس طرف دیکھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اسے چچا فقیر اللہ اور وہ دوسرا شخص نظر آئے۔ وہ دونوں مہمان خانے کے دروازے سے نکل کر اس راستے پہ جا رہے تھے جو فاریسٹ کے دفتر کی طرف جاتا تھا۔ حنا نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان دونوں کا کچھ دور تک نظروں سے تعاقب کیا پھر پلٹ کر تیز تیز چلتی چھت سے نیچے اتر آئی۔ اب ماں کی نظریں بچا کے مہمان خانے کی طرف جانے کی کوئی تدبیر کرنی تھی۔

☆☆☆

جمشید خان کی تدبیر کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وہ کفایت کے ذریعے نمبردار عنایت کو شہر بلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے کفایت کے ساتھ مل کر اپنے ایک جان پہچان والے ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ اصل بات چھپا کے اس ڈاکٹر سے استدعا کی کہ نمبردار چچا کے کچھ ایسے ٹیسٹ تجویز کرے جس کے لیے ہفتہ دس دن سے زیادہ لگیں۔ اس نے ڈاکٹر سے بہانہ کیا کہ تھلکون میں نمبردار چچا کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں ان کی موجودگی کی صورت میں جھگڑا بڑھنے کا اندیشہ ہے

اس لیے میڈیکل ٹیسٹ کے بہانے چند دن انہیں روکے رکھنا ہے۔

ڈاکٹر کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اسے معلوم تھا ان علاقوں میں اکثر مار دھاڑ اور سر پھٹول کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی تو ایک معمولی واقعہ بھی کسی کی موت پر منتج ہوتا تھا اس لیے ڈاکٹر نے ان کی خواہش کے مطابق نمبر دار عنایت کے لیے متعدد ٹیسٹ لکھ کر دے دیے۔ عنایت خان نے بہت احتجاج کیا۔ چھوٹے بھائی کفایت اور جمشید سے بہت تو تکار کی۔ وہ بالکل صحت مند تھا۔ یہ بات ماننے کو قطعاً تیار نہیں تھا کہ اسے کوئی پیچیدہ بیماری ہے جس کے لیے اتنے دنوں تک ڈاکٹروں کی نگرانی میں رہنا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا بیمار وہ نہیں، اس کا ہونے والا داماد تھا۔ لالچ اور حرص کا بیمار......

نمبر دار چچا کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے چند دن وہ اس کے ساتھ ہی رہا۔ کئی دفعہ اسپتال اور کلینک اس کے ساتھ چلا گیا۔ پھر ایک دن دوسرے شہر میں ضروری کام کا بہانہ بنا کے وہاں سے کھسک گیا اور سیدھا تھلچون کے جنگلات میں پہنچ گیا۔ وہاں اس کے کارندے چوری چھپے درختوں کی کٹائی میں مصروف تھے۔ اس کام کے لیے پہلے ان کے پاس بڑی کلہاڑیاں، ہاتھ سے چلانے والی آریاں ہوتی تھیں۔ اس بار ملک امین شیر کی طرف سے مشینی آریوں کا تحفہ ملا تھا۔ ایندھن سے چلنے والی یہ آریاں کارگر اور موثر تھیں۔ بہت تیزی سے کام کرتی تھیں۔

جمشید کا تھلچون کے جنگل میں دوسرا دن تھا جب علاقے کا فاریسٹ گارڈ اس کے پاس آگیا۔ اس فاریسٹ گارڈ سمیت کئی اور لوگ جمشید کے قابو میں تھے۔ انہیں ہمیشہ حصہ مل جاتا تھا اس لیے فرض شناسی بھول کے حرام مال سے شکم پروری کرتے تھے۔

اس فاریسٹ گارڈ نے یہ تشویش ناک خبر سنائی کہ فاریسٹ افسر سلمان احمد چلاس مرکزی دفتر سے تھلچون کے لیے روانہ ہوا ہے۔ شام تک وہ پہنچ جائے گا۔

جمشید نے حیرت سے پوچھا۔ ''ابھی ایک مہینہ پہلے ہی تو اس نے دورہ کیا تھا۔ اب پھر آنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ کیا ہماری سرگرمیوں کی اُسے خبر ہوئی ہے؟''

فاریسٹ گارڈ نے کہا۔ ''میں بھی حیران ہوں۔ اتنی جلدی ان کے آنے کی توقع بالکل نہیں تھی۔ میں نے تو سنا تھا ان کی ٹانگ کا زخم بھی اچھی طرح بھرا نہیں ہے۔''

جمشید کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس فاریسٹ افسر کے آنے کی خبر تمہیں کس نے دی ہے؟''

''چلاس آفس میں میرا خاص بندہ ہے۔ آج صبح اُس نے تھلچون کے دفتر میں فون کر کے اطلاع دی تھی۔ اس کے مطابق یہ دورہ پہلے سے شیڈول میں شامل نہیں تھا۔ فاریسٹ افسر نے بس اچانک اِدھر آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیوں آرہا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔''

جمشید اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھلچون میں صرف تم سرکاری بندے ہو۔ اگر تم نے مخبری نہیں کی ہے تو ظاہر ہے مقامی تنظیم کے کسی ممبر نے نمک حرامی کی ہوگی۔ وہ جو بھی ہے مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔''

فاریسٹ گارڈ بولا۔ ''مقامی تنظیم کے چار افراد ہیں۔ ان کے اوپر آپ کے چچا نمبر دار چیئرمین ہیں۔ اگر فارسٹ افسر کا دورہ آپ کی سرگرمیوں کے خلاف چھاپا ہے تو لازم ہے ان چاروں میں سے کسی نے آگے خبر دی ہوگی۔ مخبری جس نے بھی کی ہے وہ سامنے آئے گا۔ اب اصل بات آپ نے خود کو بچانا ہے۔ جو لکڑی کاٹی گئی ہے اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ ورنہ آپ کے ساتھ میں بھی پھنس جاؤں گا۔''

جمشید ناگواری سے بولا۔ ''تم فکر مت کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ فاریسٹ افسر آج شام تک تھلچون پہنچ جائے گا۔ رات وہاں گزار کے کل شام کو یہاں جنگل کے اس حصے میں پہنچ سکتا ہے۔ تب تک ہم سارا کٹا ہوا مال نالے کے ذریعے نیچے پہنچا دیں گے۔ ایک بات یاد رکھو، تم بھی تنظیم کے اُن چاروں مقامی افراد سمیت مشکوک بن گئے ہو۔ اگر مجھے پتا چلا کہ اس کے پیچھے تمہارا یا مقامی افراد میں سے کسی کا ہاتھ ہے تو سارا کھلایا پلایا باہر نکال دوں گا۔''

جمشید نے اپنے کارندوں کو مخصوص ہدایات دیں۔ ایسی صورتِ حال اس کے لیے انہونی نہیں تھی۔ پہلے بھی کئی بار اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جانتا تھا ایسے موقع پر اس نے کیا کرنا ہے۔ پھر اپنے قریبی ساتھی جمدر خان کو تھلچون جانے کی ہدایت کی۔ اسے سمجھایا کہ وہاں جا کے فاریسٹ افسر کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔

جنگل کا وہ حصہ جہاں دیودار کے قیمتی درخت پائے جاتے تھے، اس کے قریب ہی ایک پہاڑی نالا تھا۔ نالے کا پانی بلند پہاڑوں کے اندر موجود جھیلوں میں سے بہتا ہوا نشیب میں بہت دور دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا تھا۔ غیر قانونی لکڑی کاٹنے والوں کے لیے نالے کا پانی لکڑی کی ترسیل کا اہم ذریعہ تھا۔ جنگل میں درخت گرا کر اسے مخصوص سائز کے ٹکڑوں میں کاٹ دیتے تھے۔ اس کے بعد ان ٹکڑوں کو گھسیٹ کر نالے تک لاتے تھے۔ پھر ان بڑے ٹکڑوں کو اوپر سے
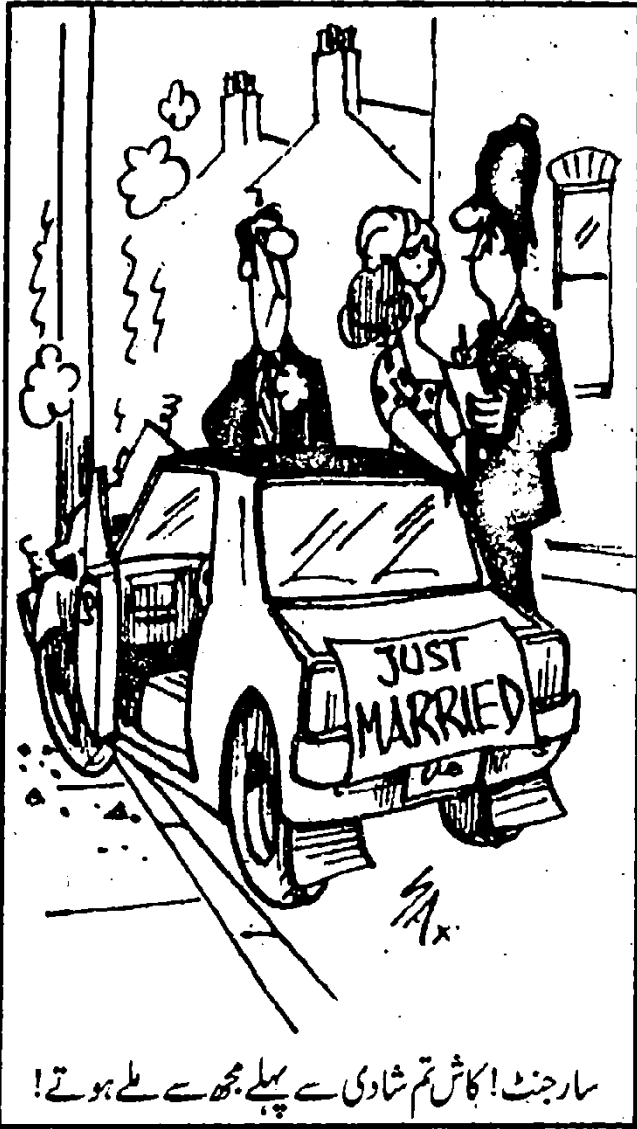
لڑھکا دیتے تھے۔ یہ گول گول موٹے ٹکڑے لڑھکتے ہوئے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے نالے کے پانی میں پہنچ جاتے تھے۔ نالے کا تیز پانی انہیں بہا کر بہت دور لے جاتا تھا۔ ایک مخصوص جگہ ان کے کارندے رسی اور لمبے لمبے ڈنڈے لیے انتظار کرتے تھے۔ جب لکڑی کے گول ٹکڑے اس مخصوص جگہ پہنچ جاتے، انہیں رسی اور لمبے ڈنڈوں کی مدد سے گھسیٹ کر کنارے تک لاتے تھے۔ وہاں سے خاص قسم کی جیپوں اور ٹریکٹر کے ذریعے آگے محفوظ ٹھکانوں تک لے جاتے تھے۔

جمشید نے بھی اپنے کارندوں کو کٹی ہوئی لکڑیاں نالے کے ذریعے ٹھکانے لگانے کی ہدایات دی تھیں۔ وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ پچھلی بار کے حادثے کے بعد اس کی پوزیشن کمزور ہو گئی تھی۔ فاریسٹ افسر نے خصوصی طور پر اسے اس شرط پر معاف کیا تھا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اسی پریشانی کی وجہ سے وہ بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ آنے والی شام سے پہلے ساری کٹی ہوئی لکڑیاں کہیں غائب کر دے۔ وہ دل ہی دل میں اس شخص کو بھی گالیاں دے رہا تھا۔ اسے بدترین سبق سکھانے کی قسمیں کھا رہا تھا جس نے فاریسٹ افسر کو شکایت کی تھی۔

اب یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ سلمان احمد کسی کی شکایت پر، اس کی سرگرمیوں کے خلاف چھاپا مارنے نہیں آ رہا تھا بلکہ دلِ مضطرب کو سکون پہنچانے کے لیے سب سے چھپ کر آ رہا تھا۔ حلیچون کی اس معصوم سی، من موہنی سی لڑکی کی محبت کی طاقت تھی جس نے ادھر آنے پر مجبور کیا تھا۔ جسمانی زخم بھلا کے، دل میں اٹھنے والے میٹھے میٹھے درد کی تسکین کے لیے کھنچا چلا آیا تھا۔

☆☆☆

حنا کا اضطراب آسمان کو چھو رہا تھا۔ رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ فاریسٹ افسر سلمان احمد اس کے لیے بہت دور کا سفر کر کے آیا تھا۔ مہمان خانے میں اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل ایک فخر آمیز احساس سے سرشار تھا۔ سلمان احمد کو دیکھ کر، اس سے مل کر محبت کا جو گداز جذبہ دل میں پیدا ہوا تھا، اس کی کشش سے سلمان سب کچھ چھوڑ کے اس کے پاس آیا تھا۔

اب اسے اپنے ہی گھر کے مہمان خانے تک جانا تھا۔ اول تو فقیر اللہ چچا کے علاوہ کوئی اور کم ہی اس طرف آتا تھا۔ اگر کوئی آیا بھی تو اس کے پاس کئی بہانے ہیں۔ اس نے سنا تھا جمشید بھی کئی دنوں سے شہر گیا ہوا تھا۔ ابا بھی موجود نہیں تھے۔

سارجنٹ! کاش تم شادی سے پہلے مجھ سے ملے ہوتے!

وہ یہ سب سوچتی، دھڑکتے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ مہمان خانے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ اس نے تھوڑا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سامنے ہی مہمان خانے کے صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ نانگا پربت کی برف پوش چوٹیوں سے اترتی، صبح کی دھوپ چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں ٹھنڈک بھی تھی، نرم گرم حدت بھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر سلمان نے چونک کر اُس طرف دیکھا تھا۔ حنا پر نظر پڑی تو اس کی آنکھوں میں مسرت اور محبت کے کئی سورج روشن ہو گئے۔

حنا اک ذرا ہچکچاتی ہوئی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھی۔

سلمان احمد وارفتگی کے عالم میں مسکراتا ہوا کرسی سے اٹھا۔ محبت کے پورے جذبوں سے گندھی آواز میں بولا۔

”حنا! تم آ گئیں۔ مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔“

اس نے سادگی سے پوچھا۔ ”آپ کو یقین کیوں تھا سر،

کہ میں آؤں گی ؟''

وہ اس بے ساختہ سوال پر ایک لمحے کو گڑبڑا گیا پھر دھیرے سے بولا۔ ''جس یقین کی بنیاد پر میں شہر سے یہاں آیا ہوں جس یقین سے رات تمہیں پیغام لکھا تھا۔ اسی یقین سے اب تمہارے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پتا ہے ایسا یقین کب پیدا ہوتا ہے؟''

حنا کی آنکھوں میں حیا کی لہریں متلاطم ہوئیں۔ پلکیں بوجھ سے جھک گئیں۔

وہ بولا۔ ''ایسا یقین تبھی پیدا ہوتا ہے جب دو دل ساتھ ساتھ دھڑک اٹھیں۔ یہ آنکھیں ایک جیسے خواب دیکھنے لگیں۔''

حنا اس سے پہلے کبھی کسی غیر مرد کے پاس تنہائی میں نہیں گئی تھی نہ ہی کسی نے اس سے ایسی میٹھی میٹھی گفتگو کی تھی۔ وہ شرم اور گھبراہٹ سے ہلکے ہلکے کانپنے لگی تھی۔

سلمان اس کی کیفیت کا لطف لیتے ہوئے بولا۔ ''حنا! تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ آؤ یہاں کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ مت ڈرو۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔''

وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''نن... نہیں تو سر! میں ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھ جائیں۔''

سلمان اسے ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔ ''اے لڑکی! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا مجھے سر مت کہا کرو۔ میرا نام سلمان احمد ہے۔ تمہاری زبان سے اپنا نام سننے کو ترس گیا ہوں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''مس۔ سر...... سوری، سلمان صاحب! میں زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتی۔ کسی نے دیکھا تو آپ کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔ مجھے بھی نہیں بخشیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں حنا! یہاں اس بات کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ بس میرے دل نے شدت سے چاہا تھا تم سے ایک بار ملوں۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے میری خواہش رد نہیں کی۔''

وہ بولی۔ ''چچا فقیر اللہ بتا رہے تھے آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔ کیا تھلچون سے بھی واپس جا رہے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''میرا دل بالکل نہیں مانتا کہ تمہارے قریب سے دور ہو جاؤں۔ مگر نمبردار صاحب کے نہ ہونے کی وجہ سے مناسب نہیں لگتا کہ زیادہ دن یہاں ٹھہروں۔ آگے جنگل کے قریب فاریسٹ آفس ہے۔ وہاں ایک دن مزید رہ کر کل واپس چلا جاؤں گا۔''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''آپ کو جمشید کے حوالے سے مزید کوئی شکایت نہیں ملی ہے نا۔ ویسے بھی وہ کافی دنوں سے شہر میں ہے۔ ابا کے ساتھ وہ بھی میرے چھوٹے چچا کے پاس گیا ہوا ہے۔''

سلمان احمد ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ جمشید میرا رقیب بھی ہے، پیشہ ورانہ حریف بھی۔ فی الحال تو اس کی طرف سے کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی ہے۔ میں کشمکش میں ہوں آئندہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کروں۔ اس نے کوئی جرم کیا تو تمہاری وجہ سے معاف کروں یا رقابت کے جذبے سے کوئی سخت قدم.... اٹھاؤں۔ ویسے تم کس بات کی سفارش کرو گی؟''

وہ سٹپٹا کر بولی۔ ''مجھے ایسی باتوں کی سمجھ نہیں سلمان صاحب! آپ کا قانون جو کہتا ہے، اس پر عمل کریں۔ ویسے بھی ابھی اس نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔''

''میں اس جیسی فطرت کے لوگوں کو جانتا ہوں۔ بہت سابقہ پڑا ہے ایسے لوگوں سے مجھے۔ وہ بہ ظاہر وقتی طور پر خاموش ہوگا۔ دکھانے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھ لیا ہوگا مگر جلد ہی اس خول سے باہر نکلے گا۔ خیر، میرا یہ اندازہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ تم ایک بات بتاؤ نا۔ جمشید سے جلد ہی تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ کیا تم خوش ہو؟''

وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ''سلمان صاحب! آپ جانتے ہیں ان علاقوں میں لڑکی کی خوشی نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اکثر بچپن میں بات پکی کر دی جاتی ہے۔ پھر زندگی بھر کے لیے یہ زنجیریں پیروں میں باندھ دی جاتی ہیں۔ لڑکیوں کی مجال نہیں ہوتی ہے کہ بغاوت کریں۔''

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''دیکھو حنا! اب وقت بدل رہا ہے۔ رویے بھی بدل رہے ہیں۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں اک ذرا ہمت دکھانی ہوگی۔ اگر تم میں بغاوت کا حوصلہ ہے تو میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔ میں تمہیں یہاں سے بہت دور لے جاؤں گا۔''

وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ ''سلمان صاحب! آپ کے دل میں میرے لیے جو جذبہ ہے، میں اس سے واقف ہوں۔ میں آپ کی بات مان کے آگئی ہوں اس سے آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے دل میں آپ کے لیے کیسے جذبات ہیں۔ مگر اس سے آگے ایک قدم بھی اٹھانا ممکن نہیں۔ یہ ایسے بے رحم لوگ ہیں دنیا کے آخری کونے تک ہمارا پیچھا کریں گے۔ کسی کو قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا اوپر جنگل میں کسی جانور کا شکار کرنا۔ پھر غیرت کے نام پر تو خون بہا کر فخر سے سینہ تان کر یوں پھرتے ہیں جیسے کافروں سے جہاد کر کے آئے ہوں۔ نہیں نہیں سلمان صاحب! بس آپ کے لیے اس

دل میں محبت کے کچھ اچھے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ سے ملنے آئی ہوں۔ اب آگے جو آپ کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کھلونوں کی گلیوں میں سب کے سامنے آپ کا ہاتھ تھام کے چلنا۔ اس لیے ہمارے اس تعلق کو بس اس حد تک ہی رہنے دیں۔ آج کے بعد آپ سے پھر ملاقات ہوگی یا نہیں، میں نہیں جانتی۔ چند مہینے بعد میری شادی ہوگی۔ اس کے بعد مہمان خانہ بھی میرے لیے اجنبی بن جائے گا۔ اس لیے آج کی اس ملاقات کو آخری سمجھ لیں۔ میں آپ کو بہت دیر تک یاد رکھوں گی۔ اب مجھے اجازت دیں۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ کر بیرونی دروازے کی طرف چلنے لگی۔ سلمان احمد پیچھے سے اسے آوازیں دیتا، کچھ دیر اور رکنے کی درخواست کرتا رہ گیا مگر وہ تیز تیز چلتی دروازے تک آگئی۔ وہاں سے پلٹ کر گہری سلگتی ہوئی نظروں سے سلمان احمد کی طرف دیکھا پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

یکا یک اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں اٹک گیا۔ پورے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹی نہر تھی۔ اس پہ پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا چچا فقیر اللہ اس پگ ڈنڈی پر چلتا مہمان خانے کی طرف آرہا تھا۔ وہ تقریباً بیس گز دور تھا۔ اس کی نظر بھی حنا پر پڑی تھی۔ وہ چونکتی ہوئی، ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی، غصہ بھی تھا۔

حنا اسے دیکھ کر ایک لمحے کو بدحواس سی ہوگئی تھی۔ دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھالا۔ وہاں رک کر اس کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے تیز قدموں سے چلتی گھر کی طرف آنے لگی جو کہ ایک کھیت کی دوری پہ تھا۔ اپنے گھر کے دروازے کے پاس آکے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اسی کی طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے مہمان خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اسی وقت حنا کی نظر دوسری طرف گئی۔ اس کا دل ایک اور خوف کے گھیرے میں آگیا۔ مہمان خانے کے دوسری سمت اسے جمدر خان دکھائی دیا تھا۔ یہ جمشید کا خالہ زاد بھائی تھا۔ اس کے ساتھ لکڑیوں کی اسمگلنگ کا کام کرتا تھا۔ جمدر بھی اسے دیکھتا ہوا قریب آرہا تھا۔

حنا دل میں کئی اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوگئی۔

☆☆☆

مادو پور پولیس اسٹیشن تلاش کرنے میں اسے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ چھوٹی سی پُرامن وادی کا یہ پولیس اسٹیشن تین کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کا ایس ایچ او ایک جوان سب انسپکٹر تھا۔ اپنی گفتگو اور رویّے سے بڑا سلجھا ہوا انسان لگتا تھا۔ سلمان احمد نے اپنا تعارف کروا کے مختصراً وائلڈ لائف پارک سے واپسی پر دشمنوں کے حملے کا ذکر کیا۔

سب انسپکٹر فیاض علی توجہ سے اس کی بات سنتا رہا۔ اپنے سامنے موجود لیٹر پیڈ پر کچھ نوٹس لکھتا رہا۔ بیچ بیچ میں اس سے پوچھتا بھی رہا۔

اپنی بات ختم کر کے اس نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں پچھلے ایک سال سے کچھ لوگوں کی دشمنی کا نشانہ بن رہا ہوں۔ اس میں میری بیوی کے کچھ رشتے دار بھی ہیں۔ ٹمبر مافیا کے کچھ عناصر بھی ہیں۔ مجھے زیادہ شک ان رشتے داروں پر ہے۔ ان میں سے ایک شخص کو کل ہم نے مادو پور میں دیکھا تھا۔ اس کا نام جمدر خان ہے۔ آپ اس کے خلاف ایف آئی آر درج کریں۔“

سب انسپکٹر فیاض علی بولا۔ ”ہم آپ کی درخواست کے مطابق ایف آئی آر درج کریں گے۔ اس سے پہلے میں اسپتال کا دورہ کروں گا۔ جو دشمن زخمی حالت میں ہے، اسے اپنی کسٹڈی میں لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد کارروائی کا آغاز کریں گے۔“

اس نے پریشانی سے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میری بیوی فاریسٹ ہاؤس میں اکیلی ہے۔ میرے ساتھ اس نے بھی ایک سال تک دشمنوں کا سامنا کیا ہے۔ مجھے دو گھنٹے پہلے اس کے پاس پہنچنا تھا۔ اس وقت وہ میرے لیے، بہت پریشان ہو گی۔ آپ پلیز مجھے ایک دو گھنٹے کی مہلت دے دیں۔ میں اسے تسلی دلاسا دے کر واپس تھانے آؤں گا۔ آپ کے ساتھ پورا پورا تعاون کروں گا۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”مجھے آپ پر بھروسا ہے سلمان صاحب! لیکن درپیش صورت حال میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کے ساتھ پولیس جائے گی۔ آپ اپنی وائف سے مل کر تھانے پہنچ جائیں۔ میں تب تک اسپتال سے ہو کر آتا ہوں۔“

سب انسپکٹر فیاض علی نے اپنے ایک حوالدار اور دو سپاہیوں کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔ سلمان احمد راستے بھر، اپنے ساتھ ہونے والے واقعے سے زیادہ حنا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ مقررہ وقت سے بہت تاخیر سے واپس جا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا حنا اس وقت بہت پریشان ہوگی۔ پھر جب اسے معلوم ہوگا کہ دشمنوں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا تو اس کی جان ہی نکل جائے گی۔

گیسٹ ہاؤس زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ بیس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ فاریسٹ کا یہ گیسٹ ہاؤس ایک بلند ٹیلے پر تھا۔ مرکزی سڑک سے ایک ذیلی راستے کے ذریعے اس تک جانا پڑتا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے دو طرف گہری کھائیاں تھیں۔ سامنے وہ کچا راستہ تھا جو مرکزی سڑک سے اس جانب آتا تھا۔ صرف ایک سمت میں ذرا فاصلے پہ چند مکان بنے ہوئے تھے۔

گیسٹ ہاؤس کے مرکزی دروازے کو کھلا دیکھ کر.....

سلمان احمد کی چھٹی حس نے کسی غیر معمولی واقعے کی گھنٹی بجا دی۔ اس کے کہنے پر ڈرائیور نے زور زور سے ہارن بجایا لیکن گیسٹ ہاؤس کا خانساماں جو کہ چوکیداری کا کام بھی کرتا تھا، وہ باہر نہیں آیا۔ وہ پولیس موبائل وین سے اتر کر تیز تیز چلتا اندر داخل ہوا۔ وسیع صحن سے گزر کر برآمدے میں آیا۔ حنا یا خانساماں دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت تک سامنے نہیں آیا تھا۔ سلمان احمد، حنا کا نام لے کر پکارتا ہوا خواب گاہ کے دروازے کے پاس آیا۔ ہاتھ سے ذرا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے دیکھا خواب گاہ میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بلند آواز میں حنا کا نام لے کر پکارا۔ مگر جواب ندارد۔ واش روم کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اسے کھول کر اندر جھانک کر دیکھا واش روم خالی تھا۔ وہ شدید پریشانی کے عالم میں خواب گاہ سے باہر آیا۔ دوڑنے کے انداز میں کچن کی طرف آیا۔ کچن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ شدید گھبراہٹ اور پریشانی سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

خانساماں کچن میں ایک طرف آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ سلمان نے تیزی سے اس کے پاس جا کے اسے سیدھا کیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا جس نے پورے چہرے کو لہولہان کر دیا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔

سلمان فوراً باہر آیا۔ پولیس کے جوان پورچ میں کھڑے تھے۔ اس نے چیخ کر انہیں آواز دی۔ وہ دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ اس نے بتایا کہ یہ گیسٹ ہاؤس کا خانساماں ہے۔ اس کی بیوی کہیں نظر نہیں آرہی ہے۔ پولیس کے جوان پورے گیسٹ ہاؤس میں حنا کو تلاش کرنے لگے۔ گیسٹ ہاؤس اتنا بڑا بھی نہیں تھا۔ تین ہی کمرے تھے۔ جہاں حنا کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔

اس دوران گھبراہٹ اور پریشانی کے باوجود سلمان احمد خانساماں کو ہوش میں لانے کے جتن کر رہا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ کا نشان تھا۔ ایسا لگتا تھا کسی نے ڈنڈے سے اس پر وار کیا تھا۔ جس کی ضرب سے اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

کچھ دیر میں اس کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ خانساماں آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگا۔ اس وقت تک پولیس والے بھی حنا کی ناکام تلاش کے بعد واپس آگئے تھے۔

سلمان نے اسے ہوش میں آتا دیکھ کر بے تابی سے کہا۔ ”چچا! حنا کدھر ہے؟ تمہارے ساتھ کس نے ایسا کیا ہے؟“

اس نے بہ مشکل کہا۔ ”مم۔۔۔ میں نہیں جانتا وہ کون تھے۔ دو آدمی تھے، ان کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ میں کچن میں کھانا بنا رہا تھا۔ وہ اچانک ہی کچن میں داخل ہوئے تھے۔ میرے کچھ کرنے سے پہلے پستول کے دستے سے میرے سر پر بہت زور سے مارا تھا۔ چوٹ کھا کے میں گر گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں۔“

”وہ اندر کیسے آگئے؟ کیا گیٹ بند نہیں کیا تھا؟“

”گیٹ بند تھا سر۔ شاید وہ دیوار پھلانگ کر آئے تھے۔ مم..... مجھے بیگم صاحبہ کا کچھ پتا نہیں۔ کیا وہ موجود نہیں؟“

سلمان کا دل جیسے صدمے سے پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ ایک ہی وقت میں دشمنوں نے اس پر حملہ بھی کیا تھا، گیسٹ ہاؤس میں آ کے حنا کو بھی اغوا کر لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس کے دشمن بڑی تعداد میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے مادو پور تک آگئے تھے۔ موقع دیکھ کر انہوں نے دو مختلف جگہوں پر اپنا داؤ کھیلا تھا۔

پولیس حوالدار نے فوراً واکی ٹاکی کے ذریعے سب انسپکٹر فیاض علی سے رابطہ کیا۔ یہاں حادثے کے بارے میں بتا دیا۔ پھر اس کی ہدایات سننے کے بعد سلمان سے کہا۔ ”سر! آپ تحمل سے کام لیں۔ انسپکٹر صاحب جلد یہاں آنے والے ہیں۔ مادو پور ایسا علاقہ نہیں ہے کہ مجرم واردات کے بعد بچ کر جا سکیں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ ان شاء اللہ دشمن جلد پکڑے جائیں گے۔“

☆☆☆

جمشید کو فاریسٹ گارڈ نے جب بتایا کہ سلمان بغیر اطلاع دیے کھلچون کے دورے پر آیا ہے تو وہ شدید اندیشوں میں گھر گیا تھا۔ اس نے فوراً درختوں کی کٹائی کا کام روک کر جو لکڑی کٹی حالت میں تھی، اسے ٹھکانے لگانے کی ہدایت کی تھی۔ اس کے علاوہ اپنے خاص ساتھی جمدر خان کو کھلچون بھیج دیا تھا۔ اسے سمجھایا تھا کہ فاریسٹ افسر کی نگرانی کر کے اس کی

سرگرمیوں سے اسے آگاہ کرتا رہے۔

جمدر خان بہت ہوشیار اور موقع شناس بندہ تھا۔ کچھ تو جمشید کی صحبت سے اس نے سیکھا تھا، کچھ وہ خود ہی بڑا چال باز تھا۔ وہ ایسے مزاج کے لوگوں میں شمار ہوتا تھا جن کا دین و ایمان محض پیسہ ہوتا ہے۔

جمدر اوپر جنگل سے بستی میں آیا تو رات ہوگئی تھی۔ اسی شام فاریسٹ افسر سلمان احمد بھی ٹھلکوٹ پہنچ گیا تھا۔ جمدر نے رات کو ہی معلوم کرلیا تھا کہ فاریسٹ افسر نمبردار صاحب کے مہمان خانے میں ٹھہرا ہے۔ جمشید کی ہدایت کے مطابق اس کی کوشش تھی کہ وہ فاریسٹ افسر کو اپنی نظروں میں رکھے۔ اس کی سرگرمیوں سے واقف رہے۔ بہت سوچنے کے بعد اس کی نظرِ انتخاب فقیر اللہ پر جا کر ٹھہر گئی۔ وہ مہمان خانے کا پرانا خدمت گار تھا۔ جمدر کے ساتھ بھی اس کی خوب یاد اللہ تھی۔ اس نے سوچا فقیر اللہ کے ذریعے ہی وہ فاریسٹ افسر کی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔

صبح ہوتے ہی وہ مہمان خانے سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہ فقیر اللہ کا مہمان خانے سے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا فقیر اللہ باہر نکل کر نمبردار صاحب کے گھر میں گیا۔ ذرا دیر بعد ناشتے کا سامان لے کر دوبارہ مہمان خانے میں آگیا۔ جمدر اسی جگہ بیٹھ کر کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ بڑی دیر بعد وہ ایک اجنبی شخص کے ساتھ باہر آیا۔ پھر وہ دونوں ایک طرف چلنے لگے۔ جمدر اس سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اس دوسرے شخص کی وجہ سے اس کی حکمتِ عملی میں خلل پیدا ہوگیا تھا۔ وہ دوسرا شخص سلمان احمد کا معاون تھا۔ اس وقت وہ دونوں فاریسٹ کے دفتر جارہے تھے۔

جمدر ابھی سوچ رہا تھا کہ اُن کے پیچھے جائے یا پھر اسی جگہ بیٹھ کر واپسی کا انتظار کرے، اسی وقت وہ چونک گیا۔ نمبر دار عنایت کے گھر سے اس کی بیٹی حنا نکل کر، بہت محتاط انداز میں چلتی، سہمی سہمی نظروں سے یہاں وہاں دیکھتی مہمان خانے کی طرف جارہی تھی۔ اس نے دیکھا حنا مہمان خانے کے دروازے سے جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر اندر جا کے بہت وقت گزرا۔ وہ باہر نہ نکلی۔

جمدر کے دل و دماغ میں ہر وقت فتنہ و فتور بھرا رہتا تھا۔ اس جیسی فطرت کے بندے کبھی مثبت انداز میں سوچتے ہی نہیں۔ وہ بھی حنا کے بارے میں زہریلی باتیں سوچنے لگا۔ حنا جس طرح مشکوک انداز میں چلتی ہوئی مہمان خانے میں داخل ہوئی تھی یہی بات اسے کھٹک رہی تھی۔ پھر جب بہت دیر تک وہ باہر نہ نکلی تو اس کے فتنہ ساز دماغ میں شک کے کیڑے کلبلانے لگے۔

جمشید اس کا دوست بھی تھا، خالہ زاد بھائی بھی تھا۔ اس حوالے سے حنا ان کی غیرت تھی۔ اب یہی غیرت کسی غیر کی تنہائی میں بڑی دیر سے موجود تھی۔ یہ ایسی بات تھی جمدر جیسے شقی القلب آدمی کے لیے سنسنی خیزی اور فتنہ پردازی کا بہت سا سامان اس میں موجود تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے دور سے فقیر اللہ کو مہمان خانے کی طرف آتے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا۔ جمدر اپنی جگہ سے اٹھا۔ تیز تیز چلتا اس طرف جانے لگا۔ چند قدم چلا تھا اس نے دیکھا حنا بھی مہمان خانے سے باہر نکل رہی تھی۔ فقیر اللہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی تھی۔ پھر تیز تیز چلتی اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔

جمدر اس کی طرف دیکھتے ہوئے، بدگمانیوں کے زہریلے کانٹوں میں الجھتے ہوئے فقیر اللہ کی طرف جانے لگا۔ قریب جا کر اسے سلام کرتے ہوئے بولا۔ ”چچا فقیر اللہ! میں آپ کو تلاش کررہا تھا۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”خیر تو ہے نا جمدر بیٹا! کیا پھر کوئی مسئلہ پیدا ہوگیا ہے؟ جمشید بھی آج کل نظر نہیں آرہا ہے؟“

”خیر ہے بھی، نہیں بھی چچا! آپ کچھ وقت دیں گے تو بتادوں گا۔“

فقیر اللہ بولا۔ ”اس وقت تو بہت مصروف ہوں۔ سلمان صاحب نے کچھ فائلیں اور رجسٹر دفتر لے کر جانے کا کام بتایا تھا۔ ان کا معاون بھی ساتھ تھا۔ راستے میں جا کر پتا چلا ایک اہم فائل اِدھر رہ گئی ہے۔ ان کے معاون نے مجھے واپس بھیج دیا کہ وہ فائل لے کر آجاؤں۔ اب وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم مہمان خانے میں آکر بیٹھ جاؤ۔ میں فاریسٹ آفس سے جلدی آجاؤں گا۔“

جمدر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا فاریسٹ افسر مجھے اور جمشید کو ویسے بھی پسند نہیں کرتا ہے۔ اندر آیا تو اسے بُرا لگے گا۔ آپ وہ فائل لے کر آجائیں۔ چلتے چلتے باتیں کریں گے۔“

فقیر اللہ مہمان خانے میں داخل ہوگیا۔ جمدر پلٹ کر حنا کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے وہاں سے کچھ دور راستے پر آکے بیٹھ گیا۔ ایک بات اسے بار بار چبھ رہی تھی۔ مہمان خانے میں فاریسٹ افسر اکیلا تھا ایسے میں حنا اندر زیادہ دیر کیوں ٹھہری تھی؟ کیا اس کا فاریسٹ افسر سے کوئی چکر چل رہا ہے؟ اس کا شیطانی دماغ بڑے ہی مفسدانہ انداز میں تانے بانے ملا رہا تھا۔ پھر ان کا سرا پکڑ کر وہ بہت دور تک سوچ رہا

تھا۔ فاریسٹ افسران کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اب حنا کی صورت میں ایک ایسا مہرہ ہاتھ آیا تھا جسے ذرا حکمت اور ہوشیاری سے استعمال کر کے فاریسٹ افسر کی دہشت اور دیانت کا جنازہ نکال سکتے تھے۔ اس کے لیے جمشید کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

کچھ دیر بعد فقیر اللہ مہمان خانے سے باہر آیا۔ جمدر نے ہاتھ لہرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ قریب آیا تو دونوں نہر کے ساتھ بنی پگ ڈنڈی پر فاریسٹ آفس کی طرف چلنے لگے۔

فقیر اللہ بولا۔ ''جمدر! بتاؤ کیا کام ہے؟ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ اُدھر سے واپس آ کر سلمان صاحب کو لے کر دوبارہ جانا بھی ہے۔''

جمدر نے اک ذرا طنز سے کہا۔ ''چچا فقیر اللہ! اس فاریسٹ افسر کی بڑی خاطر داریاں ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے آپ پر بہت مہربان ہے؟''

وہ ترشی سے بولا۔ ''میں نمبر دار صاحب کے حکم کے مطابق ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے تو انہی کے آگے بولو۔ یہ بتاؤ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

جمدر کھسیانا سا ہو کر بولا۔ ''غصہ کیوں ہوتے ہو چچا! فاریسٹ افسر باہر کا بندہ ہے۔ اس کے لیے اپنی برادری کے ایک جوان سے ناراض کیوں ہوتے ہو؟''

وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''برادری کا جوان ہو تو بات بھی اچھی کرو نا۔ طعنہ کیوں دیتے ہو؟ میں ان کی خدمت پر مامور ہوں۔ وہ مجھ سے جو کام لیں گے میں پورا کروں گا۔ ایسے میں تمہارا یہ کہنا کہ کسی غرض کی وجہ سے ایسا کرتا ہوں، مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔''

جمدر خوشامدی انداز میں بولا۔ ''چھوڑو نا چچا! ذرا سی بات کو کیوں دل پر لیتے ہو۔ چلو میں معافی مانگتا ہوں۔ یہ بتاؤ فاریسٹ افسر کب تک کھلچون میں ہے؟ وہ یہاں کس مقصد سے آیا ہے؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے یہی معلوم کرنے کے لیے ملنا چاہتے تھے؟ شاید جمشید کے کہنے پر میرے پاس آئے ہو۔ لگتا ہے پھر کسی چکر میں پڑے ہو تم... دونوں ؟''

''چچا فقیر اللہ! تم جانتے ہو میں اور جمشید لکڑی کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس افسر کی وجہ سے ہمارا کام دھندا چوپٹ ہو گیا ہے۔ یہ کون ہوتا ہے ہمیں جنگل کی کٹائی سے روکنے والا؟ یہ جنگل، یہ علاقہ صدیوں سے ہماری ملکیت ہے۔ اسی جنگل کی لکڑی سے ہمارا روزگار چلتا ہے۔ کون سا ہم سارے کا سارا جنگل کاٹ کے آگے بیچ دیتے ہیں۔ ایک دو ٹرک لکڑی ہی تو ہماری ضرورت ہوتی ہے۔''

فقیر اللہ چلتے چلتے اک ذرا رک کر بولا۔ ''دیکھو جمدر! میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ فاریسٹ افسر کو جنگل کاٹنے سے روکنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ میں بس حکم کا غلام ہوں۔ نمبر دار صاحب کے کہنے پر ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ میری اپنی رائے پوچھو گے تو یہی کہوں گا اس جنگل پر ہم سب کا حق ہے۔ اپنی ضرورت کے مطابق لکڑی کاٹ کے استعمال نہیں کریں گے اور آگے نہیں بیچیں گے تو پھر گھر کیسے چلائیں گے؟ کیونکہ ہمارے پاس آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں۔''

جمدر خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں چچا! ہمارے اکثر نوجوان بے روزگار ہیں۔ چند ایک شہر جا کر نوکری کرتے ہیں۔ ایسے میں جنگل کی لکڑی ہی ہماری آمدنی کا بنیادی ذریعہ ہے مگر حکومت کا ارادہ ٹھیک نہیں۔ وہ ہمیں آمدنی کے اس ذریعے سے بھی محروم رکھ کر سارا جنگل اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہے۔ بعد میں اپنے من پسند ٹھیکیداروں کے ذریعے اس کا صفایا کرا دے گی۔ یہ فاریسٹ افسر بھی اسی مقصد کی خاطر یہاں آ کر سرکار کا ڈنڈا استعمال کر رہا ہے۔''

فقیر اللہ سادہ سا انسان تھا۔ وہ چیزوں کو گہرائی سے نہیں سمجھتا تھا۔ آس پاس کے لوگوں کی عمومی سوچ کے مطابق اپنی رائے دیتا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ جنگل کے کٹنے سے ماحول پر کس طرح کے اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اس کا ذہن بس اس بات کو سوچتا تھا یہ جنگل ہماری ملکیت ہے۔ اس پر ہمارا تصرف ہے۔ اپنی ضروریات کے مطابق اسے کاٹنے کا حق ہمیں حاصل ہے۔

نمبر دار عنایت جنگل کی کٹائی کا سخت مخالف تھا۔ مقامی کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ فقیر اللہ برسوں سے اس کی خدمت کرتا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنا ہو یا مہمانوں کی مدارات کرنا ہو، وہ حاضر رہتا تھا۔ اس کے عوض نمبر دار عنایت اسے سال بھر کے اناج کے علاوہ ضرورت کے مطابق روپیہ پیسہ بھی دیتا تھا۔

اس سب کے باوجود فقیر اللہ دل ہی دل میں نمبر دار عنایت خان کی سوچ سے اختلاف کرتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ خود بھی چھپ چھپا کے ایک آدھ درخت، دو چار مہینے بعد کاٹ کے بیچ دیتا تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے نمبر دار عنایت کے چیئرمین بننے کے بعد اس کے بھی راستے مسدود ہو گئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا تھا لیکن نمبر دار صاحب کا ایسا رعب و

اثر تھا کہ ان کی مخالفت مول لینے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔

جمدر نے کہا۔ ”چچا! ذرا سوچو، جمشید نے اسلام آباد کی ایک پارٹی سے لاکھوں روپے کی لکڑی کا سودا کیا ہے۔ وہ اپنی شادی کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔ اگر معاہدے کے مطابق اس نے مقررہ وقت پر لکڑی آگے نہیں پہنچائی تو اس کا کباڑا ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں اس کے پاس شادی کے لیے پیسے بھی نہیں بچیں گے۔ عنایت خان چچا کو اپنی اصول پسندی کے سوا کسی چیز کا احساس ہی نہیں۔ وہ اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کو بھی بھول گیا ہے۔ تم اس گھر کے نمک خوار ہو۔ اس گھر کی لڑکی کل کلاں جمشید کے پاس ہی جانے والی ہے۔ آج جنگل کے کچھ درخت کاٹ کے جمشید کو مالی فائدہ ہو رہا ہے تو نمبردار صاحب کی لڑکی کو بھی اس سے فائدہ ہونے والا ہے۔“

فقیر اللہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بات تو تمہاری درست ہے۔ یہ بتاؤ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

جمدر نے چلتے چلتے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”میں اور جمشید اوپر جنگل میں تھے۔ ہم اپنے بندوں کے ساتھ لکڑی کاٹ رہے تھے۔ ہمیں فاریسٹ افسر کے بارے میں پتا چلا تو جمشید نے مجھے یہاں بھیج دیا ہے تاکہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکوں۔ تم بس یہ معلوم کرو کہ وہ اتنی جلدی کھچون کیوں آیا ہے؟ اوپر جنگل کی طرف کب جا رہا ہے؟“

وہ تفہیمی انداز میں بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آج تو سلمان صاحب فاریسٹ کے دفتر میں جا رہے ہیں۔ وہاں جا کے ان کے ارادے کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں گا۔“

جمدر نے اچانک کہا۔ ”چچا فقیر اللہ! یہ فاریسٹ افسر مہمان خانے میں ہی ٹھہرنے کیوں آیا ہے؟ ادھر دفتر میں بھی تو اچھا خاصا انتظام ہے؟“

وہ سادگی سے بولا۔ ”ان کے نمبردار صاحب سے اچھے تعلقات ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کے کھانوں کا ایسا گرویدہ بن گیا ہے کہ مجھ سے کہہ رہا تھا فاریسٹ آفس جا کر بھی نمبر دار صاحب کے گھر کا کھانا کھاؤں گا۔“

وہ دونوں چلتے ہوئے بہت دور نکل آئے تھے۔ فاریسٹ آفس ذرا فاصلے پر نظر آنے لگا تھا۔

جمدر نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”چچا! یہ فاریسٹ افسر مجھے مشکوک سا لگتا ہے۔ نمبردار صاحب کے گھر میں جوان جہان لڑکی ہے۔ گھر اور مہمان خانے میں فاصلہ ہی کتنا ہے؟ یہ بڑے شہروں میں پڑھ کر آنے والے نوجوان افسر تانک جھانک کے بڑے عادی ہوتے ہیں۔ یہ ہماری معصوم لڑکیوں کو جلدی ورغلاتے ہیں۔ تم اس پر بھی نظر رکھتے ہونا؟“

وہ بے ساختہ بولا۔ ”میں خود بھی اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ دو تین دفعہ حنا بی بی مہمان خانے میں گئی تھی۔ میں نے دیکھ کر اسے ڈانٹ بھی دیا تھا۔“

جمدر کو موقع مل گیا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے بھی وہ مہمان خانے میں گئی تھی۔ میں سمجھا تم اندر موجود ہو گے۔ بڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو تمہیں دوسری طرف سے آتا دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ میں حنا کے کردار پر شک نہیں کر رہا ہوں مگر ان شہری ماحول میں رہنے والے نوجوان افسروں پر بھروسا بھی نہیں۔“

فقیر اللہ مرتعش لہجے میں بولا۔ ”جمدر بیٹا! تم حنا والی بات کو بھول جاؤ۔ وہ بہت نادان ہے۔ کسی کام سے گئی ہوگی۔ جمشید کو ذرا سا بھی شک ہوا تو ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ اس سے کچھ بعید بھی نہیں کہ ایک آدھ قتل کر دے گا۔ بس سلمان صاحب آج یہاں سے جا رہے ہیں۔ میں کوشش کروں گا وہ آئندہ مہمان خانے کا رخ ہی نہ کریں۔ تم اب جاؤ۔ میں ان کی نقل و حرکت سے تمہیں مسلسل باخبر رکھوں گا۔“

وہ اس سے رخصت ہو کر فاریسٹ آفس کی طرف جانے لگا۔ جمدر مکاری سے ہونٹ کاٹتا ہوا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ فقیر اللہ نے کہا تھا حنا والی بات کو بھول جاؤ مگر وہ اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنے شیطانی دماغ میں ابھرنے والے مفسدانہ خیالات کی کڑیوں کو جوڑنے لگا۔ اس کے دماغ کی اسکرین پر ایک ہنگامہ خیز ڈراما چلنے لگا۔ جس کے ہر منظر میں جبر، مکر اور خون کے دھبے نمایاں تھے۔

☆☆☆

حنا مہمان خانے سے واپس آئی تو دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایک طرف سلمان احمد سے ہوئی آخری ملاقات کے پُر ملال احساسات سے دل بوجھل تھا۔ دوسری طرف مہمان خانے سے نکلتے ہوئے فقیر اللہ چچا اور جمشید کے ساتھی جمدر نے اسے دیکھا تھا۔ فقیر اللہ سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وہ جمدر کی طرف سے بہت خوف زدہ تھی۔ وہ جانتی تھی جمدر بڑا ہی موقع پرست اور چغل خور انسان تھا۔ اگر اس نے جمشید کو بتا دیا تو وہ بہت مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔ غیرت کے نام پر یہاں لوگ تحمل اور تحقیق سے کام نہیں لیتے تھے۔ ایک شخص بھی الزام لگائے تو ہتھیاروں کی زبان میں اپنی شعلہ مزاجی کا بے خوف اظہار کر دیتے تھے۔

بہت دیر بعد چچا فقیر اللہ جھوٹے برتن لے کر آیا۔ اس

کے چہرے پر سنجیدگی اور خفگی کے اثرات صاف نظر آرہے تھے۔حنا ڈر رہی تھی وہ ماں کے سامنے کہیں اس سے باز پُرس نہ کرے لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ برتن رکھ کر اکھڑے اکھڑے لہجے میں حنا کی امی کو بتایا کہ سلمان صاحب مہمان خانے سے جانے والے ہیں۔وہ ایک دن مزید ھلچون میں رہیں گے۔ان کے لیے کھانے کا انتظام فاریسٹ کے دفتر میں ہی کیا جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد حنا کو اک ذرا اطمینان ہوا مگر جمدر کے حوالے سے اندیشہ ضرور تھا کہ وہ بات کا بتنگڑ بنائے گا۔اس نے خود کو حوصلہ دیا اگر ایسا ہوا تو وہ ڈٹ کر اپنا دفاع کرے گی۔ وہ اتنی عام لڑکی نہیں، نمبردار عنایت خان کی بیٹی ہے۔کسی بے بس لڑکی کی طرح ان مفسدوں کے ظلم کا نشانہ نہیں بنے گی۔

کچھ عرصہ پہلے تک وہ اس طرح کی بات نہیں سوچ سکتی تھی۔ جب سے سلمان کی محبت کا جذبہ دل میں پھوٹا تھا، ایک جرأت بھی، سماجی رویّوں کے خلاف ایک بغاوت بھی دل و دماغ پر دستک دینے لگی تھی۔

دوپہر کے وقت چھوٹا بھائی اسکول سے آیا۔ اسے کھانا نکال کے دیا۔تھوڑی دیر بعد جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو اسے لے کر مہمان خانے میں آئی۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔وہ سمجھ گئی سلمان احمد چلا گیا ہے۔تالے کی ایک چابی ان کے پاس بھی تھی۔اس نے چھوٹے بھائی کو واپس گھر بھیج دیا۔ وہ چابی لے کر آیا تو بجھے بجھے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ اس کا دل بہت اداس تھا۔آج صبح ہی وہ سلمان احمد سے ملی تھی۔ یہاں صحن میں رکھی کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔اس سے گفتگو کی تھی۔ ابھی اس وقت وہ موجود نہیں تھا لیکن اس کے وجود کی خوشبو یہاں رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ حنا گہری گہری سانسیں لیتی ہوئی پورے مہمان خانے میں پھرنے لگی۔ سلمان احمد نہیں تھا تو کیا ہوا، اس کے ہونے کا احساس، اس کی روشن آنکھوں کا عکس حنا کے آس پاس بکھرا ہوا تھا۔

وہ کمرے میں آئی۔ پلنگ کی چادر شکن آلود تھی۔ کمبل بے ترتیبی سے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔اس نے چادر جھاڑ کے اپنی نرم گرم ہتھیلیوں سے اس کی شکنیں دور کر کے اسے پلنگ پر بچھا دیا۔ کمبل بھی تہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔اسی وقت اس کی نظر پلنگ کے سرہانے، تکیے کے نیچے رکھے ایک کاغذ پر پڑی۔حنا کا دل دھک سے رہ گیا۔بغیر لکیروں کے سرکاری دفاتر میں عام طور پر استعمال ہونے والے ایک کاغذ کے پورے صفحے پر لکھا ہوا تھا۔اسے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ سلمان نے اس کے لیے کوئی پیغام چھوڑا تھا۔

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کاغذ اٹھا کے پڑھنا شروع کیا۔سلمان احمد نے لکھا تھا۔

’’حنا! میں تمہارے مہمان خانے سے جا رہا ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ آئندہ نہیں آؤں گا۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔ تم میرے لیے اتنی اہم بن گئی ہو کہ تمہارے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھنے لگا ہوں۔

’’ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ میرا ہاتھ تھام لو۔تمہیں اپنا بنا کر بہت دور لے جاؤں گا لیکن تم بہت ڈر گئی تھیں۔تمہیں اپنے قبیلے کی بے رحم روایات کا خوف ہے۔ جس کی وجہ سے تم نے انکار کیا تھا۔میں اب بھی اپنے اس عزم پر قائم ہوں۔ میں اب بھی تم سے التجا کرتا ہوں میری بات کو مذاق مت سمجھو۔ میں پوری سنجیدگی سے تمہیں اپنا بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت مشکل ہے۔ مجھے معلوم ہے اس علاقے کے رسوم ورواج اور جمشید جیسے بے رحم اور مکار شخص کے چنگل سے تمہیں نکال کے اپنا بنانا آسان نہیں ہوگا۔تم میرا ساتھ دوگی تو یہ ساری دیواریں ہم گرا دیں گے۔

’’تمہارا ابا میرا خاص بندہ ہے۔میری بہت عزت کرتا ہے۔میں بھی اس کا احترام کرتا ہوں۔تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں کوئی چور دروازہ استعمال نہیں کرنا چاہتا۔میری خواہش ہے تمہارے ابا سے خود بات کرلوں یا چچا فقیر اللہ کو درمیان میں لاؤں۔ مجھے امید ہے ان کو قائل کرانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ اصل رکاوٹ جمشید ہے۔ اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔اب میں اسے پیشہ ورانہ طور پر ہی نہیں، رقیبانہ طریقے سے بھی اپنے نشانے پر رکھوں گا۔

’’کیا تم جانتی ہو محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔تمہاری محبت اب جمشید کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کا باعث بنے گی۔ میں جانتا ہوں جمشید اب بھی درختوں کی کٹائی سے باز نہیں آیا ہے۔ چلو اچھا ہے اسے تمہاری زندگی سے نکالنے کے لیے مجھے کسی بہانے کی ضرورت تھی۔اب اس سے میری جنگ، جنگلات کے تحفظ کی وجہ سے ہی نہیں، تمہیں حاصل کرنے کے جنون کی وجہ سے بھی ہوگی۔

’’میں کل ھلچون سے جا رہا ہوں۔ بہت جلد تمہیں پانے کے راستے صاف کر کے آؤں گا۔اس وقت تک خدا حافظ!‘‘

حنا نے یہ خط کئی بار پڑھا۔ ہر بار اسے لگا جیسے سلمان خود اس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔اس کا خط پڑھتے ہوئے وہ محبت کے جذبوں میں بھیگ رہی تھی ساتھ ہی بہت

سے اندیشوں سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ ایک طرف سلمان احمد کا وجود اس کے لیے راحتِ جاں بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف قدم قدم پہ مشکلات تھیں، بے رحم موسموں کی آتش بجاں صورتِ حال تھی۔

وہ خود سے سوال کرنے لگی، کیا وہ اس سب کے لیے تیار ہے؟ کیا سلمان احمد کی خاطر وہ اپنے خاندان برادری سے، چھلچون کی روایات سے اور جمشید کی ستم گری سے ٹکر لے سکتی ہے؟

اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

اتنی... بات وہ سمجھ گئی تھی کہ غارت گر عشق نے اپنا داؤ آزمانا شروع کیا تھا۔ اب یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کہ محبت کی جیت ہوتی ہے یا یہ محبت اس کے لیے شامت بن جانے والی تھی۔

☆☆☆

سلمان احمد ضروری میٹنگ میں شرکت کی خاطر جب مادوپور کے فاریسٹ گیسٹ ہاؤس سے چلا گیا تو حنا کا دل کسی انجانے خوف سے بڑی دیر مضطرب رہا تھا۔ ایک دن پہلے لان والے واقعے کے مابعد اثرات اب بھی باقی تھے۔ سلمان احمد کے تسلی دلاسے کے باوجود وہ دل سے خوف کی باقیات نکالنے میں ناکام رہی تھی۔

اس صبح سلمان احمد یہ وعدہ کر کے دفتر گیا تھا کہ آخری دفعہ سرکاری امور نمٹا کے آئے گا۔ پھر وہ اگلی صبح شہر واپس چلے جائیں گے۔ حنا اس کے جانے کے بعد جہاں خوف سے پریشان تھی، وہاں یہ خوش گوار احساس بھی تھا کہ بس آج مادوپور میں ان کا آخری دن ہے۔

وہ کچھ دیر برآمدے میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر ایک ناول پڑھتی رہی۔ گیسٹ ہاؤس کے خانساماں کو سلمان احمد نے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ حنا کے آس پاس رہے۔ بیرونی گیٹ کو اچھی طرح بند کر کے رکھے۔ کسی بھی اجنبی شخص کے لیے گیٹ ہرگز نہ کھولے۔

حنا کچھ دیر کتاب پڑھنے کے بعد اسے بند کر کے اٹھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آگئی۔

دوپہر ڈھل گئی۔ اس دوران خانساماں نے کھانے کا پوچھا تو اس نے منع کر دیا سلمان احمد کی واپسی پر اس کے ساتھ کھانے کا کہہ کر چائے لانے کا بتا دیا۔ خانساماں چائے لے کر آیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی چائے پینے لگی۔

گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے کی کھڑکیاں دو طرف کھلتی تھیں۔ پیچھے کی جانب جہاں گہری کھائی تھی اور پھر بلند پہاڑ تھے۔ سامنے کی جانب جہاں گیسٹ ہاؤس کا سبزہ زار تھا۔

حنا پچھلی جانب کی کھڑکی کے پاس بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس کا رخ بھی پہاڑوں کی سمت تھا۔ اچانک ہی اسے محسوس ہوا گیسٹ ہاؤس کے سبزہ زار کی طرف والی کھڑکی کے پاس سے کوئی شخص گزرا تھا۔ یہ احساس بس ذرا سی دیر کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس نے چونک کر سر گھما کر اس طرف دیکھا بھی مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے اپنا وہم سمجھا۔ واپس پلٹ کر پچھلی جانب کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی وقت اس کے کانوں نے کمرے کے دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ اس نے سوچا خانساماں ہوگا۔ چائے کی خالی پیالی لے جانے آیا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ خالی پیالی لے کر اپنی کرسی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

یکا یک کمرے کا دروازہ دھڑاکے سے کھل گیا۔ ایک شخص چہرے پہ ڈھاٹا باندھے اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پسٹل بھی موجود تھا۔

حنا کا دل اچھل کر حلق تک آگیا۔ صبح سے دل جس خوف کے گھیرے میں تھا، یہ اس کا ایک حقیقی منظر تھا۔

وہ ہکلا کر بولی۔ ”کک...... کون ہو تم؟ اس طرح کمرے میں کیوں آئے ہو؟“

وہ شخص سرسراتی آواز میں بولا۔ ”تمہارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ میں کون ہوں۔ بس یہ جان لو کسی کے حکم پر تمہیں اٹھانے آئے ہیں؟“

شدید خوف سے اس کی رگوں میں خون جیسے جم گیا۔ ماضی میں اس نے بہت مشکل اور خطرناک حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ دشمنوں سے بھاگتے بھاگتے پہاڑوں، جنگلوں اور پُراسرار قبیلوں میں خوف ناک واقعات کا سامنا کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک نازک اور کمزور لڑکی تھی۔ اچانک اپنے سامنے خطرناک عزائم کے ساتھ منہ چھپائے شخص کو دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ ”کک...... کس کے حکم پر ایسا کر رہے ہو؟ کیا تم جمشید کے پالتو کتے ہو؟“

اس شخص نے ڈپٹ کر کہا۔ ”وہ جو کوئی بھی ہے بہت جلد پتا چل جائے گا۔ ہمارا کام تمہیں اس تک پہنچانا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ حنا کی طرف بڑھا۔ حنا خوف کے باوجود چلا کر بولی۔ ”خبردار! میرے قریب مت آؤ۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔“

وہ شخص قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے قریب آنے لگا۔
”تم نازک سی لڑکی ہو۔ شرافت سے خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ ہم بدمعاشی سے تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔ تمہارا خانساماں بھی اس وقت میرے ساتھیوں کی مار کھا کے بے ہوش پڑا ہے۔ تمہیں بچانے کوئی نہیں آنے والا ہے۔“
وہ حوصلہ کر کے بولی۔ ”میرے شوہر ابھی آنے والے ہیں۔ وہ تم سب کو مزہ چکھائیں گے۔“
”اسے بھول جاؤ۔ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ ہمارے دو ساتھی اسے بدترین انجام سے دوچار کرنے کے لیے راستے میں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ یہاں نہیں آسکے گا، سیدھا اوپر پہنچ جائے گا۔“
حنا کا دل دھک سے رہ گیا۔ شدید خوف اور صدمے سے اُس کا دل جیسے ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔ دوسرے لمحے اس نے چلا کے اپنے ہاتھ میں پکڑے پیالے کو اس کی طرف پھینک دیا۔ چار پانچ فٹ کے فاصلے سے اچانک پھینکے گئے پیالے سے وہ شخص خود کو بچا نہیں سکا۔ پیالہ اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ اس چوٹ سے وہ ایک لمحے کو ڈگمگایا۔ حنا ایک دم باہر کی طرف دوڑ پڑی۔ ابھی وہ دروازے کے پاس پہنچی تھی کہ پیچھے سے اس شخص نے چھلانگ مار کے اسے کندھے سے جکڑ لیا۔ اس کے بالوں کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔
حنا ایک وحشیانہ انداز میں پلٹ کر اس پر جھپٹ پڑی۔ اپنے ناخنوں سے اس کے چہرے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ وہ شخص ذرا سی دیر کو بدحواس ہو گیا تھا۔ پھر خود کو سنبھال کے اپنے ہاتھ میں پکڑے پسٹل کے دستے کو زور سے اس کے سر پر دے مارا۔ حنا کے منہ سے ایک اضطراری چیخ بلند ہوئی۔ درد کی ایک شدید لہر سر میں اٹھی۔ آنکھوں کے آگے سفید اور سیاہ ستارے جھلملائے۔ دوسرے لمحے وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ اس کے بعد وہ بے ہوشی کے گہرے اندھیرے میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ بائیں طرف کچھ فاصلے پر نانگا پربت کی برفیلی چوٹیوں پر دھوپ ابھی خوب چمک رہی تھی۔ اس پہ شفق رنگ گلال کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پہ ابھی دھوپ کے خیمے موجود تھے۔ پوری وادی ڈوبتے سورج کی روپہلی کرنوں سے روشن تھی۔
سلمان احمد فاریسٹ ہاؤس کے کھلے لان میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دور نشیب میں تھلچون وادی کے درخت اور مکان پھیلے ہوئے تھے۔ وہ گہری سوچتی نظروں سے بستی کی طرف دیکھتے ہوئے چائے پی رہا تھا۔ فاریسٹ کا دفتر بستی کے آخر میں، جہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا تھا، واقع تھا۔ یہ ایک ٹیلے پہ بنا ہوا تھا۔ وہاں سے نیچے دور تھلچون اور ملحقہ بستیاں دکھائی دیتی تھیں۔
سلمان احمد کو حنا کے مہمان خانے سے آئے بہت وقت ہو گیا تھا۔ اس کا دل بہت اداس تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ ادھر آ تو گیا تھا مگر اندر سے جیسے بکھر گیا تھا۔ حنا کی چاہت کسی آکاس بیل کی طرح اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے دامن دل چھڑا نہیں سکا تھا۔
اپنی دیوانگی کا احساس کر کے وہ خود حیران بھی تھا۔ ایک مہینہ قبل اسے پہلی بار دیکھا تھا پھر وہ ہمیشہ کے لیے دل میں جم کر بیٹھ گئی تھی۔ واپس چلا اس جا کر اس کا سکون لٹ گیا تھا۔ رات ہو، دن ہو، اسی کا تصور کچھ اور کرنے نہیں دیتا تھا۔
اس نے سنا تھا نانگا پربت کی وادیوں اور وہاں کی جھیلوں میں پریاں اترتی ہیں۔ انسانی شکل میں آکر مردوں کو اسیر کر لیتی تھیں۔ حنا پری نہیں تھی۔ تھلچون کی ایک جیتی جاگتی لڑکی تھی۔ بس پریوں سی شیریں شمائل تھی۔ اسے بھی پہلی نظر میں اپنا قیدی بنا لیا تھا۔
سلمان احمد نے بہت چاہا، اس کا خیال دل سے جھٹک دے۔ اس کی محبت جو انگور کی بیل کی طرح مسلسل بڑھتی جا رہی تھی، اسے کاٹ دے۔ اپنے اندر سے اسے نکال کر پھینک دے مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی بے قراری میں بے اختیاری زیادہ ہونے لگی۔ اپنے اندر سر ابھارنے والے جذبے کو سُلانے کے لاکھ جتن کیے مگر حیران کن طور پر وہ بُری طرح ناکام ہوا۔ ہیڈکوارٹر میں کام کی زیادتی کے باوجود وقت نکال کے تھلچون آیا۔ نمبردار عنایت کی عدم موجودگی کے باوجود اس کے مہمان خانے میں رات گزاری۔ پھر صبح کے وقت حنا سے ذرا دیر کی ملاقات سے دلِ مضطر کو سکون پہنچانے کی کمزور سی کوشش کی تھی۔
مگر وہاں سے آنے کے بعد دل کی بے قراری پھر بڑھ گئی تھی۔ پہلے صرف اس کا دیدار مقصود تھا۔ اب اسے ہمیشہ کے لیے حاصل کرنے کی خواہش، حاصلِ حیات بن گئی تھی۔
اس شام چائے پیتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا۔ اس کا ذہن ان کڑیوں کو ملا رہا تھا جن کے ذریعے اس حاصلِ حیات کو شریکِ حیات بنا سکے۔ تھلچون کی روایات اور جمشید سے چھڑی رقابت، مگرمچھ کی طرح منہ کھولے کھڑی تھی۔ اب ان کے جبڑوں سے حنا کو نکالنا تھا۔
اس کی سوچوں کا تسلسل اچانک ٹوٹ گیا۔ اس نے

چونک کر دیکھا۔ اس کا اسسٹنٹ قریب آیا تھا۔

اس نے کہا۔ ”سر! آپ نے بتایا تھا پانچ بجے اوپر جنگل کی طرف جائیں گے۔ وقت ہو گیا ہے۔ آپ تیار ہو جائیں۔“

سلمان بولا۔ ”جاوید! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج کا پروگرام کینسل کرتے ہیں۔“

معاون جاوید نے کہا۔ ”جی بہتر سر! میں نے فقیر اللہ کے ذریعے گھوڑے بھی منگوائے تھے۔ انہیں واپس بھجوا دوں؟“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”گھوڑے واپس مت کرو۔ فقیر اللہ کو یہاں بھیج دو۔ اس سے کچھ کام ہے۔“

کچھ دیر بعد فقیر اللہ وہاں آیا۔ ”سر! آپ نے مجھے بلایا تھا؟“

”چچا فقیر اللہ! جنگل کے دورے پر آج نہیں جاتے ہیں۔ تم اس کے بجائے مجھے وادی کی سیر کراؤ۔“

”جو آپ کی مرضی سر! آپ حکم کریں، کدھر جانا ہے؟“

سلمان نے کہا۔ ”پہاڑ کے ساتھ ساتھ کچھ آگے تک جاتے ہیں۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

فقیر اللہ بولا۔ ”سر! یہاں سے بائیں طرف نانگا پربت کی وادیاں اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ جنگل ہے، کھائیاں اور گھاٹیاں ہیں۔ اسی طرح بائیں طرف تھلچون جنگل اور دوسری بستیاں ہیں۔ آپ کدھر جانا پسند کریں گے؟“

”نانگا پربت کی طرف چلتے ہیں۔ تم اپنے لیے اور میرے لیے گھوڑے تیار کرو۔ جاوید سے کہو، اِدھر ہی رک جائے۔“

فقیر اللہ نے پہلے ہی گھوڑوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر بائیں جانب جہاں دور نانگا پربت کی شفق رنگ چوٹیاں چمک رہی تھیں، اس طرف روانہ ہو گئے۔

سلمان احمد نے بہت سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ فقیر اللہ کو اپنا رازدار بنا کے اس کے آگے دل کی بات کہے گا۔ کچھ دیر انہوں نے خاموشی سے سفر طے کیا۔ اس وقت ان کے گھوڑے ایک ندی کے ساتھ بنی ہموار پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ دائیں طرف۔ بلند پہاڑ تھے، بائیں جانب ڈھلوانی جگہ تھی جس پر اخروٹ، شہتوت اور کیکر کے درخت اور خودرو گھاس تھی۔

سلمان احمد نے اپنا گھوڑا فقیر اللہ کے قریب کر لیا پھر کہا۔ ”نمبردار عنایت خان اکثر تمہارا ذکر کرتا رہتا ہے۔ وہ تم سے بہت خوش ہے۔“

وہ عاجزی سے بولا۔ ”یہ نمبردار صاحب کی بڑائی ہے سر! میں ان کا نمک خوار ہوں۔ برسوں سے اُن کی زمینوں اور مہمان خانے کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔“

سلمان نے کہا۔ ”ان کی بیٹی حنا بہت اچھی لڑکی ہے۔ تھلچون کے اکثر لڑکے اَن پڑھ ہیں مگر وہ میٹرک تک پڑھی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔“

فقیر اللہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”نمبردار صاحب نے خاندان کے بہت سے لوگوں کو ناراض کر کے بیٹی کو تعلیم دلائی ہے۔ جمشید کے گھر والوں نے تو اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ لیکن انہوں نے کسی کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ اللہ پاک حنا بیٹی کے نصیب اچھا کرے۔“

سلمان نے کہا۔ ”اس کی شادی جمشید سے ہونے والی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ ایک درست فیصلہ ہے؟“

وہ تلخی سے بولا۔ ”یہاں کے رواج ایسے ہیں سر، کہ رشتے اچھے اور بُرے کی بنیاد پر نہیں کیے جاتے بلکہ قول و قرار کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ بچپن میں ہی خاندان برادری کے بچے بچیوں کو ایک دوسرے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بالغ ہونے پر ان کی شادی کی جاتی ہے۔ اس سے انکار کرنے والے فریق کو جرمانے اور طعنے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

سلمان نے افسوس سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں یہاں کے مرد اکثر ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بچپن کا رشتہ اگر شادی کے بعد پسند نہیں آیا تو مرد اس کے اوپر اپنی پسند کی دوسری لڑکی سے شادی کر سکتا ہے مگر اس بے چاری لڑکی کا کیا قصور ہے جسے اس کی ناسمجھی کی عمر میں کسی کے ساتھ عمر بھر کے لیے باندھ دیا جاتا ہے۔ وہ مرد جتنا بھی بُرا ہو، بے جوڑ ہو، اس لڑکی کو صبر کی سِل سینے پہ باندھ کے اس کی شریکِ حیات بننا ہوتا ہے۔ کیا کوئی لڑکی بغاوت بھی کرتی ہے؟“

فقیر اللہ ہنس پڑا۔ ”آپ کیسی بات کرتے ہیں سر! یہاں کی لڑکی بہت فرماں بردار اور شریف ہوتی ہے۔ ماں باپ کی مرضی ان کا آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ ہر لڑکی اس فیصلے کو خوشی سے قبول کرتی ہے۔ شہر کی پڑھی لکھی لڑکیوں کی طرح، یہاں کی بیٹیاں اپنے بڑوں کے فیصلوں سے بغاوت نہیں کرتیں۔ خاندان برادری کی ناک نہیں کٹواتی ہیں۔“

سلمان احمد سمجھ گیا فقیر اللہ بھی اسی معاشرے کا ایک فرد ہے۔ یہاں کے رواج اور سماج کے مزاج کا اس پر بھی اتنا ہی اثر ہے۔ ایسے میں کسی دلیل یا روشن خیال معاشرے کی مثال

اس کے لیے غیر موثر ہوگی۔

سلمان احمد نے دوسرے زاویے سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ ''چچا فقیر اللہ! جمشید کیسا بندہ ہے؟ میرا مطلب ہے تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ کیا وہ حنا جیسی لڑکی کے لیے اچھا شوہر ثابت ہوسکتا ہے؟''

اس کے منہ سے بار بار حنا کا نام سن کر فقیر اللہ کو ناگوار لگ رہا تھا۔ وہ جس ماحول کا پروردہ تھا ایسی باتیں بڑی معیوب سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے جی میں آرہا تھا اسے منع کرے مگر اپنی حیثیت کے مطابق حوصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے پہلے بھی حنا کو دو ایک دفعہ مہمان خانے میں جاتے دیکھ کر بہت برا منایا تھا۔ آج صبح بھی اسے مہمان خانے سے نکلتے دیکھ کر اسے سخت غصہ آیا تھا۔ دل کے اندر بدگمانیوں کے شیشے بھی تڑخ گئے تھے۔ حنا اور فاریسٹ افسر کے کسی مشکوک تعلق کی زہریلی سوچیں بھی ابھری تھیں مگر اس خوف سے کہ ایسے کسی تعلق کو غیرت کے نام پر بہت ہی بھیانک انجام سے دوچار کرایا جاتا ہے، اس نے شک کو اپنے اندر تھپک کر سلا دیا تھا۔

جمدر نے جب حنا کے مہمان خانے میں جانے کی بات کی تو فوراً اسے خاموش کرایا تھا۔ وہ جانتا تھا ایسی باتوں میں حقیقت نہ ہو تب بھی زبان سے نکلی ہوئی بات، آفت بن جاتی تھی۔

اس وقت سلمان احمد کی زبانی حنا کا بار بار ذکر سن کر شک، پھر سے سر اٹھا کر بیٹھ گیا۔ اسے کچھ بے رحم موسموں کی بھنک مل رہی تھی۔ وہ سلمان احمد کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی ہی سوچوں میں گم ہوگیا تھا۔ اس کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''فقیر اللہ چچا! تم نے بتایا نہیں۔ جمشید کیا حنا کو خوش رکھ سکے گا؟''

اس نے بے تاثر سے لب و لہجے کے ساتھ کہا۔ ''سر! جمشید اچھا نوجوان ہے۔ محنت کرتا ہے۔ رات دن ایک کر کے لکڑیوں کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ حنا بیٹی کے لیے اچھا شوہر ثابت ہوگا۔''

سلمان نے تڑخ کر کہا۔ ''اس کا لکڑیوں کا کاروبار غیر قانونی ہے۔ اس کی محنت غلط طریقے سے ہو رہی ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ قانون کا مجرم ہے۔ کسی بھی وقت گرفت میں آسکتا ہے۔ پھر اسے اچھا نوجوان کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

فقیر اللہ سادگی سے بولا۔ ''سر! ایک بات بتائیں۔ یہ جو لوگ ان پہاڑوں میں رہتے ہیں، ان کی تھوڑی سی زمین ہوتی ہے۔ کچھ بکریاں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس آمدنی کا اور کون سا ذریعہ ہے؟ یہ نوجوان لکڑیاں کاٹ کے آگے نہیں بیچیں گے تو زندگی کیسے گزاریں گے؟ اس پر آپ قانون کا ڈنڈا لے کر آجاتے ہیں۔ اس ذرا سی آمدنی سے بھی روکتے ہیں۔''

سلمان احمد نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم بھی ان لکڑی چوروں کی طرح بات کرتے ہو۔ یہ جو جنگلات کے دشمن ہیں ان کے پاس بھی تو رٹا رٹایا نعرہ ہے کہ یہ جنگل ہماری ملکیت ہے۔ ہماری آمدنی کا ذریعہ ہے۔ حکومت ہم پر ظلم کرتی ہے وغیرہ ..... چچا فقیر اللہ! حکومت ظالم نہیں۔ حکومت نے تو آپ کے لیے پالیسی بنائی ہے۔ جس کے تحت اپنے گھر میں جلانے کے لیے اور ایک گھر کی تعمیراتی ضرورت کے مطابق درخت کاٹنے کی اجازت ہے۔ جمشید جیسے لالچی لوگوں کو اجازت نہیں جو ہزاروں فٹ قیمتی لکڑی کاٹ کے ان جنگلات کا صفایا کر رہے ہیں۔''

وہ شاکی لہجے میں بولا۔ ''آپ جب سے افسر بن کر آئے ہیں اور نمبر دار صاحب کو کمیٹی کا چیئرمین بنایا ہے، ہم ذاتی ضرورت کی لکڑی بھی کاٹنے سے محروم ہوگئے ہیں۔ اس سے یہاں کے لوگ بہت پریشان ہیں۔''

سلمان احمد اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو چچا! یہاں کے جنگل بہت بری طرح کاٹے جا رہے تھے۔ تم خود جانتے ہو اور پر جنگل کا کیا حشر ہوگیا ہے۔ اس وجہ سے ہم نے سختی کی ہے تاکہ ذاتی ضرورت کا نام دے کر قیمتی درختوں کو کاٹ کر دوسرے شہروں میں اسمگل کرنے والوں کو لگام دے سکیں۔ صورتِ حال قابو میں آگئی تو تم لوگ پھر سے اپنی ضرورت کے مطابق لکڑیاں کاٹ کے لاسکو گے۔''

فقیر اللہ نے کہا۔ ''میرا بیٹا جوان ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک تھوڑی بہت لکڑی آگے بیچ کر وہ گھر چلاتا تھا۔ اب پابندی کی وجہ سے بے روزگار ہوگیا ہے۔ اس لیے گھر سے بہت دور شہر جا کر محنت مزدوری کرتا ہے۔ آپ افسر لوگ ہیں۔ کوئی ایسا راستہ تلاش کریں کہ ہمارے جنگلات سے ہمیں کچھ فائدہ مل سکے۔''

''اس سلسلے میں حکومت نے پالیسی بنائی ہے۔ جنگلات کے تحفظ کے بدلے میں آبادی کے ہر گھر کو سالانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ وظیفہ بہت کم ہے مگر دوسری طرف جنگلات کی کٹائی سے ماحول پر جو اثرات پڑتے ہیں، وہ بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ خیر تم اس بات کو

چھوڑو۔ میں تمہارے بیٹے کے لیے کچھ کروں گا۔ اپنے دفتر میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری اسے دلا دوں گا۔ تم اس سے کہو... جلا اس ہیڈکوارٹر آ کے مجھ سے ملے۔"

ہر بے روزگار نوجوان کے غریب باپ کی طرح فقیر اللہ کے لیے بھی یہ ایک بڑی خوش خبری تھی۔ وہ ممنونیت سے بھر گیا۔ سلمان احمد نے بھی کسی موقع پرست سیاست داں کی طرح بڑے اچھے موقع پر پتا پھینکا تھا۔ حنا کو پانے کے لیے اس نے جو حکمتِ عملی سوچی تھی، اس کے لیے فقیر اللہ اہم مہرہ تھا۔ اسے قابو کرنے کے لیے بیٹے کی نوکری سے بڑھ کر دل خوش کن بات کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ دونوں گھوڑوں پر بہت دور نکل آئے تھے۔ سورج غروب ہو گیا تھا مگر شام کے سائے ابھی گہرے نہیں ہوئے تھے۔ سلمان احمد نے واپسی کا اشارہ کیا۔ ان دونوں نے گھوڑوں کا رخ موڑ لیا۔ دوبارہ کھلچون کی طرف بڑھنے لگے۔

سلمان احمد، حنا کے حوالے سے بات کرنے کے لیے حوصلہ مجتمع کر رہا تھا۔ اس نے فقیر اللہ کو بڑا۔ لالچ دیا تھا۔ اس کے باوجود دل کی بات زبان تک لاتے ہوئے شدید پس و پیش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

وہ دونوں کھلچون کے قریب پہنچ گئے تھے۔ بالآخر سلمان احمد نے جرأت سے کام لیا۔

"چچا فقیر اللہ! میں نے نمبردار صاحب کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ اس کی بیٹی اور بیوی کے ہاتھوں کے پکوان کھائے ہیں۔ خاص کر حنا سے مل کر، اس کے بارے میں جان کر اس سے ایک دلی رشتہ جڑ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں جمشید جیسے کھردرے اور جرائم پیشہ شخص سے اس کی جان چھوٹے۔ وہ اتنی اچھی، اتنی پیاری اور خاص لڑکی ہے کہ جمشید ذرا سا بھی اس کے جوڑ کا نہیں۔ میں اسے اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

اس وقت دونوں کے گھوڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سلمان احمد کی بات پر وہ اس طرح چونک اٹھا تھا کہ گھوڑا بھی اک ذرا بدک گیا۔ وہ چند ثانیوں کے لیے جیسے ہکا بکا رہ گیا۔ پھر خود کو سنبھال کے سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "سس..... سر! آپ بہت بڑی بات کر رہے ہیں۔ بہت طوفان اٹھے گا۔ جمشید کسی بھی صورت برداشت نہیں کرے گا۔"

اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ کوئی عام بات نہیں۔ جمشید، نمبردار عنایت اور کھلچون کا معاشرہ، مجھے ان سب سے

سخت ردِعمل کی توقع ہے۔ اس کے باوجود میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو، میں کتنا سنجیدہ ہوں۔''

فقیراللہ کے چہرے پر سخت تناؤ تھا۔ آنکھوں میں بہت سے طوفانوں کے آثار مچل رہے تھے۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے ان کی بات کوئی سن نہ لے۔ پھر ایک کمزوری آواز میں بولا۔ ''سر! آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں کم حیثیت کا خدمت گار بندہ ہوں۔ میں کس طرح آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔ ایسا نہ ہو مفت میں مارا جاؤں؟''

سلمان احمد نے کہا۔ ''تم پریشان مت ہو۔ تمہیں کسی بڑے امتحان میں نہیں ڈالوں گا۔ بس میری چند ہدایات پر عمل کرو۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہوگا۔''

سلمان احمد اسے بتانے لگا کہ وہ کیا کرسکتا ہے۔ وہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اس کی بات سنتا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا بیٹے کی نوکری کی بات کرکے وہ بُری طرح پھنس گیا ہے۔

سلمان نے بات ختم کی تو اسے اتنی تسلی ضرور ہوئی کہ اس کا کردار اتنا اہم نہیں۔ اس کا کام زیادہ مشکل نہیں۔ اسے محض پیامبری کرنی تھی۔ کسی تک پیغام پہنچانا تھا۔ کسی سے جواب وصول کرنا تھا۔ کسی کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی تھی۔ اس سب کے بدلے اپنے بیٹے کے لیے گھر کی دہلیز پر ہی فاریسٹ گارڈ کی نوکری حاصل کرنی تھی۔

☆☆☆

جمدر خان، فارسٹ آفس کے قریب ہی ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ فقیراللہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ فاریسٹ افسر کی سرگرمیوں سے آگاہ کرے گا۔ دوپہر کے وقت ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ فقیراللہ نے خبر دی تھی کہ سلمان نے جنگل میں جانے کے لیے گھوڑے منگوائے ہیں۔ پانچ بجے ان کا جنگل کے دورے کا پروگرام ہے۔

یہ سن کر جمدر کی پریشانی کم ہوئی تھی۔ ان پہاڑی علاقوں میں چھ بجے کے بعد اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا فاریسٹ افسر نے جنگل میں زیادہ دور جانے کا پراگرام نہیں بنایا تھا کیونکہ ایک گھنٹے میں وہ اس پہاڑی جنگل میں زیادہ دور نہیں جاسکتے تھے۔ جمشید اور اس کے بندے تھلچون سے تین چار گھنٹوں کی مسافت پر اپنی کارروائی میں مصروف تھے اس لیے جمدر آج کے دن کے حوالے سے بے فکر ہوگیا تھا۔

پانچ بجے کے قریب اس نے دیکھا سلمان احمد اور فقیراللہ گھوڑوں پر سوار فاریسٹ آفس سے باہر نکلے۔ پھر تھلچون کے جنگلات کی مخالف سمت نانگا پربت کی طرف روانہ ہوگئے۔ جمدر حیرانی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا جنگل کی طرف جانے کے بجائے انہوں نے مخالف سمت کا سفر کیوں کیا تھا۔ وہ فاریسٹ آفس کے قریب ہی بیٹھ کران کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

بہت دیر بعد جب شام کے سائے پھیل گئے تھے، وہ دونوں واپس آئے۔ جمدر نے ایک درخت کے موٹے تنے کی اوٹ سے مخصوص انداز کی سیٹی بجا کے فقیراللہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے جوابی اشارہ کیا کہ انتظار کرے۔

کچھ دیر بعد فقیراللہ اس کی طرف آیا۔ وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ بھاری بھاری قدموں سے چلتا اس کے قریب آیا۔

جمدر نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''چچا فقیراللہ! شکر ہے یہ فاریسٹ افسر آج جنگل کی طرف نہیں گیا۔ کیا وہ کل جانے والا ہے؟''

وہ رسان سے بولا۔ ''تم لوگ مفت میں ڈر رہے تھے۔ سلمان صاحب کا جنگل کے معائنے کا پروگرام ہی نہیں۔ وہ یہاں جمشید کے خلاف کوئی ایکشن لینے نہیں آئے بلکہ اپنے ذاتی کام سے آئے ہیں۔''

جمدر نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے وہ کسی مخبر کی اطلاع پر ہماری چوری پکڑنے نہیں آیا ہے؟''

فقیراللہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم بے فکر ہوکر جاؤ۔ وہ لکڑیوں کی چوری پکڑنے نہیں آئے ہیں، خود ان کا اپنا دل جو یہاں چوری ہوگیا ہے اس کی تلاش میں آئے ہیں۔''

جمدر نے ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے فتنہ پرور ذہن میں ایسی منہ زور بدگمانیاں مچلتی تھیں کہ فقیراللہ کی دل کے چوری ہونے کی بات کو عام انداز میں نہیں لیا۔ صبح کے وقت حنا کا مہمان خانے میں چھپ چھپ کر جانے کی بات اس سے ہضم نہیں ہوسکی تھی۔ اس کے دماغ نے کئی نکتے جوڑ کر ایک فتنہ انگیز کہانی بھی بنائی تھی۔ اب فقیراللہ کی مبہم بات اس میں نئے رنگ بھرنے کے لیے کافی تھی۔

اس نے کہا۔ ''چچا! میں نے پہلے بھی کہا تھا ایسے نوجوان افسر بڑے رنگیلے مزاج کے ہوتے ہیں۔ تانک جھانک میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کی کسی لڑکی نے اُس کا دل چرایا ہے کیا؟''

فقیراللہ جلدی سے بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب یہ نہیں تھا جمدر! سلمان صاحب اصل میں کچھ پریشان ہیں۔ اس لیے شہر میں اپنے دفتر کے ہنگاموں سے نکل

کر یہاں ایک دو دن سکون سے رہنے آئے ہیں۔"

جمدر کے دل میں بدگمانی کی گرہ پڑ چکی تھی۔ فقیر اللہ کی بات سن کر وہ مطمئن نہیں ہوا۔ لیکن اس کی بات جھٹلانے کا فی الحال موقع نہیں تھا۔ اس سے تکرار کر کے اسے ناراض کرانے سے زیادہ، اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس سے کام نکالنے میں فائدہ زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے چچا! ہماری دعا ہے فاریسٹ افسر جنگل کی ہماری چوری بھول کر، خود کو ہی ڈھونڈنے میں مصروف ہو جائے۔ مگر آپ بھی آنکھیں کھلی رکھنا کہیں کھلچون کی کسی لڑکی پر اس کی نظر نہ ہو۔"

فقیر اللہ تیز لہجے میں بولا۔ "تم اس فکر میں دُبلے مت ہو۔ وہ جوان ہے۔ بڑا افسر ہے۔ کوئی لڑکی پسند آ گئی تو حرج کیا ہے۔ کھلچون کے کسی بے کار نوجوان سے تو وہ ہزار گنا اچھا ہے۔ خیر، تم یہ چھوڑو۔ سلمان صاحب نے ایک اہم پیغام جمشید کو پہنچانے کی ذمے داری دی ہے۔ تم اسے خبر دو۔ وہ بلندی سے نیچے آ کے مجھ سے ملے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ زیادہ بلندی تک جا نہیں سکتا۔"

جمدر گھورتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "چچا! یہ اس افسر کی کوئی نئی چال تو نہیں۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ جمشید جنگل میں ہے؟ اسے نیچے بلا کر گرفتار تو نہیں کرانا چاہتا ہے نا؟"

فقیر اللہ ناگواری سے بولا۔ "تمہارے دماغ میں ہر وقت فتنہ وفتور ہی پکتا رہتا ہے۔ کبھی اچھا گمان بھی پیدا کرو۔ جمشید کے جنگل میں ہونے کے بارے میں تم نے ہی بتایا تھا۔ سلمان صاحب نے تو اسے تلاش کر کے پیغام دینے کا کہا تھا۔"

جمشید تجسس سے بولا۔ "ایسی کیا خاص بات ہے چچا! مجھے بھی کچھ بتائیں نا۔ آخر جمشید کا اہم ساتھی ہوں۔"

"یہ بات صرف جمشید کے لیے ہے۔ ایک طرح سے یہ ایک سمجھوتا ہے۔ کچھ دو کچھ لو والی بات ہے۔ اگر بات مان لی تو تم سب کے وارے نیارے ہوں گے۔ بس اب تم جاؤ۔ جمشید تک یہ پیغام پہنچاؤ۔ کل دوپہر کے بعد میں اس سے ملنے آؤں گا۔ وہ اوپر جنگل سے اتر کر سبز جھیل تک آ جائے۔"

سبز جھیل جنگل کے اندر ایک مقام تھا۔ کھلچون سے وہاں تک دو گھنٹے کا گھوڑے کا سفر تھا۔ جمشید وہاں سے بہت اوپر پہاڑ کی چوٹی پر موجود جنگل میں تھا۔ فقیر اللہ اکثر سبز جھیل تک جاتا رہتا تھا۔ ہمیشہ بھیڑ بکریوں کو لے کر جاتا تھا یا پھر گھر کی ضرورت کی لکڑی لانے جاتا تھا۔ آج سلمان احمد کا پیامبر بن کے جانے والا تھا۔

یہ کسی کے لیے محبت کا معاملہ تھا کسی کے لیے غیرت کا۔ اب یہ آنے والا وقت بتاتا کہ بے چارے فقیر اللہ کی اس سارے معاملے میں کیا حالت ہونے والی تھی۔

☆☆☆

سب انسپکٹر فیاض علی نے گیسٹ ہاؤس پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ سلمان احمد شدید پریشانی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سب انسپکٹر فیاض علی نے اسے تسلی دلاسا دیا۔ جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ سلمان احمد سے اور اس کے ساتھ موجود سپاہیوں سے کچھ سوالات پوچھ لیے۔ خانساماں کے حواس درست ہو گئے تھے۔ اس سے بھی وقوعے کے بارے میں پوچھ لیا۔

سلمان احمد نے ایک بار پھر اس شک کا اظہار کیا کہ اس واردات کے پیچھے اس کی بیوی کے سابقہ منگیتر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ سب انسپکٹر کے پوچھنے پر اس نے جمشید اور اس کے حواری جمدر کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دیں۔ اس کے علاوہ ایک دن قبل گیسٹ ہاؤس کے لان پر حنا کے ساتھ جو پُراسرار واقعہ پیش آیا تھا جس میں ایک مرغی کا کٹا ہوا سر اور دھڑ اس کی طرف پھینکا گیا تھا، یہ واقعہ بھی سب انسپکٹر کے گوش گزار کیا۔

سب انسپکٹر فیاض علی اس کی ساری بات سن کر بڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے مجرم شہر سے ہی آپ میاں بیوی کے تعاقب میں آئے تھے۔ یہاں موقع دیکھ کر انہوں نے ایک طرف آپ پر حملہ کیا اور دوسری طرف گیسٹ ہاؤس سے آپ کی بیوی کو اٹھا لیا۔ اس معاملے میں یقیناً مادو پور میں بھی ان کے سہولت کار موجود ہوں گے۔ جن کے تعاون سے انہوں نے اتنی بڑی واردات کی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے انسپکٹر صاحب! مادو پور میں ان کے بندے موجود ہوں گے۔ جن کی مدد سے انہوں نے میری بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ چھوٹا سا علاقہ ہے۔ آپ ان مجرموں کو آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔"

انسپکٹر فیاض علی کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر سلمان احمد اور اپنے سپاہیوں کو لے کر گیسٹ ہاؤس سے باہر آیا۔ گیسٹ ہاؤس کے باہر کھلے کھیت تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر تین چار مکان بنے ہوئے تھے۔ مرکزی سڑک سے ایک کچا راستہ گیسٹ ہاؤس کی طرف آتا تھا۔ حنا کو اگر کسی گاڑی میں لے جایا گیا تھا تو یہی راستہ استعمال کیا گیا ہوگا۔

انسپکٹر فیاض علی نے گیسٹ ہاؤس کے باہر کھیتوں میں دور دور تک دیکھا۔ اس وقت شام ہو گئی تھی۔ دو چار مرد اور

عورتیں کھیتوں میں مصروف تھے۔ وہ ان کی طرف بڑھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے محنت کش پولیس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر چونک سے گئے۔ پھر ایک ادھیڑ عمر کا شخص کام چھوڑ کر ان کی جانب آیا۔

"انسپکٹر صاحب! خیریت ہے نا؟ آپ کسے تلاش کر رہے ہیں؟"

"چچا! آپ یہاں کھیتوں میں کب سے موجود ہیں؟" انسپکٹر فیاض علی نے پوچھا۔

وہ شخص اُلجھی اُلجھی نظروں سے انھیں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے۔ سب ٹھیک ہے نا سر؟"

انسپکٹر فیاض علی نے کہا۔ "تین سے چار بجے کے درمیان گیسٹ ہاؤس میں ایک واردات ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں نے فاریسٹ افسر کی بیگم کو اغوا کرلیا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی اس دوران یہاں موجود تھا؟"

اس شخص نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں میں سے ایک کو آواز دے کر اپنی طرف بلایا۔ اس کے بلانے پر ایک نوجوان ان کی جانب آیا۔

وہ شخص بولا۔ "ہم تو ابھی تھوڑی دیر قبل یہاں کھیتوں میں آئے ہیں۔ آپ جو وقت بتا رہے ہیں، اس دوران انور کھیتوں کو پانی دے رہا تھا۔ شاید یہ آپ کو کچھ بتا سکے۔"

انور نامی نوجوان قریب آیا۔ اک ذرا پریشانی سے سب کو دیکھتے ہوئے اس شخص سے مخاطب ہوا۔ "ابا! کیا مسئلہ ہے؟ یہ پولیس کیوں آئی ہے؟"

وہ شخص بولا۔ "انور بیٹا! گیسٹ ہاؤس میں تین بجے سے چار بجے کے درمیان ایک واردات ہوئی ہے۔ تم اس وقت کھیتوں کو پانی دے رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب کو بتادو۔ تم نے اس دوران کوئی خاص بات تو نہیں دیکھی؟"

وہ نوجوان کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر انسپکٹر فیاض علی سے مخاطب ہوکر بولا۔ "گیسٹ ہاؤس کے اندر کیا ہوا ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں ہوسکا انسپکٹر صاحب! مگر جو وقت آپ بتا رہے ہیں اس دوران میں نے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر گاڑی دیکھی تھی۔ اس کے شیشے سیاہ تھے۔ گیسٹ ہاؤس میں جا کے وہ پانچ منٹ کے اندر باہر نکلی تھی، بہت تیزی سے پھر واپس چلی گئی تھی۔ انہوں نے گیٹ بھی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بہت دیر تک کسی نے گیٹ بند بھی نہیں کیا تھا۔ میں حیران بھی ہوا تھا کہ چوکیدار گیٹ کیوں نہیں بند کر رہا تھا؟ کھیتوں کو پانی دے کر میں گھر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر پہلے ابا کے ساتھ واپس آیا ہوں۔"

سب انسپکٹر فیاض علی واپس گیسٹ ہاؤس کی طرف آیا۔

سلمان احمد نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! اس نوجوان نے سفید رنگ کی لینڈ کروزر کی بات کی ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک مفید نشانی ہے۔"

"جی ہاں۔ میں اسی لائن پر سوچ رہا ہوں۔ واردات کے لیے جو گاڑی استعمال ہوئی ہے، اسے ٹریس کرنا ضروری ہے۔ مادو پور چھوٹی سی وادی ہے۔ اگر وادی میں ہے تو جلد نظر آئے گی۔ لیکن ایسا لگتا نہیں۔ آپ کی بیگم کو لے کر وہ مادو پور سے چلے گئے ہوں۔"

سلمان احمد پریشانی سے بولا۔ "مادو پور سے دوسرے علاقوں میں جانے کے لیے ایک ہی سڑک ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ بڑی سڑک سے جا کر ملتی ہے۔ وہاں سے مختلف علاقوں کے لیے راستے ہیں۔ اب کیسے معلوم ہوگا وہ کس طرف چلے گئے ہیں؟"

انسپکٹر فیاض علی نے کہا۔ "آپ مایوس نہ ہوں۔ راستے میں بڑی سڑک کے پاس پولیس کی چوکی ہے۔ میں ابھی واکی ٹاکی پر ان سے بات کرتا ہوں۔ سرخ لینڈ کروزر کے بارے میں معلومات لیتا ہوں۔"

اس نے واکی ٹاکی پر آگے اپنی چوکی سے رابطہ کیا۔ مادو پور کی سنگل سڑک کے اختتام پر جہاں سے بڑی سڑک شروع ہوتی تھی، یہ چوکی وہاں قائم تھی۔ اس نے ذرا دیر ان سے بات کی۔ پھر رابطہ منقطع کر کے کہا۔ "پولیس کے مطابق وہ گاڑی پانچ بجے کے آس پاس وہاں سے گزر کر آگے گئی ہے۔ اس کا رخ شہر کی طرف تھا۔ ابھی چھ بج رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے گاڑی ابھی شہر میں نہیں پہنچی ہے۔ اسے شہر پہنچے سے پہلے ٹریس کرنا ہوگا۔ ورنہ شہر کے ہجوم اور افراتفری میں کہیں غائب ہوجائے گی۔"

اس نے فوراً شہر کے ایک تھانے کے کنٹرول روم سے رابطہ کیا۔ گیسٹ ہاؤس میں ہوئی واردات کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔ سفید لینڈ کروزر کی نشانی بتا کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے اسے ٹریس کرنے کی ہدایات دے دیں۔

سلمان صدمے سے نڈھال ہو گیا تھا۔ ایک سال کی طویل معرکہ آرائیوں کے بعد حنا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی خوشیاں بہت مختصر ثابت ہوئی تھیں۔ حنا ایک بار پھر دشمنوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ ایک بار پھر آبلہ پائی اس کا نصیب ٹھہری تھی۔ خدا جانے اب اس کا کیا انجام ہونے والا تھا؟

☆☆☆

جمشید ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت تناؤ تھا۔ آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی تھیں۔ کلاشنکوف پر اس کی گرفت بہت سخت ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے فقیراللہ تھا۔ وہ اس وقت سبز جھیل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ بیضوی شکل کی وہ چھوٹی سی جھیل تھی۔

فقیراللہ نے سر اٹھا کے ہمت سے کہا۔ ”جمشید! میں جانتا ہوں یہ تمہارے لیے غیرت کا معاملہ ہے مگر تھوڑے ٹھنڈے دماغ سے سوچو تو تمہارا ہی فائدہ ہے۔“

جمشید پھنکارتے ہوئے بولا۔ ”چچا فقیراللہ! میں تمہیں اپنی برادری کا بزرگ سمجھ کر احترام کرتا ہوں۔ ایسی بات کوئی اور کرتا تو درجنوں گولیاں اس کے سینے میں اتار دیتا۔ تم اپنے اس فاریسٹ افسر سے کہہ دو یہ سودا مجھے بالکل منظور نہیں۔ اگر ایسی بات آئندہ زبان پر لائی تو گدی سے کھینچ کر جنگلی کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“

وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ”جمشید بیٹا! تم جذباتی انداز میں سوچ رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے اس وقت تمہیں لکڑی کی سخت ضرورت ہے۔ دو ہفتے کے اندر اسلام آباد مال نہیں پہنچایا تو لاکھوں کا نقصان ہوگا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا تم یہ سودا منظور کر لو۔ حنا سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دو۔ اس کے بدلے فاریسٹ افسر تمہیں تین مہینے تک کھلی چھوٹ دیں گے۔ جتنی چاہو لکڑی کاٹ کے آگے لے جاؤ۔“

جمدر بھی پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بہ ظاہر خاموش تھا مگر اس کا شیطانی دماغ بڑے ہی مکارانہ تیوروں سے ان دونوں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے تھلچون میں فقیراللہ سے اُگلوانے کی کوشش کی تھی کہ سلمان احمد کا کون سا پیغام جمشید تک پہنچانا ہے۔ اب ان دونوں کے سامنے وہ اس خاص پیغام کی حقیقت اور نوعیت سے آشنا ہو رہا تھا۔

فقیراللہ کی بات سن کے جمشید توقع کے مطابق بھڑک اٹھا تھا۔ کلاشنکوف لہرا کر اپنے غصے اور غیرت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے فقیراللہ کی ہر دلیل کو رد کرتے ہوئے صاف صاف بتا دیا کہ ایسا ممکن نہیں۔ حنا اس کی غیرت ہے، اس کی عزت ہے۔ اس کے بدلے کوئی بھی سودا قبول نہیں۔

فقیراللہ مایوس ہو کر بجھے بجھے قدموں سے چلتا ہوا واپس تھلچون کی طرف آنے لگا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے جمشید نے فاریسٹ افسر کی پیشکش ہی مسترد نہیں کی تھی بلکہ اس کے بیٹے کی نوکری پر بھی لات مار دی تھی۔

جمدر ان دونوں کی گفتگو کے دوران خاموش بیٹھا تھا۔ فقیراللہ کے جاتے ہی بول پڑا۔

”یارا! جمشید، بات تو غیرت کی ہے۔ ساتھ ہی بہت فائدے کی بھی ہے۔ تین مہینے تک چھوٹ مل جائے تو اندازہ کر لو کتنے فائدے میں ہوں گے۔ کروڑوں کی لکڑی ٹھکانے لگا دیں گے۔“

جمشید بھڑک کر بولا۔ ”اے جمدر! سوچ سمجھ کر بات کرو۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا میں ایسی بے غیرتی دکھاؤں گا کہ اپنی ہونے والی بیوی کسی اور کے حوالے کر دوں؟ کبھی نہیں۔ مجھ سے ایسا گھٹیا کام کبھی نہیں ہو سکتا۔“

جمدر گہری سانس لے کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے ہم اسی طرح چھپ چھپ کر، جان ہتھیلی پہ لے کر کام کرتے رہیں گے۔ ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ پکڑے جائیں گے۔ اگر پکڑے گئے تو لمبے عرصے کے لیے اندر چلے جائیں گے۔ یار کچھ دیر کے لیے سوچو۔ حنا تمہاری بیوی نہیں ہے۔ بس بچپن میں ایک دوسرے سے منسوب کر دیے گئے ہو۔ تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ تین مہینوں میں اتنا کماؤ گے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی تمہاری بن جائے گی۔“

وہ جھنجلا کر بولا۔ ”جمدر! تم میرے دوست اور کاروبار کے ساتھی ہو، اس لیے معاف کرتا ہوں۔ آئندہ ایسی بات میرے سامنے مت کرنا۔ ایسا نہ ہو ساتھی ہونے کا لحاظ بھی بھول جاؤں۔ یا پھر غصے سے اس فاریسٹ افسر کا خون کر دوں۔“

جمدر نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ ایسا مفاد پرست اور مکار تھا کہ رشتے، قدریں اور جذبات کی اس کے آگے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کا قبلہ و کعبہ بس پیسہ تھا جس کے لیے رشتے بھی، عزت اور جذبے بھی بے دھڑک قربان کیے جائیں۔ سلمان احمد اور جمشید کے بیچ بدلتے حالات کے تناظر میں اس کا دماغ بھی بہت دور تک سوچنے لگا تھا۔

اس نے دھیرے سے کہا۔ ”جمشید، تم ایک غیرت مند مرد کی طرح سوچتے ہو۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہاں کا ہر مرد ایسا ہی کرے گا مگر ایک بات ہے۔ ہم اس صورتِ حال کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ فاریسٹ افسر کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ میرے دماغ میں ایک زبردست آئیڈیا ہے۔ اگر تم ٹھنڈے دماغ سے کام لو گے تو بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

جمشید سرد لہجے میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں تمہارا دماغ شیطان کا اڈا ہے۔ کچھ نہ کچھ اس میں تماشا چلتا رہتا ہے۔ چلو اپنا آئیڈیا سناؤ۔ میں بھی دیکھتا ہوں ہم کس طرح اس افسر کو

دھوکا دے سکتے ہیں۔''
جمدر نے کہا۔ ''فقیر اللہ چچا زیادہ دور نہیں گیا ہے۔ اسے روک کر یہ فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ آپ کو فاریسٹ افسر کا سودا منظور ہے مگر ایک شرط ہے۔ تین مہینے سے پہلے وہ حنا سے شادی نہیں کرے گا۔ اس دوران میں ہم سمجھوتے کے مطابق لکڑی آگے منتقل کرتے رہیں گے۔ تین مہینے بعد تم انکار کر دینا۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ یہاں ہم مضبوط حالت میں ہیں۔ اس فاریسٹ افسر میں اتنی مجال نہیں ہو سکتی کہ زبردستی حنا کو یہاں سے بھگا کرلے جائے۔ اگر حد سے بڑھنے کی کوشش کی تو ایک گولی اس کا کام تمام کرنے کے لیے کافی ہے۔ اسے مارنے کے بعد اگر حالات مشکل ہو جائیں تو سیدھا سیدھا غیرت کے نام پر قتل کا رنگ دے دیں گے۔ ضرورت پڑنے پر کسی لڑکی کو بھی اس کے ساتھ لٹا سکتے ہیں۔ ایسے واقعات تو یہاں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔''

جمشید خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر چھایا تناؤ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی جگہ ایک وحشیانہ چمک پیدا ہو رہی تھی۔

اس نے جوش سے کہا۔ ''جمدر! میں جانتا تھا تم ایسی ہی کوئی شیطانی چال کے بارے میں بتاؤ گے۔ صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے تمہاری اس بات میں بہت وزن ہے مگر کیا ضروری ہے فاریسٹ افسر ہماری شرط مان لے گا؟ تین مہینے تک خاموشی سے ہمیں جنگل کاٹنے کی اجازت دے گا؟''

''فاریسٹ افسر سے یہ بہانہ کیا جا سکتا ہے کہ فوری شادی کرنے سے بات پھیل جائے گی۔ تمہاری بدنامی ہوگی۔ گاؤں کے اور خاندان برادری کے لوگ طعنے دے کر جینا محال کر دیں گے۔ تم کہو گے کہ کچھ عرصے بعد چپکے سے پیچھے ہٹ جاؤ گے۔ پھر وہ منصوبے کے مطابق سامنے آئے گا۔ فقیر اللہ چچا کو بھی سمجھا دیں گے کہ وہ اپنی طرف سے فاریسٹ افسر کو تین مہینے بعد شادی کے لیے راضی کرے۔ میرا خیال ہے ہماری پلاننگ کے مطابق تین مہینے نہ سہی ڈیڑھ مہینہ بھی مل جائے تو کروڑوں کی لکڑی بڑے شہروں میں پہنچا سکتے ہیں۔''

جمشید گہری سوچتی ہوئی نظریں، سبز جھیل کے فیروزی پانیوں پر جما کر بڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''تمہارے شیطانی دماغ کی یہ چال مجھے قائل کر رہی ہے۔ کچھ عرصے کے لیے فاریسٹ افسر کو دھوکے میں رکھ کر اپنا فائدہ حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ اگر حد سے بڑھ کر مسئلہ بن گیا تو اس کا پتا کاٹ دوں گا۔ اسے قتل کر کے ملک امین شیر کی پناہ میں گئے تو قانون بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

وہ دونوں سر جوڑ کر اپنے منصوبے کو آخری شکل دینے لگے۔ پھر جمدر اٹھ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اس راستے پر جانے لگا جس پر فقیر اللہ گھوڑے پہ سوار گیا تھا۔

ایک فیصلہ ان دونوں نے کیا تھا۔ ایک فیصلہ ان سب کے بارے میں مقدر نے محفوظ کیا ہوا تھا۔ اب یہ تو آنے والے وقت میں ظاہر ہونے والا تھا، کون سا فیصلہ کس کے حق میں سازگار ہوتا کس کے حق میں ستم گار ہوتا......

☆☆☆

سلمان احمد بڑی بے تابی سے فقیر اللہ کا انتظار کر رہا تھا۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ آج اس کی شہر واپسی تھی۔ فقیر اللہ کے آنے میں مزید تاخیر ہوتی تو شہر جانے کا فیصلہ کل کے لیے ملتوی ہونے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ کھلچون سے بڑی سڑک تک تین گھنٹے کا پیدل سفر تھا۔ یہ سفر بھی پہاڑوں اور کھائیوں کے درمیان سے گزر کر کرنا پڑتا تھا۔ اکثر شام کے وقت اس راستے پر سفر سے گریز کیا جاتا تھا۔ کئی دفعہ رات کو سفر کرنے والوں پر بھیڑیے اور ریچھ حملہ کر چکے تھے۔

اس پر ہر گزرتا لحہ بہت بھاری پڑ رہا تھا۔ شہر جانے کی پریشانی اپنی جگہ، اس سے بھی بڑھ کر اسے جمشید کے جواب کی فکر تھی۔ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اپنی محبت پانے کے لیے اس نے یہاں کی روایات کے خلاف قدم اٹھایا تھا۔ وہ سمجھتا تھا ایسی بات کہہ کر اس نے اپنے لیے بے شمار مسائل پیدا کیے تھے۔ قبائلی تہذیب و تمدن کے حامل یہ لوگ بات بے بات بندوق کا استعمال کرتے تھے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے قانون اور سزا کا خوف ان میں بہت کم پایا جاتا تھا۔ یہ رویے محض کھلچون تک محدود نہیں تھے۔ دیامر کی ہر وادی اور علاقے میں بسنے والوں کی فطرت میں شعلہ مزاجی اور برہم طبعی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔

یہ سب جاننے کے باوجود سلمان احمد کا جنون شوق، حنا کو پانے کا تمنائی تھا۔ یہ سب حوصلے کی بات تھی۔ جذبے کی شدت کا کمال تھا۔

بڑی بے قراری کے بعد فقیر اللہ آ گیا۔ سلمان احمد نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''چچا فقیر اللہ، بہت دیر لگا دی تم نے۔ کیا جمشید سے معاملات طے پا گئے؟''

اس نے کہا۔ ''سر! بہت مشکلوں سے چٹان اپنی جگہ سے سرک گئی ہے مگر ابھی راستہ نہیں بنا ہے۔ آپ کی خواہش

پوری ہونے میں ابھی رکاوٹیں باقی ہیں۔“

”کھل کر بتاؤ چچا! میں پہیلیاں سننے نہیں، حنا تک پہنچنے کی آسانیاں جاننے کے لیے بے قرار ہوں۔ کیا جمشید نے میری پیشکش کا مثبت جواب نہیں دیا ہے؟“

”میں آپ کی بے تابی سمجھتا ہوں سر!“ فقیر اللہ ہنس پڑا۔ ”آپ کی قسمت اچھی ہے کہ جمشید اس وقت بڑا مجبور ہے۔ لکڑی کے اس دھندے میں اس کے لاکھوں پھنس گئے ہیں۔ اسی مجبوری کی وجہ سے اس نے آپ کی آدھی بات مان لی ہے۔ وہ چاہتا ہے پہلے آپ اسے تین مہینے کی چھوٹ دے دیں۔ وہ اس دوران لکڑیاں کاٹ کے دوسری جگہ منتقل کرے گا۔ تین مہینے بعد آپ حنا سے شادی کر سکتے ہیں۔“

سلمان احمد گہری سوچ میں پڑ گیا۔ جمشید نے سودا ایک حد تک قبول کر لیا تھا، یہ اس کے لیے اطمینان کی بات تھی لیکن تین مہینے کی شرط کئی اندیشے جگا گئی تھی۔

اس نے کہا۔ ”جمشید جیسے بے ایمان شخص پر میں بھروسا نہیں کر سکتا۔ تین مہینے تک حنا کو مسلسل اپنی نظروں میں نہیں رکھ سکتا۔ میری ہزار مصروفیات ہیں۔ جمشید جیسے مکار سے کچھ بھی بعید نہیں کہ مجھے تین مہینوں کی امید میں رکھ کر یہاں کوئی تماشا دکھا دے۔ یہ اس کا علاقہ ہے۔ میری عدم موجودگی میں وہ زبردستی حنا سے نکاح پڑھوا سکتا ہے۔ اس لیے میں تین مہینے والی بات نہیں مان سکتا ہوں۔“

فقیر اللہ فکر مند لہجے میں بولا۔ ”جمشید کا بھی یہ آخری فیصلہ ہے۔ اسے یہ اندیشہ ہے فوری طور پر آپ کی اور حنا کی شادی ہو گئی تو خاندان برادری میں ناک کٹ جائے گی۔ سب طعنہ دے دے کر اس کا جینا محال کر دیں گے کہ لکڑی کے لیے اپنی عورت بیچ دی۔ اس لیے اس کی رائے ہے کہ دو تین مہینوں بعد وہ خود ہی کسی بہانے سے حنا سے دست بردار ہونے کا اعلان کرے گا۔“

سلمان بڑی دیر سوچتا رہا۔ اسے جمشید پر اعتبار نہیں تھا۔ بہت کم عرصے میں وہ اس کے مزاج سے واقف ہو گیا تھا۔ قول قرار، وعدے اور قسمیں اس کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتے تھے۔ اپنی ضرورت اور فائدے کے لیے ان کا کسی بھی موقع پر استعمال کرتا تھا۔

سلمان کے لیے دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح حنا کو بھگا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ جمشید کو لالچ دے کر ہی اپنی محبت پانے کی تدبیر اس کے لیے مناسب لگتی تھی لیکن آنکھیں بند کر کے جمشید کی بات پر بھروسا کرنے کو بھی وہ تیار نہیں تھا۔

اس نے کہا۔ ”چچا، میں جمشید پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ وہ پکے کاغذ پر لکھ کر دے گا تب بھی اس سے دھوکے کا اندیشہ رہے گا۔ اس کے باوجود میں اس کی بات ایک حد تک مان لیتا ہوں۔ تم اسے جا کر بتا دو کہ تین مہینے کے بجائے ایک مہینے کی اسے مہلت دیتا ہوں۔ ایک مہینے بعد میں حنا سے شادی کر لوں گا۔ معاہدے کے مطابق، شادی کے بعد وہ مزید دو مہینے تک لکڑی کاٹ سکتا ہے۔“

”بہتر سر، جو آپ مناسب سمجھیں۔ کیا یہ پیغام لے کر میں ابھی چلا جاؤں؟ میرے واپس آنے تک رات ہو جائے گی۔ آپ کا شہر جانا آج ممکن نہیں ہوگا۔“

سلمان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”نہیں چچا! میرا آج شہر جانا بہت ضروری ہے۔ کل دفتر میں ایک اہم میٹنگ ہے۔ تم یہ کام کل کر لو۔ اس کے علاوہ نمبردار عنایت جب شہر سے واپس آ جائے اسے میرا پیغام پہنچانا ہے۔ جس کے بارے میں تمہیں تفصیل سے بتایا ہے۔ میں آفس کے فون پر تم سے رابطہ کروں گا۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق جو ہدایات دینی ہوں گی، فون کے ذریعے ہی دے دوں گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں خود بھی آ جاؤں گا۔ اس وقت تک میری نمائندگی کرتے ہوئے تم یہ سارے معاملات طے کرو گے۔ میں چلا اس دفتر پہنچ کر تمہارے بیٹے کی نوکری کے لیے کام کروں گا۔ مجھے امید ہے تم بھی مجھے مایوس نہیں کرو گے۔“

محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ یہ پرانا مقولہ ہے۔ اپنی ضرورت کے تحت ہر کوئی اسے استعمال کرتا ہے۔ سلمان بھی اسی فلسفے پر عمل کر رہا تھا۔ وہ ویسے تو بڑا ایماندار اور فرض شناس افسر تھا۔ مگر حنا کو پانے کا ایسا سودا سما گیا تھا کہ اس کے بدلے جمشید کو غیر قانونی طور پر لکڑی کاٹنے اور آگے بیچنے کی اجازت دینے والا تھا۔

سیانے یہ بھی کہتے ہیں تمنا کا ہر دوسرا قدم کانٹوں میں اُلجھتا ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا اس کا یہ، دشت تمنا کا قدم کوچۂ جاناں تک پہنچتا ہے یا پھر راستے میں ہی لہولہان ہوتا ہے۔

☆☆☆

حنا ان دنوں بہت پریشان تھی۔ ویسے تو ہر طرف ایک خاموشی تھی۔ سلمان کے جانے کے تین دن بعد اس کا ابا شہر سے واپس آ گیا تھا۔ اگلے دن چچا فقیر اللہ گھر آیا تھا۔ ماں سے آنکھ بچا کے اسے ایک لفافہ دے گیا تھا۔ اس کے دھک دھک کرتے دل نے ایک دم سمجھ لیا تھا کہ یہ سلمان کی طرف سے کوئی پیغام ہوگا۔ محبوب کا الفت نامہ پا کے اسے مسرت تو

ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ایک خوف آمیز حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس نے تیسرے بندے کو اس راز میں شریک کیوں کیا ہے؟
کئی اندیشوں میں گھر کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ اندر سے بس چند سطروں کا مختصر رقعہ برآمد ہوا۔ اس نے لکھا تھا۔
''حنا! میں تمہاری تمنا سے باز نہیں آسکتا۔ تمہیں پانے کے لیے آخری حد تک جاؤں گا۔ میں نے راستے تلاش کرنے شروع کیے ہیں۔ بہت جلد تمہیں اس کا علم ہوگا۔ میں جانتا ہوں تمہارا حصول اتنا آسان نہیں۔ مجھے یقین ہے تم میرا ساتھ دوگی۔ آئندہ کوئی بھی بات ہوئی تو میں چچا فقیر اللہ کے ذریعے تم تک پہنچاؤں گا۔''
یہ چند سطریں پڑھ کر اس کا اضطراب دو چند ہو گیا۔ سلمان احمد نے بات واضح نہیں کی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا وہ کس طرح اسے پانے کے راستے تلاش کر رہا ہے۔ کیا جمشید آسانی سے راستے سے ہٹ جائے گا؟ کیا اس کے گھر والے اتنے بڑے فیصلے کو قبول کرلیں گے؟
شرم اور خوف کی وجہ سے فقیر اللہ چچا سے پوچھنے کی جرأت بھی نہیں تھی۔ بس ایک نامانوس سی بے چینی اور گھبراہٹ سے اس کے دن کٹنے لگے۔
ایک دن چچا فقیر اللہ گھر آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے بیٹے کو جنگلات میں نوکری مل گئی تھی۔ اس کی ڈیوٹی تھلچون میں ہی لگی تھی۔ اس کے مطابق سلمان صاحب نے اس کے بیٹے کو فاریسٹ گارڈ کی نوکری دے دی تھی۔ وہ سلمان کو دامن بھر بھر کے دعائیں دے رہا تھا۔
حنا یہ سن کے آپ ہی آپ مسکرائی تھی۔ اس کے دل میں خوشی اور فخر کے جذبات بھر گئے تھے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا یہ سب سلمان احمد نے اس کے لیے کیا ہے۔ اسے پانے کے لیے راستے ہموار کر رہا ہے۔ پھر ایک دن ساری بات واضح ہو گئی۔
اس دن وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ خالہ کے گھر گئی تھی۔ واپسی میں شام ہوگئی۔ گھر آئی تو ماں کے چہرے پہ وحشت کھنڈی ہوئی تھی۔ ابا موجود نہیں تھا۔
ماں اُسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
''جنگلات کا افسر پھر آیا ہے۔ جانتی ہو اس نے کیا کیا ہے؟ تمہارا رشتہ بھیجا ہے۔''
حنا کو ایسا لگا گویا ننگا پربت کی ساری برف شور مچاتی ہوئی آرہی ہو اور وہ ان کی زد میں آکر دب گئی ہو۔
''کک...... کیا کہہ رہی ہو ماں؟'' وہ بڑی مشکل سے تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''
''میں خود سمجھ نہیں سکی ہوں۔'' ماں اُلجھے اُلجھے انداز میں بولی۔ ''اس نے فقیر اللہ کے ذریعے پیغام بھیجا ہے۔''
اس کے دل میں وحشی گھوڑے جیسے سرپٹ دوڑنے لگے۔ ان کے سُموں تلے وہ کچلی بھی جارہی تھی۔ سلمان نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے حاصل کرنے کے راستے تلاش کر رہا ہے۔ کیا واقعی اسے کوئی راستہ مل گیا ہے جس پر چل کر وہ محبت کی جنت تک پہنچ گیا ہے؟ مگر ہزار اندیشے بھی تھے۔ لاکھوں سوال بھی تھے۔
وہ متفکر لہجے میں بولی۔ ''مگر ماں، وہ اتنا نادان نہیں۔ اسے معلوم ہے میں کسی اور کے نام سے جڑی ہوئی ہوں۔''
''یہی تو حیرت کی بات ہے۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے اس نے جمشید کو منوایا ہے۔ وہ درمیان سے ہٹ گیا ہے۔''
''ماں! میرا دل سخت گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کچھ غلط ہونے والا ہے۔ جمشید آسانی سے الگ ہوجائے، میرا دل نہیں مانتا۔''
ماں فکرمندی سے بولی۔ ''تمہارے ابا بہت پریشان تھے۔ جمشید اور اس کے گھر والے، خاص کر تمہارے بڑے ابا جو ہنگامہ کریں گے، وہ ایک طرف، پورے تھلچون میں ڈھنڈورا پٹ جائے گا۔ ہمارے لوگ بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر ہیں۔ ایسا نہ ہو تمہارے اس افسر کے ساتھ قصے پھیل جائیں۔''
حنا کا دل دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ خوف اور آنے والے دنوں کی سنگینی کے ساتھ ساتھ ایک گدگداتا احساس رگوں میں دوڑ رہا تھا۔
ماں کے چہرے پر بھی پریشانیوں کا جالا سا بن گیا تھا۔ آنکھوں میں اَن جانے موسموں کے اندیشے ہلکورے لے رہے تھے۔
حنا بوجھل سے قدموں سے چلتی کمرے میں آگئی۔ اپنی مسہری پر لیٹ کے شدید اضطراب کی حالت میں آنے والے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ خوف اتنا سوار ہو گیا تھا کہ سلمان احمد کی شریک حیات بننے کی خوشی مدھم پڑ گئی تھی۔ اس کا تعلق...... اس کی دل لگی شاید ایسے حالات کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں اندیشے تھے اور بے شمار خدشے تھے۔

عشق کے آزار میں مبتلا عشوہ گروں کی
آبلہ پائی کے مزید واقعات آئندہ ماہ پڑھیں

حرفِ غلط

جمال دستی

جرم کرنے والے اپنا ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھاتے ہیں... مضبوط اور مربوط لائحہ عمل سے ہی بازی جیتی جاتی ہے... اسے اپنے دشمن سے جان چھڑانی تھی... وہ اپنے ہر جرم کو حرفِ غلط کے مانند مٹادینے کا عادی تھا...

ایک ماہر کاریگر کی دھری رہ جانے والی کاریگری......

وہ اِس وقت شہر کے ایک معروف کارپوریٹر کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ یہ عالی شان آفس ایک معروف کاروباری علاقے میں واقع ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے گیارھویں فلور پر تھا اور بناوٹ کے اعتبار سے کسی شیش محل ایسا دِکھتا تھا۔ اس کی تیاری میں لکڑی کم اور کانچ زیادہ استعمال کیا گیا تھا جو اس کارپوریٹر کے ذوق وشوق کا عکاس تھا۔

''میں نے انڈر ورلڈ میں آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔'' کارپوریٹر نے ستائشی انداز میں گفتگو کا آغاز کرتے

ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں نے ایک خاص کام کے لیے آپ کو اپنے پاس بُلایا ہے۔ میرا یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہونے کے علاوہ بلٹ پروف بھی ہے لہٰذا ہم یہاں بیٹھ کر بے فکری سے بات کر سکتے ہیں۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”گڈ......!“ کارپوریٹر زیرِلب مسکرایا اور اپنی میز کی دراز میں سے بھورے رنگ کا لفافہ برآمد کرلیا۔

اس دوران میں وہ چپ چاپ بیٹھا، سنجیدہ نظر سے کارپوریٹر کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ کارپوریٹر نے براؤن لفافے کے اندر سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک رنگین تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اور مذکورہ فوٹو پر اپنی انگشتِ شہادت سے دستک دینے کے بعد کہا۔

”ہنٹر! یہ ہے تمہارا ٹارگٹ......“

جبران علی ال معروف بہ ہنٹر نے وہ تصویر اٹھالی اور اس پر ایک گہری نگاہ ڈالنے کے بعد اسے دوبارہ میز پر اسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا پھر وہ اپنے کلائنٹ، اس کارپوریٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔

”آپ کا کام ہوجائے گا مسٹر ولید......“

”میں ”آپ“ کے بجائے ”تم“ میں زیادہ ایزی فیل کرتا ہوں......“ ولید احمد نے کہا۔ ”اسی لیے میں بات کرتے ہوئے آپ سے تم پر اُتر آیا ہوں۔ تم نے میرے اس رویے کو مائنڈ تو نہیں کیا؟“

”میں فضول چیزوں پر دھیان نہیں دیتا اور تکلفات بھی ایک ایسی ہی شے ہے۔“ ہنٹر نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”میرا فوکس صرف اپنے کام پر ہوتا ہے اور یہ میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنی فیس کا ففٹی پرسنٹ ایڈوانس میں لیتا ہوں......“

”میں جانتا ہوں۔“ ولید احمد نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک اسائنمنٹ کے ایک ملین لیتے ہو...... پانچ لاکھ کام سے پہلے اور پانچ لاکھ کام کی تکمیل پر اسی لیے میں نے......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور میز کے پہلو میں رکھا ہوا ایک چرمی بیگ اٹھالیا پھر مذکورہ بیگ کو ہنٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔

”میں نے تمہارے ایڈوانس کی رقم، بڑے نوٹوں کی شکل میں پہلے سے اس بیگ میں رکھی ہوئی ہے۔ تم اپنے نصف معاوضے کو گن کر اطمینان کر سکتے ہو...... یہ پورے ساڑھے سات لاکھ ہیں۔ میں اپنے معاملات کا کھرا اور وعدے کا پکا ہوں......“

”میں اپنے کلائنٹس پر بھروسا کرتا ہوں اس لیے میں نے کبھی رقم گننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ ہنٹر نے اپنے کلائنٹ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا مسٹر ولید......“

”شیور......!“ کارپوریٹر ولید احمد ہمہ تن گوش ہو گیا۔

”میرے معاوضے کا آدھا پانچ لاکھ بنتے ہیں۔“ ہنٹر نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ”پھر آپ نے اس بیگ میں ساڑھے سات لاکھ کیوں ڈالے ہیں؟“

”اسے تم اپنا انکریمنٹ سمجھ لو...... میں نے تمہاری فیس میں ففٹی پرسنٹ کا اضافہ کردیا ہے۔“ کارپوریٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”آج کے بعد تم اپنے کلائنٹ سے ون پوائنٹ فائیو ملین معاوضہ وصول کیا کرو گے......“

چند لمحات کے تذبذب کے بعد ہنٹر نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ”چلے گا......“

”اس براؤن لفافے کے اندر ٹارگٹ کے حوالے سے تمام ضروری معلومات موجود ہیں۔“ کارپوریٹر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے اور اسے شکار کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“

ہنٹر نے ٹارگٹ کی تصویر کو بھی لفافے میں رکھ لیا۔

”میں اطمینان سے یہ سب دیکھ لوں گا......“ اس نے پھر ایک اہم سوال کیا۔ ”ٹائم فریم کیا ہے؟“

”زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ......“ کارپوریٹر نے کہا۔

”یہ میری ضرورت سے زیادہ ہے۔“ ہنٹر نے اپنے کلائنٹ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تین دن کے اندر اس اسائنمنٹ کو پورا کر دوں گا...... ایک آخری سوال......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری نظر سے ولید احمد کو دیکھا اور پوچھا۔

”آپ کس قسم کی موت چاہیں گے؟ میں اپنے کلائنٹ کی ہر ضرورت پوری کرتا ہوں......“

”عین فطری اور طبعی موت......“ کارپوریٹر نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”آپ میرے پہلے کلائنٹ ہیں جو اس نوعیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“ ہنٹر نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

''اس کا ایک خاص سبب ہے جو تمہیں بتانا میں ضروری سمجھتا ہوں......'' کارپوریٹر نے رازدارانہ انداز میں کہا۔''اگر اس شخص کی حادثاتی موت واقع ہوئی یا اسے خنجر، زہر، گن، اسنائپر وغیرہ کی مدد سے فنا کے گھاٹ اتارا گیا تو پولیس کا ہاتھ میرے گریبان تک پہنچ سکتا ہے کیونکہ اس نے اپنے وکیل کے ذریعے متعلقہ تھانوں میں، ایک وصیت کی صورت یہ رپورٹ درج کرا رکھی ہے کہ اس کی جان کو مجھ سے خطرہ ہے۔ وہ کارپوریٹ ورلڈ میں دن دگنی، رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور میں اس کی کامیابی سے خوف زدہ ہوں چنانچہ اسے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش میں ہوں......اس نے اپنی وصیت میں واضح طور پر ان الفاظ کو درج کروا رکھا ہے......''اگر مجھے کوئی جان لیوا حادثہ پیش آجائے یا مجھے قتل کر دیا جائے تو میری موت کا ذمّے دار میرے کاروباری حریف ولید احمد کو سمجھا جائے......''

''کافی شاطر اور چال باز شخص ہے۔'' ہنٹر نے معنی خیز انداز میں کہا۔''ایسے لوگوں کو نمٹاتے ہوئے مجھے بہت مزہ آتا ہے۔''

''اگر اس کا شاطر پن اور چال بازی بزنس تک محدود رہتی تو میں ہر قدم پر ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتا۔'' کارپوریٹر نے زہر خند لہجے میں کہا۔''لیکن اس نے معاملے کو خاصا پرسنل کر دیا ہے۔ وہ اس جنگ میں بے اصولی پر اُتر آیا ہے اور مجھے اندر سے توڑنے کے لیے اس نے میری ایک عزیز ہستی کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ ماہ جبیں......'' یکایک اس کا لہجہ خواب ناک ہو گیا۔

''جو کبھی میری تنہائی کی ساتھی ہوتی تھی، اب وہ اس کمینے کا پہلو گرماتی ہے۔ اس خطا کے لیے میں اس بدذات کو کبھی معاف نہیں کر سکتا اور اس کی کم از کم سزا موت ہے......''

''آپ بے فکر ہو جائیں مسٹر ولید......'' ہنٹر نے مستحکم انداز میں کہا۔

''آپ کا کام آپ کی مرضی اور خواہش کے عین مطابق انجام دیا جائے گا۔''

''ہوں......'' کارپوریٹر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''میں نے اس براؤن لفافے میں ماہ جبیں کی ڈیٹیلز بھی احتیاطاً رکھ دی ہیں، ہو سکتا ہے اس سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل ہو جائے......''

بات کے اختتام پر کارپوریٹر نے ایسی نظر سے ہنٹر کی طرف دیکھا جس میں سنسنی خیزی اور سفاکی پائی جاتی تھی۔

ہنٹر نے جواب میں اپنے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر صرف اتنا کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''چلتا ہوں......''

''ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہنٹر......'' کارپوریٹر نے ٹھوس انداز میں کہا۔''میں اپنے جرم کا کبھی کوئی سراغ نہیں چھوڑتا......ہر وہ چھوٹے سے چھوٹا ثبوت جو کسی بھی مرحلے پر میرے خلاف جا سکتا ہو، میں اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالتا ہوں......''

کارپوریٹر کی اس بات کے جواب میں ہنٹر نے سر کو اثباتی جنبش دی اور منی سائز کے لیدر بیگ کو اٹھا کر اس کا محل سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''کارپوریٹ ورلڈ'' دورِ جدید کا بزنس ٹرینڈ ہے اور انتہائی منافع بخش بھی......اس کی فلاسفی نہایت ہی سادہ اور پُرمغز ہے۔ ایک کارپوریٹر کسی غیر ملکی کمپنی کے کندھوں پر سوار ہو کر آپ کے ملک میں اپنا بزنس شروع کرتا ہے۔ وہ آپ کے ملک میں پیدا ہونے والی اشیا کو آپ سے سستے داموں خرید کر انہیں ایک خاص پروسس سے گزارنے کے بعد مہنگے داموں آپ کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور لاکھوں، کروڑوں کما لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرتی پیداوار کی مقدار عام مارکیٹ میں بہت کم رہ جاتی ہے جو اصل سے دگنا قیمت پر عوام کو خریدنا پڑتی ہے......!

ہنٹر کے ٹارگٹ کا نام حارث محمود تھا۔ وہ جوس اور منرل واٹر کے بزنس کا ایک ابھرتا ہوا ستارہ تھا۔ ہنٹر کا کلائنٹ ولید احمد بھی کافی عرصے سے اسی بزنس میں تھا مگر ٹارگٹ کی آمد کے بعد کلائنٹ کو اس بزنس میں قدم جمائے رکھنا خاصا مشکل محسوس ہو رہا تھا، گویا ٹارگٹ، کلائنٹ کو ٹف ٹائم دے رہا تھا اسی لیے کلائنٹ نے ہنٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔

اس براؤن لفافے میں ٹارگٹ کے بارے میں مکمل معلومات موجود تھیں۔ اس کا سیل نمبر، گھر اور آفس کے لینڈ لائن نمبرز اور ان مقامات کی لوکیشنز......اس کی دن بھر کی نقل و حرکت......وغیرہ......!

اسی دن ہنٹر اپنے کام سے لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے کلائنٹ کو بھروسا دلایا تھا کہ وہ تین دن کے اندر اس اسائنمنٹ کو پورا کر دے گا لہٰذا اسے فوری طور پر کام سے تو لگنا ہی تھا۔ ٹارگٹ کی تمام ڈیٹیلز اس کے سامنے تھیں۔ اگر ٹارگٹ کو اسنائپر شوٹ کرنا ہوتا تو یہ ہنٹر کے لیے ایک آسان

ٹاسک تھا مگر اس کے کلائنٹ نے عین فطری اور طبعی موت کی شرط عائد کر دی تھی چنانچہ اسے بھی کسی فطری اور گھریلو راستے ہی کو اپنانا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی پہلی نظر ماہ جبیں پر گئی۔

ٹارگٹ نے اس حسینہ کو ساحلِ سمندر پر ایک لگژری اپارٹمنٹ میں رکھا ہوا تھا اور اس کا سارا خرچہ اٹھاتا تھا۔ اس کا جب بھی موڈ ہوتا، وہ تنہائی کے لمحات کو رنگین اور حسین بنانے کے لیے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ ماہ جبیں یہی ''سروس'' پہلے کلائنٹ کے لیے کیا کرتی تھی۔ وہ اپنی ایک کمزوری سے مجبور ہو کر ٹارگٹ کے پاس آ تو گئی تھی لیکن ہر لمحے اسے کلائنٹ کی جانب سے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ وہ کلائنٹ کی کینہ پروری اور سفاکی سے اچھی طرح واقف تھی۔

ہنٹر نے ایک ہی دن میں اپنے مشن کے تمام لوازمات کو لائن اپ کر لیا۔ وہ فیلڈ میں اُترنے سے پہلے ہر زاویے کو اچھی طرح چیک کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے یہ معلوم کر لیا کہ آئندہ روز اس کا ٹارگٹ اپنی ہم نشیں سے ملنے ساحلِ سمندر والے اپارٹمنٹ پر جائے گا...... ہنٹر نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اتر گیا۔

ٹارگٹ، ماہ جبیں کے پاس۔ ''وقت گزاری'' کے لیے عموماً شام میں آیا کرتا تھا اور آدھی رات سے پہلے واپس لوٹ جاتا تھا۔ ہنٹر ایک کوریئر بوائے کے روپ میں ماہ جبیں کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا اور آج شام میں ٹارگٹ نے لازمی اس اپارٹمنٹ کا وزٹ کرنا تھا۔ ہنٹر نے اپارٹمنٹ کی اطلاعی گھنٹی بجائی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے دروازہ کھل گیا۔ ماہ جبیں نے حیرت بھری نظر سے کوریئر والے کو دیکھا۔ ہنٹر نے اس کے لاثانی حسن سے متاثر ہوئے بغیر ایک پارسل اور ایک چارٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

''میڈم! یہاں پر سائن کر دیں......''

''مگر میرا یہ ایڈریس تو کسی کو پتا ہی نہیں......'' ماہ جبیں نے پارسل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''پھر کس نے یہ پیکٹ بھیج دیا؟''

''پارسل کے پیچھے بھیجنے والے کا نام اور ایڈریس لکھا ہوا ہے......''

ہنٹر نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر آپ اسے ریسیو نہیں کریں گی تو میں واپس لے جاؤں گا...... سمپل!''

بے ساختہ ماہ جبیں نے مذکورہ پارسل کو پلٹ کر دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ بھیجنے والے کا نام اور ایڈریس پڑھنے کی کوشش کرتی، ہنٹر نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنی گن نکالی اور ماہ جبیں کے سینے کو نشانے پر رکھتے ہوئے وہ غرایا۔

''الٹے قدموں اندر چلو...... فوراً۔''

ہنٹر کے تحکمانہ لہجے میں ایسی درندگی جھلکتی تھی کہ ماہ جبیں کے حواس مختل ہو گئے اور وہ کسی روبوٹ کے مانند اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپارٹمنٹ کے اندر پہنچ گئی۔

ہنٹر نے اپنی پشت پر اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کیا اور ماہ جبیں کو اپنی گن کے نشانے پر رکھتے ہوئے اسے لاؤنج میں لے آیا پھر قدرے دوستانہ انداز میں بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

ماہ جبیں میکانکی انداز میں بلا سوچے سمجھے ایک صوفے پر ڈھے سی گئی۔ پارسل ابھی تک اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ ہنٹر نے اس کے سامنے والا صوفہ سنبھال لیا اور اپنی گن پر سائیلنسر فٹ کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اس پارسل کو کھول کر دیکھو۔''

ماہ جبیں اتنی خوف زدہ تھی کہ وہ پارسل بھیجنے والے کا نام دیکھنا بھول گئی اور ہنٹر کے حکم کی بجا آوری میں لگ گئی۔

پارسل کھلنے پر اندر سے نصف درجن تصاویر برآمد ہوئیں۔ وہ تمام تصاویر ایک آٹھ سالہ بچے کی تھیں جو اسکول یونیفارم میں نظر آ رہا تھا۔ بعض تصاویر میں اس بچے کے عقب میں ہاسٹل نما ایک بڑی سی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ دو تصاویر ایسی بھی تھیں جو اس بچے کو ایک کمرے میں محبوس دکھاتی تھیں۔ حالتِ قید میں مذکورہ بچہ بہت سہما ہوا نظر آتا تھا۔

''یہ تو میرا بیٹا کاشی ہے۔'' ماہ جبیں نے وحشت زدہ انداز میں کہا۔ ''میں نے اسے بورڈنگ میں ڈال رکھا ہے۔''

''اس وقت تمہارا یہ بیٹا کاشف عرف کاشی بورڈنگ میں نہیں بلکہ میری کسٹڈی میں ہے اور بالکل محفوظ بھی۔'' ہنٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ آئندہ بھی محفوظ رہ سکتا ہے، اگر تم عقل مندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو......''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' ماہ جبیں نے بکھری
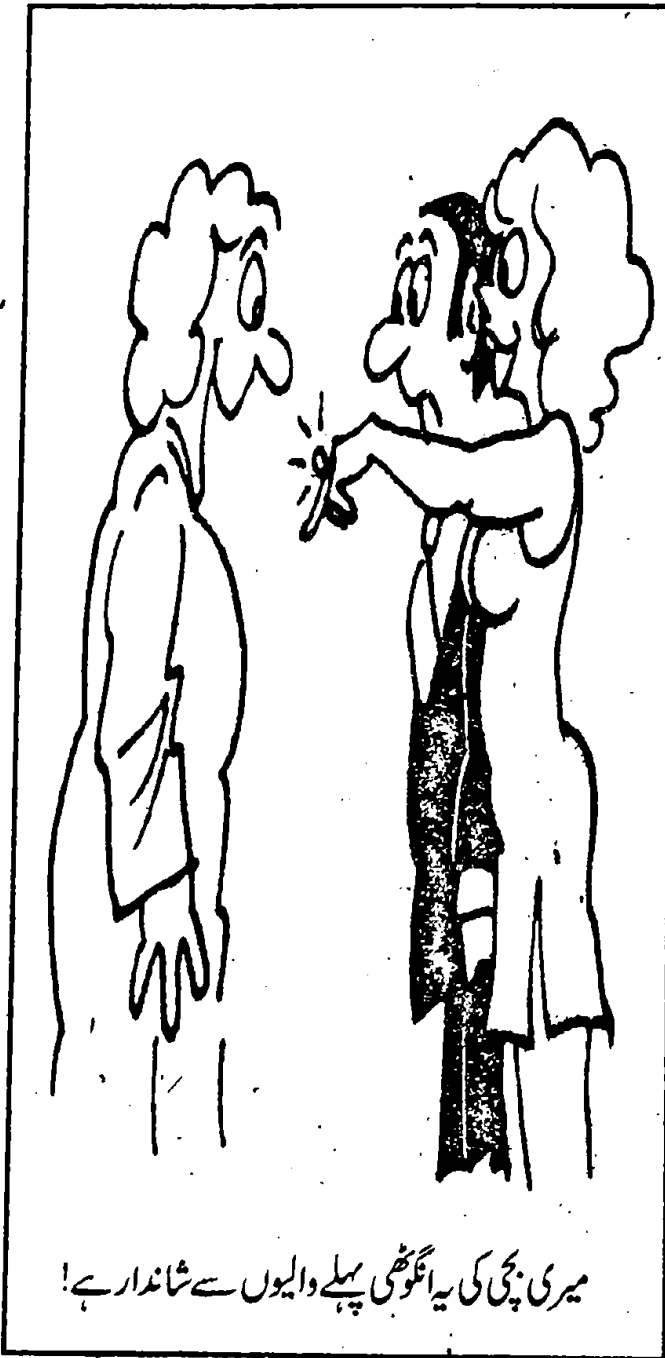
میری بچی کی یہ انگوٹھی پہلے والیوں سے شاندار ہے!

ہوئی آواز میں پوچھا۔ ’’میں کاشی سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں۔ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

’’ہر ماں اپنی اولاد سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔‘‘ ہنٹر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ’’اسی لیے اسے اپنی اولاد کی خاطر زندگی بھر کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔‘‘

’’پلیز...... تم میرے کاشی کو کچھ نہیں کرنا۔‘‘ وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ ’’اس کی سلامتی کی خاطر میں تمہاری ہر بات مان لوں گی۔‘‘

’’تمہارے پاس اور کوئی آپشن بھی نہیں ہے۔‘‘ ہنٹر نے بے رحمی سے کہا۔ ’’پہلے تم اپنے بیٹے سے بات کرلو۔ باقی سب بعد میں......‘‘

پھر ہنٹر نے اپنے سیل فون سے کہیں کال لگائی اور سیل فون کو اسپیکر پر ڈالنے کے بعد ماہ جبیں کی جانب بڑھا دیا۔ اگلے ہی لمحے فون کے اسپیکر پر کاشی کی آواز ابھری۔

’’ہیلو ممی! آپ کیسی ہیں؟‘‘

’’میں ٹھیک ہوں میری جان۔‘‘ ماہ جبیں نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔ ’’تم کہاں ہو؟ تمہیں کسی نے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟‘‘

’’نہیں ممی...... میں بہت مزے میں ہوں۔‘‘ کاشی نے جواب دیا۔ ’’یہ انکل بہت اچھے ہیں۔ آپ ان کی بات مان لوگی تو یہ مجھے واپس بورڈنگ میں پہنچادیں گے۔‘‘

’’اوکے بیٹا...... آئی لو یو۔‘‘ ماہ جبیں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’آئی لو یو ٹو ممی......‘‘ کاشی کی آواز سنائی دی۔

’’سیلولر ملاقات کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔‘‘ ہنٹر نے ماہ جبیں کے ہاتھ سے اپنا سیل فون واپس لیتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ’’جیسا کہ کاشی نے تمہیں بتایا ہے کہ انکل بہت اچھے ہیں۔ اگر آپ میری بات مان لوگی تو میں کاشی کو صحیح سلامت اس کے بورڈنگ ہاؤس پہنچادوں گا تو...... اس میں رتی برابر بھی شک یا جھوٹ نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں، وہ لازمی کرتا ہوں۔‘‘

ماہ جبیں کو اس بات کا تو بہ خوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ گن بردار اس کی یا اس کے بیٹے کی جان کا دشمن نہیں ہے لیکن وہ اس کے مقاصد سے واقف نہیں تھی۔

’’تم یہ سب کس لیے کررہے ہو؟‘‘ اس نے ہمت کرکے پوچھ لیا۔ ’’آخر تمہیں مجھ سے چاہیے کیا......؟‘‘

’’صرف تمہارا دوستانہ تعاون!‘‘ ہنٹر نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ’’اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ اس کے بعد میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟‘‘

’’بڑی اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔‘‘ ماہ جبیں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ’’آؤ، بیڈروم میں چلتے ہیں۔ تم اپنی خواہش پوری کرو اور یہاں سے چلے جاؤ اور...... میرے بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میں ساری اذیتیں کاشی کے روشن مستقبل ہی کے لیے برداشت کررہی ہوں۔‘‘

’’تم مجھے بیڈروم میں کیوں لے کر جانا چاہتی ہو؟‘‘ ہنٹر نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

’’تاکہ تم اپنی خواہش پوری کرسکو۔‘‘ ماہ جبیں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ’’ہر مرد، ایک عورت سے یہی تو چاہتا

ہے۔ کبھی دولت کے زور پر، کبھی طاقت کے بل بوتے پر اور کبھی اس کے معصوم بیٹے کو اغوا کر کے......''

''تم الٹی کھوپڑی کی مالک ہو۔'' ہنٹر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے تم دنیا کے تمام مردوں کو ایک ہی ترازو میں تول رہی ہو۔''

''تو پھر......'' وہ حد درجہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کیوں آئے ہو یہاں؟ تم نے کاشی کو کس مقصد سے اغوا کیا ہے؟ تمہیں مجھ سے چاہیے کیا......؟''

''مجھے تم سے نہیں، اس سے مطلب ہے۔'' ہنٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جو تھوڑی دیر میں یہاں آنے والا ہے...... اپنی ایک خاص ضرورت پوری کرنے اور...... اپنا پیسا وصول کرنے......''

''تم حارث محمود کی بات کر رہے ہو؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''پہلی مرتبہ تم ٹھیک سمجھی ہو۔'' ہنٹر نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں اسی بندے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں اس کے ساتھ کچھ کرنا چاہتا ہوں اور وہ تمہارے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔''

''تم حارث محمود کے ساتھ کچھ کرنے کی خواہش رکھتے ہو۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے ہنٹر کو دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ''تو تم اس لائن کے ہو......؟''

''کیا تمہارا دماغ صرف اسی سبجیکٹ پر سوچتا ہے؟'' ہنٹر نے بیزاری سے کہا۔ ''کیا ایک مرد کو دوسرے مرد سے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہو سکتا؟''

''تو پھر تم ہی بتاؤ۔'' وہ ایک مضمحل سانس خارج کرتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''تمہیں حارث محمود سے کیا کام ہے اور میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''اب آئی ہو تم پٹری پر۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اب میری بات دھیان سے سنو۔ تھوڑی دیر میں تمہارا فنانسر، اپنی شام کو رنگین اور سنگین بنانے یہاں آنے والا ہے۔ وہ آتے ہی تم سے کافی کی فرمائش کرے گا کیونکہ اسے تمہارے ہاتھوں سے بنائی گئی کافی بہت پسند ہے اور تم......''

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

''جیسے یہ معلوم کہ تمہارا کاشی کس بورڈنگ ہاؤس میں ہے اور حارث سے پہلے تم ولید احمد کی دل بستگی کا سامان ہوا کرتی تھیں......'' ہنٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اب مزید کوئی سوال نہیں۔ میری بات کو توجہ سے سنو کیونکہ وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔ میری بات بھیجے میں اتری کہ نہیں؟''

''اتر گئی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آگے کیا؟''

''تم اس کے لیے جو کافی بناؤ گی، میں اس کافی میں ایک انجکشن ملا دوں گا۔ تم وہ کافی اسے سرو کر دو گی۔ وہ جیسے ہی کافی ختم کرے گا، میں تمہارے اپارٹمنٹ سے نکل جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی تمہارے بیٹے کاشی کو اس کے بورڈنگ ہاؤس پہنچا دیا جائے گا۔ یہ میرا تم سے ایک اصلی مرد والا وعدہ ہے۔''

''تمہاری بات ماننے کے سوا میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''میں امید کروں گی، تم زبان کے دھنی ایک اصلی مرد ہی ثابت ہو۔''

''میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔

''کیا میں جان سکتی ہوں کہ اس انجکشن کے اندر کس قسم کی دوا ہے؟'' ماہ جبیں نے پوچھا۔ ''اگر وہ کافی پی کر حارث کو کچھ ہو گیا تو میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گی اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔ تم میری پوزیشن کو سمجھ سکتے ہو۔''

''میں تمہاری پوزیشن اور سچویشن سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' ہنٹر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اطمینان رکھو کہ تم پر کوئی بات نہیں آئے گی۔ کافی میں ملائے گئے انجکشن سے حارث کی طبیعت میں بوجھل پن اور بیزاری سی آ جائے گی بلکہ یوں سمجھو کہ وہ بے رغبتی کا شکار ہو جائے گا اور اسے نیند آنے لگے گی۔ میرے خیال میں وہ کافی پینے کے بعد آدھے گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں رکے گا اور اپنے گھر روانہ ہو جائے گا۔ اگر رات میں اس کے ساتھ کچھ ہو جاتا ہے تو اس سے تمہارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اس حوالے سے کبھی کوئی تم سے سوال نہیں کرے گا۔''

''اور اس تمام عرصے میں تم ادھر ہی رہو گے؟''

''بے شک!'' ہنٹر نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''کام مکمل ہونے سے پہلے میں یہاں سے جا نہیں سکتا۔''

''مجھے نہیں معلوم تمہارے اس ''کام'' کے پیچھے کون سے مقاصد پوشیدہ ہیں لیکن میں کاشی کی سلامت زندگی کے لیے تم سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ تم اسے ایک ماں کی

مجبوری سمجھ سکتے ہو۔‘‘

’’میں کسی کی مجبوری سے کبھی کھلواڑ نہیں کرتا۔‘‘ ہنٹر نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’حارث کے یہاں سے روانہ ہونے کے بعد میں دوبارہ کاشی سے تمہاری بات کراؤں گا اور وہ بھی اس کے بورڈنگ ہاؤس سے۔‘‘

’’بس، میرے سکون کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔‘‘ وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔

’’میں اس کو کافی نہیں سمجھتا۔‘‘ ہنٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’تم مجھ سے جو تعاون کرنے جا رہی ہو، اس کا تمہیں انعام بھی ملے گا۔ میں یہاں سے جاتے ہوئے تمہیں پورے ڈھائی لاکھ روپے دوں گا تاکہ تم انہیں کاشی کے بہتر مستقبل کے لیے خرچ کرسکو۔ ہمارے اس مختصر سے ڈرامے میں اس بچے کا بھی ایک اہم رول ہے۔ وہ بھی معاوضے کا حق رکھتا ہے۔‘‘

ماہ جبیں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنٹر کی بات کے جواب میں کیا کہے۔ بالآخر اس نے سرسری انداز میں ایک اہم سوال کیا۔

’’اس دوران میں تم خود کو اس اپارٹمنٹ میں چھپا کر کیسے رکھو گے۔ اگر حارث کی تم پر نظر پڑ گئی تو تمہارا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا اور تمہارے ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی۔ وہ اپنے ساتھ ایک گن بھی رکھتا ہے۔‘‘

’’یہ سب سوچنا تمہارا نہیں، میرا کام ہے۔‘‘ ہنٹر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ’’تم بس اتنا کرو، جتنا میں کہوں۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔‘‘

ادھر ہنٹر کی بات ختم ہوئی، ادھر اپارٹمنٹ کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ شام کا آغاز ہو گیا تھا اور اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا شخص حارث محمود کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے سیل فون پر ہنٹر کی کال آئی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کرلی اور چھوٹتے ہی کہا۔

’’میں نے وہ خبر پڑھ لی ہے اور نیوز چینل پر بھی دیکھی ہے۔ واقعی، تم کمال کے انسان ہو......‘‘

’’مسٹر ولید!‘‘ ہنٹر نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ’’ہمارے درمیان کچھ حساب باقی ہے۔‘‘

’’بالکل ہے اور حساب کو بے باق ہو جانا چاہیے۔‘‘ اس کے کلائنٹ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

’’تو پھر میں اپنی باقی کی پے منٹ لینے کب آؤں؟‘‘

’’دو گھنٹے کے بعد تم کسی وقت بھی آسکتے ہو۔‘‘ کلائنٹ نے کہا۔ ’’میں شام چھ بجے تک اپنے آفس میں موجود ہوں۔ جب بھی آنا ہو، ٹائم کنفرم کرکے آجانا۔ تمہیں تمہاری پے منٹ ریڈی ملے گی۔‘‘

’’میں ٹھیک دو گھنٹے کے بعد ہی آپ کے پاس حاضر ہوں گا۔‘‘ ہنٹر نے کہا۔ ’’یہی میرا کنفرم ٹائم ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہو گیا۔‘‘ کلائنٹ نے کہا۔ ’’مگر ایک چھوٹی سے پرابلم ہے۔‘‘

’’کیسی پرابلم؟‘‘ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

’’گزشتہ رات ہمارے بیسمنٹ میں دو کتے مرے ہوئے ملے ہیں۔‘‘ ولید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ’’ان آوارہ کتوں نے کہیں سے کوئی زہریلی شے کھالی تھی اور گارڈ کی نظر بچا کر وہ بلڈنگ کے بیسمنٹ میں گھس گئے۔ آج صبح ان کی لاشوں کو نکلوایا گیا ہے اور پورے بیسمنٹ کی صفائی دھلائی کا عمل جاری ہے اسی لیے......‘‘ وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’اس لیے تمہیں اپنی گاڑی باہر سڑک پر ہی پارک کرنا ہوگی۔ اس زحمت کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔‘‘

’’نو ایشو۔‘‘ ہنٹر نے بے پروائی سے کہا۔ ’’میں اپنی کار کو سائڈ اسٹریٹ میں پارک کردوں گا۔ وہاں اچھی خاصی جگہ ہوتی ہے۔‘‘

’’اوکے...... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔‘‘ کلائنٹ نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ’’تمہارے ساڑھے سات لاکھ کے ساتھ۔‘‘

’’ملتے ہیں!‘‘ یہ کہتے ہوئے ہنٹر نے رابطہ موقوف کر دیا۔

گزشتہ شام ہنٹر نے ماہ جبیں کے ساتھ کیے ہوئے تمام وعدے نبھا دیے تھے اور اس کے اپارٹمنٹ کو چھوڑتے وقت وہ اسے ڈھائی لاکھ کے کرنسی نوٹ بھی دے آیا تھا۔ یہ وہی رقم تھی جو ولید نے اسے فیس سے زیادہ دی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کلائنٹ کے سامنے کچھ نہیں بولا تھا لیکن اس نے طے کرلیا تھا کہ اوپر کے پانچ لاکھ روپے وہ نیک مقاصد میں لگائے گا۔ ڈھائی لاکھ روپے وہ کل ماہ جبیں کو دے آیا تھا اور آج اسے جو ایکسٹرا ڈھائی لاکھ ملنے والے تھے انہیں اس نے ایک خیراتی ادارے میں دینے کا سوچ رکھا تھا۔ مذکورہ ادارہ یتیم اور بے سہارا بچوں کی کفالت اور نگہداشت کرتا تھا۔

ٹھیک دو گھنٹے کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے

ہوئے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ولید نے ترنگ بھرے لہجے میں کہا۔
”معروف بزنس مین حارث محمود گزشتہ رات اپنے بیڈ روم میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔“
ہنٹر نے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔
”مائنڈ بلوئنگ...... بلکہ مائنڈ بلاسٹنگ ہنٹر......“ وہ حیرت، ستائش اور تحسین کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ ”میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ تم نے یہ کارنامہ کیسے انجام دیا۔“
”آپ کی یہی ڈیمانڈ تھی نا مسٹر ولید۔“ ہنٹر نے معتدل انداز میں کہا۔ ”عین فطری اور طبعی موت...... آپ میرے کام سے مطمئن تو ہیں نا......؟“
”مطمئن بھی ہوں اور خوش بھی۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ”اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ تم نے یہ کمال کیسے کیا ہے؟“
ہنٹر چند لمحات تک اپنے کلائنٹ کو تکتا رہا پھر ٹھوس انداز میں بولا۔ ”یہ ’میتھائل پائرولی ڈینائل پائری ڈین‘ کا کمال ہے......“
”آسان الفاظ میں بولیں تو......؟“
ہنٹر نے آسان الفاظ میں بول دیا۔ ”لیکوئیڈ نیکوٹین۔“
”لیکوئیڈ نیکوٹین......“ کلائنٹ نے ہنٹر کے الفاظ دہرائے۔ ”نیکوٹین تو تمباکو میں پایا جانے والا ایک زہریلا مادہ ہے۔ تم نے اس کی لیکوئیڈ فارم کو اپنے ٹارگٹ کے جسم میں کیسے پہنچایا؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ کیا لیکوئیڈ نیکوٹین سے کسی انسان کی اس طرح موت واقع ہو جاتی ہے؟“
”میں آپ کے دوسرے سوال کا جواب پہلے دوں گا۔“ ہنٹر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لیکوئیڈ نیکوٹین خون میں شامل ہونے کے بعد انسان کے دل پر اثر کرتی ہے اور تین سے پانچ گھنٹے میں اس کے دل کی حرکت کو مکمل طور پر روک دیتی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ٹیسٹ یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس انسان کی موت حرکتِ قلب بند ہونے سے نہیں ہوئی اور اسموکرز کے معاملے میں تو ڈاکٹروں کا فتویٰ ’ہارٹ اٹیک‘ سے شروع ہو کر ’ہارٹ اٹیک‘ پر ہی ختم ہوتا ہے۔“
”حارث بہت زیادہ سگریٹ پینے کا عادی تھا بلکہ اسے ایک ’چین اسموکر‘ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔“ کلائنٹ نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر سوالیہ نظر سے وہ ہنٹر کو تکنے لگا۔
”اوہ...... آپ کا پہلا سوال......“ ہنٹر نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مسٹر ولید! میں آپ کے اس سوال کا مفصل جواب دینا چاہوں گا لیکن اس کے بدلے میں آپ کو میری ایک بات ماننا ہوگی۔“
”ضرور مانوں گا۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں اور یہ خوشی تم نے مجھے دی ہے۔“
ہنٹر نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اپنے کلائنٹ کو بتا دیا کہ اس نے لیکوئیڈ نیکوٹین کو کس طرح حارث محمود کے معدے میں پہنچایا تھا۔
”ویل ڈن!“ ہنٹر کی بات ختم ہونے پر کلائنٹ نے استفسار کیا۔ ”اب یہ بھی بتا دو کہ مجھے تمہاری کون سی بات ماننا ہوگی؟“
”میں چاہتا ہوں کہ آپ ماہ جبیں کو معاف کر دیں۔“ ہنٹر نے معتدل انداز میں کہا۔ ”وہ اپنے بچے کی وجہ سے مجبور ہو گئی تھی۔ اسے ایک محفوظ پناہ کی ضرورت ہے اور یہ تحفظ اسے آپ ہی فراہم کر سکتے ہیں۔“
”آئیڈیا اچھا ہے۔“ کلائنٹ نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سمجھ لو کہ میں نے تمہارا کام کر دیا۔ تم مطمئن ذہن کے ساتھ جا سکتے ہو۔“
ہنٹر نے اپنے کلائنٹ کا شکریہ ادا کیا، اپنی باقی کی ففٹی پرسنٹ فیس وصول کی اور ولید کے آفس سے نکل آیا۔
اس نے اپنی کار کو بغلی گلی میں پارک کر رکھا تھا۔ وہ گاڑی کے اندر آ کر بیٹھا۔ سب سے پہلے اس نے ساڑھے سات لاکھ روپے کے کرنسی نوٹوں کو کار کے دروازوں کی لائننگ کے اندر چھپایا پھر چابی کو اگنیشن کے اندر داخل کر دیا۔
چابی اپنے مخصوص سلاٹ کے اندر ٹھیک سے گھس گئی لیکن قبل اس کے کہ ہنٹر چابی گھما کر اپنی کار اسٹارٹ کر پاتا، ایک دہکتی ہوئی آہنی سلاخ اسے اپنے سر میں داخل ہوتی محسوس ہوئی، کسی نزدیکی عمارت کی چھت پر گھات لگائے بیٹھے اسنائپر کی چلائی ہوئی بے آواز نائن ایم ایم بلٹ نے ہنٹر کی کھوپڑی کے آر پار ہوا دان بنا دیا تھا۔
زندگی کے آخری لمحات میں ہنٹر کے ذہن میں صرف ایک ہی سوچ تھی اور یہ سوچ دراصل اس کے آخری کلائنٹ کے کہے ہوئے یہ الفاظ تھے۔
”میں اپنے جرم کا کبھی کوئی سراغ نہیں چھوڑتا۔ ہر وہ چھوٹے سے چھوٹا ثبوت جو کسی بھی مرحلے پر میرے خلاف جا سکتا ہو، میں اسے ’حرفِ غلط‘ کی طرح مٹا ڈالتا ہوں۔“

❖❖❖

منہ توڑ

سیرینا راض

جانور ہو یا انسان اسے اپنی خصلت سے تعلق رکھنے والی چیزیں بڑی مرغوب ہوتی ہیں... اپنی اپنی پسند کے مطابق ہی پرواز کرتے ہیں... اپنی ذات سے محبت کرنے والے ہمیشہ اپنے فائدے کو ترجیح دیتے ہیں... وہ بھی وقتی فائدہ... ایک شاطر چال باز اور دھوکے باز کے مختلف روپ... اس کا ہر روپ طلسماتی تھا...

حسن اور ذہانت کے امتزاج کی قیامت خیزیاں......

جولی کی دادی کے انتقال کے بعد میراث میں اُسے آبائی گھر ملا تھا۔ پرانی طرزِ تعمیر کا حامل وہ گھر خاصا مضبوط اور کشادہ تھا۔ جب اس ورثے کی منتقلی کے قانونی کاغذات تیار ہوگئے اور مکان کی چابیاں مذکورہ دستاویزات کے ساتھ جولی کے حوالے کردی گئیں تو وہ گھر کا جائزہ لینے وہاں پہنچ گئی تھی۔ بِلی (Billy) بھی اس کے ہمراہ تھا۔

دادی نے گھر کی چابیوں کو جس ''کی رنگ'' میں ڈال رکھا تھا اس کے ساتھ ہی پوکر کا ایک چپ بھی منسلک تھا۔ گھر

کے داخلی دروازے کے تالے میں چابی ڈالتے ہوئے جولی کے دل و دماغ کی عجیب سی حالت تھی۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ دروازہ کھلتے ہی ماضی کی حسین یادیں اسے اپنے حصار میں لے لیں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی، دادی کی لائبریری میں رکھی ہوئی پرانی کتابوں کی مخصوص بُو اور سگریٹ کے دھوئیں کی مہک اس کے نتھنوں تک پہنچی تھی۔

''اُفوہ......'' بلی نے ناگواری سے کہا۔ ''لگتا ہے، تمہاری مرحوم دادی ابھی تک گھر کے اندر موجود ہے۔''

جولی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی اور گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ بلی نے اس کی تقلید تو کی مگر اس کی زبان نے اپنا کام بھی جاری رکھا۔

''بھول جاؤ اِس کباڑ خانے کو۔'' بلی نے زور دے کر کہا۔ ''آؤ، واپس اپنے اپارٹمنٹ چلتے ہیں۔''

''تمہیں جانا ہے تو جا سکتے ہو۔'' جولی نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں تو یہیں رک رہی ہوں۔ جب تک میں اس مکان کا مکمل سروے نہ کرلوں، میں یہاں سے جانے والی نہیں۔''

اپنی بات پوری کرنے کے بعد اس نے دو چار گہری سانسیں لیں اور سیدھی لیونگ روم (ڈرائنگ روم) میں پہنچ گئی۔ اپنے پرائمری اسکول کے زمانے میں جولی اس گھر میں شفٹ ہوگئی تھی۔ اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کرلی تھی لہٰذا عدالت نے جولی کو اس کی دادی کی تحویل میں دے دیا تھا۔ جولی کو اس گھر سے بہت زیادہ اُنسیت اور محبت تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے دس بہترین سال یہاں گزارے تھے پھر ایک غلط انتخاب کے بعد اسے یہاں سے جانا پڑا تھا۔ ہارلے ویسٹ باؤنڈ ایک بُرا انسان تھا۔ بہرحال، جولی نے اس تلخ تجربے کے بعد بہت کچھ سیکھا تھا۔ اب وہ بہت زیادہ ہوشیار، چالاک، مکار اور چالباز ہوگئی تھی۔ اسے مردوں کی نفسیات سے کھیلنے میں مہارت حاصل ہوچکی تھی۔ بلی کو وہ اپنی انگلیوں پر نچانے کا فن جانتی تھی۔ بلی چاہے کتنا بھی اسمارٹ سہی مگر جولی کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی تھی۔

☆☆☆

جُولی نے صرف دو ماہ میں اس گھر کی شکل بدل کر رکھ دی تھی۔ مکان کا بنیادی ڈھانچا مضبوط اور اپنی جگہ پر قائم و دائم تھا۔ بس، مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث مکان کی صورت خصوصاً اندرون بالکل بگڑ کر رہ گیا تھا۔ دیواروں کا رنگ، فرش کے قالین، لیونگ روم کا فرنیچر، کچن، لائبریری...... الغرض ہر شے سے ویرانی اور خستہ حالی ٹپکتی تھی۔ جب جولی نے اس مکان کی حالت اور حالات بدلنے کا بیڑا اٹھایا تھا تو بلی نے قدم قدم پر اعتراض کیا تھا۔

''جولی! میں سمجھتا ہوں، یہ تمہارا پاگل پن ہے۔'' بلی نے کہا تھا۔ ''ہم اچھے خاصے اپنے اپارٹمنٹ میں رہ رہے ہیں پھر اس کھنڈر میں شفٹ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ کھنڈر نہیں، میری یادوں کا خزانہ ہے بلی......!''

''میں تمہارے احساسات کو سمجھ سکتا ہوں جولی مگر......؟''

''کسی اپارٹمنٹ کی بہ نسبت ایک گھر کے اندر زندگی گزارنا زیادہ فخر اور عزت کی بات ہے۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے مگر وہ گھر رہائش اختیار کرنے کے قابل بھی تو ہو؟''

''میں مانتی ہوں کہ فی الحال یہاں پر شفٹ ہونا دانش مندانہ فیصلہ نہیں ہوگا۔'' جولی نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں دو ماہ کے اندر اس خستہ حال مکان کو ایک جدید اور قابلِ رشک رہائش گاہ بنادوں گی۔ اس کے بعد ہی ہم یہاں شفٹنگ کریں گے۔''

''دو ماہ...... جدید...... قابلِ رشک......!'' بلی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، تم کیا کیا بولے جارہی ہو؟ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ یہ سب کرنے کے لیے کتنی زیادہ رقم کی ضرورت پیش آئے گی۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر شک زدہ نظر سے جولی کو گھورتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''کہیں تم نے اس کباڑ خانے کی تزئین و آرائش کے لیے اپارٹمنٹ کو فروخت کرنے کا فیصلہ تو نہیں کرلیا؟''

''ایسی کوئی بات نہیں بلی!'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ ''وہ اپارٹمنٹ بھی اپنی جگہ سلامت رہے گا اور یہ میرا آبائی گھر بھی ایک جدید، عالیشان گھر میں بدل جائے گا!''

''کیا تم نے کہیں سے کوئی جادو وغیرہ سیکھ لیا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اس کام کے لیے ہزاروں ڈالرز چاہیے ہوں گے۔ وہ کہاں سے آئیں گے؟''

''یہاں سے......'' جولی نے انگشتِ شہادت سے اپنے سر کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تمہارا سر ہے، کوئی ''اے ٹی ایم'' مشین نہیں۔''

''تم ہی تو کہا کرتے ہو، میری کھوپڑی میں شیطان کا دماغ ہے۔''

''ہاں، سو تو ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ ''تم شیطان کی خالہ ہو۔''

"بس، تو پھر تم مجھ پر بھروسا رکھو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں جو کہوں، تم وہ کرتے جاؤ۔ مجھے بس تمہارا ساتھ چاہیے۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بولو، کیا کرنا ہے؟"

"نمبر ایک...... اس گھر میں کوئی مزدور، مستری، پلمبر، کارپینٹر، الیکٹریشن...... قدم نہیں رکھے گا۔" وہ بلی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ "ہم یہ سارا خرچہ بچائیں گے۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

"بہ خوبی سمجھ میں آرہا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "یہ سارے کام جن اور بھوت کریں گے...... ہیں نا؟"

"نہیں۔" وہ قطعی انداز میں بولی۔ "یہ سب ہم دونوں مل کر کریں گے۔"

"یہ کیسا مذاق ہے جولی؟" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ تمام ٹیکنیکل کام ہیں اور ہم پروفیشنل نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں تو ہو جائیں گے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "ہم گوگل کریں گے۔ یوٹیوب وزٹ کریں گے۔ وہاں پر دنیا کے ہر کام کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ ہر چیز آسانی سے سیکھی جاسکتی ہے، اگر انسان کے اندر سچی لگن ہو تو......"

"ہوں۔" بلی نے ایسی نظر سے جولی کو دیکھا جیسے اُس کے سامنے کوئی دماغی مریضہ بیٹھی ہو۔ "ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟" بالآخر اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"ہاں پوچھو۔" جولی نے معتدل انداز میں کہا۔

"تمہارے اس عظیم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں پینٹ، برش، رولرز، فلورنگ ٹائلز، ووڈن فکسچرز، ونڈوز بلائنڈز، سیلنگ فینز، اوزار اور...... ایسی ہی کئی ایک چیزوں کی ضرورت ہو گی۔" بلی نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے استفسار کیا۔ "یہ سب کہاں سے آئے گا؟"

"ایسے میٹریل کی فراہمی کے لیے شہر میں ایک بہت بڑا "بلڈرز مارٹ" موجود ہے۔" جولی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "وہاں سے ہر نوعیت کا تعمیری اور آرائشی سامان مل جاتا ہے۔"

"اور تم مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو کہ مارٹ والے مفت میں سامان دیتے ہیں؟" بلی کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ "ہم بس وہاں جائیں گے اور اپنی ضرورت کی ہر شے گاڑی میں بھر کر لے آئیں گے...... ایک ڈالر بھی ادا کیے بغیر۔"

"ہم نہیں، سامان لینے صرف میں جاؤں گی۔" جولی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "بس، پہلی بار پے منٹ کرنا ہو گی۔ اس کے بعد چل سو چل۔"

"چل سو چل۔" بلی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"میں نے اپنی ضرورت کا سامان چُرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ سنسناتے لہجے میں بولی۔ "مگر عام چور اُچکوں اور شاپ لفٹرز کی طرح نہیں۔ میرے ذہن میں ایک مست آئیڈیا ہے۔ سنو گے تو پھڑک کر رہ جاؤ گے۔"

بلی چند لمحات تک متذبذب انداز میں جولی کو تکتا رہا پھر دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "میں وہ مست آئیڈیا ضرور سننا چاہوں گا۔"

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں جولی نے بلی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔ "اچھا ہے مگر رسکی بھی۔"

"پیسے بچانا ہوں یا پیسے کمانا ہوں، رسک تو بہرحال لینا ہی پڑتا ہے بلی اور میں اپنے اس خستہ حالت آبائی گھر کو ایک قابلِ دید، شان دار جدید طرز کے مکان میں بدلنے کے لیے ہر قسم کا رسک اٹھانے کو تیار ہوں۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "اس مکان کے ساتھ میری جذباتی بلکہ روحانی وابستگی ہے۔ میں اپنے احساسات کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی کیونکہ محبت، پیار، اُنسیت کے حوالے سے انسان کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی چل رہا ہوتا ہے اسے کوئی بھی زبان نہیں دی جاسکتی۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں جولی!" وہ بڑے عزم سے بولا۔ "تمہارے اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے مجھ سے جو بھی بن پڑا، میں ضرور کروں گا۔"

"یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "بس، تم اپنا لیپ ٹاپ سنبھال کر بیٹھ جاؤ اور انٹیریئر ڈیکوریٹرز کی جتنی بھی ویب سائٹس ہیں، انہیں کھنگال ڈالو۔ تم ان کے آئیڈیاز کو چُرا کر کاپی کرتے جاؤ، میں بلڈرز مارٹ سے تمام ضروری سامان چُرا کر لاتی ہوں۔ اس کے بعد ہم کام پر لگ جائیں گے۔"

"بعد میں نہیں، کام پر تو ابھی لگنا ہو گا جولی۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"اور وہ بھی لیپ ٹاپ کو سنبھال کر نہیں۔" وہ جولی کے سوال کے جواب دینے کے بجائے اپنی ہی دُھن میں بولتا چلا گیا۔ "بلکہ تمہیں سنبھال کر......"

"اوہ...... تو یہ بات ہے؟" وہ شوخی سے بولی۔

بلی نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور

تھیوری کو پریکٹیکل میں بدلنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

آئندہ روز جُولی اپنی کار میں بیٹھ کر ''بلڈرز مارٹ'' کی جانب روانہ ہوگئی۔ اس نے اپنے سائز سے کہیں زیادہ بڑی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کی باڈی فگرز کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ سر پر بیس بال والی مخصوص کیپ تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو سلیقے سے سمیٹ کر بیس بال کیپ کے نیچے چھپا رکھا اور اپنے مشن کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔

''بلڈرز مارٹ'' کے دراصل دو حصے تھے۔ ایک حصے میں ہر نوعیت کا تعمیراتی اور آرائش و زیبائش کا سامان موجود تھا جبکہ دوسرا حصہ ''ریپئرنگ ایریا'' کہلاتا تھا۔ اس ایریا میں مختلف اوزار اور آلات کی ریپئرنگ کا کام کیا جاتا تھا جن میں ایسی تمام مشینیں شامل تھیں جو بلڈنگز کی کنسٹرکشن اور ڈیکوریشن میں استعمال ہوتی ہوں۔

آپ نے شاپنگ مالز میں اکثر سامان سے لدی پھندی ٹرالیز کو ایک کونے میں لاوارث کھڑے دیکھا ہوگا۔ دراصل یہ ان کسٹمرز کی ٹرالیز ہوتی ہیں جو اپنی ضرورت کا سامان ٹرالی میں بھر تو لیتے ہیں لیکن کیش کاؤنٹر تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ کسی بھی سبب، شاپنگ کا ارادہ ترک کردیتے ہیں اور مال سے..... نکل جاتے ہیں۔ مال کا اسٹاف مذکورہ سامان سے بھری ہوئی ٹرالیز کو ایک کونے میں دھکیل دیتا ہے، اس خیال سے کہ اس ٹرالی کو بھرنے والا تھوڑی دیر میں کہیں سے لوٹ آئے شاید۔ بہر حال کلوزنگ سے پہلے ان تمام ٹرالیز کے سامان کو واپس متعلقہ ریکس میں سجا دیا جاتا ہے۔

''بلڈرز مارٹ'' میں ایسی لاوارث ٹرالیز کو ''ریپئرنگ ایریا'' کے نزدیک جمع کیا جاتا تھا جس کے ساتھ ہی مارٹ کی پارکنگ تھی۔ جولی نے اسی زاویے کو استعمال کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ اس نے اپنی کار کو ''ریپئرنگ ایریا'' کے نزدیک پارک کیا اور خود مارٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

اس نے خاص طور پر ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا جب مارٹ کے اندر اچھا خاصا رش ہو۔ اس نے نہایت ہی مہارت کے ساتھ دو ٹرالیز میں، ایک جیسی ترتیب کے ساتھ اپنی ضرورت کا ایک جیسا سامان بھر لیا جس میں پینٹ کے ڈبے، برش، رولرز، اسکربز، کاٹن، آئل...... وغیرہ شامل تھا۔ یہ سب کرنے کے دوران میں کسی بھی کسٹمر نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ذہن میں کون سا شیطانی منصوبہ پل رہا ہے۔ وہاں موجود ہر شخص اپنی ضرورت کی شاپنگ میں مصروف تھا۔

جولی نے ایک ٹرالی کو دھکیل کر اس ایریا میں پہنچا دیا جہاں درجن بھر لاوارث ٹرالیز اپنے ''مالکان'' کا انتظار کررہی تھیں۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے چلتے ہوئے بالکل ویسی ہی دوسری ٹرالی کے پاس آئی اور اسے دھکیلتے ہوئے کیش کاؤنٹر پر پہنچ گئی۔ اسٹاف کے ایک آدمی نے اس کے سامان کو نکال کر کاؤنٹر بیلٹ پر رکھا۔ کیش کاؤنٹر پر موجود شخص نے بل تیار کر کے جولی سے پےمنٹ وصول کی اور وہ ٹرالی کے ساتھ اپنی کار تک چلی آئی۔ اس کے بعد جولی نے تمام سامان کو کار کی ڈکی میں منتقل کیا، ٹرالی کو وہیں چھوڑا اور کار میں بیٹھ کر گھر آگئی۔

اس تمام عرصے میں اس نے زیادہ تر اپنی گردن کو جھکا کر رکھا تھا۔ ایک تو اس کے سر پر بیس بال کیپ تھی، پھر اس نے اپنے بالوں کو بھی کیپ کے اندر چھپا رکھا تھا۔ مزید برآں، اس نے خاصی کھلی ڈلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ گردن کے جھکاؤ کی وجہ سے اس کا چہرہ بہت ہی کم کسی کیمرے کے سامنے آیا ہوگا۔ اس نے یہی کوشش کی تھی کہ سیکیورٹی کیمراز اس کی شکل نہ دیکھ پائیں اور وہ اپنے پہناوے سے کوئی مرد ہی دکھائی دے۔ وہ اپنے اس مقصد میں صد فیصد کامیاب رہی تھی۔

ایک خاص اور دلچسپ بات یہ تھی کہ جولی نے چوری اور ہیرا پھیری کے معاملات کے حوالے سے اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھا رکھا تھا۔ وہ اس کام کو بُرا یا غیر قانونی نہیں سمجھتی تھی بلکہ اس کا ذاتی فلسفہ یہ تھا کہ سمندر کے اندر سے پانی کے چند قطرے نکال لینے کو چوری کے زمرے میں نہیں لانا چاہیے۔ اس نے چوری چکاری کا کام اس وقت شروع کیا تھا جب اس کے سابق شوہر ہارلے ویسٹ باؤنڈ سے اس کا ازدواجی رشتہ ٹوٹا تھا۔ ہارلے اس کے لیے جو رقم چھوڑ کر گیا تھا، اس کا فگر روم ٹمپریچر سے زیادہ نہیں تھا۔ اپنی بقا کے لیے اسے میدانِ جنگ میں اترنا پڑا تھا۔ جب ہزار کوشش کے باوجود بھی اسے ڈھنگ کی کوئی جاب نہیں ملی اور بھیک مانگنا اس کی انا اور خودداری کو گوارا نہ ہوا تو اس کے شیطانی ذہن نے اسے چیٹنگ کی راہ پر ڈال دیا تھا اور اب تو وہ اس ''فیلڈ'' میں ''ڈاکٹریٹ'' کرچکی تھی۔ اس کا ایمان یہ تھا کہ اس دُنیا میں ہر شخص تھوڑا یا زیادہ بددیانت ضرور ہوتا ہے۔

گھر پہنچ کر جولی نے تمام بلڈنگ میٹریل کو کار کی ڈکی سے نکال کر اندر پہنچایا، بلی کے ساتھ مل کر لنچ کیا اور نئے گیٹ اَپ کے ساتھ ''بلڈرز مارٹ'' کی جانب روانہ ہوگئی۔

اب کی بار اس نے اسکن ٹائٹ جینز چڑھا رکھی تھی جس کے اوپر اس نے ڈراپ شولڈر اینڈ وائیڈ نیک ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس ٹی شرٹ کی وجہ سے اس کے جسم کا سامنے والا

بالائی حصہ خطرناک حد تک کھل گیا تھا اور دیکھنے والے کی پہلی نگاہ وہیں پر پڑتی تھی۔ اس مرتبہ اس نے اپنے بوب کٹ بالوں کو بھی خاصا باؤنسی بنالیا تھا۔

وہ مارٹ میں داخل ہونے کے بعد ''ریٹرنگ سینٹر'' کے نزدیک کھڑی ''لاوارث ٹرالیز کی جانب بڑھی اور اس نے دو گھنٹے پہلے وہاں جو سامان سے بھری ہوئی ٹرالی چھوڑی تھی، اسے دھکیلتے ہوئے وہ ''مرچنڈائز ریٹرنز'' والے کاؤنٹر پر پہنچ گئی۔ اس وقت مرچنڈائز ریٹرنز (بعد از فروخت واپسی) والے کاؤنٹر پر ایک نوجوان کلرک موجود تھا۔ جولی نے اپنی دونوں کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکائیں اور تھوڑی سی آگے کو جھک کر شائستہ لہجے میں بولی۔

''میرا شوہر بلی اول درجے کا نکما اور گاؤدی ہے۔ اس احمق نے مجھے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی میں ڈال دیا ہے۔''

جولی کا اصول یہ تھا کہ اپنے سامنے والے شخص کی توجہ وہاں مرکوز کردو جہاں آپ اسے کچھ دکھانا چاہتے ہوں اور اسے اس طرف جھانکنے کا موقع ہرگز نہ دو جہاں آپ اس سے کچھ چھپانا چاہتے ہوں۔ جولی کی موجودہ ڈریسنگ اور بے باک انداز اس کے مقصد کے حصول میں بہت مددگار ثابت ہو رہا تھا۔

''بتائیے میڈم......'' کلرک نے اس کے کھلے ہوئے گریبان میں جھانکتے ہوئے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''میں نے بلی کو جو سامان لینے آپ کے مارٹ پر بھیجا تھا، وہ اس سے بالکل الگ چیزیں اٹھا لے گیا ہے۔'' وہ اپنے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''پینٹ کے یہ شیڈز تو میرے پاس پہلے سے رکھے ہوئے ہیں اور دوسری چیزیں بھی سیم ٹو سیم گھر میں موجود ہیں۔ آپ یہ سامان واپس لے لیں تاکہ میں اس رقم سے دوسری خریداری کرسکوں۔ پلیز......''

لفظ ''پلیز'' کی ادائی کرتے ہوئے وہ تھوڑا سا اور آگے کو جھک گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنکھیں بھی ڈال دی تھیں۔

کاؤنٹر کلرک کی دھڑکنیں خطرناک حد تک بڑھ گئی تھیں اور اس کی چڑھی ہوئی سانسوں کو سماعت کیا جاسکتا تھا۔ وہ جولی کے پھیلائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ اس نے کسی جرح یا بحث کے بجائے صرف ایک سوال کیا۔

''میڈم! آپ کے پاس اس سامان کی رسید، میرا مطلب ہے بل وغیرہ تو ہوگا؟''

''ہاں، ہاں...... بالکل ہے۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بڑی ادا سے بولی پھر اپنے پرس میں سے ایک بل نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا اور کہا۔ ''یہ رہی اس سامان کی رسید۔''

یہ وہی بل تھا جو سامان وہ اپنے گھر پر چھوڑ آئی تھی۔ دونوں ٹرالیز کا سامان چونکہ صد فیصد ایک جیسا تھا اس لیے کلرک کو کسی قسم کا شک نہیں گزرا۔ اس نے ''ریٹرن کارڈ'' نکال کر جولی کے سامنے رکھ دیا۔

''میڈم! آپ اس کارڈ کو فل کردیں۔'' وہ بے چینی بھری آواز میں بولا۔ ''بس، یہ ایک فارمیلیٹی ہے۔''

''جانتی ہوں۔'' جولی نے ایک قاتل مسکراہٹ کاؤنٹر کلرک کی جانب اچھالی اور مذکورہ کارڈ میں درج کالمز کو بھرنے لگی جن میں نام، فون نمبر، ایڈریس...... وغیرہ جیسی معلومات مہیا کرنے کو کہا گیا تھا۔ جولی نے اپنے حوالے سے یہ معلومات فرضی بھری تھیں اور اس دوران میں اس نے کاؤنٹر کلرک کو اپنے نمایاں سراپا کے دیدار میں اس قدر مصروف رکھا تھا کہ اسے کارڈ کی طرف دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

کلرک نے دو چار گہری سانسیں لے کر اپنے سینے کے بوجھ کو کم کیا، ریٹرن کارڈ کو پڑھے بغیر سامان کے بل کو اس کارڈ کے ساتھ اسٹیپل کرنے کے بعد اپنی دراز میں ڈالا اور بل والی رقم کے برابر کرنسی نوٹ گن کر جولی کے حوالے کردیے۔

جولی نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور پُراعتماد قدموں سے چلتے ہوئے وہ مارٹ کے ایگزٹ ڈور کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

آئندہ دس روز میں جُولی نے بلڈرز مارٹ کے کئی پھیرے لگائے اور اپنی ضرورت کا تمام سامان، دادی سے ورثے میں ملنے والے مکان میں جمع کرلیا۔ اس دوران میں انہوں نے گھر کو سنوارنے اور سجانے کا کام (اپنی مدد آپ کے تحت) شروع کردیا تھا۔ اس تمام خریداری کے لیے جولی نے بس پہلی مرتبہ کچھ رقم خرچ کی تھی۔ اس کے بعد تو اسی کے بقول معاملہ ''چل سو چل'' پر ہی چل رہا تھا۔ وہ ہر بار ''ریفنڈ'' کی رقم سے کچھ اور خرید کرلے جاتی تھی۔ اس مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اس نے جامع ہوم ورک کیا تھا۔ خاص طور پر مرچنڈائز ریٹرنز والے کاؤنٹر پر ڈیوٹی دینے والے کلرکوں کے معمولات کو اس نے دھیان میں رکھا تھا۔ اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہر بار ایک نئے کلرک سے اس کا واسطہ پڑے۔ اس مقصد سے وہ کبھی صبح، کبھی دوپہر اور کبھی شام میں مارٹ کا دورہ کیا کرتی تھی اور ہر بار ایک نئی ہوش رُبا شرٹ کے ساتھ۔ ارمانی۔ ونیج، رولنگ اسٹون، ہاٹ بے بی...... ایک سے بڑھ

کر ایک، مردوں کے حواس پر بجلیاں گرانے والی شارٹس میں، اپنے پوشیدہ حسن کو نمایاں کر کے ڈیوٹی کلرک کی مت مار دیتی تھی اور وہ بے چارہ اس کے درخواست نما احکامات کی تعمیل کرتا چلا جاتا تھا۔ بس، اب ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا۔ دو گھنٹے پہلے وہ فلور ٹائلز کے تین کارٹن خرید کر گھر لے گئی تھی اور بالکل ویسے ہی تین کارٹن ایک ٹرالی میں بھی رکھے ہوئے تھے جنہیں ریٹرن کرنے وہ بلڈرز مارٹ پہنچ گئی تھی۔

اس نے اپنی کار کو پارک کیا اور اطمینان سے چلتے ہوئے لاوارث ٹرالیز والے سیکشن میں پہنچ گئی۔ اس کی چھوڑی ہوئی ٹائلز والی ٹرالی اپنی جگہ پر ''کھڑی'' تھی۔ اس نے ٹرالی کے ہینڈل کو تھاما اور اسے دھکیلتے ہوئے مرچنڈائز ریٹرنز کاؤنٹر پر پہنچ گئی۔ اس نے گتے کے کارٹن کو اوپر سے پھاڑ کر کھولا اور ایک ٹائل کو باہر نکال لیا پھر اسے ڈیوٹی کلرک کو دکھاتے ہوئے بولی۔

''میرا شوہر بلی ایک نمبر کا گدھا اور غیر ذمے دار شخص ہے۔ میں نے اسے جس رنگ کی ٹائلز لانے کو کہا تھا، یہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔''

اس نے ٹائل کو واپس کارٹن کے اندر رکھ دیا اور دونوں کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا کر وہ خطرناک حد تک آگے کو جھک گئی پھر وہ کلرک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''میں نے دیواروں پر ایش وہائٹ کلر کرایا ہے۔ تم ہی بتاؤ، ان ٹائلز کی فلورنگ دیواروں کے ساتھ میچ کرے گی؟''

''نن...... نہیں۔'' کلرک جذبات سے مغلوب، پھولی ہوئی سانس سے بولا۔ ''بالکل نہیں میڈم!''

دیواروں کے رنگ کے حوالے سے جولی نے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔ وہ کلرک کی ذہنی حالت کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی۔ فائنل ٹچ کے لیے اس نے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔

''میری بات دھیان سے سنو......'' وہ اپنا ہاتھ کلرک کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ساری پریشانی میرے شوہر سلی بلی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اس لیے تم مجھ پر مہربانی کرو اور یہ ٹائلز واپس لے کر مجھے میری رقم لوٹا دو......''

''ہاں، ہاں...... ضرور کیوں نہیں۔'' کلرک نے اضطراری انداز میں کہا اس دوران میں وہ کاؤنٹر کے نیچے نصب ایک بٹن کو دبا چکا تھا۔ اس نے ریٹرن کارڈ جولی کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ ''پلیز...... آپ یہ کارڈ فل کر دیں۔''

جولی مذکورہ کارڈ میں اپنی شخصیت کے حوالے سے فرضی معلومات بھرنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ کارڈ سے نمٹنے کے بعد کاؤنٹر کلرک کو دینے ہی والی تھی کہ عقب میں ابھرنے والی ایک تحکمانہ آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''میڈم! اپنی جگہ سے ہلنا نہیں......''

جولی کی چھٹی حس نے بتا دیا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ وہ آواز اتنے نزدیک سے آئی تھی کہ یہ سوچنا خوش فہمی بلکہ غلط فہمی ہوتی کہ اس کے بجائے کسی اور کو مخاطب کر کے رکنے کے لیے کہا گیا تھا۔ ایسی نازک صورتِ حال میں جولی کا ذہن کئی گنا زیادہ رفتار سے کام کرنے لگتا تھا۔

''جولی! فائٹ یا فلائٹ؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ ''صورتِ حال کا مقابلہ کرو گی یا بھاگنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں، میں بھگوڑی نہیں ہوں۔'' اس کے اندر کی شاطر جولی نے جواب دیا۔ ''جو بھی سچویشن ہو گی، میں ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔''

اس عزم کے ساتھ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے دو افراد اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر، دراز قامت اور منحنی سا تھا اور دوسرا پستہ قامت اور فربہ اندام، ست الوجود اور تھکیلا سا۔ دراز قامت کمزور البدن شخص نے بلڈرز مارٹ کا مخصوص یونیفارم پہن رکھا تھا جبکہ اس کے ساتھی فٹ بال نما شخص کے جسم پر سیکیورٹی گارڈ کی وردی تھی۔ اس کی بیلٹ میں گن بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے جولی کو اپنے ''فائٹ'' والے فیصلے پر افسوس ہوا۔ وہ ان دونوں کے بس کی نہیں تھی۔ اگر وہ ''فلائٹ'' والے آپشن پر عمل کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلتی تو ان میں سے کسی کا باپ بھی اسے پکڑ نہیں سکتا تھا۔ ایگزٹ ڈور تک پہنچنے سے پہلے ہی لمبو صاحب کی سانس اکھڑ جاتی اور سیکیورٹی گارڈ کی پتلون توند سے پھسل کر اس کے گھٹنوں تک پہنچ سکتی تھی۔ بہرحال، وہ رک گئی تھی تو اب ان مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہی مقابلہ کرنا تھا۔

''میرا نام ٹیلر ہے۔'' دراز قامت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میں ''بلڈرز مارٹ'' کے مفادات کی نگرانی کرتا ہوں اور اس مارٹ کو نقصان پہنچانے والوں پر میں کڑی نظر رکھتا ہوں۔ تمہیں میرے آفس تک چلنا ہو گا۔''

اس کا لہجہ اگرچہ دوستانہ سا تھا مگر اس سے ایک خاص قسم کی تلخی بھی جھلکتی تھی۔ جولی نے محسوس کیا کہ بات کرنے کے دوران میں وہ اس کے بدن کے کھلے ہوئے حصوں ہی کو گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھی گارڈ نے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید اسے اپنے بارے میں آلکسا، تھکیلا اور کائر جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی۔

جولی نے ٹیلر کی ہوس بھری نظر کو نظرانداز کرتے ہوئے

پُراعتماد لہجے میں پوچھا۔ ”مسٹر ٹیلر! تم مجھے اپنے آفس میں کیوں لے جانا چاہتے ہو؟“

”ایک چھوٹی سی انکوائری ہے۔“ ٹیلر نے بہ دستور اُس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے ریکارڈ کے مطابق، تمہارا نام ان افراد میں شامل ہو چکا ہے جو اس مارٹ کو نقصان پہنچا چکے اور پہنچا رہے ہیں۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ جولی نے اس پر چڑھائی کر دی۔ ”میری بات کا یقین کرو۔ میں تو یہ ٹائلز واپس کرنے آئی ہوں جو میرا شوہر غلطی سے لے گیا تھا۔ میں مانتی ہوں، یہ میرے شوہر کی غفلت سے ہوا ہے۔ یہ ٹائلز میرے کسی کام کے نہیں ہیں اسی لیے میں انہیں لوٹانے آگئی ہوں۔ بس، اتنی سی بات ہے۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔“ ٹیلر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ٹائلز کے یہ تین کارٹن تم گھر سے نہیں لے کر آئی ہو بلکہ تم نے اسی مارٹ کی ایک ٹرالی سے چُرائے ہیں۔“

”تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے یہ ٹائلز اس مارٹ سے چُرائے ہیں؟“ جولی نے برہمی سے کہا۔

”میں تمہیں وہ ثبوت دکھانے کے لیے ہی تو اپنے آفس لے کر جا رہا ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تنبیہی لہجے میں بولا۔

”اِن ٹائلز کی خریداری کی رسید ہے میرے پاس۔“ جولی نے کہا۔

”تمہاری رسید کو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”پہلے تم وہ دیکھ لو جو میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔“

”اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دوں تو......؟“ جولی نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو پھر مجبوراً مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔“ وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ”میں تمہیں اور تمہارے خلاف جانے والے ٹھوس ثبوت کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ پھر تم رسید کے بل بوتے پر اپنی صفائیاں پیش کرتی رہنا۔“

ٹیلر کی باتوں سے مضبوطی جھلکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا، وہ جو کہہ رہا ہے، وہ کر بھی گزرے گا۔ جولی کسی بھی قیمت پر خود کو پولیس کی تحویل میں نہیں جانے دینا چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر مارٹ والوں کی شکایت پر پولیس والوں نے اس کے گھر پر چھاپا مارا تو وہاں پر ”بلڈرز مارٹ“ کا اتنا سامان برآمد ہوگا کہ جن میں سے کسی کی رسید اس کے پاس نہیں ہوگی۔ اس کے بعد وہ لمبے عرصے کے لیے جیل چلی جاتی اور یہ جولی کو ہرگز منظور نہیں تھا۔

”ابھی تو صرف ٹائلز کے تین کارٹن کا معاملہ ہے۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”اور ان کی خریداری کا پکا ثبوت بھی ہے میرے پاس۔ مجھے ٹیلر کی بات سن لینا چاہیے۔“

”میرے خیال میں پولیس اس مسئلے کا حل نہیں ہے مسٹر ٹیلر۔“ وہ اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معتدل انداز میں بولی۔ ”میں مطمئن ہوں کہ میں نے اس مارٹ سے کوئی چوری نہیں کی۔ ان ٹائلز کی خریداری کی رسید ہے میرے پاس۔ چلو، مجھے دکھاؤ کہ تمہارے پاس میرے خلاف ایسا کون سا ثبوت ہے جس پر تم اس قدر اکڑ رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ۔“ ٹیلر نے رعونت بھرے لہجے میں کہا۔

جُولی چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

ٹیلر کا آفس ”ر یپئرنگ سینٹر“ کے عقبی حصے میں واقع تھا جو درحقیقت مارٹ کا لاس پریوینشن (نقصانات کی روک تھام) کرنے والا آفس تھا۔ ڈھیلا ڈھالا سیکورٹی گارڈ باہر رہ گیا اور ٹیلر، جولی کو لے کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچ کر جولی کو پتا چلا کہ وہ ہال نما کمرا بہ یک وقت کئی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ کمرے کے ایک حصے میں، دیواروں کے ساتھ ساتھ ریکس بنے ہوئے تھے جن پر مختلف قسم کے اوزار جیسے ڈرل مشین، ماربل کٹر، ہتھوڑے، چھینی، نٹ، بولٹ، واشرز وغیرہ سجے ہوئے تھے۔ وہ کمرا ایک لحاظ سے ریپئرنگ سینٹر کا اسٹور روم بھی تھا۔ کمرے کے دوسرے حصے میں ایک لائن سے ٹی وی مانیٹرز رکھے ہوئے تھے جن کے سامنے کنٹرول پینل بنا ہوا تھا۔ جوائے اسٹک، کمپیوٹر ماؤس، کی بورڈ الغرض کنٹرول روم سے متعلق ہر شے وہاں موجود تھی۔

ٹیلر کا اسسٹنٹ کنٹرول پینل کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر دو چیزیں اور بھی موجود تھیں۔ ایک آرام دہ صوفہ کم بیڈ اور دوسری چوبی بینچ۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی ٹیلر نے دروازہ لاک کر دیا اور روکھے پھیکے لہجے میں جولی سے کہا۔

”اُدھر بینچ پر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی تمہیں تمہارے کالے کرتوت کا ثبوت دکھاتا ہوں۔“

جُولی بادلِ ناخواستہ اس بینچ پر ٹک گئی۔

”تم کوئی بہت ہی بے وقوف عورت ہو۔“ ٹیلر نے اپنے اسسٹنٹ کو ہٹا کر اس کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ

بظاہر جولی سے مخاطب تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کمپیوٹر سسٹم پر اس کے ہاتھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ”پچھلے کچھ عرصے سے مارٹ میں چوری کا رجحان کافی بڑھ گیا ہے اس لیے ہمیں سیکیورٹی کیمراز کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑا ہے۔ اب ہم نے پارکنگ ایریا کی جانب بھی کیمراز لگا دیے ہیں۔“ اس نے کمپیوٹر ماؤس کو حرکت دے کر کرسر کو بیدار کیا۔ اس کا ٹارگٹ درمیان والا مانیٹر تھا۔ اگلے ہی لمحے مذکورہ مانیٹر کی فوٹیج ریوائنڈ ہوگئیں۔ ٹیلر نے جولی کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور پلے کے بٹن کو کلک کرنے کے بعد کہا۔

”انجوائے یور سین بے بی......!“

جُولی نے دیکھا، اس کی کار پارکنگ میں آکر رکی۔ وہ کار کو پارک کرنے کے بعد باہر آئی اور مارٹ کے انٹری ڈور کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلر نے دوسرے مانیٹر کی فوٹیج کو بھی ریوائنڈ کر کے دکھایا جس میں جولی لاوارث ٹرالیز والے پورشن میں سے ایک ٹرالی کو دھکیل کر مرچنڈائز ریٹرنز کاؤنٹر کی سمت لا رہی تھی۔ اسی طرح تیسرے مانیٹر کی فوٹیج میں وہ ٹائلز والے کارٹن کو پھاڑ کر کھولتے ہوئے نظر آرہی تھی۔

جُولی نے دل میں تسلیم کر لیا کہ بلڈرز مارٹ کا ویڈیو ریکارڈنگ سسٹم عمدہ قسم کا تھا۔ وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ ان فوٹیج میں نظر آنے والی وہ نہیں ہے۔

”تم جب اپنی کار کو پارک کرنے کے بعد مارٹ میں داخل ہوئیں تو خالی ہاتھ تھیں۔“ ٹیلر کی طنزیہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”یعنی فلور ٹائلز والے وہ تین کارٹن تم اپنے گھر سے واپس لے کر نہیں آئی تھیں۔ مزید برآں جب تم نے مرچنڈائز ریٹرنز کاؤنٹر پر ایک کارٹن کو کھول کر اس میں سے ایک ٹائل نکالا اور کاؤنٹر کلرک کو دکھایا تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس سے پہلے تمہیں خود بھی معلوم نہیں تھا کہ کارٹن کے اندر کس قسم کے ٹائلز ہیں حالانکہ تم نے اس کلرک سے یہی کہا تھا کہ تمہارا نالائق شوہر غلطی سے وہ ٹائلز خرید کر لے گیا تھا جو تمہاری دیواروں کے کلر سے میچ نہیں کرتے۔“

”ایک منٹ۔“ جولی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یہ کیسے معلوم کہ کاؤنٹر کلرک سے میری کیا بات ہوئی تھی؟“

”تمہیں یاد نہیں لیکن اس کلرک کو اچھی طرح یاد ہے کہ تم پہلے بھی اسے چونا لگا کر جا چکی ہو۔“ ٹیلر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”لہٰذا اس نے تم سے ڈیل کرنے کے دوران میں اس کاؤنٹر کے نیچے لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا تھا جس کی وجہ سے وہاں ہونے والی تمام تر گفتگو ایک آڈیو سسٹم کے ذریعے میں نے یہاں بیٹھے سنی اور پھر میں تمہیں چھاپنے کے لیے وہاں پہنچ گیا۔“

”مسٹر ٹیلر!“ وہ کسی بھی قیمت پر ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے ٹیلر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم کچھ بھی کہہ لو مگر میرے پاس ان ٹائلز کی خریداری کی رسید موجود ہے۔ تم اتنی آسانی سے مجھے چور ثابت نہیں کر سکو گے۔“

”تمہاری آسانی اور مشکل کی تو ایسی کم تیسی......!“ ٹیلر نے دانت پیس کر کہا۔ ”ابھی میں دکھاتا ہوں تمہیں تمہاری اوقات۔“

بات کے اختتام پر اُس نے ایک اور مانیٹر کی فوٹیج کو ریوائنڈ کر کے پلے کر دیا۔ مذکورہ فوٹیج چند گھنٹے پہلے کا تھا۔ اس فوٹیج میں جولی مختلف مردانہ ڈریس میں ملبوس اسی ٹائلز کے کارٹن والی ٹرالی کو دوسری درجن بھر ٹرالیز کے ساتھ ”پارک“ کرتی نظر آرہی تھی۔

”اب بتاؤ، تمہاری اس رسید کی کیا اہمیت ہے؟“ ٹیلر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر اس وقت پولیس تمہارے گھر پر چھاپا مارے تو مجھے یقین ہے کہ وہاں ایسے ہی ٹائلز کے تین کارٹن برآمد ہو جائیں گے جن کی رسید تم اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہو۔“

وہ رنگے ہاتھوں پکڑی جا چکی تھی مگر شکست تسلیم کرنا اسے منظور نہیں تھا۔ وہ ٹیلر کی آنکھوں میں حرص و ہوس کا سمندر موجزن دیکھ چکی تھی چنانچہ اس نے اپنا آزمودہ کارنسخہ استعمال کرنے کی ٹھان لی...... اپنے سامنے والے شخص کی توجہ وہاں مرکوز کر دو جہاں آپ اسے کچھ دکھانا چاہتے ہو اور اسے اس طرف جھانکنے کا موقع ہرگز نہ دو جہاں آپ اس سے کچھ چھپانا چاہتے ہوں۔

”تو پھر؟“ وہ سینہ تان کر کمالِ ڈھٹائی سے بولی۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

وہ چند لمحات تک بھوکی نظر سے جُولی کو گھورتا رہا پھر عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”کیا تم جُوا کھیلنا پسند کرتی ہو؟“

”ہاں......کبھی کبھار۔“ جولی نے جواب دیا۔

”ویری گڈ۔“ وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا پھر ایک جانب اشارہ کرنے کے بعد اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا۔ ”جاؤ، وہ باسکٹ اٹھا کر یہاں لے آؤ۔“

جُولی پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ”ہمارے اس معاملے کا جوئے سے کیا تعلق؟“

”یہ زندگی ایک قمار خانہ ہے جہاں انسان کا سب کچھ ہمہ وقت داؤ پر لگا رہتا ہے۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”تم

حسین ہو، جوان ہو۔ تمہارے سامنے بہت سارے منصوبے ہیں، لاتعداد خواہشات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پولیس کے ہتھے چڑھ کر جیل کی ہوا کھاؤ اسی لیے میں تمہیں بچاؤ کا ایک موقع دینا چاہتا ہوں، اگر تم میرے ساتھ جُوا کھیلنے کو تیار ہو جاؤ تو......!''

وہ اُلجھن زدہ انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''ابھی سمجھاتا ہوں۔'' ٹیلر نے معنی خیز انداز میں کہا اور اس کے حشر ساماں سراپا کو ندیدوں کے مانند کھوجنے لگا۔

جولی بہ خوبی جانتی تھی کہ ٹیلر کی کمزوری کو اپنا ہتھیار کیسے بنانا ہے اس لیے وہ اس کی ہوس پرست نظر سے ذرا سا بھی خفیف نہیں ہوئی۔ ٹیلر کی نگاہِ بد جولی کے پاؤں سے سفر کرتے ہوئے سینے تک پہنچ کر رک گئی۔ اس وقت جولی نے ''رولنگ اسٹونز'' برانڈ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ حریصانہ انداز میں اس کے سینے کو گھورے جا رہا تھا۔ جولی نے اس کی نفسیات سے کھیلتے ہوئے معتدل لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم رولنگ اسٹونز کو پسند کرتے ہو؟''

قبل اس کے کہ ٹیلر، جولی کے سوال کے جواب میں کچھ کہتا، اس کا اسسٹنٹ مطلوبہ باسکٹ لے کر آ گیا۔ اس باسکٹ میں مختلف ''رنگ نسل'' کے نٹ، بولٹ اور واشرز بھرے ہوئے تھے۔ ٹیلر نے اسسٹنٹ سے، باسکٹ کو فرش پر الٹنے کے لیے کہا۔ اسسٹنٹ نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ دھاتی اشیا کے فرش پر گرنے سے ایسی کھنک دار آواز پیدا ہوئی جیسے کسی بچے نے اپنا، سکوں سے بھرا ہوا منی باکس نیچے گرا دیا ہو۔

''تم نے ریٹرن کارڈ پر اپنا جو نام، فون نمبر اور گھر کا ایڈریس بھرا ہے۔'' ٹیلر نے جولی کے چہرے پر نگاہ جما کر سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ''اس کارڈ اور سیکیورٹی کیمرا زکی ان فوٹیجز کے ساتھ میں تمہیں حوالہ پولیس کروں یا تم میرے ساتھ ایک دلچسپ جُوا کھیلنے کے لیے تیار ہو؟''

یہ معاملہ اب ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ جولی پولیس کی کسٹڈی میں جانے کا رسک تو ہرگز نہیں لے سکتی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ حالات چاہے کتنے بھی گمبھیر کیوں نہ ہوں، بچ نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ موجود ہوتا ہے، اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے، میں دوسرا آپشن ٹرائی کرنا چاہوں گی۔''

''ویری گڈ!'' وہ توصیفی لہجے میں بولا۔ ''تم صرف حسین ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ ذہین بھی ہو۔ تمہارے اس فیصلے سے عقل مندی جھلکتی ہے۔''

جولی نے ٹیلر کے تبصرے کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ان لمحات میں اس نے اپنی تمام تر ذہنی توانائی بچاؤ کے اس راستے کو تلاش کرنے پر لگا رکھی تھی جو اس کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور ٹیلر کی کوئی ایک غلطی اس کے لیے وہ راستہ کھول سکتی تھی۔

''تو کھیل شروع کیا جائے؟'' ٹیلر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ضرور!'' جولی نے اثبات میں جواب دیا۔

ٹیلر فرش پر پڑے ہوئے دھاتی ساز و سامان کے پاس پہنچا۔ اس نے وہاں سے دو ایک ہی سائز کی واشرز اٹھا لیں جو رنگ میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اس نے وہ واشرز جولی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''ان میں سے گرے کلر کی واشر اسٹین لیس اسٹیل کی ہے اور دوسری ڈل گولڈن کلر والی پیتل کی ہے۔ تم انہیں اپنے ہاتھ میں لے کر بھی دیکھ اور چیک کر سکتی ہو۔''

جولی نے دونوں واشرز کو اچھی طرح گھما پھرا کر چیک کر لیا۔ ٹیلر نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ ٹیلر نے مذکورہ واشرز اس سے لے کر اپنی مٹھی میں دبا لیں اور اپنی دراز کی طرف چلا گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد اس نے ڈیسک کی دراز میں سے ایک تھیلی برآمد کی۔

وہ تھیلی دراصل ایک ڈوری والی چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ وہ جولی کے پاس آیا اور دونوں بازو اس کے سامنے پھیلا دیے۔ ٹیلر کے ایک ہاتھ میں وہ پوٹلی تھی جیسی کہ زمانہ قدیم میں سونے چاندی کے سکوں کو سنبھال کر رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں اور اس کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ اس نے اپنی مٹھی میں دو واشرز کو چھپا رکھا تھا۔

''میں دونوں واشرز کو اس تھیلی میں ڈال کر اس کا منہ بند کر رہا ہوں۔''

اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایسا کر بھی دکھایا پھر ڈوری کو کھینچ کر تھیلی کا منہ بند کر دیا اور اسے ہوا میں گھمانے لگا۔

تھیلی کے اندر موجود ''دھاتی سکے'' ایک دوسرے سے ٹکرا کر مخصوص کھنک دار آواز پیدا کرنے لگے۔ جولی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے پوچھ لیا۔ ''یہ کس قسم کا جوا ہے جو تم اکیلے ہی کھیل رہے ہو؟''

''اس جوئے میں تمہارا کردار اب شروع ہوتا ہے۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''اس تھیلی

میں دو واشرز ہیں۔ ایک اسٹین لیس اسٹیل کی اور دوسری پیتل کی۔ تم تھیلی میں ہاتھ ڈال کر کوئی ایک واشر باہر نکالوگی۔ اگر تم نے اسٹین لیس اسٹیل کی واشر نکالی تو میں تمھیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دوں گا اور بھول جاؤں گا کہ تم نے بلڈرز مارٹ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن اگر تم نے تھیلی کے اندر سے پیتل کی واشر نکالی تو میں پھر بھی تمھیں یہاں سے جانے دوں گا لیکن اس صورت میں......'' اس نے صوفہ کم بیڈ کی جانب اشارہ کیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خالصتاً لوفرانہ انداز میں اضافہ کر دیا۔

''اس صورت میں تمھیں میرے ساتھ وہاں صوفے پر کچھ وقت گزارنا ہوگا اور وہ بھی میری مرضی کے مطابق......کوئی مزاحمت کیے بغیر۔''

ٹیلر کے غلیظ ارادے نے جولی کے تن بدن میں ایک آگ سی بھر دی لیکن یہ موقع جذبات نکالنے کا نہیں بلکہ عقل سے کام لینے کا تھا اور جولی کی عقل نے اسے سمجھا دیا کہ وہ شیطان جتنے اعتماد سے تھیلی کو گھما رہا ہے، اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تھیلی کے اندر دونوں واشرز پیتل کے ہیں اور یہ فنکاری اس کمینے ٹیلر نے اس وقت کی ہوگی جب وہ دراز میں سے ڈوری والی تھیلی نکال رہا تھا۔

دشمن کی چال کا علم ہو جائے تو اس سے نمٹنا سہل ہو جاتا ہے۔ ٹیلر نے اپنی مکاری سے جولی کو سیف ایگزٹ کا راستہ دکھا دیا تھا۔ اب اس راستے تک رسائی جولی نے اپنی عیاری سے حاصل کرنا تھی۔

''مجھے منظور ہے۔'' اس نے بہ آواز بلند کہا۔

''تم تو پکی جوارن ہو......'' وہ ستائشی نظر سے جولی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''استاد گردہ تو کسی جواری ہی کا ہو سکتا ہے۔ لو تو پھر نکالو واشر۔''

جولی طے کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے بڑے اطمینان سے تھیلی میں ہاتھ ڈالا اور پھر ایک واشر کو باہر نکال کر اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ اس لمحاتی مہلت میں اس کی عقابی نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں پیتل کی واشر آئی تھی گویا ٹیلر کے بارے میں اس کے دماغ نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ اب اس کی باری تھی۔

''مجھے دکھاؤ، تمھارے ہاتھ میں کون سی واشر ہے؟'' ٹیلر نے خاصے بے قرار لہجے میں استفسار کیا۔

جواب میں جولی نے اپنی مٹھی والی واشر کو، فرش پر پڑے ہوئے دھاتی سامان کے اندر پھینک دیا۔ پیتل کی واشر وہاں موجود دوسری واشرز کے ساتھ رل مل گئی۔

''یہ...... یہ تم نے کیا کر دیا۔'' ٹیلر نے جنونی انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے دکھائے بغیر وہ واشر وہاں کیوں پھینک دی؟''

''کیا فرق پڑتا ہے مسٹر ٹیلر!'' وہ اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ایک واشر ابھی بھی تھیلی کے اندر موجود ہے۔ تم اسے نکال کر دیکھ لو۔ اگر وہ اسٹین لیس اسٹیل کی واشر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا میں نے پیتل کی واشر تھیلی سے نکالی تھی۔ اس صورت میں، میں تمھاری خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں اور اگر تھیلی کے اندر بچ رہنے والی واشر پیتل کی ہے تو پھر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ میں نے جو واشر فرش پر پھینکی ہے، وہ یقیناً اسٹین لیس اسٹیل کی تھی اور اب تم اپنے وعدے کے مطابق، مجھے یہاں سے جانے دو گے۔''

بات ختم کرتے ہی وہ تکلیف دہ چوبی بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جیب سے سیل فون نکال کر اسے آپریٹ کرنے لگی۔ جولی نے ابھی ٹیلر کے ساتھ جو ہاتھ کیا تھا اس نے ٹیلر کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو ہونقوں کے مانند پوچھ بیٹھا۔

''یہ تم کس کو فون لگا رہی ہو؟''

''کسی کو نہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''میں نے تو اپنے فون کا ریکارڈر آف کیا ہے۔''

''کیا...... کیا مطلب......؟'' ٹیلر کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ ''کیا تمھارا سیل فون آڈیو ریکارڈنگ پر تھا؟''

''آڈیو، وڈیو...... دونوں قسم کی ریکارڈنگ پر۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اور یہ سارا مواد عدالت میں میرے کام آئے گا۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے، وہ تمھیں طویل عرصے تک جیل میں سڑانے کے لیے کافی ہے۔ میں تم پر بلیک میلنگ اور اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے ہراساں کرنے کا کیس ٹھوکنے والی ہوں۔''

''اوہ......نو......'' وہ ٹپٹا کر رہ گیا۔ ''اس طرح تو میں برباد ہو جاؤں گا۔''

''تو کیا ابھی تک تم مجھے آباد کرنے کے لیے واشرز والی تھیلی کو ہوا میں گول گول گھما رہے تھے؟'' جولی نے زہرخند لہجے میں پوچھا۔ ''تمھاری وہ ابلیسی خوشی کہاں کافور ہو گئی؟''

''مجھے معاف کر دو پلیز۔'' وہ منت ریز انداز میں بولا۔

''معاف کرنے کا وقت گزر گیا ٹیلر۔''

''کیا ہمارے درمیان کوئی ڈیل ہو سکتی ہے؟''

''ڈیل کا دروازہ تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔'' وہ مکاری بھرے لہجے میں بولی۔

"تو بتاؤ......" وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ "تمہیں کیا چاہیے؟"

"ایک ہزار ڈالرز اور......!"

جولی نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو ٹیلر کی پریشانی عروج کو پہنچ گئی۔ "اور کیا......؟"

"ڈیلیٹ کا تبادلہ۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"پہلے تم اپنے سسٹم میں موجود میری تمام فوٹیجز کو میری آنکھوں کے سامنے ڈیلیٹ کرو گے۔ اس کے بعد میں اپنے سیل فون والی ریکارڈنگ کو ڈیلیٹ کر دوں گی اور یہ بھول جاؤں گی کہ تم نے مجھے اپنے آفس میں بلا کر مجھ سے کس قسم کا مطالبہ کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان رہا ہوں۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔ "لیکن اس سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ تم نے اپنے سیل فون سے کیا ریکارڈ کیا ہے؟"

"نہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ "پہلے تم وہ کرو گے جو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ اس کے بعد میں اپنا سیل فون تمہارے ہاتھ میں تھما دوں گی جس طرح تم نے پیتل اور اسٹین لیس اسٹیل کی واشرز میرے ہاتھ میں تھمائی تھیں۔ تب تم بھی اچھی طرح میرے سیل فون کو دیکھ اور چیک کر لینا۔ اگر تمہیں یہ سب منظور نہیں ہے تو میں یہ ڈیل کینسل کر رہی ہوں۔"

"اوکے۔" وہ کسی ہارے ہوئے جواری کے مانند شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہاری فوٹیجز ڈیلیٹ کرنے جا رہا ہوں۔"

"لیکن اس سے پہلے ایک ہزار ڈالرز۔" جولی نے کسی ماہر کھلاڑی کے مانند کہا۔ "میں نے رقم کا مطالبہ پہلے اور فوٹیجز ڈیلیشن کی بات بعد میں کی تھی۔ یاد ہے نا......؟"

اگر ٹیلر کا بس چلتا تو وہ کسی ریک سے کوئی ہتھوڑی اٹھا کر جولی کا ناریل چٹخا ڈالتا مگر اس کا باز تو گنے کی مشین میں آیا ہوا تھا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں سے بٹوا نکالا پھر اس میں موجود کرنسی نوٹوں کو گننے کے بعد بولا۔

"یہ تو صرف سات سو ڈالرز ہیں۔"

"باقی کے تین سو ڈالرز تمہارا یہ اسسٹنٹ ملائے گا۔" جولی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "اس کمینے نے بھی تو تمہاری لن ترانیوں سے بہت مزے لیے ہیں۔"

ٹیلر کے سامنے فرار کا ایک بھی راستہ موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کی جیب میں سے تین سو ڈالرز نکلوا کر جولی کا مطالبہ پورا کیا پھر جولی ہی کی نگرانی میں، اس کی تمام فوٹیجز کو اپنے سسٹم سے ڈیلیٹ کر دیا۔

"ویل ڈن ٹیلر!" جولی نے شاباشی دینے والے انداز میں کہا پھر اپنا سیل فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اضافہ کر دیا۔ "لو، اب تمہاری باری ہے۔"

ٹیلر نے جولی کے سیل فون کی طرف اس طرح ہاتھ بڑھایا جیسے صدیوں سے بھوکا کوئی انسان روٹی کی سمت لپکتا ہے لیکن جب اس نے سیل فون کو اپنے ہاتھ میں لے کر آپریٹ کیا تو اس کے چودہ طبق یک بہ یک گل ہو گئے۔

"یہ......کیا......؟" اس کی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "اس فون میں تو بیٹری ہے اور نہ ہی لائن۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں......"

"تم نے بھی تو اپنی دراز میں سے ڈوری والی تھیلی نکالتے ہوئے اسٹین لیس اسٹیل کی واشر کو پیتل کی واشر سے بدل دیا تھا۔" وہ اسے آئینہ دکھاتے ہوئے کڑوے لہجے میں بولی۔ "وہ بھی تو ایک دھوکا ہی تھا، مجھے مس یوز کرنے کا۔ میں بھی تو تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں اور تم......تم بھی مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو۔ تمہارے پاس دوسرا کوئی آپشن ہی نہیں ہے۔ میرے جرم کا ثبوت تم نے اپنے ہاتھوں سے مٹا ڈالا ہے۔ شکر کرو کہ میں مارٹ میں جا کر تمہاری اس بدسلوکی پر کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا نہیں کر رہی ورنہ تم جانتے ہو کہ میری اس کارروائی کا کیسا خطرناک نتیجہ برآمد ہو گا۔ میرے پاس تو ان ٹائلز کے تین کارٹن کی خریداری کی پکی رسید بھی ہے۔ میں تمہیں ذلیل کرانے کے علاوہ مرچنڈائز ریٹرنز کاؤنٹر سے اپنا ریفنڈ اماؤنٹ بھی لے کر جاؤں گی۔"

ٹیلر کے کندھے جھک گئے۔ وہ صحیح معنوں میں جولی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کسی دربان کے مانند جولی کے لیے اپنے آفس کا دروازہ کھول دیا۔

جولی نے گھر آ کر بلی کو اپنے اس کارنامے سے آگاہ کیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا پھر اس نے متذبذب انداز میں کہا۔

"تم نے اس بدذات ٹیلر کو خاصا کرارا اور "منہ توڑ" جواب دیا ہے لیکن کیا کہتی ہو، یہ کچھ زیادہ ہی نہیں ہو گیا؟"

"اور اگر میں اس کی چال کو نہ سمجھ پاتی تو؟" جولی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو وہ اپنے آفس میں میرے ساتھ جو کچھ کرتا، تمہارے خیال میں وہ کچھ زیادہ نہ ہو جاتا......کیا کہتے ہو بلی؟"

وہ لاجواب سا ہو کر اسے تکنے لگا......!

❖❖❖

قسط :5

دہر

حسام بٹ

زندگی آزمائشوں کا نام ہے۔ کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی دونوں قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانۂ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے اَن مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا ایسا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا جس کے حصول کے لیے آزاد فضاؤں کے تعلیمی و تربیتی ادارے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزارِ فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

عروس البلاد کراچی سے شہرِ ظلمات ''تی یوم'' تک دراز
ایک سنسنی خیز اور تحیر آمیز ناقابلِ فراموش سلسلہ

جاسم نے ناجیہ کا نمبر ڈائل کیا۔ ابھی اسی نمبر پر اس کی ڈیوڈ سے سیلولر گفتگو ہوئی تھی مگر جاسم کی کوشش کے جواب میں سوائے کوفت اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ڈیوڈ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، بات چیت کے اختتام پر ناجیہ والا نمبر ڈیڈ ہو چکا تھا۔ اب اس نمبر پر کانٹیکٹ کرنا ممکن نہیں رہا تھا......!

جب تک جاسم، ڈیوڈ سے گفتگو میں مصروف رہا، اس دوران میں غفار داؤد اضطرابی توجہ سے اسی کو دیکھتا رہا تھا۔ جاسم نے ہاتھ سے سیل فون رکھا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''بیٹا! کس کا فون تھا؟ تم نے کہا تھا، ناجیہ بازیاب ہو گئی۔ مجھے بتاؤ، وہ کہاں ہے...... کس حال میں ہے؟''

''میں نے ناجیہ کی بازیابی کی بات اس لیے کی تھی کہ یہ کال اسی کے نمبر سے آئی تھی۔'' جاسم نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''ناجیہ، الحمدللہ! بالکل خیریت سے ہے لیکن اس سے ملاقات کے لیے آپ کو چند روز انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جیسے ہی استنبول پہنچوں گا، ناجیہ کو آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

''اوہ......'' غفار داؤد نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''میں نہیں جانتا، ابھی تم نے کس سے بات کی ہے لیکن میری سمجھ میں یہی آیا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی شو میں تم سے کام کرانا چاہتا ہے مگر تم اس کے لیے راضی نہیں تھے اسی لیے اس شخص نے تمہیں جھکانے کے لیے ناجیہ کو کڈ نیپ کرالیا ہے۔ ایم آئی رائٹ؟''

''انکل! یو آر ایبسولیوٹلی رائٹ۔'' جاسم ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ناجیہ اس وقت ڈیوڈ نامی ایک شخص کی تحویل میں ہے۔ ابھی میری ڈیوڈ ہی سے بات ہو رہی تھی۔ آپ فوراً صدیقی صاحب کو یہاں بلا لیں۔ ان کی موجودگی میں آپ کو میں اس معاملے کی تفصیل سے آگاہ کر دوں گا۔''

غفار داؤد نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''سرمد صدیقی کا اس ایشو سے کیا تعلق ہے؟''

''میں نے صدیقی صاحب کو ڈیوڈ کے بارے میں بتا رکھا ہے۔ ہم دو ماہ کے لیے استنبول جا رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا، ڈیوڈ ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ کب سے شروع کر رہا ہے۔ ناجیہ کی بہ حفاظت واپسی کے لیے مجھے ڈیوڈ کا کنٹریکٹ سائن کرنا پڑے گا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ صدیقی صاحب کے سیریل کا اسکیجول ڈسٹرب ہو۔ اسی سلسلے میں ان سے میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔'' جاسم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''دوسری صورت یہ ہے کہ ہم دونوں صدیقی صاحب کے آفس چلتے ہیں۔''

''میں انہیں یہاں آنے کو کہتا ہوں۔'' غفار داؤد نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''میری تو کہیں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔''

''اوکے۔'' جاسم نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''کیا اس اپارٹمنٹ کی کسی ونڈو سے بلڈنگ کے داخلی گیٹ کو دیکھا جا سکتا ہے؟''

''ہاں...... مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں آپ کے سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پہلے آپ مجھے وہ ونڈو دکھائیں۔''

''آؤ میرے ساتھ۔''

ناجیہ والا وہ لگژری اپارٹمنٹ کلفٹن برج کے نزدیک ایک ہائی رائز کے ففتھ فلور پر واقع تھا۔ یہ ڈیڑھ ہزار مربع فٹ پر بنا ہوا ایک کشادہ تھری بی ڈی ڈی اپارٹمنٹ تھا۔ غفار داؤد، جاسم کو ایک بیڈ روم میں لے گیا اور ونڈو بلائنڈز ہٹانے کے بعد کہا۔

''وہ دیکھو، ہماری بلڈنگ کی انٹرنس۔''

جاسم نے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے گیٹ کا جائزہ لینے کے دوران میں ناجیہ کے باپ سے پوچھا۔ ''کیا یہاں قریب ہی کوئی ''ٹوائے شاپ'' ہے؟''

''ہاں ہے...... ہماری بلڈنگ کے برابر میں ایک پوری مارکیٹ ہے جہاں پر ہر چیز کی دکانیں ہیں۔'' غفار داؤد نے بتایا۔ ''مگر تم کھلونوں کی دکان کا کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے ایک سادہ سی ٹیلی اسکوپ چاہیے۔'' جاسم نے غفار داؤد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اس قسم کی دوربین ٹوائے شاپ پر مل جاتی ہے۔''

''ایک اعلیٰ کوالٹی کی ٹیلی اسکوپ تو میرے پاس بھی رکھی ہوئی ہے۔'' ناجیہ کے پاپا نے بتایا۔ ''میرا ایک دوست جرمنی سے لایا تھا مگر وہ ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ڈبے میں بند پڑی ہے کیونکہ مجھے ایسی چیزوں کا شوق نہیں۔ دوست کی دل شکنی نہ ہو، یہی سوچ کر خوش دلی سے لے لی تھی۔''

جاسم نے بہ دستور اپارٹمنٹ بلڈنگ کے بیرونی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''رکھی ہوئی چیز کام آ ہی جاتی ہے انکل...... آپ وہ دوربین لا کر مجھے دے دیں اور خود صدیقی صاحب کو یہاں بلانے کے لیے کال کریں۔ میری

بھوک انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی ہے۔ آج ہم تینوں مل کر ڈنر کریں گے۔ جب تک صدیقی صاحب یہاں پہنچ نہیں جاتے، میں میڈ اِن جرمنی ٹیلی اسکوپ کی کارکردگی کو چیک کرتا ہوں۔"

"ہم اس وقت جس نوعیت کے سنگین حالات سے گزر رہے ہیں ان میں تم اتنے اطمینان سے بات چیت کیسے کررہے ہو؟" غفار داؤد نے بے یقینی سے جاسم کو تکتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارے انداز سے بالکل بھی یہ ظاہر نہیں ہورہا کہ تم کسی بیڈ سچویشن میں ہو۔"

"اگر میں اپنی حرکات وسکنات اور لب ولہجے سے خود کو بہت زیادہ سراسیمہ اور حواس باختہ ظاہر کروں تو کیا اس سے حالات میں کوئی مثبت تبدیلی واقع ہوجائے گی؟" جاسم نے سوالیہ نظر سے ناجیہ کے پاپا کی طرف دیکھا پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "میرا خیال ہے، بالکل نہیں۔"

"اوکے...... میں ٹیلی اسکوپ لے کے آتا ہوں۔" غفار داؤد نے شکست خوردہ انداز میں کہا پھر ان توصیفی الفاظ میں اضافہ کردیا۔ "ویسے تمہارا کانفیڈینس لاجواب ہے۔ انسان کو ایسے ہی مضبوط اعصاب کا مالک ہونا چاہیے۔"

"تھینکس...... بالکل۔" جاسم نے پُرتشکر لہجے میں کہا اور دوبارہ بہ راستہ کھڑکی بلڈنگ کے داخلی گیٹ کو دیکھنے لگا۔

جاسم کو اس اپارٹمنٹ میں آئے ہوئے لگ بھگ ایک گھنٹا ہوگیا تھا اور اس دوران میں دو اہم واقعات وقوع پذیر ہوچکے تھے۔ نمبر ایک، ناجیہ کا اغوا۔ نمبر دو، راجو کے آدمی حنیف کا ان باپ بیٹی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے وہاں پہنچنا اور وہ بھی پزا ڈلیوری بوائے کے روپ میں۔ انہی سنسنی خیز حالات کے پیشِ نظر جاسم کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ راجو یا ڈیوڈ کے حکم پر اس اپارٹمنٹ کی نگرانی بھی توکرائی جاسکتی ہے تاکہ یہ پتا چلتا رہے کہ اس اپارٹمنٹ کے مکینوں میں سے کس وقت کون باہر گیا اور کب کوئی ان سے ملنے وہاں پہنچا؟ اسی بات کی تصدیق کے لیے جاسم بلڈنگ کے سامنے والے حصے کا تنقیدی جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ڈیوڈ نے تو جاسم کو یہاں تک بتادیا تھا کہ وہ ناجیہ کے اپارٹمنٹ میں، اس موجودگی سے آگاہ ہے لہٰذا اس امر میں کسی شک کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی، وہ اپارٹمنٹ زیرِ نگرانی تھا۔

غفار داؤد جب ٹیلی اسکوپ لے کر آیا تو جاسم نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "انکل! آج ناجیہ نے کس رنگ کا لباس پہنا ہوا ہے؟"

"جیٹ بلیک۔"

جاسم زیرِلب مسکرا کر رہ گیا۔

"تم نے ناجیہ کے ڈریس کا کلر کیوں پوچھا؟"

"بس، ایسے ہی انکل۔" جاسم نے کہا۔ "اسے بلیک کلر بہت پسند ہے۔ میرا اندازہ تھا، اس نے اسی رنگ کا لباس پہنا ہوگا۔ دیکھ لیں، میرا یہ اندازہ درست نکلا۔"

غفار داؤد نے شک زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ جاسم کی وضاحت سے وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ تاہم کوئی سوال کیے بغیر وہ اپنے دوست سرمد صدیقی کو فون کرنے کی غرض سے بیڈ روم سے نکل گیا۔

"بلیک کیٹ۔" جاسم نے زیرِلب دہرایا پھر تصور میں ناجیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "کیا کہتی ہو؟ یہ نام اتنا بُرا بھی نہیں ہے...... ہیں نا۔"

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ تینوں پچھلے ایک گھنٹے سے گمبھیر مذاکرات میں مصروف تھے۔ اسی گفتگو کے دوران میں انہوں نے اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق ڈنر بھی کرلیا تھا۔ اس سنجیدہ اور سنسنی خیز میٹنگ نے غفار داؤد پر صورتِ حال کو آشکار کردیا تھا۔ حقیقت جان لینے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہوگیا تھا۔ اس بات نے اسے تسلی دی تھی کہ ناجیہ محفوظ اور سلامت تھی۔

"سر! میں نے آپ کو سب کچھ کھول کر بتادیا ہے۔" جاسم نے سرمد صدیقی سے کہا۔ "اب آپ اپنی قیمتی رائے دیں۔"

"میں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر پروڈکشن کے شعبے میں گزاری ہے۔" صدیقی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "میں پاکستان کے تمام پروڈکشن ہاؤسز اور یہ کام کرنے والے افراد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ ڈیوڈ نام کا کوئی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر میرے ریکارڈ میں کہیں موجود نہیں۔ اب دو میں سے کوئی ایک بات ہوسکتی ہے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"یا تو یہ ڈیوڈ کسی غیر ملکی پروڈکشن کمپنی کا نمائندہ ہے اور یا پھر راجو ہی تمہارے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔"

"یہ راجو کا گیم نہیں ہوسکتا سر۔" جاسم نے پُروثوق انداز میں کہا۔ "ڈیوڈ نے میری ذات کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بھی کی ہیں جو راجو کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ یہ ڈیوڈ کوئی بہت ہی اونچی شے ہے۔ اس نے میری حرکات وسکنات پر بڑی گہری نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ اس

نے ری ایلیٹی ٹی وی کے حوالے سے مجھے جتنا بتایا ہے، اس کی روشنی میں آپ کی پہلی بات درست نظر آتی ہے۔ وہ یقیناً کسی بڑی غیر ملکی کمپنی کے لیے کام کر رہا ہے اسی لیے پینتالیس دن کی شوٹنگ کے لیے سرزمینِ اسرار و رموز مصر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ڈیوڈ نے اس ڈیڑھ ماہ کے شوٹ کے لیے مجھے بڑا ہینڈسم اماؤنٹ آفر کیا ہے۔''

''ہاں، تم نے بتایا تھا، پینتالیس دن کے کام کے لیے وہ تمہیں دس ہزار یو ایس ڈی ادا کرے گا یعنی پندرہ لاکھ روپے۔ یہ کوئی معمولی معاوضہ نہیں ہے۔ اگر روزانہ کی اُجرت کا حساب کیا جائے تو یہ رقم فی دن لگ بھگ ساڑھے تینتیس ہزار روپے بنتی ہے۔'' صدیقی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہے۔ کوئی بھی غیر ملکی پروڈکشن کمپنی کسی میگا پروجیکٹ کے لیے اپنی کاسٹ کو ہینڈسم پے منٹ کر سکتی ہے لیکن ڈیوڈ کا انداز مجھے کھٹک رہا ہے۔ اس نے جس طور تم سے رابطہ کیا، وہ خاصا مشکوک ہے اور تمہیں دبانے کے لیے اب اس نے ناجیہ کو اغوا کروا کر اپنے پاس گروی رکھ لیا ہے۔ مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔ اس کی حرکتوں سے مجھے کسی بڑے طوفان کی آمد کے آثار نظر آ رہے ہیں۔''

''اس کے اسٹائل سے مطمئن تو میں بھی نہیں ہوں سر۔'' جاسم نے کہا۔ ''لیکن اس کی بات مان لینے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک ناجیہ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ میں اس کی سلامتی اور بہ حفاظت واپسی کے لیے ڈیوڈ کے سامنے جھکنے کو تیار ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ استنبول پہنچ کر ری ایلیٹی ٹی وی شو والا کانٹریکٹ سائن کر لوں گا۔ ناجیہ، انکل غفار کے پاس پہنچ جائے، یہی میری پہلی ترجیح ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''جاسم! میں تمہارے خلوص اور ناجیہ کے لیے سچے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور موجودہ سچویشن میں تمہارے فیصلے کو درست بھی مانتا ہوں......''

''سر!'' صدیقی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جاسم بول اٹھا۔ ''اگر حالات کسی ایسی نہج پر پہنچ گئے کہ مجھے ناجیہ یا سیریل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو میں آپ کا سیریل چھوڑ دوں گا۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی جے بی......!'' صدیقی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے مجھے بات پوری کرنے دی ہوتی تو تمہیں یہ فیصلہ سنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ غفار داؤد میرا پُرخلوص دوست ہے۔ میں ناجیہ کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔ ناجیہ کی کاسٹ پر تو میں بڑے سے بڑے نقصان کے لیے تیار ہوں، ایک سیریل کی قربانی کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن میں سمجھتا ہوں، ہم اس کرائسس کو اپنی حکمتِ عملی سے منیج کر سکتے ہیں۔''

''آئی ایم سوری سر......'' جاسم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا۔ خیر، آپ بتائیں......کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

''میں کل اس سیریل کے ڈائریکٹر بابر بخاری سے ایک میٹنگ کرتا ہوں۔'' سرمد صدیقی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ہم نے استنبول والی شوٹنگ کے لیے دو ماہ کا اسکیجوئل بنا رکھا ہے۔ ہم ہنگامی بنیادوں پر، نظریۂ ضرورت کے تحت یہ کر سکتے ہیں کہ جن سینز میں تمہارا کام ہے، انہیں ابتدائی چند دنوں میں ریکارڈ کر لیا جائے یعنی تمہیں ایک ہفتے میں فارغ کر دیا جائے۔ اس دوران میں تم ڈیوڈ سے میٹنگ کر کے اس سے ہفتہ دس دن کی مہلت لے لو۔ میرا خیال ہے، وہ تمہیں اتنا وقت ضرور دے گا۔''

''وہاٹ اے بریلینٹ آئیڈیا۔'' جاسم نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''سر! آپ نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا۔ اس حوالے سے میرے سینے پر بڑا بھاری بوجھ تھا۔ میں آپ کے سیریل کو متاثر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوڈ سے ٹائم لینا آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔''

''انسان اگر ہمت نہ ہارے تو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آتا ہے جے بی......'' صدیقی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم ایک باہمت اور حوصلہ مند انسان ہو۔ بس، ذرا جذبات کو قابو میں رکھنے کی عادت ڈالو۔ جذبات سے مغلوب ذہن درست فیصلے کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس نکتے کو ذہن نشین کر لو۔''

''سر! میں آپ کی اس نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' جاسم نے فرمانبرداری سے کہا۔ ''آپ مجھے کم و بیش ایک سال سے جانتے ہیں۔ آپ کو نہیں لگتا کہ میں نے اپنے معاملات کو کافی حد تک کنٹرول کر لیا ہے۔''

''یو آر ناؤ مچ بیٹر......'' صدیقی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کے سمجھانے سے انسان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ وقت پڑنے پر حالات خود ہی اسے بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ خیر......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر غفار داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''میں چاہتا ہوں، ہفتہ سولہ تاریخ کی دوپہر تک جاسم اسی اپارٹمنٹ پر قیام کرے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......''

''میں بھلا کیوں اعتراض کروں گا۔'' ناجیہ کا پاپا جلدی سے بولا۔ ''جاسم کوئی غیر تھوڑی ہے۔ یہ جب تک چاہے، یہاں رہ سکتا ہے۔''

سرمد صدیقی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا پھر جاسم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''جے بی! میں کل کسی وقت تمہارا سامان یہاں پہنچانے کا انتظام کر دوں گا۔ تم یہیں سے سیدھے ائرپورٹ جاؤ گے۔ امید ہے، تم اپنے انکل غفار کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرو گے۔''

صدیقی کا آخری جملہ پُرمعنی اور فکر انگیز تھا۔ جاسم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''یس سر...... میں اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھوں گا۔''

''ویری گڈ......'' صدیقی نے توصیفی انداز میں کہا پھر غفار داؤد سے پوچھا۔ ''اینی پرابلم؟ میں کافی دیر سے محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔''

''ہاں...... میں تذبذب کا شکار ہوں۔'' ناجیہ کے پاپا نے جواب دیا۔

''کس سلسلے میں؟''

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہمیں اس واقعے کی پولیس میں رپورٹ ضرور درج کرانا چاہیے تاکہ بعد میں ہم کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔''

''اصولی طور پر آپ کی بات صد فیصد درست ہے غفار صاحب۔'' صدیقی نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ ''لیکن اس وقت ہم جس نوعیت کے حالات کا شکار ہیں، ان میں ہمارا یہ عمل ناجیہ کے لیے کوئی بڑی پریشانی کھڑی کر سکتا ہے۔''

''سر جو کہہ رہے ہیں، اس کی بعض تکنیکی وجوہات ہیں انکل۔'' جاسم نے غفار داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ بات صرف ہم جانتے ہیں کہ ناجیہ اس وقت ڈیوڈ کی تحویل میں ہے۔ اگر ہم تھانے جا کر یہ رپورٹ درج کراتے ہیں کہ ڈیوڈ نے ناجیہ کا کڈنیپ کرایا ہے تو ڈیوڈ کو اسٹیبلش کرنے کے لیے ہمیں پولیس کے درجنوں سوالات کے جوابات دینا پڑیں گے اور بڑی بات یہ ہے کہ ہم ڈیوڈ اور اس کے کارنامے کو ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ نتیجتاً ہمیں غلط سمجھا جائے گا اور ہمارے اس اقدام سے ڈیوڈ برہم ہو کر ناجیہ کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

''جے بی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' سرمد صدیقی نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''ڈیوڈ ایک ایسا کردار ہے کہ جسے ہم جانتے تو ہیں لیکن اس کے حوالے سے ہمارے ہاتھ میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ہم اغوا والے معاملے کو تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔'' غفار داؤد نے کہا۔ ''ناجیہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ بعد میں جب وہ واپس آجائے گی تو ہم اس کے غیاب کے حوالے سے کوئی بھی کہانی تیار کر لیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''ناجیہ کی گمشدگی کی رپورٹ تو کسی بھی وقت درج کرائی جا سکتی ہے۔'' جاسم نے کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں اس سلسلے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں، ناجیہ ڈیوڈ کی کسٹڈی میں بالکل محفوظ ہے۔ ہمیں دانش مندی سے کام لیتے ہوئے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''غفار صاحب! جوان بیٹی کا معاملہ بڑا حساس ہوتا ہے۔'' سرمد صدیقی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ چار دیواری کے اندر کا معاملہ تشہیر کی نذر ہو گیا۔ میری میز کی دراز میں ایک اسکرپٹ رکھا ہے۔ آپ اس وقت جن حالات کا شکار ہیں، ایسی ہی سچویشن کے لیے رائٹر نے بڑی خوب صورت اور طاقتور لائن لکھی ہے...... اگر کوئی لڑکی اپنے ورثا کے علم اور مرضی کے بغیر ایک رات بھی گھر سے باہر گزار کر آجائے تو دنیا والوں کی نظر میں اس کا کردار مشکوک ہو جاتا ہے، چاہے اس نے وہ رات کہیں [illegible] عبادت کرتے ہوئے بتا دی ہو۔''

''ٹھیک ہے، جیسے آپ لوگوں کی مرضی......'' غفار داؤد نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کے ساتھ ہوں۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

سرمد صدیقی اپنے پریشان حال دوست غفار داؤد کو تسلی دلاسا دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا تو جاسم نے پوچھا۔

''انکل! مجھے کہاں ڈیرا لگانا ہے؟''

''میرے روم میں۔'' ناجیہ کے پاپا نے جواب دیا۔

''اور آپ......؟''

''میں اپنی مرحوم بیوی نرجس کے روم میں شفٹ ہو

جاؤں گا۔"

"اوہ...... میری وجہ سے آپ کو کافی پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہے نا؟"

"بیٹا! ایسی غیریت کی باتیں نہ کرو۔" غفار داؤد نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم تو میرے لیے نجات دہندہ ثابت ہورہے ہو۔ مجھے ناجیہ پر فخر محسوس ہورہا ہے کہ اس نے تم جیسے بہادر، ذمے دار اور پُرخلوص انسان کا انتخاب کیا۔ دکھ سکھ تو زندگی کا حصہ ہے۔ اس اپارٹمنٹ میں تین بیڈ روم ہیں۔ آج ناجیہ والا بیڈ روم خالی رہے گا۔ باقی دو بیڈ روم میں ہم قیام کریں گے بلکہ تم نے تو میرے والے بیڈ روم میں اپنا قدم ڈال ہی دیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں انکل؟" جاسم نے اُلجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے بھئی...... جس کمرے کی کھڑکی میں سے تم اس بلڈنگ کے داخلی گیٹ کا دور بینی مشاہدہ کرتے رہے ہو، وہ میرا بیڈ روم ہی تو ہے۔"

"اوہ ...... تو یہ بات ہے۔" جاسم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ غفار داؤد نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ "تم نے میڈ اِن جرمنی ٹیلی اسکوپ کی کارکردگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"آپ میرے ساتھ آئیں۔" جاسم اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو لائیو تماشا دکھاتا ہوں۔"

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اس بیڈ روم میں پہنچے جو چند روز کے لیے جاسم کے استعمال میں رہنے جارہا تھا۔ جاسم نے اسی کمرے کی سلائڈنگ ونڈو سے ایک شخص کی مشکوک سرگرمی نوٹ کی تھی۔ جاسم نے غفار داؤد کی فراہم کردہ ٹیلی اسکوپ کو اپنی آنکھوں پر لگا کر باہر کا جائزہ لیا پھر غفار داؤد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"روڈ کے پار آپ کو ایک بلڈنگ نظر آرہی ہے نا۔ اس دومنزلہ عمارت میں ایک بینک کا برانچ سیٹ اَپ ہے یعنی دونوں منازل پر مذکورہ بینک کا قبضہ ہے؟"

"بالکل، میں اس بینک سے اچھی طرح واقف ہوں۔" غفار داؤد نے اثبات میں جواب دیا۔ "میرا کئی بار اس برانچ میں جانا بھی ہوا ہے۔"

"کیا اس وقت وہ بینک آپریٹیو ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" غفار داؤد نے قطعی لہجے میں کہا۔ "پبلک کے لیے بینک کی ٹائمنگ ساڑھے پانچ بجے تک ہے۔ اسٹاف میں سے اکثر افراد سات سے آٹھ بجے تک اور بعض اوقات نو بجے تک رکتے ہیں اور وہ بھی بینک کے شٹر گرا کر وہ کلوزنگ کے پروسس میں معروف رہتے ہیں جسے 'آپریٹیو' ہرگز نہیں کہا جاسکتا اور اس وقت تو نصف شب کا عمل ہے۔"

"جب سے بینک کے 'آف ٹائم' میں بینک کے لاکرز کی ڈکیتیوں کے متعدد واقعات ہوئے ہیں، کم از کم دو سیکیورٹی گارڈز کا بند بینک کے اندر قیام لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔" جاسم نے کہا۔ "اس حساب سے سامنے والی بینک برانچ میں اس وقت دو سیکیورٹی گارڈز اور ایک بلڈنگ کا چوکیدار موجود ہونا چاہیے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟"

"نہیں بیٹا، تمہارا حساب بالکل درست ہے۔" غفار داؤد جلدی سے بولا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم اس بینک کا ذکر اتنی سنجیدگی سے کیوں کررہے ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے وہاں کچھ ملا ہے۔" جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اصولی طور پر اس وقت سیکیورٹی گارڈز کو بینک کی عمارت کے اندر اور چوکیدار کو گیٹ کے نزدیک ہی کہیں موجود ہونا چاہیے...... بلڈنگ کی چھت پر تو قطعی نہیں۔"

"مطلب...... تم نے اس ٹیلی اسکوپ کی مدد سے...... بینک کی چھت پر کچھ غیر معمولی پن دیکھ لیا ہے؟"

جاسم نے ٹیلی اسکوپ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ بھی مشاہدہ فرمائیں انکل۔"

غفار داؤد نے جاسم کے ہاتھ سے ٹیلی اسکوپ لے کر آنکھوں پر لگائی اور چند سیکنڈ کے بعد بے یقینی سے بولا۔ "بینک کی چھت پر ایک ہٹا کٹا شخص بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں دوربین بھی دیکھی ہے۔ وہ تھوڑی، تھوڑی دیر کے بعد اس دوربین سے ہماری اپارٹمنٹ بلڈنگ کی طرف بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے بیٹا......؟"

"انکل! کیا اس بینک کے سیکیورٹی گارڈز یا چوکیدار کو اس اپارٹمنٹ کی دور بینی نگرانی کرنے کی ضرورت ہے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، وہ اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے کسی اپارٹمنٹ کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہے۔" جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم اس وقت جس نوعیت کے حالات سے گزر رہے ہیں، اس میں، میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اس بندے کی توجہ کا مرکز آپ کا یہ

اپارٹمنٹ ہے۔"

"اوہ......" وہ ایک پُرتشویش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "میری سمجھ میں یہ آرہا ہے کہ اس بندے کا تعلق انہی لوگوں سے ہے جنہوں نے ناجیہ کا کڈنیپ کیا ہے۔"

"اس بات کے امکانات بہت کم ہیں۔" جاسم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "ڈیوڈ کے آپریشن کا انداز بڑا پرفیکٹ ہے۔ اسے جو چاہیے تھا، وہ اس نے بہ آسانی حاصل کرلیا۔ ناجیہ اس وقت ڈیوڈ کی کسٹڈی میں ہے۔ اس کے بعد آپ کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کا جواز باقی نہیں رہتا جبکہ......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"راجو کا بھیجا ہوا جو بندہ آپ باپ بیٹی کو، پزا ڈیلیوری بوائے کے روپ میں قتل کرنے آیا تھا، اسے میں نے فریج والے آدم قد ڈبے میں "پیک" کرکے یہاں سے روانہ کردیا ہے یعنی وہ اپنے باپ راجو کے پاس واپس نہیں پہنچا۔ بینک کی بلڈنگ کی چھت پر حنیف کا کوئی ساتھی ہوسکتا ہے لیکن مجھے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے چیک کرنا پڑے گا۔"

"کیا مطلب......تم کیسے چیک کروگے؟" غفار داؤد نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، اس بیڈ روم میں بیٹھ کر اُس بندے کی "مزاج پرسی" کرنا تو ممکن نہیں ہے۔" جاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس نیک کام کے لیے مجھے اس کے پاس جانا ہوگا۔"

"اوہ......" غفار داؤد تفکر آمیز نظر سے اسے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم نے شروع ہی میں اس مشکوک بندے کو بلڈنگ کی چھت پر دیکھ لیا تھا...... ہیں نا؟"

جاسم نے اثبات میں گردن ہلانے کو کافی جانا۔

"ہم نے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹا صدیقی صاحب کے ساتھ، موجودہ صورتِ حالات پر خاصی گمبھیر گفتگو کی ہے۔" غفار داؤد نے سوالیہ نظر سے جاسم کو دیکھا۔ "تم نے ان کے سامنے اس نگرانی کرنے والے بندے کا ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"تاکہ وہ مجھے یہاں سے لے نہ جائیں......"

"میں سمجھا نہیں؟"

"اگر صدیقی صاحب کو یہ پتا چل جاتا کہ روڈ کے اُس پار بینک والی بلڈنگ کی چھت پر کوئی شخص دوربین تھامے آپ کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کررہا ہے تو انہیں یہ سمجھ لینے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی کہ میں اس بندے کی گردن کا سائز لینے ضرور وہاں جاؤں گا لہٰذا وہ مجھے اس اپارٹمنٹ پر رکنے کی اجازت نہ دیتے کیونکہ وہ چاہتے ہیں، میں کسی لفڑے میں ملوث ہوئے بغیر ہفتے کی دوپہر استنبول روانہ ہوجاؤں۔"

جاسم نے غفار داؤد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ "جبکہ میں نے اس نگرانی کرنے والے مشکوک بندے کو دیکھتے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کا گھوفٹ کرنے کے بعد ہی یہاں سے ٹلوں گا۔"

"تمہارے یہاں رکنے کی تجویز صدیقی صاحب نے دی تھی۔" وہ جاسم کو ٹٹولنے والی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پھر تم اس اپارٹمنٹ پر اپنے قیام کے لیے کوئی دوسرا راستہ نکالتے......؟"

"جی بالکل۔ یہی بات ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ "اس بندے کا گھوفٹ کیے بغیر آگے بڑھنا ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ ہوتا۔ میں راجو کو اچھی طرح جانتا ہوں انکل...... وہ ایک خطرناک اور بدبودار معاشرتی ناسور ہے۔ اس کا ہر منصوبہ کسی ہلاکت خیز انفیکشن سے کم نہیں۔ یہ کوئی عام فیور نہیں کہ دو گولی کیل پول یا پیناڈول سے اتر جائے گا۔ یہ تھرڈ جنریشن اینٹی بائیوٹک کا کیس ہے انکل۔"

غفار داؤد نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر جاسم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "تم کب وہاں جانا چاہتے ہو اور کتنی دیر میں واپس آؤگے؟"

"اِس روڈ پر ایک، ڈیڑھ بجے تک رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔" جاسم نے سلائیڈنگ ونڈو کے پار دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میرے خیال میں اس کام کے لیے دو بجے کے بعد کا وقت زیادہ مناسب رہے گا اور میں سمجھتا ہوں، یہ معاملہ پندرہ سے بیس منٹ میں نمٹ جانا چاہیے۔ اس دوران میں آپ میڈان جرمنی ٹیلی اسکوپ کے توسط سے بینک والی بلڈنگ کی چھت کا سنسنی خیز نظارہ کیجیے گا۔ آپ اسے انٹرٹینمنٹ کا ایک چھوٹا سا پیکیج سمجھ لیں۔"

"میرے پاس ایک لانگ رینج، وائیڈ اینگل زوم لینس والا ڈیجیٹل "ڈی ایس ایل آر" کیمرا بھی رکھا ہوا ہے۔" غفار داؤد نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ "تم اُس بلڈنگ کی چھت پر جو کچھ بھی کروگے، میں اسے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلوں گا لیکن اس سلسلے میں میری ایک شرط ہے۔"

"جی بتائیں؟"

"تمہاری روانگی میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔" وہ جاسم کے چہرے پر نگاہ جما کر بولا۔ "اس دوران میں تم مجھے اپنی زندگی کی مکمل کہانی سناؤ گے...... کچھ بھی ایڈیٹ کیے بغیر۔ ناجیہ کی زبانی تمہارے بارے میں مجھے جو پتا چلا ہے، وہ کافی نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"انکل! ناجیہ کے توسط سے میں آپ کے ساتھ زندگی کا ایک نہایت ہی نازک اور اہم رشتہ جوڑنے جارہا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لہٰذا کوئی ڈنڈی مارے بغیر میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں گا۔"

آئندہ دو گھنٹے تک غفار داؤد، جاسم کی رُودادِ زندگی سنتا رہا۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی، اس نے سوال بھی کیا۔ اس سٹنگ کے اختتام پر جاسم کا سُسر بننے سے پہلے ہی غفار داؤد اس کا ایک بے تکلف رازدار دوست بن چکا تھا۔

☆☆☆

نصف شب کا عمل تھا۔ ڈاکٹر جنید واسطی اور شعیب چاچا اپنے ایک یورپی مہمان سے ملنے جارہے تھے۔ ڈاکٹر اسمتھ نامی اس شخص کا تعلق ہنگری سے تھا اور وہ کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اپنے اس تین روزہ قیام کے دوران میں اس نے بہت سے اہم کام نمٹانا تھے جن میں سے ایک کام ڈاکٹر جنید واسطی سے ملاقات بھی تھی۔ ڈاکٹر اسمتھ دراصل شعیب چاچا کو جانتا تھا اور اسی کی معرفت اسمتھ، جنید واسطی سے ملنے والا تھا۔ ڈاکٹر اسمتھ، بلغارین کارٹل مسٹر برانڈو کا خاص آدمی تھا۔

"ڈاکٹر! آپ نے فائلوں کی تیاری میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی۔" شعیب نے جنید واسطی سے پوچھا۔ "یہ ذہن میں رہے کہ سامنے بھی ایک ڈاکٹر ہے۔ وہ ایک ایک رپورٹ کو عقابی نگاہ سے دیکھے گا۔"

"آپ فکر نہیں کرو۔" جنید واسطی نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "میں اپنے کام کا ماہر ہوں۔ اس گورے ڈاکٹر کا باپ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ میں نے ان پانچ مریضوں کی رپورٹس تیار کرنے میں کیسی 'مہارت' سے کام لیا ہے۔"

"بس کوئی گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کروڑوں کی ڈیل ہے جس کا ففٹی پرسنٹ ہم ایڈوانس لے چکے ہیں۔"

"گڑبڑ تو ہوچکی ہے شعیب لیکن ہم نے اس حادثے کو بڑی خوب صورتی سے ہینڈل کیا ہے، یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہو......"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" شعیب نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہماری نظر اپنے فائدے پر ہے۔ باقی دنیا جائے جہنم میں اور جہاں تک ان پانچ افراد کا تعلق ہے، جو ہمارے تجربے کی بھینٹ چڑھ گئے، ان کی زندگی میں پہلے کون سی خوشی تھی جو وہ اپنی زیست کے سفر کو جاری رکھ سکتے......"

"ہم نے تو انہیں غموں سے نجات دلائی ہے۔" ڈاکٹر جنید نے سفاک لہجے میں کہا۔ "وہ پانچوں معاشی اور معاشرتی طور پر تباہ حالی کا شکار تھے۔ ہم نے انہیں بالکل درست جگہ پر پہنچا دیا۔ انہیں...... یعنی اُن کی روحوں کو ہمارا شکرگزار ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر جنید کی اس بات پر شعیب چاچا نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ آج سہ پہر میں، ڈاکٹر جنید کے عالی شان پرائیویٹ اسپتال میں ایک خوف ناک دھما کا ہوا تھا۔ بنگلے پر ہونے والی کارروائی اس کے علاوہ تھی مگر اس وقت وہ دونوں ان ہنگامی واقعات کو یکسر بھلا کر کسی اور ہی مشن پر نکلے ہوئے تھے، گویا ڈاکٹر اسمتھ سے ہونے والی یہ ملاقات بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔

"آج ہم بہت خوش ہیں کہ یہ تجربہ کامیاب ہوگا۔ آپ اِن فائلز کو چیک کرلیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو ہم کل کسی وقت ان پانچ مریضوں سے آپ کی ملاقات بھی کرا دیں گے۔ یہ پانچوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کی ویکسین نے زبردست رزلٹ دیا ہے۔"

"ہوں......" ڈاکٹر اسمتھ نے اثبات میں گردن ہلائی اور مذکورہ فائلز کی اسٹڈی میں مصروف ہوگیا۔

ڈاکٹر جنید نے ڈاکٹر اسمتھ سے صریحاً غلط بیانی کی تھی کیونکہ متذکرہ بالا تجربہ بُری طرح ناکام رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں پانچ افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ڈاکٹر اسمتھ کو پیش کی جانے والی ان پانچ فائلز اور ان میں لگی ہوئی رپورٹس کا موت کے منہ میں چلے جانے والے افراد سے کوئی ناتا واسطہ نہیں تھا۔ یہ تمام کی تمام فائلز جعلسازی کا عمدہ نمونہ تھیں۔

دھوکا دہی اور جعل سازی کا معاملہ دوطرفہ تھا۔ ڈاکٹر اسمتھ دراصل بلغارین کارٹل مسٹر برانڈو کے لیے کام کرتا تھا اور وہ برانڈو کا ایک آئیڈیا لے کر دو ماہ پہلے شعیب چاچا سے ملا تھا۔ مسٹر برانڈو نے شعیب کو بتایا تھا کہ ڈاکٹر اسمتھ کے ریسرچ سینٹر نے کینسر کی ویکسین تیار کرلی ہے۔ ہنگری کی ایک دواساز کمپنی نے یہ کام بہت ہی رازداری کے ساتھ انتہائی خفیہ طریقے سے کیا تھا اور اس ویکسین کا ٹیسٹ بھی نہایت ہی پردہ داری سے کیا جانے والا تھا، اسی سلسلے میں مسٹر برانڈو نے شعیب چاچا سے رابطہ کیا تھا۔ اس طرح یہ

پروجیکٹ ڈاکٹر جنید واسطی کے اسپتال میں پہنچ گیا تھا۔ دو ماہ پہلے ڈاکٹر اسمتھ انہیں ویکسین دے گیا تھا۔ ڈاکٹر جنید نے اپنے اسپتال کے پانچ مریضوں کو ان کے علاج کے بہانے اس دوا سے ویکسینیٹ کرنا تھا اور پھر ایک ماہ تک باقاعدگی سے ان کا بلڈ ٹیسٹ کرتے رہنا تھا۔ ڈاکٹر اسمتھ نے انہیں بتا دیا تھا کہ اس ویکسین کے بعد مریض کی بلڈ رپورٹس میں ڈراسٹک چینجز آئیں گی۔ ویکسین مریض کے خون میں شامل ہونے کے بعد اس کے سیرم میں اسٹور ہو جائے گی اور کینسر کے خلاف مریض کی قوتِ مدافعت کو بہت زیادہ بڑھا دے گی۔ اس دوران میں، سیرم میں رونما ہونے والی کیمیائی اچانک اور شدید تبدیلیوں کو مریض کی بلڈ رپورٹس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر اس ویکسینیشن کے بعد ایک ماہ تک مریض زندہ رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس ویکسین کا تجربہ کامیاب رہا۔ اب اس ویکسینیٹڈ شخص کو عمر بھر سرطان کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔

بدقسمتی سے کینسر ویکسین کا تجربہ بُری طرح فیل ہو گیا تھا۔ وہ پانچوں مریض جنہیں ویکسینیٹ کیا گیا، وہ ایک ہفتے کے اندر اذیت ناک موت کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے لیکن دولت کے لالچ میں ڈاکٹر جنید اور شعیب چاچا نے ایک خطرناک چال چلنے کا فیصلہ کیا اور پانچ تندرست افراد کی ڈراسٹک چینجز والی بلڈ رپورٹس تیار کر کے ڈاکٹر اسمتھ کو بتایا تھا کہ تجربہ کامیاب رہا ہے لہٰذا اس ویکسین کو لانچ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر جنید واسطی اور شعیب چاچا تو تھے ہی..... ضمیر فروش مگر ڈاکٹر اسمتھ اور مسٹر برانڈو بھی کوئی دودھ کے دھلے ہوئے نہیں تھے۔ ان کا کسی فارماسیوٹیکل کمپنی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ وہ لوگ کارپوریٹرز تھے اور کارپوریٹ ورلڈ میں صرف اپنے فائدے پر نظر رکھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر اسمتھ نے بہ غور ان پانچ افراد کی رپورٹس کا مطالعہ کیا پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے پُرمسرت لہجے میں بولا۔ ''ہم اگلے ماہ اس ویکسین کو لانچ کر دیں گے۔ پہلی لاٹ پچاس کروڑ روپے کی مالیت کی ہوگی جس پر آپ لوگوں کا کمیشن دو فیصد تھا۔ اس سلسلے میں ہاف پے منٹ ایڈوانس میں کی جا چکی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''ڈاکٹر اسمتھ یو آر رائٹ۔'' شعیب چاچا نے کہا۔

''پچاس کروڑ روپے پر دو فیصد کمیشن ایک کروڑ بنتا ہے جس کا نصف یعنی پچاس لاکھ روپے آپ ادا کر چکے ہیں، پچاس لاکھ روپے باقی ہیں۔''

''وہ کل آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر اسمتھ نے کہا۔ ''چند روز بعد میں یہ ویکسین آپ کے ہاتھوں میں پہنچا دوں گا۔ اسی کے بعد آپ کا کام شروع ہوگا۔ یہ دو فیصد کمیشن تو ٹوکن منی ہے۔ اصل بزنس میں آپ ہمارے برابر کے پارٹنرز ہیں۔ مال سپلائی کرنا ہماری ذمے داری، اسے مارکیٹ میں کھپانا آپ کا فرض......'' پھر وہ براہِ راست شعیب چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''مسٹر برانڈو سے آپ کی ملاقات ہونے والی ہے۔ باقی کی تفصیلات وہ آپ کو بتا دیں گے۔''

''ہاں۔'' شعیب چاچا نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اس ماہ کے تھرڈ ویک میں ہماری ملاقات استنبول میں فکس ہے۔''

''آل دی بیسٹ......'' ڈاکٹر اسمتھ نے خوش دلی سے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ڈاکٹر اسمتھ کو ''گڈ نائٹ'' کہہ کر ہوٹل سے نکل آئے۔ واپسی کے سفر میں جنید واسطی نے شعیب چاچا سے کہا۔

''یہ ڈیل ہمارے لیے کافی منافع بخش ہے۔ پچاس لاکھ ہم وصول کر چکے، باقی کے پچاس لاکھ کل ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے جائیں گے اور جب آپ کی برانڈو سے میٹنگ ہو جائے گی تو ہم اس بزنس میں ففٹی پرسنٹ کے پارٹنر بن جائیں گے یعنی اس پہلی پچاس کروڑ کی لاٹ کو مارکیٹ میں کھپانے کے بعد پچیس کروڑ روپے ہمارے حصے میں آئیں گے۔''

''میں سمجھتا ہوں، یہ کاروبار منافع بخش ہونے کے ساتھ ہی بہت رسکی بھی ہے۔'' شعیب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے ابھی تک صرف پانچ افراد پر اس ویکسین کو ٹیسٹ کیا ہے اور وہ پانچوں ایک ہفتے کے اندر اذیت ناک موت سے دوچار ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تاحال کینسر ایک لاعلاج مرض ہے کیونکہ جب تک اس موذی مرض کی تشخیص ہو پائے، یہ مریض کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد پیسے کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ صاحبِ ثروت لوگ مہنگے علاج سے گزرنے کے بعد نسبتاً آسان موت کا شکار ہوتے ہیں اور غریب غربا بے چارے خیراتی اسپتالوں میں دھکے کھاتے کھاتے اپنے حسرت ناک انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ جب کسی انسان کے اندر کینسر اپنی جگہ بنا لیتا ہے تو جلد یا بہ دیر اسے موت کو گلے لگانا ہی پڑتا

ہے لیکن......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن اس ویکسین کے مارکیٹ میں آجانے کے بعد لوگ دھڑا دھڑ اس کا استعمال شروع کردیں گے تاکہ وہ کینسر کے مرض سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائیں جس کے نتیجے میں روزانہ لاتعداد اموات کی خبریں سننے کو ملیں گی۔"

"میں آپ کو اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ اس ویکسین کو انجیکٹ کرنے والا کوئی بھی شخص ہلاک نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر جنید نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہو؟" شعیب چاچا نے بے یقینی سے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ اُن پانچ پیشنٹس کی المناک اموات کو بھول چکے ہیں جنہیں ہم نے ویکسینیٹ کیا تھا؟"

"نہیں۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔" جنید نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔ "وہ پانچوں اس ویکسین کے سائڈ ایفیکٹس کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلے گئے تھے لیکن اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں بیٹھ رہی ڈاکٹر......؟"

"ویری سمپل!" ڈاکٹر جنید چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "جب یہ ویکسین کسی کی باڈی میں انجیکٹ ہی نہیں ہوگی تو پھر اس کی موت کیسے واقع ہوگی۔"

"ہاؤ کین اِٹ پاسیبل؟" شعیب چاچا نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ "جب یہ ویکسین مارکیٹ میں موجود ہوگی تو لوگ کینسر سے بچاؤ کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر اسے لگوائیں گے بھی۔ پھر وہ لوگ اس ویکسین کے مُضر اثرات سے کس طرح محفوظ رہ پائیں گے؟"

"اس ویکسین کو مارکیٹ میں لانچ کون کرے گا؟" ڈاکٹر جنید واسطی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ظاہر ہے، آپ ہی لانچ کریں گے۔" شعیب چاچا نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔ "ڈاکٹر اسمتھ اس ویکسین کا اسٹاک آپ تک پہنچائے گا۔ مسٹر برانڈو سے ہماری یہی ڈیل ہوئی ہے۔ وہ ہمارے علاوہ پاکستان میں کسی اور پارٹی کو یہ ویکسین نہیں دے گا۔ اسے آپ پر بھروسا ہے اور ہمیں بھی اس پر بھروسا کرنا ہوگا، کم از کم اس وقت تک ضرور جب تک اس ڈیل کا ففٹی پرسنٹ شیئر یعنی پچیس کروڑ روپے ہمیں مل نہیں جاتے اور یہ کام میرے استنبول والے ٹرپ کے بعد ہی ہوسکے گا۔"

"جب اس ویکسین کا اسٹاک میرے پاس پہنچے گا تو میں اسے اپنی نگرانی میں "ری پیک" کرواؤں گا۔" جنید نے شعیب چاچا کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ویکسین کلیئر لیکویڈ ہے، بالکل انسانی بلڈ میں موجود سیرم کے مانند۔ میں اس ویکسین کے انجکشن والی وائلز کا لیکویڈ تبدیل کرکے انہیں پہلے جیسا سیل پیک بنادوں گا۔ میرے پاس اس پروسس کا مکمل بندوبست موجود ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ تبدیل شدہ اس ویکسین کو استعمال کرنے والا شخص موت کے منہ میں نہیں جائے گا۔"

"انٹرسٹنگ۔" شعیب چاچا نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "یہ بتائیں، آپ اس ویکسین کو بے ضرر بنانے کے لیے کون سا لیکویڈ یوز کریں گے؟"

"ایکوا پورا......" ڈاکٹر جنید نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "یعنی ڈسٹلڈ واٹر جسے ہم لوگ پاؤڈر بیسڈ انجکشنز میں ملاتے ہیں۔ یہ فلٹرڈ واٹر سے بھی زیادہ پیور اور کلیئر لیکویڈ ہوتا ہے۔"

"آپ کی کھوپڑی کے اندر تو شیطان کا دماغ فٹ ہے ڈاکٹر جنید۔" شعیب چاچا نے توصیفی نظر سے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا۔ "اس طرح جب تک ممکن ہوگا، ہم یہ گیم چلاتے رہیں گے۔"

"اگر اس ویکسین کو لگوانے کے بعد بھی کوئی شخص سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اس سے ہم پر کوئی آفت نازل نہیں ہوگی۔" جنید نے بے پروائی سے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا یہ ویکسین بنانے والی کمپنی سے اعتماد اٹھ جائے گا...... ہماری بلا سے۔"

"ہم پر کسی بھی صورت میں کوئی مصیبت نازل نہیں ہوگی ڈاکٹر صاحب۔" شعیب چاچا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "مسٹر برانڈو ڈاکٹر اسمتھ کے توسط سے ہمارا کندھا استعمال کرکے راتوں رات اربوں کمانا چاہتا ہے۔ یہ ویکسین ہنگری کی کسی برانڈڈ فارماسیوٹیکل کمپنی کی تیار کردہ نہیں ہے۔ یہ کارپوریٹ ورلڈ کا ایک ننھا مُنّا پروجیکٹ ہے۔ اس نوعیت کے پروجیکٹس کا فالو اَپ نہیں ہوتا۔ بس، ایک ہی جھٹکے میں اربوں کھربوں سمیٹو اور پھر مارکیٹ سے چپ چاپ غائب ہوجاؤ۔ آپ نے دیکھا ہوگا، کئی ایک میڈیسن، کاسمیٹکس اور دیگر غیرملکی پروڈکٹس بڑی دھوم دھام سے منظرِعام پر آتی ہیں اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ مارکیٹ میں ناپید ہوجاتی ہیں اور اس شارٹیج کے حوالے سے کئی من گھڑت کہانیاں پھیلا دی جاتی ہیں۔ ہماری عوام کی یادداشت اتنی کمزور ہو

چکی ہے کہ ایسے معاملات کی طرف کوئی سنجیدگی سے دھیان نہیں دیتا۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' جنید نے تشویش بھرے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آج والے واقعات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''آج والے واقعات کے ساتھ چند روز پہلے والا ایک واقعہ بھی نتھی کرلیا جائے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ کوئی ہمارا مشترکہ دشمن میدان میں اتر آیا ہے۔'' شعیب چاچا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''چند روز پہلے، قسطوں پر گھریلو سامان دینے والے ایک بندے جلیل وارثی نے گرفتاری کے وقت پولیس کو بیان دیا تھا کہ میرے آدمیوں نے اسے اغوا کر کے دس لاکھ روپے تاوان وصول کیا اور بعدازاں انہی لوگوں نے اس کے گھر اور دکان میں منشیات رکھ کر اسے پولیس کے چکر میں ڈال دیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں اور آج آپ کے اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں ایک تباہ کن دھماکا ہوا ہے۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے آپ کے ایک پُرسکون بنگلے پر میڈیا اور پولیس نے مشترکہ ریڈ کیا اور آپ ہی کے تنخواہ دار ملازمین ڈاکٹر آفتاب اور اس کی معاون نرس یاسمین نے پولیس اور میڈیا والوں کو بتایا کہ اس بنگلے پر آپ ہیومن آرگنز کی غیرقانونی ٹرانسپلانٹیشن کا کام کررہے تھے۔ میں ان واقعات کو محض اتفاقات نہیں سمجھ سکتا ڈاکٹر جنید...... اسی لیے میں نے اپنے ایک آدمی اویس کو راجو سے رابطہ کرنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ کل شام تک مجھے اس معاملے کی تفصیلی رپورٹ مل جائے گی۔''

''راجو وہی لوکل غنڈا ہے ناجس سے آپ نے مراد علی کے کیس میں مدد لی تھی؟'' جنید نے سوالیہ نظر سے شعیب چاچا کی طرف دیکھا۔

''کہنے کو راجو ایک لوکل غنڈا ہی ہے مگر اس کے کنکشنز بڑے جاندار ہیں۔'' شعیب چاچا نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے اپنے دیرینہ دشمن مراد علی عرف دادا اور اس کی فیملی کو جہنم واصل کرنے کے لیے راجو سے مدد لی تھی۔ میں نے اویس کو راجو کی طرف اسی لیے روانہ کیا ہے کہ وہ ان واقعات کی حقیقت کو کھود کر نکالے اور ہمیں اس ماسٹر مائنڈ بندے تک پہنچائے جو ہمارے خلاف علمِ جنگ بلند کرچکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایک، دو روز میں ہم اپنے مطلوبہ شخص تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔''

شعیب چاچا کی بات کے جواب میں ڈاکٹر جنید نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ نے کہہ دیا ہے تو پھر ایسا ہی ہوگا جناب۔''

شعیب چاچا نے اپنے جس اویس نامی بندے کو راجو سے ملنے کے لیے کہا تھا، یہ وہی شخص تھا جو شعیب چاچا کے سیٹ اَپ میں رہتے ہوئے کامل کو ضرورت کی معلومات فراہم کرتا رہتا تھا۔ اویس ہی نے کامل کو بتایا تھا کہ اس ماہ کے آخری حصے میں شعیب چاچا استنبول کے ہوٹل ''سوئسوٹل'' میں کسی بلغارین کارٹل سے ملاقات.... کرنے والا تھا۔

اویس کی فراہم کردہ یہ اطلاعات تو صد فیصد درست تھیں۔ اب آنے والے وقت نے یہ ثابت کرنا تھا کہ اویس درحقیقت شعیب چاچا کا نمک خوار تھا یا کامل کا وفادار......

☆☆☆

جاسم نے بینک والی بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے سامنے والے ''ذریعے'' کو یکسر نظرانداز کردیا تھا۔ آج کل تو پان سگریٹ والے کیبنز میں بھی سیکیورٹی اینڈ سیفٹی کے پیشِ نظر کلوز سرکٹ ٹی وی کیمراز کی تنصیب ایک عام سی بات ہوگئی تھی اور وہ تو پھر... ایک بینک کی دومنزلہ عمارت تھی۔ وہ سی سی ٹی وی کیمراز کی آنکھ میں قید نہیں ہونا چاہتا تھا لہٰذا وہ بغلی گلی کے راستے مذکورہ بلڈنگ کے عقب میں پہنچ گیا۔

اس وقت رات کے بہ الفاظ دیگر صبح کے ڈھائی بجے تھے۔ جب وہ ناجیہ کے اپارٹمنٹ سے نکلا تو اس نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے یہ تسلی کرلی تھی کہ اس کا ٹارگٹ بینک والی بلڈنگ کی چھت پر موجود تھا۔ اس نے ٹہلنے کا عمل روک دیا تھا اور چھت کے پچھلے حصے میں ایک اسٹول پر اس پوزیشن میں بیٹھ گیا تھا کہ اس کا رخ ناجیہ والی بلڈنگ کی طرف رہے، گویا اس نے نگرانی والے معاملے پر کمپرومائز نہیں کیا تھا۔

غفار داؤد نے انٹرکام پر اپنی بلڈنگ کے چوکیدار کو بتا دیا تھا کہ اس کا مہمان یعنی جاسم پندرہ بیس منٹ کے لیے باہر جائے گا۔ اسے سامنے والے بینک کے اے ٹی ایم سے اپنے کسی عزیز کو فنڈز ٹرانسفر کرنا ہیں۔ اس خوب صورت اور مؤثر بہانے کی برکت سے چوکیدار نے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا تھا۔

بینک والی بلڈنگ کے عقب سے، سیوریج پائپ کے ذریعے چھت تک رسائی حاصل کرنے میں جاسم کو تھوڑا کشت تو اٹھانا پڑا تاہم وہ اس مقصد میں سرخ رُو ہوگیا۔ اس نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ چھت پر موجود وہ تاڑو اس کی آمد سے بے خبر رہے۔ جاسم اس وقت ایکشن سے بھرپور ایک لائیو پرفارمنس دینے جارہا تھا جس کا ڈوپ

(ڈائریکٹر آف فوٹو گرافی) اس کا ہونے والا سُسر غفار داؤد تھا۔ لہٰذا کسی مسٹیک، کسی ری ٹیک کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ اسے جو بھی کرنا تھا، آن کٹ اینڈ ون ٹیک ہی کرنا تھا۔

جاسم اپنی منزل پر پہنچا اور ذرا سی گردن اٹھا کر اس نے بلڈنگ کی چھت کا جائزہ لیا۔ اس تنومند شخص کی پشت جاسم کی جانب تھی اور چھت کی منڈیر سے اس کا فاصلہ تین سے چار فٹ رہا ہوگا۔ جاسم اس وقت جس مقام پر موجود تھا وہاں مکمل طور پر تاریکی کا راج تھا۔ وہ سیوریج والے پائپ کے ذریعے اتنی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ نیچے سے اوپر تک پہنچا تھا کہ ایک ذرا سی آہٹ یا آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نگرانی پر مامور وہ گینڈا نما شخص جاسم کی آمد سے قطعی بے خبر تھا۔

جاسم نے بلّی کے مانند پورے بدن کی لچک کا استعمال کرتے ہوئے خود کو اپنے اندر سمیٹا پھر چھت کی منڈیر پر دونوں ہاتھ جما کر ایک بے آواز جھٹکے سے خود کو اس بندے کے عقب میں، چھت پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

''السلام علیکم......!''

وہ شخص اس طرح یکایک اچھلا جیسے کسی نے اس کی تشریف پر گیارہ ہزار وولٹ کا ننگا تار رکھ دیا ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور بھی اس چھت پر موجود ہے۔ اُچھلنے کے بعد اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا تھا کیونکہ آواز ادھر ہی سے آئی تھی۔

جاسم کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو وہ بے ساختہ بولا۔ ''کون ہو تم......اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

''میں جو کوئی بھی ہوں، تمہارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں۔'' جاسم نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''ہاں، اتنا بتا دوں کہ مجھے راجو بھائی نے یہاں بھیجا ہے تاکہ تمہیں ریلیف دے سکوں۔ تم کافی دیر سے اس لڑکی کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کر رہے ہو جہاں حنیف پزا ڈلیوری دینے گیا تھا۔ تم اس کڑی مشقت سے بہت تھک گئے ہوگے۔ اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے......ایک لمبا آرام......''

''میں نے بھائی کے گینگ میں تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ جاسم کو گہری نظر سے گھورتے ہوئے شک زدہ لہجے میں بولا۔ ''کیا تم نئے ہو......مجھ سے تو یہی کہا گیا تھا کہ جب تک حنیف اپنا کام کر کے واپس نہیں آجاتا، مجھے اِدھر ہی رہنا ہے مگر پتا نہیں، حنیف کہاں رہ گیا ہے؟''

اس گینڈے کی باتوں سے اس امر کی تصدیق تو ہوگئی تھی کہ وہ راجو کے گینگ سے تعلق رکھتا تھا۔ گویا، جاسم کا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔

''حنیف کو میں نے ریلیف دے دیا ہے۔'' جاسم نے اس کی جانب سے کسی ممکنہ حملے کو ذہن میں رکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اب تمہاری باری ہے لیکن تمہاری بدتمیزی کے پیشِ نظر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں بائی ائر واپس بھیجنا ٹھیک رہے گا۔''

''کیا بک رہے ہو؟'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''میں نے تم سے کون سی بدتمیزی کی ہے اور...... بائی ائر واپسی کا کیا مطلب ہوا؟''

''میں بک نہیں رہا، فرما رہا ہوں۔'' جاسم نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''کسی کے سلام کا جواب نہ دینا بدتمیزی میں شمار ہوتا ہے اور بائی ائر کا مطلب ہے، اُڑ کر جانا......'' اس کے ساتھ ہی جاسم نے ہاتھ کے اشارے سے ایک اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز کا ڈیمو دیا پھر تحکمانہ انداز میں پوچھا۔ ''تم خود ہی چھت سے کود دو گے یا میں تمہیں اٹھا کر نیچے پھینک دوں؟''

اِدھر جاسم کی بات ختم ہوئی، اُدھر اس شخص نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوربین کھینچ کر جاسم کے منہ پر دے ماری۔ جاسم اس کی طرف سے ایسی کسی بھی اشتعال انگیز حرکت کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس نے یکبارگی ایک ''سِٹ اَپ'' لگائی اور اٹھتے کے ساتھ ہی حملہ آور کے پیٹ میں ایک زوردار لات رسید کر دی۔

سِٹ اَپ (بیٹھک) کے طفیل جاسم کو ماری جانے والی ٹیلی اسکوپ اس کے سر کے اوپر سے گزر کر چھت کے دوسرے کنارے پر جا گری اور جاسم کی لات کھانے کے بعد مقابل کراہتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔

وہ گینڈا جاسم کی جانب سے ایسے جوابی حملے کی توقع نہیں کر رہا تھا اس لیے مار کھا گیا لیکن وہ زیادہ دیر تک چھت پر پڑا نہیں رہا۔ وہ بڑی پھرتی سے اٹھا اور آناً فاناً اس نے جاسم پر چھلانگ لگا دی اور اسے لیتے ہوئے دور جا گرا۔

جاسم گرنے کے بعد اس گینڈے کے نیچے دب گیا تھا۔ مدِمقابل نے جاسم کے سینے پر سوار ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جما دیے۔ جاسم کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس بندے کی گرفت میں حیوانی طاقت تھی۔ جاسم کو اندازہ ہو گیا کہ اگر اس نے حملہ آور کو من مانی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تو وہ مکمل طور پر اس پر چھا جائے گا جس کے نتیجے میں اسے اپنے ہونے والے سُسر کے سامنے بڑی

شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔
غفار داؤد کے سامنے ندامت سے جھکی ہوئی گردن کے تصور نے جاسم کے رگ و پے میں بجلیاں بھر دیں۔ اُسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ ناجیہ کے باپ کے سامنے ایک شکست خوردہ انسان کے روپ میں پیش ہو۔
''میرے سیل فون...... پر...... بھائی کی...... کال آرہی ہے۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''اگر تمہیں...... میری بات کا...... یقین نہیں آرہا تو...... میری جیب سے فون نکال کر...... خود بھائی سے بات کرلو۔''
جاسم نے ایک فوری خیال کے تحت یہ چال چلی تھی جو کارگر ثابت ہوئی۔ بھائی کی کال کا ذکر سن کر وہ شخص ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور جاسم کی گردن دبانے کی طرف سے اس کا دھیان ہٹ گیا جس کے نتیجے میں اس کے ہاتھوں کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔
جاسم کے لیے اتنی مہلت بہت کافی تھی۔ اس نے گینڈے کی لحاتی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے برق رفتاری سے اپنی ٹانگوں کو فولڈ کیا پھر دونوں پاؤں کو اس کے پیٹ پر ٹکا کر ایک طوفانی جھٹکے سے دونوں ٹانگوں کو کھول دیا۔
جاسم کا یہ انقلابی عمل سیکنڈ کے دسویں حصے میں مکمل ہو گیا تھا جس کے ردِعمل میں وہ قوی الجثہ شخص جاسم کے اوپر سے اچھل کر چار فٹ کی دوری پر، پشت کے بل بلڈنگ کی چھت پر گرا۔ اس کے بعد جاسم نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔
ایک منٹ کے اندر جاسم کے فولادی مکوں اور دھواں دھار ٹھڈوں نے اس شخص کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ اس بدبخت نے خود کو بچانے کے لیے بہت داؤ آزمائے مگر جاسم نے اُس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس مارا ماری کے اختتام پر جاسم نے اسے نیک لاک لگا کر بپھرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
''کیا نام ہے تمہارا......؟''
''ارشد!'' اس نے متوحش آواز میں جواب دیا۔
''راجو کی دشمنی مجھ سے ہے۔ وہ مردوں کی طرح میرے سامنے آکر وار کیوں نہیں کرتا۔'' جاسم نے زہرخند لہجے میں پوچھا۔ ''وہ میرے دوستوں اور تعلق داروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑا ہوا ہے؟''
''ہم بھائی سے سوال نہیں کرتے۔ بس اُس کا حکم مانتے ہیں۔'' ارشد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
''راجو کے بھیجے ہوئے لوگوں نے میری دوست کو اغوا کرلیا ہے۔'' جاسم نے ایک نئی چال چلی۔ ''بتاؤ، تم لوگوں نے میری دوست کو کہاں رکھا ہے؟''
''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ حیرت بھرے منت ریز انداز میں بولا۔ ''حنیف تو ان باپ بیٹی کو ختم کرنے گیا تھا۔ یہ اغوا والی کہانی میرے علم میں نہیں ہے۔''
''لیکن میرے علم میں تو ہے اور میں قسماً کہہ رہا ہوں کہ میری دوست ناجیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے۔'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''پلیز...... میری گردن چھوڑ دو...... تمہاری دوست کے اغوا میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔''
جاسم نے ارشد کو نیک لاک لگاتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ وہ اس کے استفسارات کا بہ آسانی جواب دے سکے۔ ارشد لڑائی بھڑائی کا ماہر تھا اسی لیے اسے اندازہ تھا کہ اگر اس نے جاسم کے نیک لاک کے خلاف اپنی طاقت اور ہوشیاری کا استعمال کیا تو اس کے بڑے بھیانک اور خطرناک نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔
''اچھا یہ بتاؤ، راجو اس وقت کہاں ہوگا؟''
''مجھے نہیں معلوم۔ بھائی کے کئی ٹھکانے ہیں۔''
''جب تم کچھ جانتے ہی نہیں تو میں تمہارے ساتھ اپنا وقت کیوں برباد کررہا ہوں۔'' جاسم نے سفاکی سے کہا۔ ''بتاؤ، تمہیں کون سی موت پسند ہے؟''
''میں مرنا نہیں چاہتا۔'' وہ خوف زدہ انداز میں منمنایا۔
''میرے پاس تمہیں دینے کے لیے صرف موت ہی ہے۔'' جاسم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''سو...... کھیل ختم، دکان بند۔''
اپنی بات کے اختتام پر، جاسم نے دادا کی روح کی خوشنودی کی خاطر ایک جھٹکے سے ارشد کی گردن کا منکا توڑ کر اسے غمِ زندگی سے ہمیشہ کے لیے آزاد کردیا۔
''رخصت'' سے پہلے جاسم نے ڈھلکی ہوئی گردن والے مردہ ارشد کو چوبی اسٹول کے سہارے بلڈنگ کی چھت پر اس طرح بٹھا دیا کہ اس کی دونوں ٹانگیں اپنے پھیلاؤ سے ایک سو بیس کا زاویہ بنا رہی تھیں۔ اس کے بعد اس نے دوربین کو بے جان و بے روح گینڈے کی جھکی ہوئی گردن میں لٹکایا اور وہاں سے لوٹ آیا۔
☆☆

اپارٹمنٹ پر غفار داؤد بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کررہا تھا۔ جاسم جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، غفار داؤد نے داخلی دروازے کو ڈبل لاک لگایا پھر بے حد بکھری ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔

''بیٹا......تم ٹھیک تو......ہونا......؟''

''جی انکل! اللہ کا شکر ہے۔ میں آپ کی دعاؤں کے طفیل زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' جاسم نے جواب دیا۔

''میں تو ڈر ہی گیا تھا جب اس منحوس نے تمہیں نیچے گرا کر تمہاری گردن کو دبانا شروع کردیا تھا......'' غفار داؤد نے فکرمندی سے جاسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور جب میں نے اس کی گردن کی ''خیریت'' دریافت کی تو آپ کا سارا ڈر نکل گیا ہوگا......ہیں نا؟''

غفار داؤد جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''اس سین کو دیکھ کر تو میری سانس ہی رک گئی تھی۔ تم نے......تم نے......''

وہ بولتے بولتے رک گیا اور سہمی ہوئی نظر سے جاسم کو تکنے لگا۔ جاسم اس کے ذہن میں چلنے والی خوف و ہراس کی آندھی سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس کے ہاتھوں راجو کے بندے ارشد کی حسرت ناک موت نے غفار داؤد کے حواس اور محسوسات کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ اپنے وجود میں پھیلی ہوئی سراسیمگی کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر تھا اسی لیے اس کی زبان ڈاؤن بیٹری والی کسی گاڑی کے انجن کے مانند لڑکھڑا کر خاموش ہوگئی تھی۔ جاسم نے اس کی مشکل کو آسان کرنے کی غرض سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں نے وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس، وہ ایک حادثہ تھا۔ اس شہرِ ناپُرساں میں روزانہ درجن بھر افراد کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اچھے لوگوں کے بچھڑ جانے پر دل کو افسردہ اور آنکھوں کو لازمی نم ہونا چاہیے انکل لیکن درندوں، وحشیوں اور شیطانوں کے خاتمے پر اشک بہانے کے بجائے تہِ دل سے یہ کہنا چاہیے......خس کم، جہاں پاک!''

غفار داؤد چند لمحات تک ٹٹولتی نظر سے جاسم کو دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''میں نے کیمرے کی آنکھ سے صرف تمہارا ایکشن دیکھا ہے۔ تم دونوں کے بیچ کیا مکالمے ہوئے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ویسے وہ تھا کون؟''

''ہم نے راجو کے بھیجے ہوئے جس قاتل کو بے بس، مجبور اور لاچار بنانے کے بعد فریج والے ڈبے میں پیک کر کے یہاں سے روانہ کیا ہے، وہ بندہ اس کا ساتھی تھا یعنی راجو کی ٹیم کا ایک کھلاڑی جسے حنیف کو کور دینے اور آپ کے اپارٹمنٹ پر نگاہ رکھنے کے لیے اس بلڈنگ کی چھت پر تعینات کیا گیا تھا۔ اس گینڈے نے مجھے اپنا نام ارشد بتایا تھا۔'' جاسم نے غفار داؤد کے اضطراری سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اور جہاں تک میرے ''ایکشن'' کا معاملہ ہے تو......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے تو بالکل مزہ نہیں آیا انکل۔ اس گینڈے کے وجود میں جتنی توانائی بھری ہوئی تھی، وہ اس کے بالعکس بہت بودا ثابت ہوا ہے۔ اس نے جلدی ہتھیار پھینک دیے لہٰذا مجھے آسانی سے اس پر فتح حاصل ہوگئی۔ آپ نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔''

''ہاں...... میں نے تم دونوں کے درمیان ہونے والے معرکے کو دیکھا ہے، ریکارڈ کیا ہے اور......''

غفار داؤد نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو جاسم نے تیز آواز میں پوچھا۔ ''اور کیا انکل؟''

''اور میں نے ڈی ایس ایل آر کیمرے کے میموری کارڈ کو ڈیلیٹ مار دیا ہے۔'' غفار داؤد نے سرسراتی آواز میں بتایا۔ ''اب اس ڈیجیٹل کیمرے میں تمہارے کسی کارنامے کی ریکارڈنگ کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔''

جاسم ایک بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''بیٹا!'' غفار داؤد نے جذبات میں ڈوبے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''انسان کو صرف خوش گوار اور تعمیری لمحات کی یادگاروں کو سمیٹ کر اپنی آنکھ، اپنے دل، اپنی یادداشت اور دوسری اشیا کے اندر محفوظ کر کے رکھنا چاہیے تاکہ انہیں دیکھ کر گزری ہوئی دلچسپیوں، بیتے ہوئے سہانے دنوں کی یادوں کو تازہ کیا جاسکے۔ یہ مار دھاڑ سے بھرپور ڈ-تھ سینز کی ریکارڈنگ کو سنبھال کر رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے بھلا۔''

''مطلب......آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں؟''

''آئی ایم پراؤڈ آف یو۔'' غفار داؤد نے جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے فراخ دلی سے کہا۔

''تھینک یو انکل۔'' جاسم نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے جو کچھ کیا، وہ حالات اور وقت کا تقاضا تھا۔ اسے آپ ''حفاظتِ خود اختیاری'' کے تحت کیا جانے والا ایک عمل بھی کہہ سکتے ہیں۔ راجو کی فطرت میں کمینگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کی بدمعاشی کا منہ توڑ جواب دینا بہت

ضروری تھا تاکہ وہ آئندہ کوئی گھٹیا قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچے۔ ہماری جیت اور ہمارا تحفظ اسی میں ہے کہ اس کینہ پرور بدذات کے دل و دماغ پر ہماری دہشت کا سایہ ہر وقت چھایا رہے......"

"تمہیں اتنی زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں بیٹا۔" غفار داؤد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں کرنٹ افیئرز کے ایک پروگرام کا پروڈیوسر ہوں۔ میں نے لاتعداد کرائم اسٹوریز بھی کی ہیں۔ میں ان معاملات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ تمہیں ٹینشن لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔"

"اور دماغ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تمہیں ایک بھرپور نیند لینا چاہیے تاکہ کل کے دن ایک دم فریش رہ سکو۔" غفار داؤد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں بھی سونے جا رہا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بوجھل آواز میں اضافہ کر دیا۔ "گڈ نائٹ بیٹا۔"

"گڈ نائٹ انکل!" جاسم نے بہ صد احترام کہا۔

وادیٔ نیند میں قدم رکھنے سے پہلے جاسم نے اپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیوں اور داخلی دروازے کو اچھی طرح چیک کیا پھر غفار داؤد کے بیڈ پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

آج کا پورا دن بلکہ کل کا دن اور آج کی رات بے انتہا مصروف اور ایکشن سے بھرپور گزرا تھا، خاص طور پر راجو کے آدمی ارشد کے ساتھ ہونے والے "لیٹ نائٹ وینچر" نے جاسم کو بُری طرح تھکا دیا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب عالمِ ہوش سے عالمِ رُویا میں چلا گیا۔

☆☆☆

جمعرات چودہ تاریخ کی دوپہر جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہشاش بشاش پایا۔ غفار داؤد اس سے پہلے بیدار ہو چکا تھا اور ناشتے کے لیے جاسم کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جاسم نے بستر کو الوداع کہا اور واش روم میں گھس گیا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ غفار داؤد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے چینل کی طرف چلا جاؤں گا۔ آج میرا پروگرام بھی ہے۔ میری واپسی رات گیارہ بجے تک ہو گی۔"

"اور مجھے آپ کے اپارٹمنٹ میں نظر بند رہنا ہو گا؟" جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ ضروری نہیں ہے۔" غفار داؤد نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تمہارے تن بدن میں گویا ایک پارا سا بھرا ہوا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہارے ارادوں کے سامنے بند نہیں باندھ سکتی اس لیے میں جاتے ہوئے اس اپارٹمنٹ کی ڈپلی کیٹ چابیاں دے جاؤں گا۔ تم اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق "اِن/آؤٹ" کر سکتے ہو۔"

"تھینک یو سو مچ انکل۔" جاسم نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے مجھ پر بھروسا کیا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں اپنے کسی عمل سے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم مثبت تعمیری سوچ کے حامل ایک بہادر انسان ہو۔" وہ توصیفی نظر سے جاسم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم کبھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ بس، میں تمہیں ایک ہی نصیحت کروں گا...... بلکہ یہ میری درخواست ہے کہ تم جو بھی کرو، سیفٹی فرسٹ کے اصول پر کرنا۔ مجھے تمہاری سلامتی عزیز ہے۔"

"میں آپ کے اس خواہش نما مشورے کو ہمیشہ یاد رکھوں گا انکل......" جاسم نے فرمانبرداری سے کہا۔ "آگے جو اللہ کو منظور۔"

غفار داؤد نے جذب کے عالم میں کہا۔ "پروردگار تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

غفار داؤد کے جانے کے بعد جاسم نے بیرونی دروازے کو لاک کیا اور اپنا سیل فون اٹھا لیا۔ رات کو سونے سے پہلے، پُرسکون نیند کے خیال سے اس نے سیل فون آف کر دیا تھا۔ اب جو اس نے فون آن کیا تو کامل کی دو مس کالز لگی ہوئی تھیں اور اِن باکس میں ایک میسج بھی پڑا ہوا تھا۔ جاسم نے وہ میسج اوپن کر لیا۔

"تمہارا نمبر سوئچڈ آف آ رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم سو چکے ہو۔" کامل نے ٹیکسٹ میسج میں لکھا تھا۔ "امید ہے، تمہیں ناجیہ کے حوالے سے کوئی اچھی خبر مل گئی ہو گی اسی لیے تم نے دوبارہ مجھے کال نہیں کیا۔ تم نے جو ڈبا پیک فریج بھیجا تھا، میں نے اس پر اچھی خاصی ٹمپنگ کی ہے جس کے نتیجے میں کافی کچھ ہاتھ لگا ہے۔ یہ بات نوٹ کر لو کہ ناجیہ والے معاملے میں "فریج کمپنی" کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ میسج دیکھتے ہی مجھ سے رابطہ کرو۔ ملاقات ناگزیر ہو چکی ہے۔"

گزشتہ رات کے ابتدائی حصے میں جب جاسم، ناجیہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا اور غفار داؤد کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ کسی نے اس کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع دے کر ناجیہ کو

تین تلوار پہنچنے کو کہا ہے تو جاسم نے فون کر کے کامل کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا لیکن کامل یہ نہیں جانتا تھا کہ ناجیہ کو ڈیوڈ نے ایک خاص مقصد سے اغوا کرایا ہے کیونکہ ڈیوڈ نے بعد میں جاسم سے کانٹیکٹ کیا تھا۔

جاسم نے فوراً کامل کو فون کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔ ''میں خود بھی پہلی فرصت میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے رشین ایمبیسی کی طرف جانے والی روڈ پر موجود ہوں۔'' کامل نے بتایا۔ ''ایک لوکیشن کا سروے کر رہا ہوں۔''

''اوہ...... لوکیشن کا سروے۔'' جاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا سیلف پروڈکشن کا ارادہ ہے؟''

''بس، کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔'' کامل نے گول مول جواب دیا۔ ''کیا تم ابھی تک اپنی ہونے والی سسرال ہی میں ہو؟ ناجیہ کی کیا خبر ہے؟''

جاسم نے ایک کافی ہاؤس کا نام لینے کے بعد کہا۔ ''خبریں بہت زیادہ ہیں۔ فون پر بات نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد کافی ہاؤس میں ملتے ہیں، اگر تمہیں کوئی دقت نہ ہو تو......''

''نو پرابلم جگر! میں نے سروے کا کام مکمل کر لیا ہے۔'' کامل نے کہا۔ ''تم پہنچو، میں بھی آ رہا ہوں۔''

دونوں دوست مذکورہ کافی ہاؤس میں ملے اور باری باری انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا احوال کہہ سنایا پھر ایک ایک پوائنٹ پر وہ ترتیب وار ڈسکس کرنے لگے۔ پہلے راجو کا نمبر آیا، اس کے بعد ڈیوڈ کے حوالے سے بات کی گئی۔

''تم نے راجو کے آدمی کے ساتھ جو سلوک کیا، اس نے میرے کلیجے میں ٹھنڈک بھر دی ہے۔'' کامل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا اشارہ ارشد کی طرف ہے جسے تم نے بینک والی بلڈنگ کی چھت پر دادا کے انداز میں گردن توڑ موت دے کر ایک طرح سے اپنے استادِ محترم کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے...... ویل ڈن جگر!''

''راجو کا ایک اور بندہ میں نے بھی ''پیک'' کر کے تمہاری جانب بھیجا تھا۔'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے حنیف کے ساتھ کیا کیا؟''

''اس کے ساتھ تو تم نے بھی کافی کچھ کرنے کے بعد ہی فریج کے ڈبے میں بہ حفاظت پیک کیا تھا۔'' کامل پُر معنی انداز میں بولا۔ ''بہر حال، وہ ابھی تک میرے قبضے میں ہے۔ میں اسے آج والے مشن میں قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہوں۔''

''آج والا کون سا مشن؟'' جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس مشن کی تفصیل بعد میں۔'' کامل نے کہا۔ ''میں نے حنیف پر کافی ''محنت'' کے بعد یہ پتا چلا لیا ہے کہ ناجیہ کے اغوا میں راجو کا گینگ ملوث نہیں۔ تم نے بھی ابھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ بہر حال، حنیف کی زبانی پتا چلا ہے کہ آج سہ پہر میں راجو اپنے چند حواریوں کے ساتھ غازی بابا کے مزار پر حاضری دینے جائے گا۔ اس کے بعد وہ اس روڈ کے ذریعے سی ویو جانے کا ارادہ رکھتا ہے جو رشین ایمبیسی کے سامنے سے گزرتی ہے۔''

''اوہ...... تو تم اسی لیے اس روڈ کا سروے کرنے پہنچے ہوئے تھے؟'' جاسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... آج ''جمعرات، بھری مراد'' ہے۔'' کامل نے سنسناتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''سانپ کو زخمی کرنے کے بعد ایسے ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ گھائل سانپ موقع ملتے ہی ڈس گھولنے سے باز نہیں آتا۔ سانپ کو کیلنے کے بعد اس کا زہر نکال دینا چاہیے تاکہ اس کی حیثیت کسی بے ضرر کیچوے جیسی ہو جائے یا کم از کم اس کے منہ میں لیموں نچوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ کسی کو ڈسنے کی کوشش نہ کرے۔ تم نے فارم ہاؤس میں راجو کو جس ''امتحان'' سے گزارا تھا، وہ قابلِ ستائش ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کافی نہیں۔ اس ذلیل شخص کی حرام زدگیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو برو!'' جاسم نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ ''کتے کی دم کی اکثر مثال دی جاتی ہے جو ٹیڑھے لوگوں کی وضاحت کے لیے ہوتی ہے لیکن عام طور پر کتے کی ٹیڑھی دُم بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔''

''یہ تو میں پہلی مرتبہ سن رہا ہوں جگر۔'' کامل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک کُتے کی دُم وہ ہوتی ہے جسے سیدھا کرنے کے لیے اگر سو سال تک بھی شیشے کی نلکی میں ڈال کر رکھا جائے تو باہر نکالنے پر وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے جبکہ دوسری قسم کی کُتے کی دم کو اگر سیدھا کرنے کی غرض سے شیشے کی نلکی میں ڈالا جائے تو وہ اس نلکی کو بھی ٹیڑھا کر دیتی ہے۔ راجو بسکہ دوسری قسم کی کُتے کی ٹیڑھی دُم ہے لہٰذا اسے سیدھا کرنے کے لیے کوئی دیرپا اور مستقل طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''اسی لیے...... اسی لیے میں نے اس شر انگیز کردار کو اُڑانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' کامل نے جذبات سے عاری لہجے

میں کہا۔ ''یہ اس کی زندگی کا آخری دن۔ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی راجو اپنے گماشتوں کے ساتھ واصلِ جہنم ہو جائے گا...... نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری!''

''زبردست۔'' جاسم نے توصیفی نظر سے کامل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تمہارا کیا پلین ہے؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' کامل نے کہا۔ ''پہلے ہم ناجیہ کے ایشو کو دیکھ لیں۔ تم نے ڈیوڈ کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا ہے اس میں اگرچہ کوئی خرابی نظر نہیں آ رہی مگر اس کا طریقہ کار انتہائی گھٹیا اور پُراسرار ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے آج تک کوئی ایسا پروڈیوسر نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی سے سنا جو گن پوائنٹ پر اور کڈنیپنگ کے ذریعے آرٹسٹوں کو اپنے ڈراموں اور شوز وغیرہ میں کام کرنے پر مجبور کرتا ہو لیکن میں ناجیہ کی وجہ سے اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا ہوں۔''

''جگر! میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔'' کامل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، اس کے آدمی ماسٹر شیف بن عرفات سے جا کر ملو۔ ''زینو'' نامی وہ یونانی ریسٹورنٹ میرا دیکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''سیر آئے'' نام کا ریسٹورنٹ ہے۔ میں کئی بار سیر آئے جا چکا ہوں اور ہاں، میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''شعیب کے سیٹ اپ میں موجود میرے وفادار اویس نے اطلاع دی ہے کہ شعیب اس ماہ کی بائیس تاریخ کو استنبول کے عالی شان ہوٹل ''سوئسوٹل'' میں بلغارین کارٹل مسٹر برانڈو سے نہایت ہی اہم اور خفیہ میٹنگ کرنے والا ہے۔''

''گریٹ نیوز برو......'' جاسم نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''میرا ایک دوست راشد فیضی ادھر استنبول میں ہوتا ہے۔'' کامل پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''میں تمہیں اس کا ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر دے رہا ہوں۔ وہ تمہارے لیے کافی مفید ثابت ہوگا۔ تم استنبول پہنچو۔ ایک دو ضروری کام نمٹانے کے بعد میں بھی آ رہا ہوں۔ پھر ہم دونوں مل کر شعیب کی بینڈ بجائیں گے۔''

''اِن شاءاللہ...... ضرور!''

''تمہیں وہ بلیک ڈیلیوری بیگ یاد ہے جس کے ساتھ حنیف، ناجیہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا؟'' ایک فوری خیال کے تحت کامل نے پوچھا۔

''ہاں، بالکل۔'' جاسم نے جواب دیا۔ ''میں نے حنیف کی گن اور وہ بلیک بیگ بھی حنیف کے ساتھ ہی ڈبے میں پیک کر دیا تھا۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے، اس بیگ کے اندر کیا تھا؟''

جاسم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''دو ریگولر پزا۔'' کامل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ان دونوں پزا میں ایک سریع الاثر زہر ملا ہوا تھا۔ حنیف نے ناجیہ اور اس کے پاپا کو ٹھکانے لگانے کے بعد دو مزید افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ وہ دونوں زہریلے پزا انہی لوگوں کے لیے تھے لیکن تم نے حنیف کو قابو کر کے اس کے مشن کی ایسی کم تیسی کر دی۔ گزشتہ رات حنیف نے راجو کے حکم پر چار انسانوں کی جان لینا تھی مگر قدرت کا تماشا دیکھو کہ متذکرہ چاروں افراد اس وقت زندہ سلامت ہیں جبکہ ان کی زندگی چھیننے کا خواہش مند حنیف میرے رحم و کرم پر ہے۔''

''یہ حنیف تو راجو سے بھی زیادہ کڑی سزا کا مستحق ہے۔'' جاسم نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''تم اسے چھوڑنا نہیں۔''

''بالکل نہیں چھوڑوں گا جگر......'' کامل بے رحمی سے بولا۔ ''میں نے بتایا ہے نا، آج والے مشن میں حنیف کی حیثیت قربانی کے بکرے ایسی ہے۔''

''اپنے اس مشن کے بارے میں کب بتاؤ گے؟''

''ابھی......'' کامل نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

آئندہ دس منٹ میں کامل نے جاسم کو اپنے منصوبے کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ پھر وہ دونوں کافی ہاؤس سے باہر نکل آئے کیونکہ بقول شخصے... وقت کم اور مقابلہ سخت تھا۔

☆☆☆

غازی بابا کے مزار سے سی ویو تک، اس روڈ پر پانچ سے سات منٹ کی ڈرائیو تھی۔ جاسم اور کامل اس وقت رشین ایمبیسی سے تھوڑے فاصلے پر، ایک معروف پرائیویٹ پروڈکشن ہاؤس کے نزدیک گاڑی میں موجود تھے اور ان کا رخ سمندر سے مزار کی جانب تھا جبکہ راجو نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مزار سے سمندر کی طرف جانا تھا۔ کامل نے اپنے ایک آدمی کو مزار کے سامنے تعینات کر رکھا تھا جس کا کام راجو

اینڈ کو پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ مزار اور جاسم و کامل کے درمیان کامل کے دو آدمی گرین ہائی روف میں چاق چوبند بیٹھے تھے۔ حنیف انہی کی کسٹڈی میں تھا۔

کامل نے اپنا لیپ ٹاپ آن کرنے کے بعد جاسم سے کہا۔ ''میں نے حنیف کے لباس کے اندر، شرٹ کے بٹن کے سائز کی ایک اسمارٹ چپ چھپا دی ہے جو درحقیقت ایک ٹریکنگ ڈیوائس ہے جس میں ایک طاقتور حساس مائیک بھی لگا ہوا ہے۔ اس مائیکرو چپ کی برکت سے ہم حنیف کی لوکیشن اور آواز کو بہ آسانی اپنے لیپ ٹاپ پر دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ حنیف جس سے جو بات کرے گا، وہ ہم تک پہنچ جائے گی۔ اس سہولت کو حاصل کرنے کے لیے میں نے ایک خاص قسم کی ایپ کا استعمال کیا ہے۔ باقی میں سب تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔''

''برو! تمہارا منصوبہ لاجواب ہے۔'' جاسم نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''اگر سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ایگزیکیوٹ ہو گیا تو مزہ آجائے گا۔''

''انشاء اللہ! میں نے جو سوچا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔'' کامل نے پورے تیقن سے کہا۔ ''آج یہ دھرتی راجو کے غلیظ وجود کے بوجھ سے آزاد ہو جائے گی۔''

اِدھر کامل کی بات مکمل ہوئی، اُدھر اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال پک کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''فیضان! کیا خبر ہے؟''

فیضان کو کامل نے راجو کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''سر! وہ لوگ نکل رہے ہیں۔''

''وہ کتنے افراد ہیں؟''

''ٹوٹل چار ہیں۔ ایک راجو اور تین اُس کے ساتھی۔'' فیضان نے بتایا۔ ''اب وہ لوگ لینڈ کروزر میں بیٹھ رہے ہیں۔ راجو ڈرائیور کے برابر میں پسنجر سیٹ پر ''براجمان'' ہو چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہارا کام ختم......'' کامل نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اب تم نکلو وہاں سے۔''

''اوکے سر!'' فیضان فرمانبرداری سے بولا۔

کامل نے گرین ہائی روف میں موجود اشعر کا نمبر لگایا اور رابطہ ہونے پر پوچھا۔ ''تم لوگ تیار ہو؟''

''یس سر......''

''راجو والی بلیک لینڈ کروزر کا نمبر یاد ہے؟''

''جی بالکل یاد ہے۔'' اشعر نے کہا۔

''وہ لوگ مزار سے روانہ ہو رہے ہیں۔'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم حنیف کو ریڈی کر دو۔ راجو کا اسپیشل گفٹ اسے دینا نہیں بھولنا۔ حنیف کو ہائی روف سے باہر نکالنے کا وقت ہو گیا ہے۔''

''سمجھ گیا سر۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔'' اشعر نے مستعدی سے کہا۔

کامل نے سیل فون ایک طرف رکھا اور لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ جاسم اس کے پہلو میں دوسری سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی نگاہ بھی لیپ ٹاپ کے اسکرین پر جمی تھی۔

''برو! تم نے راجو کے لیے بڑے شاندار ''گفٹ'' کا انتخاب کیا۔'' جاسم نے کہا۔ ''وہ بدبخت ایسی ہی بھیانک موت کا حق دار ہے۔''

''گفٹ والے ڈبے کے اندر میں نے ایک بٹنوں والا بیسک سیل فون رکھا ہے جس میں ایک طاقتور سیلولر بم نصب کیا گیا ہے۔ یہ بم اپنے قد کاٹھ اور جسامت میں بہت چھوٹا اور ہلاکت خیزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ حنیف اس گفٹ کے ساتھ جیسے ہی راجو کی بلیک لینڈ کروزر کے نزدیک پہنچے گا، میں اسی تباہ کار بم والے سیل فون پر کال کر دوں گا...... اس کے بعد جو ہوگا، اس کا تصور تم بہ آسانی کر سکتے ہو۔''

''وہ دیکھو، حنیف ہائی روف سے باہر نکل آیا ہے۔'' جاسم نے لیپ ٹاپ پر نظر آنے والے سیلائٹ میپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہیجان خیز آواز میں کہا۔

''اب حنیف سڑک کے کنارے سبک خرامی سے چلتے ہوئے اس سمت بڑھے گا جدھر سے راجو والی بلیک لینڈ کروزر آرہی ہے۔'' کامل نے دوبارہ سیل فون اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں گفٹ والے سیل فون کا نمبر فیڈ کرنے جا رہا ہوں تاکہ کال کرنے کے لیے صرف ''یس'' کا بٹن دبانے کی ضرورت باقی رہ جائے۔''

اپنی بات کے اختتام پر کامل نے لیپ ٹاپ کے اسپیکر کا والیم سو فیصد پر سیٹ کر دیا تاکہ جاسم بھی حنیف اور اس سے ہم کلام افراد کی باتوں کو بہ آسانی سن سکے۔ اگلے چند سیکنڈ میں راجو اور اس کے تین حواریوں کی زندگی کے چراغ گل ہونے والے تھے۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ آج جمعرات کا دن تھا اس لیے غازی بابا کے مزار پر معمول سے زیادہ رش تھا۔ راجو اینڈ کو کو رشین ایمبیسی والی سڑک پر آنے کے لیے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہرحال، بی ویو کی جانب اُن کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

راجو لینڈ کروزر کی پسنجر سیٹ پر ”بیٹھا“ ہوا تھا۔ جب سے جاسم نے اس کمینے کو وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا تھا، اس کی ”بیٹھک“ کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ کو کوماز کے اندر لکھنا لازمی ٹھہرا تھا۔ درحقیقت اس اپاہج کو وہیل چیئر میں سے اٹھا کر گاڑی پر سوار کیا جاتا تھا اور گھر کے اندر وہ زیادہ وقت وہیل چیئر کی سنگت ہی میں گزارتا تھا۔ لینڈ کروزر کی عقبی نشست پر موجود دو افراد راجو کی اسی ”اٹھک بیٹھک“ کی خدمات پر مامور تھے۔ راجو کی فولڈنگ وہیل چیئر بھی لینڈ کروزر کے عقبی حصے میں موجود تھی۔

اچانک راجو کی نظر روڈ کے کنارے ایک شناسا چہرے پر پڑی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”حنیف یہاں کیا کر رہا ہے؟“

اس دوران میں ڈرائیور نے بھی حنیف کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بھائی! آپ نے تو حنیف کو کل رات ایک بہت ہی اہم مشن پر روانہ کیا تھا اور یہ پتا نہیں، کہاں غائب ہو گیا تھا۔“

”ماجد گاڑی روکو۔“ راجو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”اس کی گمشدگی کی کہانی، اسی کی زبانی سننا پڑے گی۔“

بلیک لینڈ کروزر پہلے ہی ہلکی رفتار سے ڈھلوانی سڑک پر چل رہی تھی۔ اسی لیے حنیف، راجو اور ماجد کی نگاہ میں آسانی سے آ گیا تھا۔ ماجد نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لینڈ کروزر کو حنیف سے پندرہ فٹ کی دوری پر بہ آہستگی سڑک کے کنارے روک دیا۔

حنیف نے نگاہ اٹھا کر راجو کی گاڑی کی جانب دیکھا۔ راجو پہلے سے اسی کو تک رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو حنیف کسی وفادار کتے کے مانند تیزی سے لینڈ کروزر کی سمت بڑھا۔

راجو نے اپنی سائڈ کا ونڈو گلاس نیچے گرایا اور حنیف کے قریب آنے پر غصیلے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تم کہاں مر گئے تھے؟“

”بھائی...... معاملہ بہت گمبھیر ہے۔“ وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ ”یوں کھڑے کھڑے نہیں بتا سکتا۔ اُس لڑکی کے اپارٹمنٹ میں دو ہائی رینک پولیس آفیسر موجود تھے اور......“

حنیف نے بات ادھوری چھوڑ کر چوکنا نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو راجو نے کہا۔

”گاڑی کے اندر آ جاؤ۔“

اگلے ہی لمحے لینڈ کروزر کا پچھلا دروازہ کھلا اور حنیف، راجو کے دو خدمت گاروں کے برابر میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ راجو نے ماجد کو گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔

”چوہا پنجرے کے اندر پہنچ گیا ہے جگر......“ کامل نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”بس، راجو کی لینڈ کروزر تھوڑا آگے بڑھ جائے پھر میں اپنا کمال دکھاتا ہوں۔“

جاسم گہری دلچسپی سے لیپ ٹاپ کے اسکرین پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ کامل نے اسمارٹ ٹریکنگ ڈیوائس کو حنیف کے لباس کے اندر چھپایا تھا اور حنیف اس وقت راجو کی بلیک لینڈ کروزر میں موجود تھا لہٰذا اسیٹلائٹ میپ پر گاڑی کی لوکیشن برابر دکھائی دے رہی تھی۔ لینڈ کروزر لحہ بہ لحہ ان کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ اگرچہ وہ مخالف سمت میں جانے والی تھی تاہم کامل اور جاسم کے مقامِ ٹھہراؤ کا فاصلہ بتدریج کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔

لیپ ٹاپ کے اسپیکر پر راجو کی آواز سنائی دی۔ ”تمہاری کہانی میں آرام سے بیٹھ کر سنوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ، تم نے ہاتھ میں کیا اٹھا رکھا ہے؟“

ٹریکنگ ڈیوائس کے اندر موجود انتہائی حساس مائیک لینڈ کروزر کے اندر ہونے والی گفتگو کو کرسٹل کلیئر لیپ ٹاپ تک پہنچا رہا تھا۔ جاسم ان لوگوں کو دیکھ تو نہیں رہا تھا لیکن گاڑی کے اندر کی سچویشن بہ خوبی سمجھ میں آ رہی تھی۔ راجو کے استفسار کے جواب میں حنیف نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

”بھائی...... آپ نے جس لڑکے کو اذیت ناک سبق سکھانے کے لیے مجھے ان باپ بیٹی کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا، یہ اسی نے دیا ہے۔“

”کیا بک رہے ہو۔“ راجو نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ”کیا تم اس شیطان سے ملے تھے؟“

”جی بھائی......“ حنیف نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ لڑکا کوئی جادو وغیرہ جانتا ہے اور اس کے پولیس کے اعلیٰ افسروں سے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ وہ آپ سے......“

”ابے...... تو مجھے اس مردود کا قصیدہ کیوں سنا رہا ہے؟“ راجو تڑخ کر بولا۔ ”مدعا پر آ اور مجھے اِس باکس کے بارے میں بتا جو تو نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔“

”اس ڈبے میں ایک موبائل فون ہے بھائی......“ حنیف نے معتدل انداز میں کہا۔ ”یہ اُس لڑکے نے آپ کے لیے گفٹ بھیجا ہے۔ وہ اگلی پچھلی ساری دشمنی ختم کر کے آپ کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہے۔ یہ گفٹ اسی سلسلے کی شروعات ہے۔“

''اس منحوس کی دوستی گئی تیل لینے......'' راجو بھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہمارے ایک بندے کی گردن ٹوٹی لاش بینک والی عمارت کی چھت کے اوپر پڑی ملی ہے۔ وہ اسی باپ بیٹی کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کررہا تھا جنھیں تو موت کے گھاٹ اتارنے گیا تھا اور اب...... تو اس پارٹی کی وکالت کرنے میں لگا ہوا ہے۔''

''بلیک لینڈ کروزر ہمیں کراس کررہی ہے برو......'' جاسم نے لیپ ٹاپ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر گاڑی کے باہر لائیو منظر کا نظارہ کرتے ہوئے کامل کو بتایا۔

''کراس کرنے دیتے ہیں۔'' کامل نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''ارے...... یہ کیا ہوا؟'' جاسم اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ان کی گاڑی رک کیوں گئی۔''

لینڈ کروزر انہیں کراس کرنے کے بعد لگ بھگ پچاس گز آگے، سڑک کے کنارے رک گئی تھی اور یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے کسی لوکیشن فائنڈر ایپ کی ضرورت ہرگز نہیں تھی۔ وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے رکی ہوئی لینڈ کروزر کو واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔

''ایک منٹ......'' کامل نے لیپ ٹاپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ابھی پتا چل جائے گا۔''

اگلے ہی لمحے اسپیکر سے راجو کی آواز ابھری۔ وہ ڈرائیور سے پوچھ رہا تھا۔ ''ماجد! تم نے گاڑی کیوں رک دی؟''

''بھائی...... مجھے حنیف میں کوئی گڑبڑ محسوس ہورہی ہے۔'' ماجد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بدذات ہمارے دشمن کے ہاتھ بِک چکا ہے۔ اس موبائل فون والے ڈبے میں کوئی خطرناک بم وم بھی ہوسکتا ہے۔ اسے فوراً گاڑی سے نیچے اترنے کا حکم دیں۔''

ماجد کی بات راجو کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے حنیف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''چلو...... نکلو باہر...... کل ڈیرے پر آنا، پھر میں تمہاری کہانی سنوں گا۔''

''برو! حنیف گاڑی سے اترنے والا ہے۔'' جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''ایسے کیسے اتر جائے گا۔'' کامل نے بے حد سفاک اور سرد لہجے میں کہا۔ ''شطرنج کی بساط میں نے بچھائی ہے۔ سیاہ اور سفید تمام کے تمام مہرے میرے ہیں۔ میں کوئی پھیری والا بساطی نہیں، کھلاڑی ہوں اور دونوں طرف سے کھیلتا ہوں۔ راجو کا کنگ میرے گھیرے میں ہے۔ میں نے اس کے فرار کی تمام راہیں مسدود کردی ہیں۔ اس کی موت یقینی ہے...... چیک میٹ!''

اِدھر کامل کی بات ختم ہوئی، اُدھر حنیف کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے باکس کے اندر موجود سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ لینڈ کروزر کے ''باسیوں'' نے صرف ایک رِنگ سماعت کی۔ اگلے ہی لمحے اس گفٹ باکس میں ایک ہولناک، سماعت شکن دھماکا ہوا جس کے نتیجے میں بلیک لینڈ کروزر، راجو اور دیگر چار افراد کے پرخچے اُڑ گئے۔

کامل نے اشعر کا نمبر ملایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کام ہوگیا ہے۔ تم لوگ جائے وقوعہ سے دور نکل جاؤ اور ہاں...... حبیب کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر اسے کسی ویران علاقے میں چھوڑ دینا۔''

''اوکے باس......'' اشعر نے اطاعت گزار انداز میں کہا۔ ''ہم سیدھے وہیں جارہے ہیں جہاں حبیب کو قید کرکے رکھا ہوا ہے۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔''

کامل نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور گاڑی کو جائے وقوعہ کی مخالف سمت میں بڑھا دیا۔ جاسم نے پوچھا۔

''حبیب کا حنیف سے کیا کنکشن ہے؟''

''وہ حنیف کا چھوٹا بھائی ہے۔'' کامل نے عام سے لہجے میں بتایا۔ ''میں نے آج صبح ہی حبیب کو اٹھوالیا تھا تاکہ اسے یرغمال بنا کر میں حنیف سے اپنی مرضی کا کام لے سکوں۔ حنیف، حبیب سے بہت محبت کرتا ہے اسی لیے اس نے سب کچھ ویسا ہی کیا جیسا میں نے اسے سمجھایا تھا اور میں نے بھی اپنا وعدہ پورا کردیا۔''

''کون سا وعدہ برو......؟'' جاسم نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں نے حنیف کو یقین دلایا تھا کہ اگر اس نے میری ہدایات پر من وعن عمل کیا تو میں اس کے عزیز از جان چھوٹے بھائی کو ایک بھی کھروچ پہنچائے بغیر زندہ چھوڑ دوں گا۔''

''جب حبیب کو اپنے بڑے بھائی کی عبرت ناک موت کی خبر ملے گی تو اس کا دل شق ہوجائے گا۔'' جاسم نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جانتا ہوں جگر......'' کامل ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''اگر حنیف اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہوجاتا تو ناجیہ اور اس کے پاپا کی حسرت ناک موت پر کیا تمہارا دل، دماغ اور جگر پارہ پارہ نہیں ہوجاتا؟''

کامل کی مبنی برحقیقت باتیں سن کر جاسم لاجواب سا ہو

کر رہ گیا۔ کامل اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔

''کرنا پڑتا ہے جگر...... یہ سب کسی فرض کے مانند انسان کے کندھوں پر سوار ہو جاتا ہے اور فرض کی ادائی کے بغیر ضمیر مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک صحت مند معاشرے کا قیام اس بات کا متقاضی ہے کہ اپنے ماحول میں پھیلنے والی گندگی کو روزانہ کی بنیاد پر صاف کیا جائے۔ راجو اور اسی قماش کے دوسرے لوگ بدبودار معاشرتی ناسور ہیں۔ ان کا قلع قمع بے حد ضروری ہے۔ اگر انہیں کھلی چھوٹ دے دی جائے تو یہ کسی خون آشام عفریت کے مانند اس معاشرے کی رعنائی اور خوب صورتی کو نگل جائیں گے۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں برو۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس جنگ میں تم مجھے اپنے شانہ بہ شانہ پاؤ گے۔''

کامل نے ناجیہ کے اپارٹمنٹ والی بلڈنگ کے نزدیک گاڑی روک دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہارے پاس صرف کل کا دن بچا ہے۔ تم پرسوں استنبول کے لیے روانہ ہو جاؤ گے۔ مجھے امید ہے کہ اب تمہیں اور تمہارے ہونے والے سسر کو ڈسٹرب کرنے کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا پھر بھی اگر تمہیں کسی بھی وقت میری ضرورت محسوس ہو تو بلاتکلف ٹچ کر لینا۔ تم مجھے خود سے دور نہیں پاؤ گے۔''

جاسم گاڑی سے باہر نکلا تو کامل بھی نیچے اتر آیا۔ دونوں نے الوداعی معانقہ کیا۔ جاسم نے کہا۔

''برو! اگر کل کا دن امن و امان سے گزر گیا تو استنبول میں ملاقات ہوگی۔''

''انشاءاللہ...... ضرور۔'' کامل نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''اس کے بعد کامل دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھا اور جاسم چہل قدمی کرنے والے انداز میں اپارٹمنٹ بلڈنگ کی جانب چل پڑا۔

☆☆☆

رات کے نو بجے تھے۔ غفار داؤد نے گیارہ بجے تک آنے کو کہا تھا۔ جاسم اس وقت اپارٹمنٹ میں اکیلا ہی تھا۔ راجو اور اس کے حواریوں کو نیست و نابود کرنے کے بعد جاسم کا ذہن پُرسکون ہو گیا تھا۔ فی الوقت اس کے ڈکلیئرڈ دشمن دو ہی تھے، راجو اور ڈیوڈ۔ ڈیوڈ کے اسٹائل سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ ایک اصول پرست اور حسابی شخص ہے۔ جب تک جاسم استنبول پہنچ کر اُس سے میٹنگ نہیں کر لیتا، اُس کی جانب سے کسی شرانگیزی کی توقع نہیں تھی۔ باقی بچا راجو تو اس کے گینگ میں صف ماتم بچھ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حنیف، ماجد اور دیگر دو افراد بھی دوسرے جہاں میں ٹرانسفر ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان کی بھیانک اموات کے ساتھ ہی یہ راز بھی دفن ہو گیا تھا کہ جاسم نے حنیف کے ہاتھ راجو کے لیے کوئی تحفہ بھیجا تھا اور اسی تحفے نے ان سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے باوجود بھی جاسم نے میڈ ان جرمنی ٹیلی اسکوپ کی مدد سے اس اپارٹمنٹ کے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ بھوک کا احساس ہونے کے بعد اس نے کچن کا رخ کیا۔ گزشتہ روز والے ڈنر کے لیے تیار کیے جانے والے کھانے میں سے کافی کچھ بچا ہوا تھا لیکن جاسم کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا اور اس نے مذکورہ خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا...... یہ تھا کوکنگ کا آئیڈیا۔

فریج اور کچن کیبنٹس کی ''تلاشی'' کے بعد اسے اپنے مطلب کی ساری چیزیں مل گئیں۔ اس کے پاس کم و بیش دو گھنٹے تھے۔ اتنا وقت ہلکی پھلکی کوکنگ کے لیے کافی تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک اچھی سی چائے بنائی اور کیک کے ہمراہ چائے نوشی کو جاری رکھتے ہوئے وہ کوکنگ میں جُت گیا۔ آئندہ ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے مونگ مسور کی مکس پتلی دال اور بھگارے ہوئے سادہ چاول تیار کر لیے۔ علاوہ ازیں اس نے تلی ہوئی لیموں کے رس والی ہری مرچیں بھی بنالی تھیں۔ چائے کیک سے پیٹ پوجا کرنے کے بعد اس کی بھوک کو غفار داؤد کی آمد تک بریک لگ گئے تھے۔

غفار داؤد نے چینل کی طرف جاتے ہوئے جاسم سے کہا تھا کہ وہ ڈنر ایک ساتھ کریں گے لہٰذا جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کھانے سے بھری ہوئی دو تین تھیلیاں بھی تھیں۔

''میں تمہارے لیے گرما گرم تلی ہوئی مچھلی لایا ہوں۔'' غفار داؤد نے کھانے والی تھیلیاں جاسم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ تم کھانا لگاؤ، میں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔''

قبل اس کے کہ غفار داؤد باتھ روم میں قدم رکھتا، فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ کال لینڈ لائن پر آئی تھی۔ غفار داؤد نے فون اٹینڈ کیا پھر دوسری جانب بولنے والے کو سننے کے بعد جاسم کی طرف دیکھا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔

''ہاں ہے۔''

اس نے توجہ سے دوسری طرف کی بات سنی پھر معتدل

انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، آپ آجائیں۔ کھانا ایک ساتھ ہی کھائیں گے۔''

غفار داؤد نے ریسیور کریڈل کیا تو جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''انکل کون تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو وہ میرے بارے میں آپ سے استفسار کر رہا تھا؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' غفار داؤد نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنے صدیقی صاحب تھے۔ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ آرہے ہیں۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ لوگ ہمارے ساتھ ہی ڈنر کریں گے۔ میں تو ہم دونوں کے حساب سے مچھلی لے کر آیا تھا۔ کہیں کھانا کم نہ پڑ جائے۔''

''آپ ٹینشن نہ لیں انکل اور جلدی سے جا کر فریش ہو جائیں۔'' جاسم نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں اس بات کی گارنٹی لیتا ہوں کہ کھانا کم نہیں پڑے گا۔''

غفار داؤد چند لمحات تک حیرت اور اُلجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ جاسم کو تکتا رہا پھر ایک لفظ زبان سے ادا کیے بغیر وہ کندھے اچکاتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سرمد صدیقی اور بابر بخاری وہاں پہنچ گئے اس دوران میں جاسم نے بڑے سلیقے سے ڈنر چن دیا تھا۔ جب وہ چاروں کھانے کے لیے بیٹھے تو غفار داؤد نے دال اور چاول کی ڈشز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جاسم سے پوچھا۔

''کیا یہ تم ہوٹل سے لے کر آئے ہو؟''

''نہیں انکل۔'' جاسم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ میں نے خود بنایا ہے۔''

''ریئلی......!'' وہ بے یقینی سے جاسم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں کوکنگ بھی آتی ہے؟''

''جی انکل...... دو چار چیزیں بنانا جانتا ہوں۔''

''زبردست!'' غفار داؤد نے ستائشی انداز میں کہا۔

''تم نے یہ سب کہاں سے سیکھا؟''

''جیل میں انکل......'' جاسم نے سادگی سے بتایا۔ ''اس آٹھ سال کے عرصے کے دوران میں، میں نے جو کچھ سیکھا اس میں کھانا پکانا بھی شامل ہے۔ آپ لوگ ''بسم اللہ'' کریں۔ اگر میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا آپ کو پسند نہ آئے تو میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔''

ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت دال چاول کے علاوہ تلی ہوئی لیموں والی ہری مرچیں، ٹماٹر اور املی کی مکس چٹنی، فرائی فش اور فرمائشی چپاتیاں موجود تھیں۔ جب ان چاروں نے کھانا شروع کیا تو ہر ایک کا ہاتھ بار بار جاسم کی تیار کردہ ڈشز کی طرف ہی جا رہا تھا۔ وہ کھاتے جا رہے تھے اور تعریفوں کے ڈونگرے بھی برسا رہے تھے۔ ڈنر کے اختتام پر دال چاول صاف ہو چکے تھے اور فرائی فش جیسی ہاٹ فیورٹ ڈش بھی اچھی خاصی مقدار میں بچ گئی تھی۔

''جے بی......!'' بابر بخاری نے کہا۔ ''استنبول پہنچ کر تم کہیں اپنا ارادہ نہیں بدل دینا۔''

ڈائریکٹر کے اس معنی خیز جملے پر غفار داؤد پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''بابر بھائی! اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''بھئی! جے بی کے ہاتھ میں تو کمال کی لذت چھپی ہوئی ہے۔'' بابر بخاری وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر استنبول پہنچ کر اس نے اپنے ٹاسک کو پس پشت ڈال کر وہاں دال چاول کا ٹھیلا لگانے کا فیصلہ کر لیا تو ہم کس کی ماں کو ماسی کہیں گے......''

بابر بخاری کی اس ظریفانہ وضاحت پر وہاں موجود سب لوگ دل کھول کر قہقہے لگانے لگے۔ جاسم زیرِ لب مسکرانے تک محدود رہا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور اسی دوران میں سرمد صدیقی نے جاسم سے وہ ضروری بات بھی کر لی جس کے لیے وہ وہاں پہنچا تھا۔ اس نے جاسم کے چہرے پر نگاہ جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جے بی! اس وقت ہم جس نوعیت کے حالات میں گھرے ہوئے ہیں، ان کے پیشِ نظر میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں جمیم کو بھی یونٹ کے ساتھ استنبول بھیج رہا ہوں۔''

جاسم، جمیم کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک ابھرتا ہوا ینگ ٹی وی اسٹار تھا۔ صدیقی کی تمہید نے جاسم کو اس کہانی کے اینڈ تک پہنچا دیا۔ اس نے احترام بھرے انداز میں کہا۔

''سر! آپ کھل کر بات کریں۔''

''دیکھو جے بی......'' صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''استنبول پہنچنے کے بعد تمہارے سامنے دو قسم کی سچویشن آسکتی ہیں۔ نمبر ایک، ڈیو ڈاس سیریل کی شوٹنگ کے لیے تمہیں آٹھ دس دن کی مہلت دینے پر راضی ہو جائے۔ نمبر دو، وہ ایسی کوئی رعایت دینے سے صاف انکار کر دے۔ اگر اس نے تمہیں چند دن کی چھٹی دے دی تو تم دن رات کام کر کے اپنے حصے کے تمام سینز کو مکمل کراؤ گے۔ بہ صورت دیگر، بہ حالت مجبوری تمہیں کٹ کر کے ہم وہی کام جمیم سے لیں گے۔

اس کے پاسپورٹ پر ترکی کا ویزا لگا ہوا ہے لہٰذا یونٹ کے ساتھ جانے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔''
''سر! میں آپ کے اس پروگرام سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' جاسم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے نزدیک اس سیریل میں کام کرنے سے زیادہ اہمیت ناجیہ کی ہے۔ اس کی بہ حفاظت واپسی کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ ویسے آپ کی تجویز مجھے بہت پسند آئی ہے۔ میں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ کا سیریل اپنے طے شدہ اسکیجوئل کے مطابق ہی مکمل ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس میں، میں کام کروں یا حمیم یا کوئی تیسرا چوتھا......''
''ایک اور آپشن بھی ہوسکتا ہے۔'' غفار داؤد نے کہا۔
بخاری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سا آپشن؟''
''ڈیوڈ جس ری ایلیٹی میں جے بی کو کام کرنے کے لیے مجبور کررہا ہے، اس ٹی وی شو کا شوٹنگ ٹائم پینتالیس دن ہے اور ہمارا یونٹ ساٹھ روز کے لیے استنبول جارہا ہے۔'' غفار داؤد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فرض کریں، ڈیوڈ جے بی کو ایک دن کی مہلت بھی دینے کو تیار نہیں ہوتا تو اس صورت میں جے بی پہلے ڈیڑھ ماہ میں ڈیوڈ کے ری ایلیٹی ٹی وی کو نمٹائے اور آخری دو ہفتوں میں واپس استنبول آکر اپنے یونٹ کو جوائن کرلے۔ آپ لوگوں کے سیریل میں جے بی کا جو کام ہے، اسے اسکیجوئل میں تبدیلی کرکے آخری پندرہ دنوں میں بھی تو شوٹ کیا جاسکتا ہے۔''
''گڈ آئیڈیا......'' سرمد صدیقی نے توصیفی نظر سے اپنے دوست غفار داؤد کی طرف دیکھا۔ ''اس پوائنٹ کی طرف تو ہمارا دھیان ہی نہیں گیا۔''
''ہم حفظِ ماتقدم کے طور پر حمیم کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔'' بابر بخاری نے کہا۔ ''استنبول پہنچنے کے بعد وہاں کے حالات کے پیشِ نظر کوئی حتمی فیصلہ کرلیا جائے گا۔ میرے خیال میں حمیم کو اسٹینڈ بائی رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے!''
''بالکل ٹھیک۔'' صدیقی نے تائیدی انداز میں کہا پھر جاسم سے مخاطب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے اضافہ کیا۔ ''جے بی! تم کل کا پورا دن مکمل ریسٹ کرنا کیونکہ پرسوں علی الصباح تمہیں نکلنا ہوگا۔''
''علی الصباح کیوں......؟'' جاسم نے سوالیہ نظر سے بابر کی جانب دیکھا۔ ''آپ نے تو سولہ تاریخ بہ روز ہفتہ دوپہر کا پروگرام بتایا تھا۔''
''دوپہر کا مطلب، استنبول پہنچنے کا وقت۔'' بخاری وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہماری فلائٹ کا ڈیپارچر صبح سات بج کر پچاس منٹ پر ہے۔ چھ گھنٹے پانچ منٹ کا فضائی سفر کرنے کے بعد ہم دوپہر گیارہ بج کر پچپن منٹ پر استنبول کے ائرپورٹ پر لینڈ کریں گے۔''
جاسم کے چہرے اور آنکھوں میں اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ سرمد صدیقی نے صورتِ حال کو ہینڈل کرتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''جے بی! کراچی اور استنبول بہ الفاظ دیگر پاکستان اور ترکی کے معیاری وقت میں دو گھنٹے کا فرق ہے۔ جب تم لوگ استنبول میں لینڈ کرو گے تو اس وقت یہاں کراچی میں دوپہر کے ایک بج کر پچپن منٹ ہورہے ہوں گے۔ مغرب میں واقع ہونے کے باعث ترکی کا معیاری وقت پاکستان سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔''
جاسم ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ گیا سر۔''
صدیقی اور بخاری کے جانے کے بعد غفار داؤد نے کہا۔ ''بیٹا! تم پچھلی رات بہت دیر تک جاگتے رہے تھے۔ آج جلدی سو جانا اور کل کا دن بھی گھر پر ہی آرام کرنا، باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر ایک فوری خیال کے تحت اس نے پوچھ لیا۔ ''کیا میرے آفس جانے کے بعد تم کہیں گئے تھے؟''
''جی انکل......'' جاسم نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔
''سب ٹھیک رہا۔'' غفار داؤد نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''خیریت ہی سے گئے تھے نا؟''
''انکل! آپ اتنے مہربان ہیں کہ آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی کرنے کو من راضی نہیں ہوتا۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''میں نے جب تمہیں اپنی فرزندی میں لینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو سمجھ لو، میرے نزدیک تم ناجیہ سے بھی زیادہ اہم ہوگئے ہو۔'' غفار داؤد نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''میں تم پر اندھا اعتماد کرنے لگا ہوں۔ اگر کوئی ایسی بات ہے جو تم سمجھتے ہو، مجھے بتانے میں......''
''ایسی کوئی بات نہیں انکل......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بس، آپ کی حفاظت مقصود تھی تاکہ میرے غیاب میں... شر پسند عناصر آپ کو تنگ نہ کرسکیں۔''
''تمہاری بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔'' غفار داؤد

نے گہری نگاہ سے جاسم کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''پھر تم نے میری حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے؟''

''انکل! اس شہر میں ایک کمپنی بہت ہی غیر معیاری فریج تیار کر رہی تھی۔'' جاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس کمپنی کے بنائے ہوئے فریج جس بھی گھر میں پہنچتے، اس گھر کے مکینوں کی زندگی عذاب ہو کر رہ جاتی تھی۔ ایسا ہی ایک ناقص، اذیت دینے والا فریج غلطی سے کل رات اس اپارٹمنٹ میں بھی آ گیا تھا جسے ہم دونوں نے مل کر ڈبے میں پیک کرنے کے بعد واپس کمپنی بھیج دیا تھا لیکن کمپنی کا مالک اس فریج کو ریپیر کرنے کے لیے راضی ہوا اور نہ ہی مزید گھٹیا فریج بنانے سے باز آنے کا وعدہ کیا لہٰذا......'' ڈرامائی انداز میں توقف کرنے کے بعد جاسم نے پُرمعنی اسٹائل میں کندھے اچکائے اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لہٰذا اس ہیچ مداں، نجم الحمقا اور نطفۂ ناتصدیق ''فریج میکر'' کی فیکٹری پر ہمیشہ کے لیے تالا ڈالنے کی خاطر ایک چھوٹا سا ڈیمو دینا پڑا ہے۔''

''تمہارا اشارہ کہیں لینڈ کروزر میں ہونے والے بم دھماکے کی جانب تو نہیں ہے جس میں بیٹھے ہوئے چار پانچ افراد لقمۂ اجل بن گئے ہیں؟'' غفار داؤد نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''میں نے ٹی وی چینل پر وہ بریکنگ نیوز چلتے دیکھی ہے۔''

جواباً جاسم نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

جغرافیائی لحاظ سے ترکی ایک جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اسے عام طور پر ایک منقسم ملک بھی کہا جاتا ہے یعنی ترکی کا ایک حصہ براعظم ایشیا میں اور دوسرا حصہ براعظم یورپ میں ہے۔ مشرقی ایشیائی ترکی ''اناطولیا'' کے نام سے موسوم ہے جبکہ مغربی یورپی ترکی ''تھریس'' یا ''ترا کیا'' کہلاتا ہے۔ استنبول تھریس یعنی یورپ ترکی میں شمار ہوتا ہے۔ تھریس کی معاشرت اور لائف اسٹائل ہو بہو یورپ جیسا ہے۔ آئندہ چند سالوں میں ترکی یورپی یونین کا باقاعدہ حصہ بن کر ''شینگن کنٹری'' کا اعزاز حاصل کرلے گا۔

ترکی کو تین سمندروں (بحیرۂ ایجہ، بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود) کی دھرتی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی ساحلی پٹی کی مجموعی طوالت آٹھ ہزار کلومیٹرز کے قریب ہے۔ ایک روایت کے مطابق، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بحیرۂ اسود (بلیک سی) کو پار کرنے کے بعد خشکی تک پہنچی تھی۔ ترکی پاکستان سے کم و بیش چار ہزار کلومیٹرز کے فاصلے پر واقع ہے۔

ترکش ائرلائنز کی فلائٹ ٹی کے۔ سیون زیرو نائن نے مقررہ وقت پر، استنبول کے اتاترک ائرپورٹ پر لینڈ کیا تھا۔ کسٹم کے جھمیلوں سے نمٹنے کے بعد یونٹ نے میٹرو پکڑی اور ایک گھنٹا، بارہ منٹ کے بعد وہ لوگ اپنی قیام گاہ ہوٹل ون ون سکس ریزیڈینس پہنچ گئے اور اسی شام جاسم ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گلاٹا برج کی جانب روانہ ہو گیا۔

باسفورس اسٹریٹ (آبنائے باسفورس) دنیا کی سب سے کم چوڑی آبنائے کہلاتی ہے۔ اس کی کل لمبائی اکتیس کلو میٹرز، کم از کم چوڑائی سات سو میٹرز اور اوسط گہرائی ستر میٹرز ہے۔ جاسم آبنائے باسفورس کی خوب صورتی کا نظارہ کرتے ہوئے گلاٹا برج پہنچ گیا۔ عظیم الشان گلاٹا برج کے نچلے حصے میں سیاحوں کی تفریحِ طبع کے لیے، ایک قطار میں معیاری ریسٹورنٹس بنائے گئے ہیں۔ گلاٹا برج پر کھڑے ہو کر مسجد سلطان احمد المعروف بہ ''نیلی مسجد'' کو دیکھنا ایک ایمان افروز اور روح پرور نظارہ ہے۔ اس روح پرور مسجد کی دلکشی انسانی سوچ کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔

جاسم کو اپنی منزل تک رسائی حاصل کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس نے زینان ریسٹورنٹ پہنچ کر وہاں کے ماسٹر شیف بن عرفات سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو ایک وردی پوش ملازم نے اسے ریسٹورنٹ کے عقبی حصے میں پہنچا دیا۔

بن عرفات نے گہری سنجیدگی سے اس کا استقبال کیا۔

ڈیوڈ نے اسے ہدایت کی تھی کہ بن عرفات کے ساتھ عربی میں گفتگو کرنا ہے۔ جاسم نے عربی ہی میں بن عرفات کو اپنے بارے میں بتایا۔

بن عرفات نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تو آپ کنٹریکٹ سائن کرنے کے لیے تیار ہو؟''

ان کے بیچ تمام تر بات چیت عربی ہی میں ہو رہی تھی اور ریسٹورنٹ کے اس دور افتادہ آفس نما حصے میں ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا گویا اس اہم میٹنگ کے لیے انہیں مکمل پرائیویسی میسر تھی۔

جاسم نے جواب دیا۔ ''میرے پاس دوسرا کوئی آپشن موجود نہیں۔ تم ڈیوڈ کو بلاؤ......''

''ڈیوڈ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔'' بن عرفات نے اپنی میز کی دراز سے ایک فولڈر برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ جس کے توسط سے رابطہ کرتا ہے، اس وقت وہی ڈیوڈ ہوتا ہے۔ کراچی کے ایک ہوٹل میں تم سے مختصر بات کرنے والا، لڑکی کے سیل فون سے تمہیں کال کر کے طویل گفتگو کرنے والا

اور میں...... سب ڈیوڈ ہی ہیں۔'' اس نے فولڈر کھول کر چند پیپرز باہر نکالے اور انہیں جاسم کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ رہا تمہارا کنٹریکٹ۔ اسے اچھی طرح پڑھ لو۔ کوئی پوائنٹ سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ سکتے ہو لیکن اگر ایک بار تم نے اس کنٹریکٹ پر اپنے دستخط کر دیے تو پھر ہر حال میں تمہیں اس ڈاکومنٹ کی پاسداری کرنا ہوگی۔ خلاف ورزی کی گنجائش ہے اور نہ ہی واپسی کا کوئی راستہ!''

بن عرفات جتنے اعتماد سے بات کر رہا تھا، اس سے جاسم کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک صاحبِ اختیار اور ذمے دار شخص تھا۔ جاسم نے اس کنٹریکٹ کو دو تین بار گہری توجہ سے پڑھا۔ وہ ایک انتہائی سادہ سا عہد نامہ تھا جو جاسم اور ڈیوڈ کے درمیان ایک تحریر کی شکل میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ جاسم نے دس ہزار امریکی ڈالرز کے عوض ڈیوڈ کے ایک ریلیٹی ٹی وی میں ایکشن سے بھرپور ایکٹنگ کرنا تھی اور پینتالیس دن تک اپنا سارا وقت ڈیوڈ اور اس کے پروڈکشن یونٹ کو دینا تھا۔ اس کے قیام و طعام، ٹرانسپورٹ اور دیگر اخراجات کی ذمے داری پروڈکشن کمپنی کے سر تھی۔ کنٹریکٹ کے آخر میں جاسم کو اپنے دستخط کرنا تھے۔ یہ تمام وہی باتیں تھیں جو ڈیوڈ اس سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ پورے کنٹریکٹ میں ایک بھی پوائنٹ ایسا نہیں تھا جس کے لیے اسے بن عرفات کی صلاح کی ضرورت محسوس ہوتی۔

''میں نے اس کنٹریکٹ کو پڑھ لیا ہے۔'' جاسم نے بن عرفات کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے ڈیوڈ سے ایک دو نہایت ہی اہم باتیں کرنا ہیں۔''

''وہ باتیں تم مجھ سے بھی کر سکتے ہو۔'' بن عرفات نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میں ہی ڈیوڈ ہوں۔'' اس کے آخری جملے میں یاددہانی چھپی ہوئی تھی۔

بن عرفات کا گھمنڈی انداز جاسم کو ناگوار گزر رہا تھا لیکن صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے کسی برہمی یا خفگی کا اظہار کرنے کے بجائے بڑی رسان سے کہا۔

''اس کنٹریکٹ پر میرے دستخط کے ساتھ، میری دوست کی واپسی جڑی ہوئی ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ کنٹریکٹ سائن ہونے کے بعد تم ناجیہ کو آزاد کر دو گے؟''

''اور کچھ؟'' بن عرفات نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

''ڈیوڈ جانتا ہے کہ میں استنبول اپنے ایک ٹی وی سیریل کی شوٹنگ کے لیے آیا ہوں۔'' جاسم نے کہا۔ ''اگر ڈیوڈ اپنا ریلیٹی ٹی وی آٹھ دس دن کے بعد شروع کرے تو مجھے سیریل کا کام نمٹانے کا موقع مل جائے گا۔''

''یہ نہیں ہو سکتا......'' بن عرفات نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''یہ کنٹریکٹ سائن ہونے کے بعد تم ہمارے چینل پر آجاؤ گے۔ پورے ڈیڑھ ماہ تک تمہاری زندگی کا ایک ایک پل ہمارا ہے۔ تم کسی اور کا کام نہیں کر سکتے۔ اگر تمہاری نظر میں تمہاری ٹی وی سیریل کی اہمیت زیادہ ہے تو پھر پہلے جا کر تم اپنا کام نمٹا لو۔ تب تک وہ لڑکی ہمارے قبضے میں رہے گی اور اس صورت میں، یہ ضروری نہیں ہے کہ ڈیوڈ اپنے وعدے پر قائم بھی رہے کیونکہ جب تک یہ کنٹریکٹ سائن نہیں ہو جاتا، ہماری کہی ہوئی کسی بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور جہاں تک لڑکی کو چھوڑنے کا معاملہ ہے تو......'' ایک لمحہ رک کر بن عرفات نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''تم کنٹریکٹ سائن کرو۔ میں لڑکی کے سیل فون پر کال کر کے تمہاری اس سے بات کرا دیتا ہوں۔ پھر تمہیں یقین آجائے گا کہ ہم کچھ بھی ایسے ہی نہیں کہہ دیتے اور...... ہم جو کہتے ہیں اس پر عمل کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ وہ لڑکی خود تمہیں اپنی آزادی کی خوش خبری سنائے گی۔''

بن عرفات کے انداز سے جھلکتے اعتماد نے جاسم کو اس کے الفاظ پر یقین کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے ایک قلم کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اس عہدنامے پر دستخط کر رہا ہوں۔''

''اوں ہوں......'' بن عرفات نے انگشتِ شہادت سے نفی میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سائن پین سے نہیں کرنا۔''

''پھر کس سے کرنا ہے؟'' جاسم کی آنکھوں میں حیرت اُبھر آئی۔

بن عرفات نے میز کی دراز میں سے ایک ڈسپوزیبل سرنج اور ایک چھوٹی سی بوتل برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کنٹریکٹ پر تم اپنے خون سے دستخط کرو گے اور اس کے لیے مجھے تمہارا دو سی سی خون لینا ہوگا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' جاسم جھلا کر رہ گیا۔

''تم نے جو سنا، میں وہی کہہ رہا ہوں۔'' بن عرفات نے ٹھوس انداز میں کہا اور ڈسپوزیبل سرنج کو اس کی پیکنگ سے باہر نکال لیا پھر جاسم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو شروع کریں؟''

جاسم نے بادلِ ناخواستہ اپنا بازو بن عرفات کی جانب بڑھا دیا۔ بن عرفات نے جاسم کی ورید (وین) میں سے سرنج بھر کر خون نکالا اور پھر مذکورہ سرنج کو چھوٹی بوتل میں خالی کر دیا۔ اس بوتل کے اندر پہلے سے کوئی محلول موجود تھا۔

یہ ''اینٹی کوائیگولیٹ'' تھا جو خون کو جمنے سے روکتا ہے۔ بن عرفات نے خون اور اینٹی کوائیگولیٹ کو، بوتل کو جھٹک کر اچھی طرح مکس کرنے کے بعد دراز میں سے ایک روایتی قلم نکالا اور اس قلم دوات (خون والی بوتل) کو جاسم کی جانب بڑھاتے ہوئے سر کے اشارے سے کہا۔

''ہوں......''

جاسم نے اس قلم کو اپنے خون میں ڈبو کر ڈیوڈ کے ری ایلیٹی ٹی وی پروجیکٹ والے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیے۔

بن عرفات نے کنٹریکٹ کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد اپنے سیل فون سے کسی کو کال کی اور یونانی زبان میں کچھ ہدایات جاری کر دیں۔ جاسم اس دوران میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ چند سیکنڈ کے بعد بن عرفات کے سیل فون پر ایک ٹیکسٹ میسج موصول ہوا۔ بن عرفات نے میسج کو اوپن کر کے پڑھا پھر جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم خود اس لڑکی کے نمبر پر کال کرو گے یا میں اپنے سیل فون سے اسے کال کر کے تمہاری بات کرا دوں؟''

''میں خود ناجیہ سے کانٹیکٹ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہوں گا۔'' جاسم نے اپنے سیل فون کو آپریٹ کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' بن عرفات نے کہا۔ ''یہ تمہارا حق ہے۔''

چند سیکنڈ کے بعد جاسم کا ناجیہ سے رابطہ ہو گیا۔ ناجیہ کی آواز سن کر جاسم کا دل اطمینان بھری خوشی سے معمور ہو گیا۔ اس نے ''ہیلو ہائے'' کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تفصیلی گفتگو بعد میں۔ ابھی بس تم میری تشفی کے لیے اتنا بتا دو کہ کیا تمہیں ڈیوڈ کے لوگوں نے آزاد کر دیا ہے؟''

''ہاں۔'' ناجیہ نے جواب دیا۔ ''اس وقت میں پاپا کے ساتھ کار میں ہوں۔ ہم لوگ گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے میرا اسیل فون بھی واپس کر دیا ہے۔ تم تو ٹھیک ہو نا جے بی؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' جاسم نے کہا۔ ''رات میں تفصیلی بات کریں گے۔''

جاسم نے سیل فون کو اپنی جیب میں رکھا اور بن عرفات کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تمہارا ڈیوڈ تو میری نظر میں حمقا کا سردار ہے۔''

بن عرفات کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم اس نے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''وہ کیسے؟''

''میری دوست اب تمہارے قبضے میں نہیں ہے۔'' جاسم نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری گردن کا کڑا اکا نکال کر اگر یہاں سے چلتا بنوں تو تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟''

''میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا۔'' بن عرفات نے شانت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم کنٹریکٹ کی دھجیاں بکھیرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو تمہاری مرضی۔''

''ہاں، میری مرضی اور میرا ہی فیصلہ......'' جاسم نے زہرخند انداز میں کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت ہی کڑوے الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم بہ صد شوق اس کنٹریکٹ کا تعویذ بنا کر ڈیوڈ کے گلے میں ڈال سکتے ہو۔ میں اس کی حلقہ بگوشی اختیار کرنے والا نہیں ہوں۔''

بن عرفات نے جاسم کی اس باغیانہ دھمکی کو شیخی پر محمول کیا اور ایک آسودہ سانس خارج کرنے کے بعد کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔

جاسم نے بن عرفات پر حقارت بھری نگاہ ڈالی اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے زیتان کو خیرباد کہہ دیا۔ بن عرفات نے جو کہا تھا، وہی کیا بھی یعنی اس نے جاسم کو جانے سے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جاسم، زیتان سے نکل کر گلاٹا برج پر بمشکل دس فٹ چلا ہو گا کہ اس کے دماغ میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اسے چکر آ گیا۔ سر میں اٹھنے والی چمک اتنی شدید اور درد انگیز تھی کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا لیکن دماغ کی چکراہٹ اور قدموں کی ڈگمگاہٹ پر قابو نہ پا سکا۔ اگلے ہی لمحے وہ گلاٹا برج کی گزرگاہ پر لڑکھڑا کر دھڑام سے گرا اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو جاسم نے خود کو ایک گداز آرام دہ بستر پر پایا۔ وہ کمرا کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے لگژری بیڈروم ایسا تھا۔ جاسم کو اس کی بے خبری میں یہاں پہنچایا گیا تھا۔ اسے بس اتنا

یاد تھا کہ وہ سولہ تاریخ کی شام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے ایک ریسٹورنٹ زینان میں بن عرفات نامی ایک عرب النسل شخص سے ملاقات کرنے گیا تھا جس کے نتیجے میں اچھی خاصی بدمزگی ہوگئی تھی اور وہاں بن عرفات کو کھری کھری سنا کر وہ ریسٹورنٹ سے نکل آیا تھا مگر چند قدم بعد ہی اس کے دماغ میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اتنی زور کا چکر آیا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا۔

بے ہوش ہونے کا منظر اس کے ذہن میں اپنے پس منظر کے ساتھ تازہ ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنی گردن کی بائیں جانب تکلیف کا احساس ہوا۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ گردن کے متاثرہ حصے پر چلا گیا۔ وہاں پر اسے ایک بینڈ ایج لگی ہوئی ملی۔ یہ اس کے لیے ایک ناقابلِ یقین اور حیران کن بات تھی کیونکہ جب اس نے زینان ریسٹورنٹ کو خیرباد کہا تو وہ صحیح سلامت تھا، پھر یہ چوٹ اور اس پر لگی ہوئی بینڈ ایج کیا معنی رکھتی تھی۔

اس نے بستر چھوڑ دیا اور ایک دیوار گیر قدِ آدم آئینے کی جانب بڑھا۔ اگلے ہی لمحے اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بیڈ روم ایک دم ساکن نہیں تھا بلکہ اس کے وجود میں ایک غیر محسوس ہلکا سا ارتعاش پایا جاتا تھا۔ اس احساس نے اس کے ذہن کو اُلجھا دیا اور وہ بہ غور اس عالی شان کمرے کا تفصیلی جائزہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ جلد ہی اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ اس وقت کسی بحری جہاز پر سوار تھا اور اس کمرے میں محسوس ہونے والا وہ معمولی نوعیت کا ارتعاش دراصل مذکورہ بحری جہاز کے کسی گہرے سمندر کے سینے پر حرکت کا نتیجہ تھا۔ اس کمرے کی تمام دیواریں اور چھت لکڑی سے بنائی گئی تھیں اور ایک دیوار میں موجود چوبی کھڑکی سے اتھاہ نیلگوں سمندر کا حسین نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

وہ دیوار گیر آئینے کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا اور اپنی متاثرہ گردن کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ہاتھ کی ٹٹول نے یہ پتا تو لگالیا تھا کہ گردن کے جس حصے سے درد کی ٹیس اٹھ رہی ہے۔ وہاں کوئی بینڈ ایج کی گئی ہے۔ اب اس نے آئینے کے توسط سے وہ بینڈ ایج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لی۔ مذکورہ بینڈ ایج کے سائز سے اس نے اندازہ لگالیا کہ اس کے پیچھے ایک انچ کے ا... قریب کوئی زخم ہونا چاہیے۔

اس نے سوچنے اور یاد کرنے کی بہت کوشش کی کہ اس کی گردن کی بائیں جانب یہ چوٹ کب اور کیسے لگی تھی؟ اس کی ڈریسنگ کس نے کی؟ اور سب سے بڑی بات کہ اس شپ پر وہ کیسے پہنچا اور وہ جا کہاں رہا ہے؟

کافی سوچ بچار کے بعد بھی جب اسے ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں ملا تو وہ اس کھڑکی کی جانب بڑھ گیا جس کے توسط سے ٹھاٹھیں مارتے ہیبت ناک سمندر کو دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ مذکورہ کھڑکی سے ایک گز کی دوری پر تھا کہ اس لگژری روم میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کھڑکی کی سمت بڑھتے ہوئے اس کے قدم رک گئے۔ یہ اس کے سیل فون کی گھنٹی نہیں تھی۔ گھنٹی کی آواز سائڈ ٹیبل پر سے آرہی تھی۔

اس نے دیکھا، مذکورہ سائڈ ٹیبل پر ایک بیسک سیل فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ سادہ سا سیل فون اٹھالیا اور کال ریسیو کرنے کے لیے فون کو کان سے لگالیا۔ اگلے ہی لمحے ایک ٹھہری ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”گڈ آفٹر نون مسٹر جے بی......!“

”کون ہو تم؟“ جاسم نے اکھڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”ڈیوڈ......تمہارا خیر خواہ......“

”تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟“ جاسم نے خفگی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”اور مجھے زخمی کرکے کہاں لے جارہے ہو؟“

”میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا جے بی......“ یہ سب تمہارے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”تم اس وقت استنبول سے پورٹ سعید جارہے ہو۔“

”میرے کرتوت......“ جاسم کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ ”میں نے تو شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہارے کنٹریکٹ پر اپنے خون سے دستخط کردیے تھے۔ پھر مجھے زخمی کرکے اس شپ پر سوار کیوں کیا گیا اور وہ بھی بے ہوشی کی حالت میں......؟“

”ری ایلیٹی ٹی وی پروجیکٹ والے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے تک معاملہ سیدھا تھا۔“ ڈیوڈ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن اس کے بعد تم نے جو بے ہودگی کی وہ بغاوت اور سرکشی کے زمرے میں آتی ہے......“

جاسم اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میں نے کون سی بے ہودگی کی ہے؟“

”جب تم نے اس امر کی تصدیق کر لی کہ ہم نے تمہاری بلیک کیٹ کو آزاد کردیا ہے تو تمہارے تیور ہی بدل گئے......“ ڈیوڈ کے لہجے سے گہرا طنز جھلکتا تھا۔ ”پہلے تم نے میری شان میں گستاخی کی، پھر بن عرفات کو الٹے سیدھے چیلنج کرڈالے۔ اس کا ضبط دیکھو کہ وہ تمہاری ہر زہریلی بات کو پی

گیا اور اس نے تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ بن عرفات ماسٹر شیف ہونے کے علاوہ باکسنگ کا مڈل ویٹ چیمپئن بھی ہے۔ وہ بہ آسانی تمہاری گردن توڑ کر ریسٹورنٹ کے اندر ہی کہیں پھینک سکتا تھا لیکن اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی کیونکہ بن عرفات جانتا تھا کہ تم ریسٹورنٹ سے نکل کر چند قدم بھی نہیں چل پاؤ گے.... کیا سمجھے؟"

"تو..... تو میں جو چکرا کر گلاٹا برج کی گزرگاہ پر گرا تھا، اس کے پیچھے بن عرفات کا ہاتھ تھا؟" جاسم نے چونکتے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں، بالکل ایسی ہی بات ہے۔" ڈیوڈ نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ "جس سرنج کی مدد سے تمہاری وین سے خون لیا گیا تھا اس کی نیڈل پر ایک خاص قسم کا کیمیکل لگا ہوا تھا جو نیڈل کے ذریعے تمہارے خون میں شامل ہو گیا تھا۔ اگر تم چپ چاپ ایک دو منٹ ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہتے تو تب بھی تمہیں یونہی چکرا کر بے ہوش ہو جانا تھا مگر تم نے ہیرو گیری کے چکر میں بڑی بڑی باتیں کیں اور اس طرح ریسٹورنٹ سے نکلے تھے جیسے پورا استنبول فتح کرنے جا رہے ہو۔ اپنی اس احمقانہ بہادری کے نتیجے میں تم گلاٹا برج کی راہداری میں گرے اور تمہاری بدقسمتی کہ جہاں تم گرے وہاں کانچ کا ایک خطرناک ٹکڑا پڑا ہوا تھا جو تمہاری گردن میں چبھ گیا اور وہاں سے خون نکلنے لگا۔ بہرحال....."

وہ سانس لینے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"ہم نے تمہاری مرہم پٹی کر دی ہے۔ دو، تین روز میں تمہارا زخم بھر جائے گا۔ تم نے زینان میں جس رویّے کا مظاہرہ کیا، اسے تمہاری پہلی خطا سمجھ کر معاف کیا جاتا ہے۔ امید ہے، آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔ اگر کبھی تمہارے دماغ میں کسی مہم جوئی کا کیڑا کلبلائے تو یہ نہیں بھولنا کہ ہم نے تمہاری بلیک کیٹ کو آزاد ضرور کر دیا ہے مگر وہ مسلسل ہماری نگرانی میں ہے۔ تمہاری ذرا سی کوتاہی اس کی زندگی کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"تم مجھے دھمکا رہے ہو؟"

"نہیں، میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔" ڈیوڈ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "سولہ تاریخ بہ روز ہفتہ کی شام تم نے ری ایلیٹی ٹی وی کا کنٹریکٹ سائن کیا ہے۔ اسی لمحے سے تم ہمارے چینل پر ہو۔ پورے پینتالیس دن تک تم وہی کرو گے جو ہم چاہیں گے حتیٰ کہ تمہیں سانس بھی ہماری ہی مرضی سے لینا ہو گی۔"

"اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو.....؟" جاسم نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔

"یہ آپشن تمہارے پاس نہیں ہے جے بی....." ڈیوڈ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "وہ سامنے والی الماری میں ایک لیپ ٹاپ رکھا ہے۔ اس کے ڈاؤن لوڈز میں چند ویڈیو کلپس پڑے ہیں۔ تم ذرا انہیں دیکھ لو۔ میں تھوڑی دیر میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔"

بات کے اختتام پر ڈیوڈ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ جاسم کے ذہن میں کسی بجلی کے کوندے کے مانند ایک خیال چمکا اور اس نے اضطراری انداز میں ناجیہ کا نمبر پنچ کر دیا۔ اگلے ہی لمحے یہ ریکارڈنگ اس کی سماعت تک پہنچی۔

"سوری..... یہ سہولت آپ کو میسر نہیں ہے۔"

"کئی بار کی کوشش کے بعد بھی جب نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا تو جاسم کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس سیل فون کی آؤٹ گوئنگ لاک ڈھی اور صرف اِن کمنگ اوپن تھی۔ اس نے ڈیوڈ کا غائبانہ تصور کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ شیطان تو میری توقع سے زیادہ مکار ہے....."

جاسم نے لیپ ٹاپ آن کیا اور ڈیوڈ کے بتائے ہوئے ویڈیو کلپس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ وہ ڈھائی منٹ سے چھ منٹ تک کی ڈیوریشن کے کلپس تھے۔ جب جاسم نے انہیں یکے بعد دیگرے پلے کر کے دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ سب کے سب کلپس اس کو بے حد کمزور بناتے تھے۔ وہ سانس روک کر ایک کے بعد ایک ویڈیو کلپ دیکھتا چلا گیا۔

پہلا کلپ اس کے فارم ہاؤس والے مشن سے متعلق تھا جب جاسم نے راجو کو نمونۂ عبرت بنانے کے لیے اس کے لمبو لا کے نزدیک واقع اکلیس ٹینڈن کو تیز دھار چھری کی مدد سے کاٹ ڈالا تھا۔ دوسرے ویڈیو کلپ میں لبرٹی مارکیٹ میں آرا مشین کی کارروائی کو ریکارڈ کیا گیا تھا جب جاسم اپنے جلیل ماموں کو خوف زدہ کرنے کے لیے مصروف عمل تھا۔ تیسرا ویڈیو کلپ ڈاکٹر جنید واسطی کی خفیہ لیبارٹری اور آپریشن تھیٹر سے متعلق تھا جب جاسم نے اپنے پارٹنر کامل کی مدد اور تعاون سے قادر، بشارت، طارق اور ہارٹ سرجن جمیل باقر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور بعد ازاں ڈاکٹر آفتاب اور سسٹر یاسمین کو قرار واقعی سزا دی تھی۔ چوتھے ویڈیو کلپ میں جاسم کے شیریں جناح کالونی والے معرکے کو ریکارڈ کیا گیا تھا۔ پانچواں اور آخری ویڈیو کلپ راجو والی بلیک لینڈ کروزر میں ہونے والے سیلولر بلاسٹ کی عکاسی کرتا تھا۔ اس کلپ میں

ایک شاٹ ایسا بھی تھا جب راجو کی لینڈ کروزر اور جاسم والی گاڑی، ایک ہی سڑک کی دونوں جانب تھوڑے فاصلے پر موجود تھیں اور جاسم لیپ ٹاپ پر مصروف نظر آتا تھا......

''حرام زادہ...... گدھے کا بچہ...... شیطان کا چیلا......'' جاسم نے نفرت بھرے انداز میں خود کلامی کی پھر ڈیوڈ کی اس کمینی چال کے بارے میں سوچنے لگا۔

''یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس مردود نے میرے معمولات کو ریکارڈ کرنے کے لیے ہر جگہ کیمرے لگوا رکھے ہوں۔ یہ یقیناً اڈوب فوٹو شاپ کا کمال ہے۔'' اس نے خود کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔ ''لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ تمام تر واقعات وقوع پذیر ہوئے تو ہیں۔ اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ڈیوڈ میرے پرانے اور نئے تمام تر حالات سے اچھی طرح واقف ہے۔''

وہ اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جاسم نے فوراً کال ریسیو کر لی۔ دوسری جانب خود کو ڈیوڈ بتانے والا شخص ہی تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی برہمی سے کہا۔

''جے بی! تم میرے لیے شیطان اور مکار کے الفاظ استعمال کرو یا مجھے مردود، کمینہ، حرام زادہ اور گدھے کا بچہ کہو...... اس سے تمہاری مشکلات میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اس طرح تم اپنے لیے سنگین مسائل کھڑے کر رہے ہو۔''

''تمہیں کیسے پتا کہ میں نے تمہیں اِن ''القابات'' سے نوازا ہے؟'' جاسم نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ہم ایک پُراسرار نادیدہ آنکھ ہیں جو سب کو دیکھتی ہے مگر کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔'' ڈیوڈ نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''اس آنکھ نے دیکھا کہ میرے فون بند کرتے ہی تم نے کالی بلی کو کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کوشش میں تمہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' جاسم صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس سیل فون کی آؤٹ گوئنگ لاکڈ ہے۔ تم نے میرا اصل فون کہاں پھینک دیا؟''

''پھینکا نہیں، اسی روم میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔'' ڈیوڈ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اس گفتگو کے اختتام پر تمہاری ہر شے تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔ فی الحال تم میری باتوں پر فوکس کرو اور بتاؤ، تم نے تمام ویڈیو کلپس دیکھ لیے ہیں؟''

''کیا تمہاری وہ نادیدہ پُراسرار آنکھ یہ بات نہیں جانتی؟''

''بے شک جانتی ہے لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے تاکیدی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔''

جاسم نے سوچ لیا کہ ڈیوڈ سے مغز ماری کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا اسے صبر و برداشت سے کام لیتے ہوئے اس کے سامنے چٹانی اعتماد کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ رسان بھرے لہجے میں بولا۔

''ہاں...... دیکھے ہیں۔''

''ایسے ہی چند اور ویڈیو کلپس بھی میرے اسٹاک میں موجود ہیں جیسا کہ بینک والی بلڈنگ کی چھت پر تمہارا کارنامہ اور ڈاکٹر جنید واسطی کے اسپتال میں ہونے والا خوفناک دھماکا...... وغیرہ وغیرہ......'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ذرا غور کرو...... اگر یہ تمام ویڈیو کلپس متعلقہ افراد یعنی تمہارے دشمنوں کے حوالے کر دیے جائیں تو وہ تمہارا کیسا حشر نشر کریں گے؟''

جاسم، ڈیوڈ سے گفتگو کے حوالے سے اپنے ذہن میں ایک پالیسی مرتب کر چکا تھا لہٰذا فکرمندی سے جواب دیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر یہ کلپس میرے دشمنوں کے ہتھے چڑھ جائیں تو وہ مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''تمہاری یہ تمام تر کمزوریاں ہمارے پاس محفوظ رہیں گی، بہ شرط یہ کہ تم ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کرو اور اس مشن کے اختتام پر یہ سارے ویڈیو کلپس بھی تمہارے حوالے کر دیے جائیں گے۔'' ڈیوڈ نے معتدل انداز میں کہا۔

جاسم یہ بخوبی سمجھ رہا تھا کہ ڈیوڈ اسے اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے یہ سارے ہتھکنڈے آزما رہا تھا لہٰذا اس نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔

''میں دل و جان سے تمہارے ری ایلیٹی ٹی وی پروڈکشن میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی......'' جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''کون سی بات؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''اس شو کا فارمیٹ......'' جاسم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ویسٹرن اور ایسٹرن دونوں دنیاؤں کے کئی ایک ری ایلیٹی ٹی وی شوز دیکھے ہیں جیسا کہ بگ باس لیکن ان شوز میں حصہ لینے والے افراد کو ایسی زور زبردستی اور غنڈا گردی سے تو اس کام پر مجبور نہیں کیا جاتا جیسا کہ تم میرے ساتھ کر رہے ہو۔ یہ سب کیا ہے؟''

''تم نے بگ باس غور سے دیکھا ہے؟''

"یس!" جاسم نے جواب دیا۔

"پھر تو تمہیں اس ری ایلیٹی ٹی وی کا لوگو بھی یاد ہوگا۔" ڈیوڈ نے معنی خیز انداز میں استفسار کیا۔ "وہ پُراسرار آنکھ والا......؟"

"ہاں...... بالکل یاد ہے۔" جاسم نے پورے تیقن سے کہا۔

"خیر......" ڈیوڈ اس گفتگو کو سمیٹتے ہوئے سرسری انداز میں بولا۔ "تم دوسرے ری ایلیٹی ٹی وی شوز کو ذہن سے جھٹک کر صرف اپنے والے پر توجہ دو جس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے تم قاہرہ جا رہے ہو۔"

"قاہرہ......!" جاسم نے اُلجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "مگر تھوڑی دیر پہلے تو تم نے بتایا تھا کہ اس شپ کی آخری منزل پورٹ آف سعید ہوگی؟"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" ڈیوڈ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ جدید طرز کا ایک عالی شان کروز شپ ہے جس پر کم و بیش دو ہزار مسافر سفر کر رہے ہیں۔ جس کمرے میں اس وقت تم موجود ہو، ایسے ہی ایک سو پچاس کمرے اس شپ پر مزید ہیں۔ مختصر کیبن اور دیگر برتھ اس کے علاوہ ہیں۔ یہ کروز شپ سمندر کے سینے پر رواں دواں ایک الگ دنیا ہے جس میں ریسٹورنٹس، بارز، سوئمنگ پولز، گیم زونز، ریسٹ رومز، کیسینوز، ریڈنگ رومز اور ایسی ہی دیگر...... بے شمار سہولیات میسر ہیں۔ تم جب اپنے کمرے سے نکل کر اس کروز کی سیر کرو گے تو تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ ایسی رنگینی، تازگی اور گلیمر تم نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا......"

"تم مجھے قاہرہ اور پورٹ سعید کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے۔" جاسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"میں اسی طرف آ رہا تھا......" ڈیوڈ نے متحمل انداز میں کہا۔ "یہ کروز شپ پچھلی رات دس بجے استنبول کے "پورٹ آف حیدر پاشا" سے روانہ ہوا تھا۔ انیس گھنٹے میں ہم آبنائے باسفورس، بحیرۂ مرمرا، ڈارڈنیلس چینل، بحیرۂ ایجہ کو عبور کر کے بحیرۂ روم میں داخل ہو گئے ہیں۔ ابھی بحیرۂ روم میں اکیس گھنٹے کا سفر باقی ہے۔ ہم کل پیر کی دوپہر دو بجے تک مصر کی ایک معروف بندرگاہ "پورٹ آف سعید" پہنچیں گے۔ پورٹ سعید سے بہ ذریعہ جیپ تمہیں کائرو (قاہرہ) پہنچایا جائے گا۔ پورٹ سعید پر میرے بندے تمہیں پک کر لیں گے۔ اگلے روز یعنی منگل انیس تاریخ اس ری ایلیٹی ٹی وی شو کی افتتاحی تقریب...... ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد کی جائے گی۔"

"تم نے دو تین بار جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔" جاسم نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "کیا تم بھی اس شپ پر سوار ہو؟"

"جب تک تم کام سے نہیں لگ جاتے، میں تمہارے انتہائی قریب موجود رہوں گا۔" ڈیوڈ نے گول مول جواب دیا۔

"میں تمہاری بات کا کیسے یقین کرلوں......" جاسم نے شاکی لہجے میں کہا۔ "کراچی میں تم نے کہا تھا کہ استنبول میں ملاقات ہوگی مگر تم نے وعدہ ایفا نہیں کیا......"

"اگر تم بن عرفات کے ساتھ بدتمیزی بلکہ بدمعاشی سے پیش نہ آتے تو میں ضرور اپنا وعدہ پورا کرتا۔" ڈیوڈ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "میں جب فون بند کروں گا تو تم اکیس گھنٹے کے لیے بالکل آزاد ہو گے یعنی جب تک یہ کروز شپ پورٹ آف سعید نہیں پہنچ جاتا۔ تمہارے بیڈ کے نیچے ایک ہینڈ بیگ رکھا ہوا ہے جس میں تمہارے سیل فون کے علاوہ چند اور چیزیں بھی ہیں۔ قاہرہ پہنچنے تک تم جسے چاہو، کال کر سکتے ہو۔ جس سے چاہے، مل سکتے ہو یعنی اس شپ پر اور اگر مجھ سے ملنے کا بہت زیادہ شوق چڑھا ہوا ہے تو اپنے کمرے سے نکلو اور مجھے تلاش کرو۔ تمہارے کمرے کے اندر کھانے پینے کا اچھا خاصا سامان موجود ہے۔ اگر یہ پسند نہ آئے تو شپ کے کسی ریسٹورنٹ میں جا کر پیٹ پوجا کر لینا۔ اس کروز شپ پر عیش و عشرت کا تمام اعلیٰ معیاری سامان موجود ہے۔ یہ حسین، نمکین، رنگین، اور سنگین لمحات اگر اچھے نہ لگیں تو پھر تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے......" ڈیوڈ نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سفاک لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تم واقعتاً جینے کا حق کھو بیٹھو تو چپ چاپ سمندر میں کود جانا۔ اس طرح ہمارے ری ایلیٹی ٹی وی کا نہ سہی مگر میڈیٹیرینین سی میں پائی جانے والی مچھلیوں کا ضرور بھلا ہو جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔ جاسم نے غصیلی نظر سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیل فون کو گھورا پھر اسے اس روم کی چوبی دیوار پر دے مارا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا چشمِ تصور میں اس نے اس سیل فون کو ڈیوڈ کے اَن دیکھے تھوبڑے پر مارا ہو......!

ڈیوڈ جاسم کے ساتھ ایسے ہی کھیل رہا تھا جیسے کوئی ماہر شکاری اپنے شکار کے ساتھ......!

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس
داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے
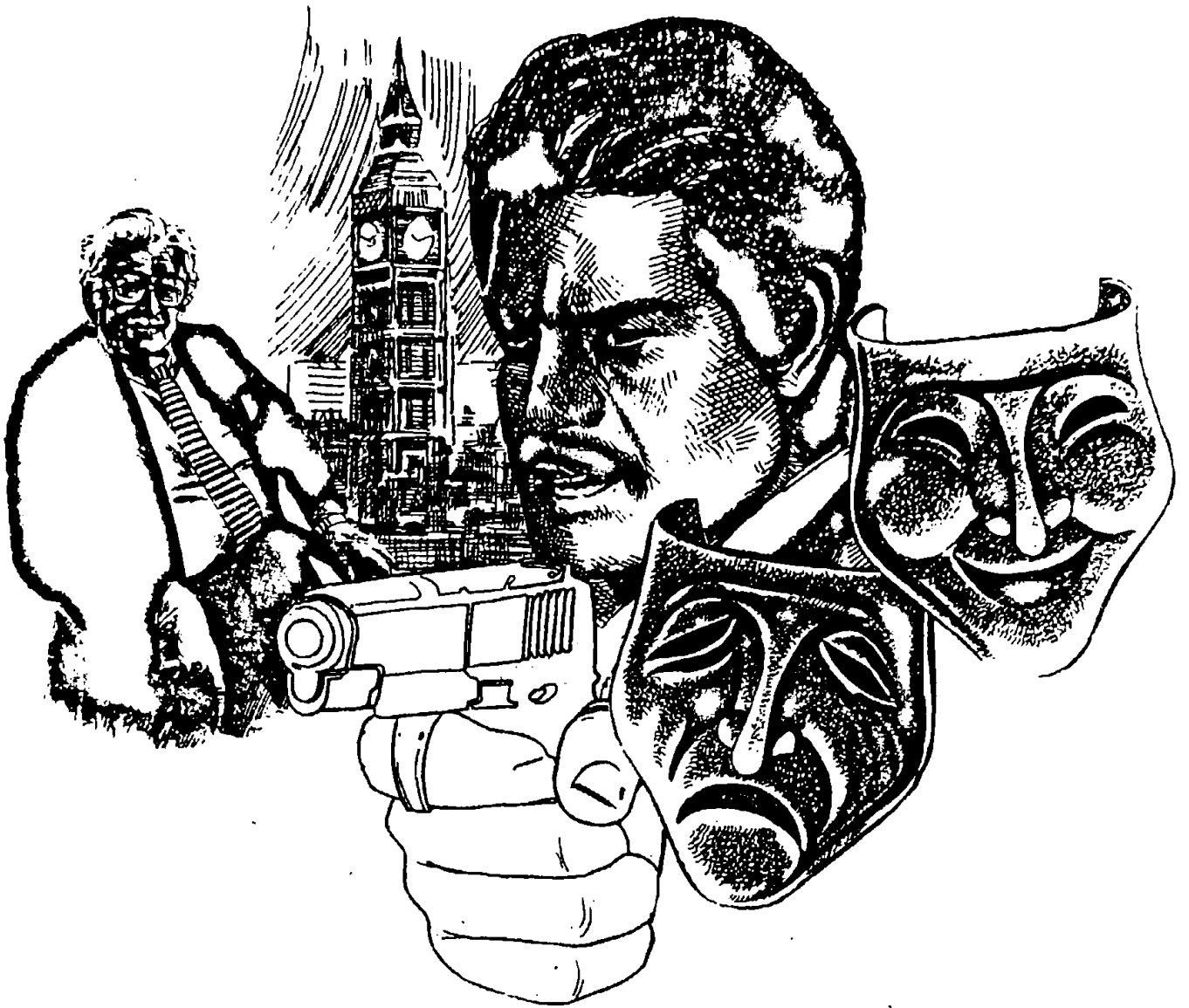
فنکار

عائشہ نصیر

اپنی کمان میں ایک زیادہ تیر رکھنا ہمیشہ بہتر ہوتا ہے... اسے یہ بات دیر سے پتا چلی... مگر ابھی وقت اس کے ہاتھوں میں تھا... اس نے یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لی... ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا... جسے اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا...

ایک ہی وقت میں دو مختلف کردار نبھانے والے فنکار کی فنکاریاں......

ایک اداکار کے طور پر کیتی ماؤنٹ فورڈ کی خواہش تھی کہ وہ کچھ سنجیدہ کام کرے۔ کچھ ایسا جو اُسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے۔ ڈراما اسکول سے فارغ ہونے کے بعد، اس نے کچھ عرصہ تھیٹر کیا لیکن زیادہ تر ٹیلی ویژن، جو اس کے لیے اس لحاظ سے اچھا تھا کہ اس میں معاوضہ ٹھیک ٹھاک ملتا تھا۔ تاہم کچھ عرصے بعد دی بل، ہارٹ بیٹ، اور مڈسمر مرڈرز میں اس کا کردار ختم کر دیا گیا۔ وہ اب تیس کا ہونے کو تھا اور شدید عدم اطمینان کا شکار تھا۔ وہ خود کو دیکھتا اور سوچتا کہ یہ وہ مشہور شخصیت

تونہیں تھی جس کی اس نے ہمیشہ تمنا کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جب بھی بات اس کے پیشے کی سچائی اور کاملیت پر آئے، دوسرے اداکاروں کے درمیان اس کا سر اونچا ہو۔

وہ اب واقعی تھیٹر کرنا چاہتا تھا۔ تھیٹر کا کام جتنا مشکل اور پیچیدہ ہوتا ہے اس کے اداکار اتنے ہی کامل اور فن کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد در حقیقت، رجحان ساز ڈائریکٹرز کی ایک چھوٹی سی فہرست میں سے کسی ایک ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرنا تھا جنھوں نے اپنے کام کو قابل رسائی یا محض تفریحی بنا کر عوام کے سامنے پیش نہیں کیا۔ چنانچہ کینی ماؤنٹ فورڈ ایسے ڈائریکٹر سے ملنے اور اپنے آپ کو کسی قابل ثابت کرنے کی مہم پر لگ گیا۔ ویسے بھی ایک کامیاب سٹ کام پر بارمین کا کردار ادا کرنے سے اس کی آمدنی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس نے اپنے ناٹنگ ہل کے گھر کا قرض بھی ادا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ، اس کی اداکارہ گرل فرینڈ، لیسلی جین والڈن جو اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک طویل عرصے سے چلنے والے سوپ اوپیرا میں ایک ویمپ کا رول پلے کر رہی تھی...... اس لیے اس کی طرف سے بھی کینی مطمئن تھا کہ کم سے کم پیسوں کے معاملے میں وہ فی الوقت اسے پریشان نہیں کرے گی، لہٰذا کینی ماؤنٹ فورڈ ایسی پوزیشن میں تھا جہاں وہ صرف اور صرف آرٹ کی خاطر آگے بڑھنے کا متحمل ہو سکے۔

برٹش تھیٹر کا سب سے جانا مانا ڈائریکٹر چارلی فینٹن تھا۔ دوسرے کامیاب ڈائریکٹرز کی طرح وہ بھی کافی خود پرست اور سنکی تھا۔

جس چیز کے لیے وہ مشہور تھا وہ تھا کردار نگاری کے لیے اس کا پاگل پن کی حد تک مختلف نقطۂ نظر...... اگرچہ "میتھڈ" کے بانی، لی اسٹراسبرگ کے نیویارک میں کام کو تسلیم کرنے کے باوجود چارلی اسے اپنا طریقہ قرار دیتا تھا۔

یہ اداکاری کا ایک انداز تھا جس کا مقصد زیادہ صداقت تھی، لی اسٹراسبرگ کے میتھڈ کو اپنانے والوں میں ال پچینو، میریل اسٹریپ، پال نیومین، رابرٹ ڈی نیرو، اور یہاں تک کہ حیرت انگیز طور پر، مارلن منرو بھی شامل تھی۔

اوپر اوپر سے اپنا کردار نبھانے کے بجائے ایک "میتھڈ ایکٹر" اس شخص کی شناخت اوڑھ کر عملی طور پر وہی شخص بن جاتا ہے جس کا کردار وہ ادا کر رہا ہو۔

تو اگر کوئی ایکٹر چارلی فینٹن کی پروڈکشن میں گوالے کا رول کر رہا ہوتا تو چارلی اسے تین مہینوں تک دودھ سپلائی کرنے کے کام پر لگا دیتا۔ ایک طوائف کا کردار ادا کرنے والی اداکارہ کو کنگز کراس کے آس پاس کی گلیوں میں چالیس چلنی پڑتیں (اور تقریباً یقینی طور پر چارلی فینٹن کی خدمت بھی، تاکہ وہ چیک کر سکے کہ وہ یہ ٹھیک کر رہی ہے یا نہیں)۔ اور ایک غریب نے تو اپنے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تین مہینے ایک تہ خانے میں آنکھوں پر پٹی باندھے یرغمالی بنے ہوئے گزارے۔ (حالانکہ چارلی نے تین ہفتے بعد ہی اپنے اس آئیڈیے کو ترک کر دیا تھا مگر کسی وجہ سے وہ اس ایکٹر کو مطلع نہ کر سکا)

ایک بار جب اس کی کاسٹ اپنے کرداروں میں غرق ہو جاتی، تو ریہرسل رومز میں کئی ہفتوں تک اصلاحی عمل شروع ہو جاتا، جب تک کہ ہدایت کار اس میں ترمیم نہ کرتا۔ پلے مکمل ہونے کے بعد اداکاروں کے خطوط اور تاثرات پر مبنی کتاب شائع کی جاتی جس کی رائلٹی چارلی فینٹن کی ہوتی۔

ان کے ریہرسل کے طریقوں کو منظر عام پر نہ لانے کی احتیاط بھی چارلی کو مزید پُراسرار بناتی تھی...... اور بہت کم لوگ جانتے تھے کہ چارلی فینٹن کے اس طویل المدتی پروجیکٹس کا تھیٹر کے معیار سے کوئی تعلق نہیں تھا یہ تو بس دیگر ڈائریکٹرز کے مقابلے خود کو ممتاز اور منفرد دکھانے کا ایک طریقہ تھا۔ ڈائریکٹر کے اسی طریقہ کار، اور انفرادیت نے تھیٹر میں کامیابی کی تلاش میں آنے والے ہر ایکٹر کو اس کا معتقد بنا دیا تھا۔

اور ایسا ہی کچھ کینی ماؤنٹ فورڈ کے ساتھ بھی تھا۔ وہ پہلی بار نیشنل تھیٹر کنگ لیئر کی پہلی رات ملے۔ یہ ڈراما واقعی کوئی سطحی سا تفریحی ڈراما نہیں تھا، لیکن جین کچھ مایوس تھی۔ ایسے مواقع پر وہ ہمیشہ بجلیاں گراتی فوٹوگرافرز اور پاپارازیوں کے نرغے میں رہنے کی خواہش کرتی تھی...... مگر آج اتنا ہجوم نہیں تھا جتنا اس نے سوچا تھا۔

جیسے ہی پلے ختم ہوا، چارلی فینٹن بار میں اپنے چمچوں کے درمیان گھرا ہوا نظر آیا اور ظاہر ہے ان میں سے زیادہ تر وہی تھے جو چارلی کے ساتھ کام کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔

کینی اور جین اپنے ایک اداکار دوست کے ساتھ آئے تھے جس نے ایک بار ٹماٹر چننے اور پولش سیکھنے میں چھ مہینے گزارے تھے تاکہ تارکینِ وطن کارکنوں کے بارے میں چارلی فینٹن کی پروڈکشن میں حصہ لے سکے۔ ان کے دوست نے چارلی سے ان کا تعارف کروایا۔

چارلی نے پہلی توجہ جین کو دی...... "میں نے تمہارا کام دیکھا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ سوپ اوپیرا کی گندگی کے درمیان بھی اتنی خوبصورت اداکارہ موجود ہے۔"

اس پر جین شرما گئی۔

"جین والڈن کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ وہ اتنی

خوبصورت اور باصلاحیت ہے کہ اپنا ہر کردار نہایت عمدگی سے نبھاتی ہے۔'' کینی نے بھی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھا۔

اگر چارلی فینٹن نے سوپ اوپیرا میں اس کی گرل فرینڈ کے کام کے معیار کو تسلیم کیا تھا، تو وہ سٹ کام میں اس کے کام کو بھی اتنا ہی سراہ سکتا ہے۔ کینی نے سوچا لیکن چارلی نے اس کے اس وہم کو زیادہ دیر قائم نہیں رہنے دیا۔ وہ اپنے چشمے کی اوٹ سے اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''اوہ ہاں، میں تمہارا نام جانتا ہوں۔ تم بھی ٹیلی ویژن پر کوئی سٹ کام کرتے ہو ناں؟''

''ہاں۔'' کینی نے جواب دیا۔ ''لیکن میں سمت بدلنے ہی والا ہوں۔''

''کس طرف؟''

''کچھ سنجیدہ...... تھیٹر کی طرف۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ ہاں؟'' ڈائریکٹر نے طنز کیا۔ ''سب یہی کہتے ہیں۔''

''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ......''

''کینی، مجھے نہیں لگتا کہ تم تھیٹر کے کام کے لیے موزوں ہو۔ واضح طور پر تمہیں پیدائش سے ہی اچھی تنخواہ والی اعتدال پسند زندگی کے لیے بنایا گیا ہے۔'' چارلی کا انداز کینی کو پسند نہیں آیا۔

''میں متفق نہیں ہوں۔ میں حقیقی طور پر زیادہ سنجیدہ کام کرنے کے لیے پُرعزم ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''واقعی؟'' چارلی نے اسے کسی حد تک حقارت بھری نظروں سے جانچا۔ ''میں نہیں سمجھتا تم کر پاؤ گے۔''

''آپ مجھے آزما سکتے ہیں۔''

چارلی فینٹن ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرا طریقہ کار پسند نہیں آئے گا۔''

''کیا آپ مجھے اپنے ساتھ کام کی پیشکش کر رہے ہیں؟'' کینی پُرجوش ہوا۔

''میں کرتا اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم اس کے اہل ہو۔''

''میں دوبارہ کہتا ہوں۔ مجھے آزمائیں۔'' کینی کا انداز اکسانے والا تھا۔

ایک بار پھر خاموشی چھائی۔ چند لمحوں بعد چارلی نے اعلان کیا۔ ''میں ایک نئے پروجیکٹ پر کام شروع کر رہا ہوں، لندن میں جرائم پیشہ گروہوں کے بارے میں۔''

''اس میں ایکٹرز کے لیے کیا شامل ہوگا؟''

''گہرا مشاہدہ۔ گروہوں میں دراندازی۔'' چارلی نے وضاحت کی۔

کینی، جین کے سر کے ہلکے سے انتباہی اشارے سے واقف تھا، لیکن اس نے اسے نظرانداز کر دیا۔

''میں اس کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہیں مزید تفصیلات کے لیے فون کروں گا۔''

''کیا میں آپ کو اپنا موبائل نمبر دوں؟'' کینی اتنا پُرجوش پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

''لینڈ لائن...... میں موبائل استعمال نہیں کرتا۔'' سنکی پن کی ایک اور علامت، اس نے کیسلی جین کی طرف ایک فدویانہ مسکراہٹ دی، پھر کینی کی جانب متوجہ ہوا۔ ''اگر تم تین ماہ بعد میرے پاس لندن گینگ کے ایک رکن کے طور پر آئے تو میں تمہیں اپنے نئے شو میں کاسٹ کرلوں گا۔''

کینی ماؤنٹ فورڈ مسکرایا۔ ''آپ ضرور کریں گے۔''

☆☆☆

جین اس آئیڈیے سے زیادہ خوش نہیں تھی، اگر کینی انڈرگراؤنڈ جا رہا تھا، تو ظاہری بات تھی کہ وہ اسے پریمیئرز میں نہیں لے جا سکے گا، اس کے اپنے کام کی صورتِ حال بھی نازک تھی۔ سوپ اوپیرا میں نوجوان خواتین کے کرداروں کی زندگی مختصر تھی۔ اسکرپٹ رائٹرز میں سے ایک نے پہلے ہی اشارہ کیا تھا کہ اس کے کردار کو ایک مہلک کار حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ یہ اعلان کرنے سے پہلے اور فینز کو یہ خبر سنانے سے پہلے کہ وہ شو چھوڑ رہی ہے یا اس کا کردار ختم کر دیا ہے اسے آگے بڑھنے کے لیے ایک اور سیریز کی ضرورت ہوگی، جبکہ فی الحال ایسی کسی پیشکش کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ایسے وقت میں وہ لامحالہ کینی کی شہرت پر انحصار کرتی۔ (اس نے ہمیشہ شو بزنس کے اس مقولے پر عمل کیا تھا: اگر آپ خود مشہور نہیں ہو سکتے، تو کسی ایسے شخص کے ساتھ بستر پر جائیں جو مشہور ہو) مگر یہاں کینی خود کو گینگ لینڈ کلچر میں غرق کر رہا تھا۔ اس نے یکسر نظرانداز کر دیا کہ جین اس سے کیا چاہتی تھی۔

کینی کا ذہن اب صرف ایک چیز پر مرکوز تھا اور وہ تھا چارلی فینٹن کو بطور اداکار اپنی سنجیدگی ثابت کرنا۔ اور ایسا کرنے کے لیے اسے لندن کے ایک گینگ میں گھسنا پڑا جو حیرت انگیز طور پر اس کی اُمید سے زیادہ آسان نکلا۔ اسے زیادہ دیر تک شیفرڈز بش گرین میں گھومنے کی ضرورت نہیں پڑی اس سے پہلے کہ وہ بھاری روسی لہجے کے ساتھ کسی سے رابطہ کرتا اور پوچھتا کہ کیا وہ منشیات خریدنا چاہتا ہے۔ ہیروئن کی باقاعدگی سے خریداری کرنے کے چند ہفتوں کے بعد (جسے اس نے استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اپنے باتھ روم کے کیبنٹ میں ذخیرہ

کرلیا تھا) اسے صرف دو بار ادائیگی میں آنا کانی کرنی پڑی اور تنظیم کے لوگ اسے بند کھڑکیوں والی کار میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے گئے۔

انہیں اپنے پیسے حاصل کرنے کے لیے اسے تکلیف نہیں پہنچانی پڑی تھی۔ کینی نے نقد رقم اپنے پاس پہلے سے تیار کر رکھی تھی اور جیسے ہی اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی اس نے اسے ان کے حوالے کر دیا۔ یہ تہ خانے جیسا کمرا تھا جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور اسے کرسی پر ہاتھ پیچھے باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔ اس کے سر پر دو باڈی بلڈر ٹائپ کے رشین کھڑے تھے اور ایک مہنگے سوٹ میں ایک پتلے چہرے والا آدمی اس کے سامنے تھا۔

کار میں ان کی گفتگو سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کے اغوا کاروں کو واسیلی اور ولادیمیر کہا جاتا تھا۔ انہوں نے پتلے چہرے والے آدمی کو فیوڈور کہہ کر مخاطب کیا۔ تینوں بھاری لہجے کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔

''تو اگر تمہارے پاس پیسا تھا تو تم نے وقت پر ادائیگی کیوں نہیں کی؟'' سوٹ میں ملبوس شخص نے اس سے پوچھا، جس کا حاکمانہ طرزِ عمل اسے گینگ کا سرغنہ بتا رہا تھا۔

''شاید اسے مار کھانے میں مزہ آتا ہو۔'' اس بھاری وجود والے نے اسے گھورتے ہوئے کہا جس کے بارے میں کینی کو یقین تھا کہ اسے واسیلی کہا جاتا ہے۔

''ہوسکتا ہے۔'' کینی نے خود کو ٹھنڈا رکھا آخر کار اس نے ڈراما اسکول میں تین سال گزارے تھے۔ ''لیکن حقیقت میں یہ وجہ نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ تم سے ملنے کا ایک اچھا طریقہ ہے، فیوڈور۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟'' پتلے چہرے والا آدمی ایک دم چونک گیا۔

''میں صرف تمہارا نام جانتا ہوں، لیکن یہ اندازہ لگانے کے لیے زیادہ ذہانت کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہارا رینک اس تنظیم میں ان دو غنڈوں سے زیادہ ہے جو مجھے یہاں لائے ہیں۔'' کینی نے محسوس کیا کہ اس کے دونوں اطراف میں کھڑے دیوؤں کو اس کی بات بُری لگی تھی...... وہ اس کی طرف بڑھے مگر فیوڈور نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں پُرسکون رہنے کو کہا۔

''یہ سچ ہے۔ میں تنظیم کو کنٹرول کرتا ہوں۔''

''اور کیا مجھے یہ جاننے کی اجازت ہے کہ اس تنظیم کا نام کیا ہے؟'' اس نے دوستانہ انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔

''سمفر و پول بوائز۔ جہاں سے ہم نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ تم جانتے ہو سمفر و پول کہاں ہے؟'' فیوڈور پوچھ رہا تھا۔

کینی نے سر ہلایا۔ ''یہ کریمیا میں ہے۔ جنوبی یوکرین۔ یالٹا کے قریب۔ تم وہاں کام نہیں کرتے؟''

''ہم وہاں پر جو کچھ کر سکتے تھے وہ ہم نے کیا، لیکن وہاں ماحول سازگار نہیں تھا۔ لندن میں ہماری زندگی آسان ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''اور سمفر و پول بوائز میں بوائز کتنے ہیں؟''

''بیس، شاید تیس، یہ منحصر ہے۔ بعض اوقات لوگ ناقابلِ اعتماد ہو جاتے ہیں اور انہیں ختم کرنا پڑتا ہے۔''

کینی نے اس بات پر واسیلی اور ولادیمیر کے چہروں پر پُرلطف مسکراہٹ دیکھی۔ واضح طور پر یہ خاتمہ ان کے کام کا حصہ تھا جس سے وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔

''اور کیا تم صرف منشیات کا کاروبار کرتے ہو؟''

فیوڈور نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''منشیات...... جسم فروشی...... قرضوں کی وصولی...... دی سمفر و پول بوائز ملٹی فنکشن آرگنائزیشن ہے۔''

پھر اس کی طرف سے یہ سوال آیا اور کینی کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر وہ یہ سوال پوچھے گا۔ ''مگر تم یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟ تجسس؟''

''نہیں...... تجسس سے کچھ زیادہ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر یہ محض تجسس ہے تو میرے خیال میں واسیلی اور ولادیمیر کو فوراً تمہیں ختم کرنا پڑے گا۔'' گینگ باس نے اسے خوفزدہ کرنے والی ہلکی سی مسکراہٹ دی۔ ''تمہاری پوچھ گچھ کی وجہ کچھ بھی ہو۔ تم ایک پولیس والے ہو سکتے ہو۔''

''میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ میں پولیس والا نہیں ہوں۔'' کینی بالکل نہیں گھبرایا۔

''تم تب بھی یہی کہتے اگر تم پولیس والے ہوتے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن میں نہیں ہوں۔'' اسے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ واقعی پولیس والا نہیں تھا۔

''مسٹر ماؤنٹ فورڈ، میں یہاں تمہارے ساتھ وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ میں ایک معروف آدمی ہوں۔'' فیوڈور نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''میری جلد ہی ہوم آفس میں ایک سینئر سول سرونٹ سے ملاقات ہے۔ وہ سمفر و پول میں میرے خاندان کے افراد کے لیے کچھ ویزا اور خواستوں میں میری مدد کر رہا ہے۔ اب برائے کرم، کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تم یہاں

کیوں ہو؟ یا پھر میں تمہیں سیدھے واسیلی اور ولادیمیر کے حوالے کردوں؟''

کینی نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے خود کو حقیقی خطرے میں ڈال دیا تھا لیکن، جیسا کہ اس کے پاس یہ تسلی آمیز سوچ تھی کہ چارلی فینٹن اس کی لگن اور اپنے کردار سے انصاف کرنے کے لیے اس کی اس حقیقی جستجو سے بہت متاثر ہوگا۔

''میں یہاں اس لیے ہوں کیونکہ میں تمہارے گینگ میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔''

''سمفر ڈپول بوائز میں؟'' فیوڈور نے حیرت سے پوچھا۔

واسیلی اور ولادیمیر اس بات پر قہقہے لگانے لگے۔

''ہاں۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

''لیکن میں تمہیں اپنے گینگ میں کیوں شامل کروں؟ جیسا کہ میں نے کہا، تم پولیس کے جاسوس ہو سکتے ہو۔ صحافی ہو سکتے ہو۔ تم اوڈیسا ریڈرز کے جاسوس بھی ہو سکتے ہو۔'' اوڈیسا ریڈرز شاید ان کا حریف گینگ تھا۔

''تو میں کیسے ثابت کروں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں؟ تمہارے گینگ میں شامل ہونے والے زیادہ تر لوگوں کے لیے کیا اہلیت ہوتی ہے؟''

''ان میں سے زیادہ تر کے میرے ساتھ سمفر ڈپول میں خاندانی روابط ہیں جو کئی نسلوں پرانے ہیں، ان میں سے زیادہ تر یوکرائنی ہیں۔''

''میں یوکرائن لہجے میں بول سکتا ہوں۔'' کینی نے یوکرائنی لب و لہجے میں یہ بات کی تھی (اس نے ڈراما اسکول میں لہجوں کا کافی مطالعہ کیا تھا)

اس کا تاثر واسیلی اور ولادیمیر پر اچھا نہیں پڑا۔ انہیں لگا وہ ان کے لہجوں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ان کے ہاتھ اس کے کندھوں پر آ کر ٹھہر گئے مگر ایک بار پھر فیوڈور کے اشارے نے انہیں دور ہٹنے پر مجبور کیا۔

''جو بھی سمفر ڈپول بوائز میں شامل ہونا چاہتا ہے، اسے کچھ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، کچھ ٹیسٹ دینے پڑتے ہیں۔'' وہ اسے جانچ رہا تھا۔

''ٹیسٹ؟'' کینی نے بڑی مشکل سے اپنی بے چینی پر قابو پایا۔

گینگ باس نے سر ہلایا۔ ''بڑا اور فائنل ٹیسٹ آخر میں ہوگا۔ ابھی تمہیں اپنا پہلا ٹیسٹ دینا ہوگا...... اگر تم یہ کر سکے۔''

''میں کروں گا۔'' کینی نے بے تابی سے اس کی بات کاٹی۔

فیوڈور آگے جھک کر اسے بتانے لگا کہ اس کا پہلا ٹیسٹ کیا ہوگا۔

☆☆☆

زیادہ تر اداکاروں کی طرح، کینی ماؤنٹ فورڈ بھی ہمیشہ نیا رول ملنے پر جوش اور ہیجان کا ایک طوفان اپنے اندر محسوس کرتا تھا۔ رول اگرچہ معمولی ہی کیوں نہ ہوتا، کردار کے لہجے اور باڈی لینگویج کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے، اسکرپٹ کو چھیڑنے میں وہ گھنٹے صرف کرتا۔

فیوڈور نے اسے جو رول دیا تھا وہ بالکل ویسا ہی ہیجان خیز تھا، حالانکہ اس پر کام کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اسکرپٹ نہیں تھا۔ کینی نے کریمیا کے علاقے اور خاص طور پر سمفر ڈپول کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس نے انگریزی بولنے والے یوکرینیوں کی ریکارڈنگز کا بھی پتا لگایا اور ان کے لہجے اور انداز کو نقل کرنے کی مشق کرتا رہا۔

اس کا کیریئر جو نئی کروٹ لے رہا تھا وہ جین میں زیادہ جوش ابھارنے میں ناکام رہا۔ ابتدائی عمر سے ہی، زندگی میں جین کا بنیادی مقصد توجہ کا مرکز بننا تھا، اس لیے اس نے اس شخص کی طرف سے مکمل طور پر نظرانداز کیے جانے کا اچھا جواب نہیں دیا جس کے ساتھ وہ رہ رہی تھی لیکن کینی اپنے نئے کردار میں اتنا مصروف تھا کہ اس کی پریشانی کو محسوس نہیں کر سکا۔

فیوڈور نے جو پہلا امتحان دیا تھا وہ نسبتاً آسان تھا۔ اسے صرف شیفرڈز بش میں منشیات بیچنا تھی، بالکل اس ڈیلر کی طرح جس نے سمفر ڈپول بوائز سے اپنے ابتدائی تعارف کے طور پر یہ کام کیا تھا۔

اس محنت کے علاوہ جو وہ اپنے لہجے پر کر رہا تھا، کینی نے اس کردار کے لیے کپڑوں کی فراہمی میں بھی کافی وقت صرف کیا، اور وہ مطمئن تھا کہ جس ہُڈی، جینز، اور ٹرینرز کے ساتھ اس نے یہ ٹیسٹ دیا، وہ بالکل مطلوبہ حد تک ان کی شباہت حاصل کر چکا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے کافی راحت کا سبب تھی کہ وہ اپنے کپڑے خود منتخب کر رہا ہے، بجائے اس کے کہ وہ ٹیلی وژن کے کسی ڈیزائنر کی خواہشات کی پیروی کرے۔ حالانکہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس قسم کے رول کے لیے وہ یہ سب کر رہا تھا اس میں ''لک'' کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ بس اسے ایک یوکرینی غنڈا نظر آنا تھا۔ مگر کینی ماؤنٹ فورڈ کا خیال تھا کہ بطور فنکار...... اور چارلی فینٹن کی پروڈکشن میں ممکنہ رول کے لیے ضروری تھا کہ وہ چھوٹی سی چھوٹی بات کا

بھی دھیان رکھتا۔

☆☆☆

اس دن وہ اپنا پہلا کامیاب امتحان دے کر گھر آیا تو دلکش سے ایوننگ گاؤن میں ملبوس جین نے اسے دیکھتے ہی چیخ ماری۔

”کہاں تھے تم، تمہیں پتا بھی ہے آدھے گھنٹے میں ہمیں ٹام کروز کی فلم کے پریمیئر کے لیے نکلنا ہے۔“

”اوہ سوری، میں بھول گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، اب خدا کے لیے کچھ ڈھنگ کا لباس پہن کر اپنا حلیہ درست کرلو۔ پہلے ہی دیر ہورہی ہے۔“ وہ سخت بیزار لگ رہی تھی۔

”میں چینج نہیں کروں گا۔“ کینی نے پہلے اس خیال کو حقیقتاً باضابطہ طور پر نہیں اپنایا تھا، لیکن اسے اچانک ہی محسوس ہوا کہ اسے اس وقت تک حلیہ نہیں بدلنا چاہیے جب تک کہ چارلی فینٹن اسے اپنی اگلی پروڈکشن میں رول دینے پر راضی نہ ہوجائے۔ وہ اس شاندار لمحے تک سمفرو پول بوائے کے کردار میں خود کو غرق کرنے والا تھا۔

اس نے اپنے بہترین یوکرائنی لہجے میں مزید کہا۔”اور میرا ذہن بدلنے کی کوشش نہ کرو۔“

”یہ تم کس بے ہودہ انداز میں بات کررہے ہو اور اتنی احمقانہ آواز کیوں نکال رہے ہو؟“ جین مزید غضبناک ہوئی۔”اگر ہم اگلے پانچ منٹ میں نہیں نکلے۔ تو ہم تمام پاپرازیوں کو مس کردیں گے۔ اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں ٹام کروز کے پریمیئر میں ایسے گھٹیا حلیے کے مالک شخص کے ساتھ نظر آنا چاہوں گی۔“ اس کا چہرہ غصے سے اتنا بگڑ گیا تھا کہ اب وہ ذرا بھی خوبصورت نظر نہیں آرہی تھی۔

”سنو۔“ کینی نے اپنی یوکرائنی آواز میں بات جاری رکھی۔”میرے پاس کرنے کے لیے اس سے زیادہ اہم کام ہیں۔“ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

جین نے نفرت سے اس سے منہ موڑلیا۔

کینی نے ریسیور اٹھایا تو لائن کی دوسری طرف سے خمار آلود ”ہیلو“ کہا گیا۔ آدمی کی آواز مبہم طور پر جانی پہچانی تھی، لیکن کینی فوری طور پر اس کی شناخت نہیں کرسکا۔

”ہیلو۔“ اس نے جواب دیا، ویسے ہی یوکرینی لہجے میں۔

آواز کا خمار ایک پل میں اڑن چھو ہوا تھا۔ اور اب اس کی جگہ شک نے لے لی۔”کون بول رہا ہے؟“

اور ادھر کینی اچھل پڑا۔”چارلی۔“ اس نے پُرجوش ہو کر اپنی عام آواز کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔”تمہاری آواز سن کر کتنا اچھا لگا۔“

چارلی فینٹن کی گہری سانس سنائی دی۔”اوہ......تم کینی ہو؟“

”ہاں۔ مجھے لگا تم تین مہینوں تک مجھ سے رابطہ نہیں کرو گے؟“

چارلی کا انداز اب بھی معمول کی طرح پُراعتماد نہیں تھا، ایک پل کے لیے تو وہ ہکلا گیا۔”اوہ، میں بس...... میں ام......“ پھر اپنا لہجہ سنبھالتے ہوئے بولا۔”میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اپنے درانداز کے عمل کو کیسے آگے بڑھا رہے ہو۔“

”میں نے ایک گینگ کے لیے کام کرنا شروع کردیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”یہ اچھا ہے۔“ چارلی کی آواز حوصلہ افزائی سے عاری تھی۔

”وہ یوکرائنی ہیں۔“ اس نے اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے دوبارہ یوکرینی لہجے میں بولنا شروع کیا۔”اور، یہ اچھا ہی ہوا کہ تم نے کال کی کیونکہ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں......تمہارے خیال میں مجھے اس کردار میں کتنا گہرا جانا چاہیے جو میں ادا کررہا ہوں؟“

”جتنا گہرا ممکن ہے، کینی۔“ ڈائریکٹر کا پرانا پُراعتماد انداز لوٹ آیا۔”میرے پروڈکشن میں کام کرنے والے ایکٹرز کو کردار کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ کہا۔“ کینی کا دل بلیوں اچھلا۔”کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے واقعی اپنے گھر میں رہنا چاہیے۔ مطلب ایک یوکرینی گینگسٹر میرے نوٹنگ ہل کے گھر جیسے گھر میں نہیں رہے گا، ہے نا؟“

”بالکل، وہ یقینی طور پر نہیں رہے گا۔“ چارلی نے پُرزور تائید کی۔

”تو تمہیں لگتا ہے کہ مجھے اپنے گھر سے نکل جانا چاہیے؟“ اس نے یقین دہانی چاہی۔

”یہ اس کردار کی ڈیمانڈ ہے کینی......اور تمہیں یہ کرنا ہی پڑے گا۔“ چارلی نے جواب دیا۔

☆☆☆

کینی نے گولڈ ہاک روڈ کے قریب ایک تہ خانے میں ایک گندا سا کمرا کرائے پر لیا اس نے سوچا کہ وہ اب بینی ماؤنٹ فورڈ نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنی نئی شخصیت کے ساتھ ایک نئی شناخت، نئے نام کی ضرورت ہوگی۔

اس نے یوکرین کے ناموں پر واسیلی اور ولادیمیر سے مشورہ کیا اور ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے، اپنا نام اناتولی سیمیونوف رکھ دیا۔ اس نے خود کو میڈیا سے بھی دور کرلیا۔ اس نے ٹیلی ویژن دیکھنا چھوڑ دیا۔ اس نے یوکرین کے اخبار خریدے، جن میں پہلے تو وہ حروف تہجی کو بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

اس دوران فیوڈور کے طے کردہ مراحل سخت ہوگئے۔ ڈیلنگ کے اوپری حصے میں، کینی کو اب واسیلی، ولادیمیر، اور دیگر سمفر وپول بوائز کے ساتھ کچھ کام کرنا تھا۔ منشیات کے وہ گاہک جو ادائیگی نہیں کررہے تھے، دلال جو طوائفوں سے زیادہ حصہ لینے کی کوشش کرتے...... ان کو سبق سکھانے کے لیے دھمکی آمیز رویہ، اور ایک خاص حد تک تشدد۔ ایسے حالات میں، جیسا کہ منشیات کے کاروبار کے معاملے میں، کینی یا اناتولی نے وہی کیا جو اس سے مطلوب تھا۔ اس کے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے وہ غیر قانونی ہے اور اگر وہ پکڑا گیا تو اسے ایک طویل عرصے کے لیے جیل ہوسکتی ہے۔

کینی ماؤنٹ فورڈ اداکاری کررہا تھا، وہ اناتولی کے کردار پر تحقیق کررہا تھا۔

کبھی بھولے بھٹکے یہ خیالات اس کے ذہن میں آتے بھی تو وہ خود کو سمجھاتا کہ اخلاقیات چھوٹے ذہنوں کے لیے تھی...... فن اس سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

جیسے جیسے وہ اپنے سمفر وپول بوائے کے غلاف میں گم ہونا شروع ہوا، جین سے اس کی دوریاں بڑھتی گئیں۔ وہ اپنے کام کے طور پر جس چیز کو دیکھتا تھا اس پر اس کی توجہ اس قدر مرکوز تھی کہ اس کے دماغ میں دوسرے خیالات کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

واسیلی، ولادیمیر اور کچھ دوسرے لڑکوں کے ساتھ ایک شام جب وہ ایک کلب کے مالک سے وصولی کرکے آئے تو فیوڈور کافی خوش ہوا۔

"مجھے لگتا ہے جب سے اناتولی ہمارے ساتھ شامل ہوا ہے ہمارا کام بڑھ گیا ہے۔"

واسیلی اور ولادیمیر قدرے بیزار لگ رہے تھے، لیکن کینی کا چہرہ فخر سے چمک اٹھا۔ وہ اس مقام پر تھا جہاں فیوڈور کی تعریف بھی اس کے لیے چارلی فینٹن کی تعریف سے کم اہم نہیں تھی۔

"اور اب وقت آگیا ہے کہ اناتولی کو اس کا آخری مشن دیا جائے۔"

کینی کی دھڑکن بڑھ گئی۔ اپنی بھاری بھرکم یوکرینی آواز میں، اس نے پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے وہ جو حقیقت میں مجھے سمفر وپول بوائز کا مکمل اہل ممبر بنائے گا؟"

فیوڈور نے سر ہلایا۔ "ہاں، میرا مطلب بالکل یہی ہے۔"

واسیلی اور ولادیمیر اس کے سر کے اشارے کو سمجھتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فیوڈور اس سے مخاطب ہوا۔ "تم نے ثابت کردیا ہے اناتولی کہ تم اس گینگ میں شامل ہونے کے قابل ہو۔"

کینی کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ جو بھی ہے، میں کروں گا۔ میں تمہیں مایوس نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "تمہیں کسی کو مارنا ہوگا۔"

☆☆☆

پہلے پہل کینی واڈکا کے ایک خاص حد سے زیادہ شاٹس نہیں لے پاتا تھا...... مگر سمفر وپول بوائز گینگ میں آنے کے بعد تو جیسے اسے لت لگ گئی تھی اور بعض اوقات تو وہ واسیلی اور ولادیمیر کے ساتھ مقابلے پر اُتر آتا۔

وہ اس وقت ویسٹ بورن گرو کے ایک کلب کے بیسمینٹ بار میں بیٹھے تھے...... یہاں ہر طرف سگریٹوں کا دھواں اڑ رہا تھا۔

کینی وہاں آنے والا واحد غیر روسی تھا، حالانکہ اس کی زبان پر گرفت بہتر ہورہی تھی، آن لائن کورس کی بدولت۔

کینی کی خواہش تھی کہ جب تین ماہ مکمل ہوجائیں گے تو وہ چارلی فینٹن کے پاس واپس نہ صرف یوکرین کے گینگسٹر کے طور پر جائے گا بلکہ ان کی طرح بات بھی کرے گا۔

اس وقت جب وہ پوری طرح سے واڈکا میں ڈوبے ہوئے تھے، ولادیمیر نے اس سے اس کام کے بارے میں پوچھا۔

"تو، تم کیا سمجھتے ہو تم یہ کر پاؤ گے؟ یہ کسی مرغی پر چھری پھیرنے جیسا آسان کام نہیں ہے۔"

"فکر نہ کرو، توارچ، میں یہ کرسکتا ہوں۔" وہ ہمیشہ کی طرح پُراعتماد لگ رہا تھا، لیکن وہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتا تھا کہ فیوڈور کا مطالبہ چونکا دینے والا تھا۔ "میں بس یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے کس کو مارنا چاہیے...... کیا میں ایسے ہی گلی میں سامنے آتے کسی بھی شخص کو گولی مار دوں...... کیا یہ کرنا ٹھیک ہوگا؟"

"نہیں...... نہیں...... تم یہ بھی کرسکتے ہو مگر میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔" واسیلی بول اٹھا۔ "جب تم کسی کو مارنے

ہی جا رہے ہو تو یہ یقینی بناؤ کہ وہ ایسا شخص ہو جسے تم پہلے ہی اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ متذبذب تھا۔

"انتقام انا تولی۔" ولادیمیر نے بے صبری سے کہا۔ "اپنے دشمنوں میں سے ایک کو مار ڈالو!"

"آں......" کینی نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ کیا واقعی اس کا کوئی دشمن ہے۔ ایسے لوگ تھے جنہوں نے برسوں پہلے اس کے ساتھ کچھ بُرا کیا تھا...... زیادہ برا نہیں۔ ایسے ہدایت کار جنہوں نے اس کی صلاحیتوں کو نہیں پہچانا تھا، کاسٹنگ ڈائریکٹر جنہوں نے اسے کاسٹ کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا، وہ اداکار جنہوں نے اس کی ہنسی کی نقل کی تھی...... لیکن ان میں سے کسی کو بھی مارنے کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

اس کی الجھن ولادیمیر دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ "کوئی تو ایسا ہوگا جس نے تمہیں کسی وقت غصہ دلایا ہو، کوئی ایسا شخص جس نے تمہیں پیسے کا دھوکا دیا ہو، یا ایسا آدمی جس نے تمہاری گرل فرینڈ کو چرایا ہو۔"

"ہاں، ہونا تو چاہیے۔" وہ پُرسوچ لہجے میں بولا مگر ان میں سے کسی کو بھی وہ اپنے انتقام کے لیے موزوں امیدوار نہیں مانتا تھا۔

واڈکا کے کچھ اور شاٹس کے بعد، ولادیمیر تو چلا گیا لیکن واسیلی رکا رہا۔ اس نے کینی کی بے چینی محسوس کر لی تھی۔

"تم اپنے آخری ٹیسٹ کے بارے میں فکرمند ہو...... ہے نا؟"

"ہاں......" کینی نے اعتراف کیا۔

"یہ عام بات ہے۔ پہلی بار کسی کو مارتے ہوئے سب ایسے ہی پریشان اور فکرمند رہتے ہیں...... یہ آسان کام نہیں۔" پھر واسیلی نے آگے جھک کر اپنی آواز کو نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "تم چاہو تو میں اس کام میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیسے؟" وہ چونکا۔

"میں ایک سروس فراہم کرتا ہوں۔ یہ فری نہیں ہے، لیکن یہ اتنی مہنگی بھی نہیں ہے۔" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "بہت سارے سمفرو پول لڑکے ہیں جنہوں نے میری وجہ سے اپنے فائنل ٹیسٹ میں کامیابی حاصل کی ہے۔"

کینی حیران نظر آیا۔

"میرا مطلب ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کو نہیں مارا۔ میں نے ان کے لیے قتل کیے ہیں۔" واسیلی نے شیطانی لہجے میں وضاحت کی۔

"اوہ۔" کینی ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ چارلی فینٹن کے سامنے پرفیکٹ بننے کے لیے اسے خود قتل کرنا چاہیے۔ لیکن یہ سچ تھا کہ قتل کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی ایسے میں اگر واسیلی اسے مسئلہ حل کرنے کی پیشکش کر رہا تھا تو اس میں برائی کیا تھی۔

"کتنا؟" اس نے پہلی بار تھوڑا ریلیکس ہو کر یہ سوال کیا اس اطمینان کے ساتھ کہ اب اس کے قتل کرنے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

واسیلی نے اسے اپنی قیمت بتائی۔ یہ انسانی زندگی کی قیمت کے مقابلے بہت معمولی سی رقم لگ رہی تھی، لیکن کینی جانتا تھا کہ یہ جذباتی ہونے کا وقت نہیں ہے۔ اور اس کے پاس ابھی بھی سٹ کام کی فیس سے کافی رقم باقی تھی۔

"تو تم ہدف کا انتخاب کیسے کرتے ہو؟ اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ فیوڈور کو کیسے پتا لگے گا کہ یہ قتل میں نے کیا ہے؟"

واسیلی نے ہاتھ لہراتے ہوئے گویا اس کے سوالات کو مسترد کر دیا۔ "میں نے پہلے بھی یہ کیا ہے، لہٰذا میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ جہاں تک فیوڈور کا تعلق ہے، اسے یقین ہوگا کہ قاتل تم ہو...... اور اگر بات پولیس کی ہے تو اس قتل سے وہ تمہارا کوئی تعلق ثابت نہیں کر پائیں گے۔ تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ کل شام کو جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ایک گواہ بنانا ہے۔"

"کل شام؟" اس مختصر سے نوٹس پر کینی حیران رہ گیا۔ "ٹھیک ہے لیکن تم نے ابھی تک واضح نہیں کیا کہ تم شکار کو کیسے چنتے ہو؟"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ عام طور پر میں اپنے کلائنٹ کے دشمنوں میں سے کسی کو مارتا ہوں۔ اس طرح فیوڈور نہ صرف اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس قتل کا کوئی مقصد ہے، بلکہ کلائنٹ کسی ایسے شخص سے بھی چھٹکارا پاتا ہے جس سے اسے نفرت ہو۔ یہ ایک بہت ہی کارآمد نظام ہے۔"

"لیکن اگر تمہارے کلائنٹ کا کوئی دشمن ہی نہ ہو تو......" وہ اسی الجھن میں الکا ہوا تھا۔

"ہر ایک کے دشمن ہوتے ہیں،" واسیلی نے مضبوطی سے کہا۔

کینی یہ کہنے ہی والا تھا کہ میرا کوئی دشمن نہیں مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔

"تو انا تولی، کیا ہم نے کوئی ڈیل کر لی ہے؟" واسیلی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں، ہم نے ڈیل کرلی ہے۔'' اس نے بہت پُرجوش انداز میں یہ مصافحہ کیا تھا۔

☆☆☆

واسیلی سے قتل کے لیے مجوزہ ٹائم کی جانچ پڑتال کرنے اور اگلی صبح مطلوبہ فیس اس کے حوالے کرنے کے بعد کینی نے اپنی عدم موجودگی کے ثبوت کے بندوبست کرنے کا ارادہ کیا۔ اس میں سمفرو پول بوائز میں سے کسی کو شامل نہیں کیا جاسکتا تھا، کیونکہ فیوڈور کا مقصد اس کی جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت مانگنا نہیں تھا۔

اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ خود کو پولیس کے شکوک و شبہات سے محفوظ رکھنے کے لیے اناتولی کو صرف ایک شام کے لیے، کینی ماؤنٹ فورڈ کی اپنی پرانی شخصیت کی طرف واپس لوٹنا پڑے گا اور اس کے لیے اس نے فرینج تھیٹر کو چُنا۔

اس نے اپنے ایک اداکار دوست جیری کو کال کی، جو اس کی بات سُن کر قدرے حیران ہوا لیکن پھر ڈارکسٹ، کلبرن میں ایکسپریمنٹل پلے دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ شامل ہونے پر راضی ہوگیا، اس پلے کی کاسٹ میں ایک اداکارہ شامل تھی جسے وہ دونوں جانتے تھے۔

''تم جین کے ساتھ نہیں جا رہے؟'' دوست نے فون بند کرتے کرتے اس سے یہ پوچھ لیا۔

''نہیں۔'' اس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔

''میں حیران نہیں ہوں۔'' وہ بول اٹھا۔

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' اسے اچنبھا ہوا۔

''کچھ نہیں کینی، کچھ نہیں۔''

عام حالات ہوتے تو وہ اپنے دوست کے اس ریمارک کی وضاحت طلب کرتا، لیکن کینی پریشان تھا۔ شام میں انجام پانے والے اپنے منصوبے کے لیے۔ آج اگر آڈینس کم ہوتی ویسے تو اس کا امکان کم تھا مگر کینی کوئی بھی پہلو نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دوپہر کو فیوڈور کی ایک کال نے اس کا رہا سہا سکون بھی غارت کردیا۔

''اناتولی، میں چاہتا ہوں کہ تم واسیلی پر نظر رکھو۔ مجھے اس پر بھروسا نہیں۔ وہ میرے ساتھ کھیل رہا ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' کینی نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں نے افواہیں سنی ہیں کہ وہ سائیڈ پر کام کررہا ہے، نہ صرف وہ نوکریاں جو میں اسے سمفرو پول بوائز کے لیے دیتا ہوں۔''

''کیسا کام؟''

''کنٹریکٹ کلنگ۔ اگر تم میرے پاس کوئی ثبوت لا سکتے ہو کہ وہ کیا کررہا ہے اناتولی، تو میں دیکھوں گا کہ اسے ختم کر دیا جائے۔ اور تمہیں اس کے بدلے انعام ملے گا۔''

''اوہ......'' کینی کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے بقیہ دوپہر واسیلی سے رابطہ کرنے کی کوششوں میں گزارا...... وہ اس کا فون نہیں اٹھا رہا تھا اور پھر اس کا موبائل ہی بند ہوگیا۔ جس وقت وہ کلبرن کے فرینج تھیٹر میں اپنے دوست جیری سے ملا۔ کینی کی حالت پتلی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر فیوڈور کو پتا چلا کہ اس نے بھی واسیلی کو اپنے ٹیسٹ میں کامیابی کے لیے ادائیگی کی تھی، تو وہ اس کے قتل کے احکامات جاری کردے گا۔ لیکن وہ تھیٹر میں کسی کو یہ دیکھنے نہیں دے سکتا تھا کہ وہ کتنا بے چین ہے، اس لیے اس کی اداکاری کی تمام مہارتیں اپنے عروج پر تھیں۔ کیونکہ اس مسلسل تھکا دینے والے بدترین پلے کو نہ صرف اس نے پورا دیکھا بلکہ پھر بار میں شراب پی کر، اداکارہ کو یہ بھی بتایا کہ اس کی کارکردگی کتنی شاندار رہی۔

اس نے شاید زیادہ پی لی تھی جب جیری نے اسے گھر ڈراپ کرنے کی ذمے داری اٹھائی۔ وہ اس وقت گاڑی میں ہی تھے جب انہوں نے ریڈیو فار مڈنائٹ نیوز سنی۔

''تھیٹر کے مشہور و معروف ڈائریکٹر چارلی فینٹن کو آج رات دس بجے ناٹنگ ہل میں گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔''

کینی کے سر میں دھماکے ہوئے تھے، اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر دیوار پر دے پٹخا ہو۔

''گڈ گاڈ۔'' جیری کی آواز بلند ہوئی۔ ''اگر تم اس وقت میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں تمہیں اس قتل کے لیے نمبرون مشتبہ قرار دیتا، کینی۔''

وہ ساکت بیٹھا اس قدر شدید سکتے میں تھا کہ اس نے جیری سے اس کی اس بات کا مطلب تک نہیں پوچھا۔

☆☆☆

اگر کینی نے خود کو مکمل طور پر انگلش پریس اور میڈیا سے الگ نہ کیا ہوتا تو وہ چارلی فینٹن اور لیسلی جین والڈن کے تعلقات کے بارے میں بہت پہلے جان چکا ہوتا۔ ان کی تصاویر کئی ہفتوں سے اخبارات کی زینت بن رہی تھیں۔

وہ ذرا سا بھی سوچنے کی زحمت کرتا تو اسے اندازہ ہوجاتا کہ چارلی کو کبھی اس میں یا اس کے کام میں دلچسپی تھی ہی نہیں۔ اسے صرف جین میں دلچسپی تھی اور یہ سب تب شروع ہوا جب اس نے پہلی بار ان کے گھر کے فون پر جین سے بات چیت شروع کی۔

چارلی نے بہت ہی آسانی سے کینی جیسے گدھے کو

گینگسٹر گروپ میں الجھا کر اپنے لیے میدان چھوڑنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

فیوڈور کو اس بات پر قائل کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ قتل کا مناسب مقصد تھا۔

اس دن واسیلی نے نوٹنگ ہل کے گھر کے باہر کافی دیر انتظار کیا تھا، اس یقین کے ساتھ کہ جلد یا بدیر چارلی فینٹن آئے گا۔ اور ایسا ہوا بھی۔ کینی ماؤنٹ فورڈ کے گھر کے سامنے رکنے والی کار میں ایک کامیاب ڈائریکٹر موجود تھا جو اپنے ساتھ بیٹھی حسینہ کو بوسہ دے رہا تھا۔ جونہی وہ گاڑی سے باہر نکلا۔ واسیلی نے اپنا پسندیدہ ہتھیار پی ایس ایس سائلنٹ پسٹل نکالا جو کے جی بی کے لیے تیار کیا گیا تھا، اس نے بنا لمحہ ضائع کیے دو فائر کیے تھے اور دونوں گولیاں چارلی فینٹن کے سر میں لگیں۔

”جاب ڈن۔“ اطمینان بھرے انداز میں پستول کو اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے، واسیلی اس یقین کے ساتھ وہاں سے چلا گیا کہ کوئی اسے اس قتل سے نہیں جوڑ پائے گا، کیونکہ اس سے پہلے اس کے پچھلے پچاس سے زیادہ ہٹس میں سے بھی کوئی اس تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ فیوڈور یہ فرض کر لے گا کہ یہ کام کینی ماؤنٹ فورڈ نے کیا ہے۔ جس چیز کو اس نے دھیان میں نہیں رکھا تھا وہ تھی چارلی فینٹن کی معروف شخصیت۔ ٹھیک اسی وقت ایک پاپا رازی بھی اپنے کیمرے کے ساتھ وہیں موجود تھا...... جیسے ہی چارلی فینٹن گاڑی سے باہر نکلا، اس نے اپنے کیمرے سے اس کی ویڈیو بنانی شروع کر دی تھی، اور یوں اس کا کیمرا قتل کی اس واردات کا عینی شاہد بن گیا۔

فوٹیج جب پولیس کے حوالے کی گئی تو واسیلی کی بہت واضح تصاویر بھی سامنے آئیں، جن سے اس کی شناخت ہو گئی اور اسے فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا۔

جین والڈن پہلے تو ساتویں آسمان پر تھی۔ قتل کیس میں مرکزی کردار ہونا۔ ایسی اداکارائیں تھیں جو اس قسم کی مشہوری حاصل کرنے کے لیے خود قتل کر دیتی تھیں مگر اس کی ساری امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب پولیس نے اپنی کسی پریس کانفرنس میں اس کا ذکر تک نہیں کیا، نہ تفتیش میں اس کی مدد کرنے پر کوئی شکریہ کہا۔ بلکہ انہوں نے تو عوامی سطح پر اس کا نام تک نہیں بتایا۔ چارلی فینٹن کی شخصیت اس کے منفرد نظریات، اس کی تھیٹر کے لیے خدمات اور ایک پیار کرنے والے خاندانی آدمی کے طور پر سامنے آئی۔

جین غصے سے پاگل ہو گئی تھی۔ اس پر مستزاد کینی نے بھی اسے اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اب وہ اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ فلیٹ شیئر کر رہی تھی اور اپنے ایجنٹ کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

”تم ایک ہوشیار لڑکے ہو، اناتولی سیمیونوف۔“ فیوڈور نے کہا، جب ان کی اگلی ملاقات ہوئی۔ ”اپنی گرل فرینڈ کے عاشق سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ایسا بندوبست کرنا کہ واسیلی کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا جائے۔ یہ بہترین کام ہے۔ میں ایک طویل عرصے سے واسیلی کو راستے سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔ تم صرف ایک ہوشیار لڑکے نہیں ہو اناتولی، تم اب ایک ہوشیار سمفر وپول بوائے ہو۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں گینگ میں شامل ہونے کے لیے کوالیفائی کر چکا ہوں؟“ بات پہلے جیسی ہوتی تو وہ یہ سن کر اچھل پڑتا مگر اب کینی کے لہجے میں وہ پہلے والا جوش و خروش نہیں تھا۔

”یقیناً تم اہل ہو چکے ہو۔ اب تمہیں یہاں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ اب تم سمفر وپول کے لڑکوں میں سے ایک ہو۔“ فیوڈور نے کافی زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

کینی ماؤنٹ فورڈ نے بھی سوچا۔ کام ہو گیا۔ یہ الگ بات کہ اس کام کو کر لینے سے اب اسے کوئی شو نہیں ملنا تھا۔ کینی نے وہی [illegible] کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ لندن کے ایک گینگ میں گھس آیا لیکن وہ شخص جس سے اس نے یہ وعدہ کیا تھا وہ اب نہیں رہا تھا۔

لندن کے گینگز کے بارے میں چارلی فینٹن کی پروڈکشن کبھی نہیں ہوگی۔ کینی ماؤنٹ فورڈ کی تمام کوششیں رائگاں گئی تھیں مگر پھر اس خیال نے اسے تقویت دی کہ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے بطور اداکار عزت حاصل کرنے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش نہیں کی، اب آگے بڑھنے کا وقت تھا۔ کینی ماؤنٹ فورڈ بننے کا وقت۔

جب اس نے اپنے ایجنٹ سے بات کی، تو اس نے انکشاف کیا کہ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بی بی سی ایک نیا سٹ کام شروع کرنے والا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کینی اس میں مرکزی کردار ادا کرے۔ کینی نے ہامی بھر لی تھی۔

لیکن کینی ماؤنٹ فورڈ نے فیوڈور اور سمفر وپول بوائز سے بھی رابطہ کبھی نہیں چھوڑا۔ اس کا ماننا تھا کہ ایک اداکار کے طور پر، اپنی کمان میں ایک سے زیادہ تیر رکھنا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔

❖❖❖

ایک زوردار دھماکا ہوا اور اُس کے حواس جیسے معطل ہو کر رہ گئے۔
حادثے سے قبل ہی میگی او ڈیل کو اپنی ماں کے ساتھ گاڑی پر یہ 'روڈ ٹرپ' ایک بُرا آئیڈیا لگ رہا تھا۔ ماں کے ساتھ اس طرح کی کوئی بھی تفریح کرنا اسے ہمیشہ ایک غلطی لگتی تھی اور بیشتر اوقات یہ کام گھاٹے کا سودا ہی ثابت ہوتا تھا۔
گاڑیوں کی ٹکر اور پھر بریک لگانے کی وجہ سے ٹائروں کی رگڑ، ربڑ جلنے کی بُو اور سڑک پر نشان اس بات کے گواہ تھے کہ میگی

تقابلی عمل سے گزرنے والی ایک بیٹی کی شکرگزاری......

تقابل

مظہر سلیم ہاشمی

طویل سفر ہو یا زندگی کے عام ایام... کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی موڑ پر رشتے مل ہی جاتے ہیں... کسی سورما پر اگر بہت سارے دشمن ایک ساتھ حملہ کر دیں تو جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے... کیونکہ وہ بیک وقت دونوں حملوں سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا... ایک ایسی ہی صورتِ حال میں گرفتار لڑکی کی روداد... ایک ہی وقت میں اسے دو محاذ پر اپنا دفاع کرنا تھا...

ایک بار پھر سے پچھتانے کے لیے خود کو تیار کرلے۔
حادثے سے کئی گھنٹے قبل ہی اس نے پچھتانے کا اعتراف کرلیا تھا اور اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے یہ روڈ ٹرپ کرنے کا منصوبہ تشکیل دیا تھا۔
اس کی ماں کیتھی بار بار رکنے کی فرمائش کر رہی تھی کیونکہ اسے کچھ کھانا تھا۔
''کہیں رک کر کچھ کھا لیتے ہیں۔'' کیتھی کوئی دسویں بار بولی تو کئی مرتبہ نظر انداز کرنے کے بعد آخر کار میگی نے اس بار سپر ڈال دی اور 'فریڈی ڈائنر' کی پارکنگ میں کار روک دی۔ یہ نہ لنچ کا وقت تھا اور نہ ہی ڈنر کا لیکن کون میگی کی ماں کو یہ بات سمجھاتا؟
ڈائنر کے نیون سائن کا آخری حرف حوادثِ زمانہ کا شکار ہونے کے بعد غائب تھا اور اب محض 'ڈائن' کا لفظ جگمگا رہا تھا۔ میگی کو ایسے سستے مقامات پر کھانا کھانے سے کبھی بھی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ مہنگے اور فینسی ریستوران بھی جاتی تھی لیکن ایسی کسی جگہ پر کھانا کھاتے ہوئے بھی ناک بھوں نہیں چڑھاتی تھی۔ اسے بس اتنا اطمینان درکار ہوتا تھا کہ جو کچھ بھی کھانے کے لیے پیش کیا جائے، وہ تازہ، پورا پکا ہوا ہو اور کسی بھی حوالے سے مضرِ صحت نہ ہو۔
میگی کی جاب ہی ایسی تھی کہ اس نے کئی بار مردوں کے پوسٹ مارٹم کے دوران ہی بیٹھ کر بیف برگر کھائے تھے۔ ایک بار تو ایک ایسے مقام پر بیٹھ کر اس نے سینڈوچ بھی کھائے تھے جہاں ہر جانب ڈرموں میں سے لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔ پھر یہ چھوٹا سا ڈائنر عرف ڈائن اس کے اعصاب پر کیسے اثر انداز ہوسکتا تھا؟
ویٹرس نے جب ایک ایپل پائی کا ٹکڑا ونیلا آئس کریم کی ٹاپنگ کے ساتھ ان کے سامنے رکھا تو وہ ایک ٹک اسے دیکھتی ہی رہ گئی...... اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ ویٹرس کو اپنے کپ میں مزید کافی ڈالنے سے روک دے۔ اسے اور اس کی ماں کو اب مزید کافی پینے کی حاجت نہیں رہی تھی۔
ایپل پائی کے ٹکڑے میں کوئی نقص نہیں تھا...... بلکہ اس میں سے اٹھتی خوشگوار مہک یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ اسے تازہ تازہ بیک کیا گیا ہے۔ اس کی گرمائش سے اس پر رکھی آئس کریم پگھلنے لگی اور قطرہ قطرہ بہہ کر پلیٹ میں جمع ہونے لگی تھی۔
مسئلہ یہ ایپل پائی کا ٹکڑا بھی نہیں تھا...... بس میگی کو تخیل آزمانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی کہ سفید پلیٹ میں پگھلتی آئس کریم کی بوندیں اسے خون کی بوندیں لگنے لگیں۔ یہ خوفناک نظارہ دماغ سے نکالنے کے لیے اس نے پانی کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو پلیٹ میں خون کے بجائے ایک بار پھر سے پگھلتی آئس کریم نظر آنے لگی تھی۔
بات صرف اتنی تھی کہ میگی نے اس ایپل پائی کا آرڈر نہیں دیا تھا...... یہ پائی کا ٹکڑا اس کی ماں نے منگوایا تھا۔
میگی اپنی ماں کیتھی کی اس حرکت پر بس ایک بار پھر سے سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ ایسے تمام کام وہ جان بوجھ کر کرتی ہے یا پھر اس سے انجانے میں ہی یہ غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی انسان اتنا بے حس نہیں ہوسکتا کہ دوسروں کے جذبات و احساسات کا گلا جان بوجھ کر گھونٹ دے۔
میگی نے اپنی جاب کے حوالے سے ماں سے زندگی میں چند بار ہی گفتگو کی تھی۔ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ کیتھی نے اپنی بیٹی کی زندگی کے بارے میں کبھی دوسری بار سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میگی...... ایف بی آئی میں بطور ایک 'پروفائلر' کام کرتی تھی۔ مجرموں کی ذہنی کیفیات کا اندازہ لگانا، ان کے طریقۂ واردات کی جانچ کرنا اور جائے وقوعہ پر جا کر خون آلود لاشوں کے تجزیے کرنا اس کی جاب کا اہم حصہ تھا۔
میگی کو ایپل پائی اور اس پر رکھی پگھلتی آئس کریم دیکھ کر متلی سی ہونے لگی لیکن کیتھی کو پروا نہیں تھی۔ اس کی اپنی بیٹی کی زندگی کے بارے میں عدم دلچسپی اس بات سے عیاں تھی کہ وہ اسے اب بھی نظر انداز کر رہی تھی۔
''ماں نے اس دن شراب بھی تو بہت پی رکھی تھی...... شاید بھول گئی ہوں۔'' میگی اب بھی اپنی ماں کیتھی کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے سوچنے لگی۔
یہ چند سال پہلے کی بات تھی جب وہ جاب سے سیدھا اپنی ماں کے گھر گئی تو اسے.... شراب کے نشے میں غرق پایا۔ جام بنانے کے بجائے وہ براہِ راست بوتل کو منہ لگا کر پی رہی تھی۔
''مجھے گرفتار کرنے آئی ہو؟'' کیتھی نے پوچھا۔
''شراب پی کر خودکشی کرنے والوں کو ایف بی آئی والے گرفتار نہیں کرتے۔'' میگی نے ناگواری سے جواب دیا۔
اس کی ماں یہ سب ان سنی کر کے اپنے آپ... ہی بڑبڑاتی رہی تو میگی نے اپنی جیکٹ کی جیب سے پولورائڈ

کیمرے سے بنائی گئی تصاویر نکالیں اور کیتھی کے سامنے رکھی میز پر بکھیر دیں۔

''یہ کام کرتی ہوں میں......'' وہ جھنجلا کر بولی۔

تصاویر خوفناک حد تک چونکا دینے والی تھیں......

جائے وقوعہ پر پیش آنے والے سارے ثبوتوں کو انتہائی قریب سے اور واضح انداز میں عکس بند کیا گیا تھا۔ کچن میں مختلف کھانے کے کنٹینر رکھے دکھائی دے رہے تھے......

ایک تصویر ان میں خاص طور پر نمایاں ہو رہی تھی جس میں ایک ایپل پائی دکھائی دے رہی تھی اور اسے کسی میٹھے کے بجائے ایک انسانی کلیجے سے سجایا گیا تھا۔ رستے ہوئے خون کی بوندیں اس منظر کو مزید خوفناک بنا رہی تھیں۔

اب یہ ساری تفصیلات اس کی ماں بھول گئی تھی یا پھر اس نے از خود انہیں اپنی یادداشت سے مٹا ڈالا تھا، اس بات کا اندازہ میگی نہیں لگا پائی تھی۔ اس کی ماں کیتھی نے زندگی کی پریشانیوں سے نمٹنے کا یہ فن نجانے کہاں سے سیکھا تھا کہ وہ ہر بری یاد کو ایسے بھول جاتی تھی جیسے وہ کبھی ہوئی ہی نہ ہو۔ سائیکالوجی میں اس عادت کو ''ڈینائل'' یعنی حقیقت سے انکار کہا جاتا تھا۔ میگی کو شک تھا کہ اس کی ماں اس بیماری کا شکار تھی۔ وہ زندگی میں پیش آئے بیشتر حادثات کے حوالے سے منکر ہو جایا کرتی تھی جیسے وہ کبھی وقوع پذیر ہی نہ ہوئے ہوں۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی ماں یہ بات بھول جاتی کہ وہ ہر رات نشے کی حالت میں کسی مرد کو اپنے ساتھ لایا کرتی تھی اور یہ توقع رکھتی تھی کہ بارہ سالہ میگی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا؟ کیتھی کو اپنے 'دوست' گھر نہ لانے کا خیال بھی تب آیا جب ان میں سے ایک نے ایک رات یہ تجویز پیش کی کہ میگی کو بھی ان کے ساتھ اس 'کھیل' کا حصہ بننا چاہیے جو ہر رات اس کی ماں کھیلا کرتی تھی۔ اس واقعے کا بس یہی فائدہ ہوا کہ کیتھی گھر پر دوست لانے کے بجائے ہوٹل میں کمرا لینے کو ترجیح دینے لگی لیکن میگی کو نتیجتاً تنہا راتیں گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔

کم عمری سے ہی میگی کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسے اپنا خیال خود رکھنا ہے......کوئی دوسرا آکر اس کا خیال نہیں رکھے گا۔ تنہائی اور اکیلے پن میں ہی اس نے عمر گزاری اور ایسے ہی بڑی ہوئی......اب اپنے شوہر سے علیحدگی کے بعد اسے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ تنہائی میں خود کو زیادہ محفوظ خیال کرتی ہے۔ اپنے گھر میں رات کو کسی بھی شخص کی موجودگی میں وہ اعصابی تناؤ کا شکار رہتی تھی...... چاہے وہ اس کی ماں ہو یا پھر اس کا سابقہ شوہر۔

اب اتنے طویل عرصے بعد اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ اس کی ماں بدل گئی ہے...... یہ میگی کی خام خیالی بھی ہو سکتی تھی۔

اس روڈ ٹرپ میں واقعی اسے اپنی سوچ غلط لگنے لگی تھی کہ اس کی ماں بدل گئی ہے۔ یہ سب اسے ایپل پائی آرڈر کرنے سے پہلے ہی لگنے لگا تھا۔ میگی کو اس بات کا بہت پہلے ہی اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ اس کی ماں کبھی نہیں بدل سکتی۔ وہ کوئی روایتی ماں بیٹی نہیں تھے جو سڑک پر گاڑی میں سیر و تفریح کرتے پھرتے...... ریڈیو پر گانے سنتے، جا بجا ہوٹلوں پر رک کر کھانے کھاتے اور پھر میٹھے میں ایپل پائی منگوا کر مل بانٹ کر اس سے لطف اندوز ہوتے۔ ان کا تعلق ایک ایسے برائے نام رشتے میں بندھا ہوا تھا جسے دونوں بس گزار رہی تھیں۔

وہ خاموشی سے اپنی ماں کو کافی کی چسکیاں لیتے دیکھتی رہی...... گاہے بگاہے وہ ایپل پائی کے ٹکڑے سے بھی انصاف کر رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ میگی ایف بی آئی میں مجرموں کی 'پروفائلر' تھی جس کے ذمے جائے واردات پر جا کر ان کی ذہنی کیفیت اور طریقۂ واردات کا تعین کرنا ہوتا تھا لیکن کبھی اسے یہ کام کرتے ہوئے دقت نہیں ہوئی تھی......

لیکن اپنی ماں کے ساتھ تھوڑا سا ہی وقت گزارنے کے بعد اسے وہ ساری ہولناک وارداتیں یاد آنے لگی تھیں جن میں قاتل کھانے کے ڈبوں میں انسانی اعضاء اکٹھے کرتا تھا۔ ڈیوٹی کے دوران میں یہ سب ہوتا تو عام بات لگتی لیکن ذہنی طور پر خود کو آرام دینے کے لیے اس نے اپنی ماں کے ساتھ وقت گزاری کو ترجیح دی تھی تو اچانک سے ہی یہ سب ہونے لگا تھا۔ شاید وہ اپنی ماں کی طرح 'ڈینائل' کا شکار نہیں تھی......ایک لحاظ سے یہی اس کے لیے بہتر تھا۔

'حقیقت کا سامنا جتنی جلدی کر لیا جائے اتنا ہی زندگی میں آگے بڑھنا آسان ثابت ہوتا ہے۔' اس نے شانے اُچکاتے ہوئے سوچا۔

''اوں......اوں۔'' اچانک کیتھی اپنے چمچ کے ساتھ ایک جانب اشارہ کرنے لگی۔ بول وہ اس لیے نہیں سکتی تھی کیونکہ ایک تو اس کا منہ پورا ایپل پائی سے بھرا ہوا تھا اور دوسرا اس کے نزدیک بھرے منہ کے ساتھ بات کرنا بدتمیزی میں شمار ہوتا تھا۔ میگی اپنی ماں کی اس حرکت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی کیونکہ ہمیشہ اس کے بچپن میں اگر وہ کسی کی جانب اشارہ کرتی تھی تو اس بات پر سخت تادیب

ہوتی تھی۔
اس نے جان بوجھ کر اپنی ماں کی اس حرکت کو نظر انداز کیا...... وہ اب اس صورتِ حال سے لطف لینا چاہ رہی تھی۔ اب اسے دیکھنا تھا کہ آخر کیسے اس کی ماں دو بدتمیز حرکات میں سے ایک کا انتخاب کرتی ہے۔ ایک طرح سے وہ اپنی ماں کو تنگ ہی کر رہی تھی لیکن کیتھی نے باز آنے کے بجائے اپنے چمچ کی مدد سے اشارے کرنے کا عمل مزید تیز کر دیا۔

''وہ آدمی نرا اُلّو کا پٹھا ہے......'' چند لمحوں کے بعد اپنے منہ میں رکھا ایپل پائی کا ٹکڑا تقریباً نگلتے ہوئے کیتھی نے سرگوشی کی۔

میگی کے لیے اب اپنی ماں کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اس 'اُلّو کے پٹھے' پر ڈال ہی لی تاکہ اس کے دفاع میں کچھ بول سکے اور اپنی ماں کو غلط ثابت کر دے۔

وہ شخص اتنا عام تھا کہ اسے میگی کے دفاع کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پروفائلر ہونے کے ناتے وہ لمحوں میں ہی کسی کا جائزہ مکمل کر کے اس کے بارے میں رائے قائم کر لیتی تھی۔ ابھی بھی اس کی نگاہ میں ایک درمیانی عمر کا طویل قامت آدمی موجود تھا جس کے بال تیزی سے اُڑنے کی راہ پر گامزن تھے۔ پتلی ٹھوڑی اور ریم والے چشمے میں اس کا چہرہ واضح ہو رہا تھا۔ اس نے ایک غیر استری شدہ آکسفورڈ شرٹ پہن رکھی تھی جو اس کے سائز سے بڑی تھی۔ شکن زدہ پتلون میں ٹھونسنے کے باوجود شرٹ میں سے اس کی توند نمایاں ہو رہی تھی جیسے وہ سارا دن آفس میں بیٹھ کر کام کرتا ہو۔

وہ ایک کونے والی میز کا انتخاب کرنے کے بعد وہاں بیٹھ کر اب مینیو کا جائزہ لے رہا تھا۔ نیپکن میں لپٹے کانٹے چمچ کو نکالنے کے بعد وہ آرڈر دینے کے لیے تیار ہی نظر آتا تھا۔ ایک ایسا عام شخص جو اپنے کام میں وقفہ لے کر کچھ کھانے کے لیے آیا ہوا۔

میگی اس پر سے توجہ ہٹانے ہی والی تھی کہ اس کی نظر ایک بڑھیا پر پڑی جو بمشکل خود کو چھڑی کے سہارے گھسیٹتے ہوئے اس میز کی جانب بڑھ رہی تھی۔ عام سا نظر آنے والا شخص کوئی پروا کیے بغیر ہی اپنی میز پر بیٹھ گیا تھا جبکہ اس بڑھیا کو آگے بڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اپنی چھڑی کو بجاتے، وہ ہانپتے کانپتے بمشکل اس کونے والی میز پر پہنچی اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑھیا اس عام شخص کے ساتھ ہی تھی۔ تب ہی میگی کو احساس ہوا کہ اس کی ماں نے اس شخص کے حلیے کے بجائے اس کی اس حرکت کی بنا پر اسے 'اُلّو کے پٹھے' کا خطاب دیا تھا۔

وہ ان کی جانب سے توجہ ہٹا کر اپنی کافی کی جانب دیکھنے لگی...... وہ زیادہ دیر تک ان لوگوں کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی اسے اب خجالت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ اس شخص کے بارے میں اپنی ماں کی رائے سے متفق تھی۔ اپنی بوڑھی ماں کے بجائے خود پر توجہ دینے والا شخص اس کی نظر میں بھی 'اُلّو کا پٹھا' شمار ہوتا تھا۔

''چچ...... چچ...... چچ۔'' کیتھی کے حلق سے نکلتی یہ تاسف آمیز بلند آوازیں اسے سخت زہر لگ رہی تھیں...... اسے اُلّو کے پٹھے شخص سے زیادہ اب...... اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ اس کی ماں یہ آوازیں کیوں نکال رہی ہے؟ ڈائنر میں باقی بیٹھے لوگوں کے سامنے اسے شرمندہ کرنے میں کیتھی نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اس نے تیزی سے بل منگوایا اور تقریباً اپنی ماں کو وہاں سے گھسیٹتے ہوئے لے گئی۔

اس کی ماں راستے بھر بالکل خاموش رہی لیکن اب حادثے کے بعد وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھی بری طرح چلا رہی تھی۔ میگی کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح خوامخواہ چلاتی ہوئی اپنی ماں کو کچھ بھی دے دلا کر چپ کروا دے۔ حتیٰ کہ وہ چچ چچ کی آوازیں سننے کے لیے راضی تھی جن سے تنگ آ کر اس نے ڈائنر سے فوری نکلنے کی غلطی کی تھی۔ اگر اس کی ماں اس بری طرح نہ چلا رہی ہوتی تو وہ کم از کم اس سیاہ اسٹیل والی تیز رفتار سواری کو دیکھ لیتی جو اب سڑک کے ایک جانب رکی تھی۔ گاڑی تیز رفتاری سے اسے کراس کرنے کے بعد آگے آئی تھی اور پھر اپنی رفتار مدھم کر لی۔ میگی پہلی بار نہ سہی لیکن کم از کم جب اس پک اپ ٹرک نے دوسری بار اس کی ٹویوٹا کو نشانہ بنایا تو تب وہ خود کو بچانے کی کوشش کر ہی سکتی تھی۔ گاڑی شدید نقصان کا شکار ہونے کے بعد سڑک سے ہی اتر گئی تھی۔

اس کی گاڑی کا بمپر پک اپ کی گرل میں اس طرح پھنسا ہوا تھا جیسے کسی خوش خوراک شخص کی داڑھی میں کھانا پھنسا ہو۔ پتا نہیں گاڑی کو ٹکر مارنے والا یہ شخص اندھا تھا یا کوئی اور مسئلہ تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے اسے آتے ہوئے نہیں دیکھا؟'' کیتھی نے اسے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ یہ الگ بات تھی کہ حلق کے بل چلانے کے باعث اس کی آواز کی سمع خراشی میں کمی آ گئی تھی اور اس طرح ڈانٹتے ہوئے اس کی

آواز کسی کارٹون آواز سے مشابہ لگنے لگی تھی۔ میگی نے بمشکل خود کو مسکرانے سے روکا۔

''یہ آیا کہاں سے تھا؟'' کیتھی نے اپنی ہی بات کی تردید اگلے جملے میں کر دی تھی۔ اسے دنیا کی ہر ماں کی طرح بس غصہ اپنی اولاد پر نکالنا تھا ورنہ وہ خود بھی نہیں دیکھ پائی تھی کہ یہ حادثہ کس طرح ہوا تھا۔

کیتھی نے سیٹ بیلٹ سے کھینچا تانی کرتے ہوئے ان ٹافیوں کو اٹھانے کی کوشش کی جو ٹکر ہونے سے قبل اس نے گود میں رکھی ہوئی تھیں اور اب اچھل کر اس طرح سے پھیل گئی تھیں جیسے کسی قوسِ قزح رنگت والی مالا کے موتی بکھر گئے ہوں۔ سیٹ بیلٹ نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

''میں نے اسے آتے ہوئے نہیں دیکھا......'' میگی نے اعتراف کیا۔

گاڑی سنبھالنے کے بعد اس نے اسے کچے میں روک دیا تھا۔ وہ اسے ابھی واپس ہائی وے پر نہیں لانا چاہ رہی تھی۔

اس کے ہاتھوں میں ابھی تک لرزش تھی۔ اس کپکپی پر قابو پانے کے لیے اس نے مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل کو دونوں ہاتھوں سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے اسٹیئرنگ چھوڑ کر ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے۔ اسے اپنی گردن اور پشت پر پسینہ بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ اس پک اپ ٹرک کو آتے ہوئے کیوں نہیں دیکھ پائی۔

تین یا چار کاروں کے بعد وہ پک اپ ٹرک بھی ان سے آگے رکا ہوا تھا۔ عقبی بتیاں اُڑتی ہوئی خاک میں جلتی بجھتی نظر آ رہی تھیں۔ دونوں گاڑیوں کے بیچ میں میگی کی کار کا بمپر کچرا کچرا ہو کر بکھرا ہوا تھا۔

''اب یہ ان کو نہ جا کر بتا دینا......'' کیتھی نے سرگوشی کی۔

''کیا مطلب؟'' میگی نے قدرے غصے میں کہا۔

''اب وہاں جا کر یہ اعتراف نہ کر لینا کہ تم نے انہیں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ خوامخواہ ہی انشورنس والے تمہارے گلے پڑ جائیں گے۔'' کیتھی نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا آپ مجھے جھوٹ بولنے کا کہہ رہی ہیں؟'' میگی نے حیرت سے اپنی ماں سے سوال کیا۔

''میں بس اتنا کہہ رہی ہوں کہ فضول باتیں کرنے سے پہلے کچھ سوچ لینا اور اس دوران اپنا منہ بند رکھنا۔'' کیتھی منہ بناتے ہوئے بولی۔

''میں فیڈرل لاء آفیسر ہوں......'' میگی نے ناراض لہجے میں کہا۔ ''آپ پتا نہیں یہ بات بھول کیوں جاتی ہیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے......'' کیتھی نے تیزی سے کہا لیکن اپنی بیٹی کے بگڑتے تیور دیکھ کر فوراً وضاحت کی۔ ''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے دن تم اپنی گن گھر چھوڑ آئی ہو......آج کے دن تم نے ایک عام شہری بن کر ہی میرے ساتھ وقت گزارنا تھا۔''

''ہم......'' میگی اس وضاحت پر صرف سر ہلاتے ہوئے ایک ہنکارا ہی بھر سکی۔

اس دوران میں کیتھی نے ٹافیاں کھول کھول کر کھانی شروع کر دیں۔ یہ رنگ برنگی ٹافیاں دیکھ کر میگی کو اپنی ماں کی دوا کی گولیاں یاد آ گئیں جو وہ اکثر واڈ کا پیتے ہوئے نگلتی تھی۔ ایسے اچانک حادثے کے بعد اس طرح بھوکے انداز میں ٹافیاں کھانا میگی کی سمجھ سے باہر تھا۔ ابھی ایک گھنٹا قبل ہی تو انہوں نے ڈنر کیا تھا۔ پھر بھی میگی نے شکر ادا کیا کہ اس کی ماں کو لگنے والی نئی لت صرف ٹافیوں تک ہی محدود تھی ورنہ وہ شراب جیسے نشے کی بھی عادی رہ چکی تھی۔

''کالج سے لے کر آج تک میرا کوئی کار ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا۔'' میگی نے اپنے پرس میں سے انشورنس اور لائسنس کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔

''جو مرضی ہو جائے......بس تم پولیس کو بلانے سے احتراز ہی برتنا۔'' کیتھی نے ایک بار پھر سرگوشیانہ انداز اختیار کیا۔ ''پولیس والے معاملے میں شامل ہو جائیں تو مسئلہ بڑھ ہی جاتا ہے۔''

وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے عالمی سازش چھپانے کا کوئی راز اپنی بیٹی کے گوش گزار رہی ہو۔

میگی اور اس کی ماں کبھی بھی گہرے دوست نہیں رہے تھے......حتیٰ کہ ان کا دنیا دیکھنے کا نظریہ بھی بالکل الٹ ہی تھا۔ اچانک یہ حادثہ کیا ہوا کہ اب میگی اپنی ماں کو بہترین سہیلی بن کر قیمتی مشورے دیتے ہوئے دیکھ رہی تھی جو اس نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔

سہیلی شاید زیادہ ہو گیا تھا......'کسی کے خلاف سازش کرتے ہوئے دو لوگوں' کی اصطلاح زیادہ مناسب انداز میں میگی کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھی۔

''اس نے سائڈ سے مجھے ٹکر ماری ہے اور بغیر اشارہ کیے ہی میرے آگے آ گیا تھا۔'' میگی نے احتجاج بھرے

لہجے میں اپنا دفاع کیا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنی ماں کو وضاحت دے رہی تھی جو یہ حقیقت پہلے سے ہی جانتی تھی۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... پولیس جب بھی آئے گی معاملات مزید خراب ہی ہوں گے۔'' کیتھی نے ایک اور ٹافی کا ریپر کھولنے کے بعد اسے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

میگی نے اپنی ماں کو غور سے دیکھا...... اکثر جاننے والے احباب ان دونوں کی مماثلت کے بارے میں بات کرتے تھے۔ سرخ و سپید رنگت، بھورے بال اور گہری بھوری آنکھیں...... مماثلت واقعی تھی، پھر بھی میگی کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس نے ساری زندگی کسی اجنبی عورت کے ساتھ گزاری ہو جو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کی بیٹی کو اپیل پائی سے نفرت ہے۔

''ماں...... آپ پھر سے بھول رہی ہیں۔'' میگی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک بار پھر سے اپنی ماں کو یاددہانی کراتے ہوئے کہا۔ ''میں خود ہی پولیس ہوں۔''

''نہ میری جان...... میری پیاری بیٹی' ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' اس کی ماں ابھی بھی انکاری تھی۔ ''ایف بی آئی اور پولیس دو الگ الگ شعبے ہیں اس لیے خود کو پولیس کہنے کی حماقت کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہ۔''

میگی اس بات پر باقاعدہ سر پیٹ کر ہی رہ گئی۔

''اوہ......'' کیتھی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو وہی اُلو کا پٹھا ہے۔''

میگی نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھا تو اسی ڈائنر میں موجود 'عام شخص' کو پک اَپ ٹرک کا جائزہ لیتے پایا۔ وہ غالباً اپنے پک اَپ سے اتر کر نقصان کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''چلو یہاں سے......'' کیتھی نے اپنی بیٹی کو بازو سے پکڑتے ہوئے سختی سے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔''

''ماں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ......'' میگی نے غصہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جائے حادثہ سے فرار کا مطلب ہے کہ ہم تفتیش کا آغاز ہونے سے قبل ہی اپنے مجرم ہونے کا اعلان کر دیں۔''

''ارے جب غلطی اُس کی ہے تو وہ کیوں ہماری رپورٹ کرے گا؟'' کیتھی نے بھی غصے سے کہا۔

''میرے خیال میں ہمیں بھاگنے میں تاخیر ہو گئی ہے......'' میگی نے عقبی آئینے میں پولیس کار کی جھلملاتی بتیوں کو دیکھتے ہوئے کہا لیکن اس کی ماں کو یہ بات سمجھ نہ آئی کیونکہ وہ پولیس والے کو آتے ہوئے نہیں دیکھ پائی تھی۔

پٹرولنگ پولیس والے نے اپنی گاڑی میگی کی کار سے کچھ فاصلے پر پارک کر دی تھی۔

''لعنت ہو......'' کیتھی کی نگاہ جب اُس پر پڑی تو بے ساختہ ایک گالی اس کے منہ سے نکلی اور وہ لعن طعن کرنے لگی۔

''ماں...... یہ کیسی زبان استعمال کر رہی ہیں آپ؟'' میگی نے احتجاجاً کہا۔ اس کی ماں اس کے ساتھ کتنی بھی بُری تھی لیکن کم از کم بدکلامی اور گالیاں دینے جیسی کسی بھی قسم کی علتوں کا شکار نہیں تھی۔

''اف خدایا...... کتنا بے کار ٹرپ ہے یہ۔'' اس کی ماں نے شکایت کی۔ ''اب پولیس سے بھی نمٹنا پڑے گا۔''

میگی اپنی ماں پر بس ایک گہری نگاہ ڈال کر ہی رہ گئی...... اسے لگا تھا کہ اپنی ماں کے ساتھ یہ سیر و تفریح کا پروگرام شاید صرف اس کے لیے ہی ناگوار ہے لیکن اپنی ماں کی اس بے ساختہ شکایت پر وہ ایک ٹھنڈی سانس ہی لے کر رہ گئی۔ یقیناً اس کے رویّے کا اثر اس کی ماں پر بھی پڑا تھا اور وہ بھی اس سارے سفر کے دوران اتنا ہی تنگ ہو رہی تھی جتنا کہ میگی خود ہوئی تھی۔

''اب زیادہ ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرنا۔'' کیتھی نے میگی کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ تو بتانے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے کہ تم ایک فیڈرل آفیسر ہو۔''

''اگر میں نے یہ بتا دیا تو شاید ہمارے لیے آسانی ہو جائے۔'' میگی نے رسان سے کہا۔ ''قانون کے محافظ ایک دوسرے کی اتنی عزت تو کرتے ہی ہیں کہ ضرورت کے وقت ان کی جائز مدد کر سکیں۔''

''ہاہاہا......'' اس کی ماں نے ایسے قہقہہ لگایا جیسے اُس نے کوئی تازہ تازہ وائرل ہوا لطیفہ سنایا ہو۔ ''میری جان ...... تم بڑی نادان ہو...... ایک مقامی پولیس والا کیونکر ایک فیڈرل آفیسر کی بات سنے گا؟ اوپر سے تم عورت ذات بھی ہو......''

میگی بے اختیار ہی اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی...... وہ ایک ہی دن میں دوسری بار اپنی ماں کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی...... خاص طور پر تب جب وہ دونوں اچھا وقت ساتھ بتانے کے لیے نکلے ہوئے ہوں...... لیکن اسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں کے تحفظات غلط نہیں تھے۔

کسی بھی چھوٹے شہر یا قصبے میں جب بھی وہ پہنچی تو اسے اسی قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی پولیس والے ایک خاتون افسر کو دیکھ کر جھینپ جاتے اور تعاون کرنے میں متامل رہتے۔

''یہ ٹریفک پولیس والا بھی کہیں ویسا ہی نہ نکلے۔'' میگی نے اپنے خدشات کو صرف سوچا کیونکہ زبان پر لانے کی غلطی کرتی تو اسے اپنی ماں سے مزید بہت کچھ سننا پڑتا۔

جب اس نے کار کا دروازہ کھولا تو اسے تب احساس ہوا کہ ابھی تک اس کا بازو ماں نے تھام رکھا تھا۔

''وعدہ کرو...... تم ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرو گی۔'' کیتھی نے اسی تہدیدی لہجے میں کہا جو میگی بچپن سے سنتی آرہی تھی...... البتہ یہ تنبیہ بچپن میں عموماً شراب کی بوتلوں سے دور رہنے کے لیے ہی ہوتی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں......'' میگی نے نرمی سے کہا اور آہستگی سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آئی۔

''اوہو...... یہ تو بڑا نقصان ہو گیا۔'' پولیس والا اونچی آواز میں میگی کی جانب آتے ہوئے بولا۔

اس نے اپنے دونوں بازو اپنی بیلٹ کے بکل پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے میگی کی کار کے بمپر کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ ایک گاڑی سے دوسری کی جانب دیکھتے ہوئے اس کا سر تاسف سے ہل رہا تھا۔ میگی اس کے چشمے میں اس حادثے کے باعث پھیلنے والے کچرے کا عکس دیکھ سکتی تھی لیکن وہ مسلسل ہی سر ہلائے جا رہا تھا۔

وہ نوجوان کافی کم عمر دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر میگی اس بات کا اندازہ آسانی سے لگا سکتی تھی۔ وہ اس علاقے کے پولیس میں بھرتی کے قوانین سے واقف نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ میگی کو عام پولیس والوں کے مقابلے میں پستہ قامت محسوس ہوا۔ البتہ وہ گٹھے ہو مضبوط جسم کا حامل تھا اور اس بات سے وہ خود بھی بخوبی واقف معلوم ہوتا تھا۔

میگی کو یکلخت ہی احساس ہوا کہ اپنی بیلٹ کے بکل پر ہاتھ دھرنے کی وجہ یہ بالکل نہیں تھی کہ موقع پڑنے پر وہ اپنی گن آسانی سے نکال سکتا...... بلکہ وہ اپنے بنا توند والے پیٹ اور کشادہ سینے کی نمائش کر رہا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس کی عمدگی سے پتلون میں اُڑسی ہوئی شرٹ کے نیچے ایسا کسرتی جسم موجود ہو جسے دیکھ کر لڑکیاں بے ساختہ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں۔

''میرے خیال میں......'' وہ میگی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا جبکہ پک اَپ کا ڈرائیور ابھی تک اپنی گاڑی کے گرد ہی گھوم رہا تھا۔ ''گاڑی اچانک آپ کے قابو سے نکل گئی...... آپ شاید اس دوران اپنا میک اَپ ٹھیک کر رہی تھیں؟''

''ایکسکیوزمی...... کیا کہا آپ نے؟'' میگی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

''اچھا میک اپ نہیں ہوگا تو آپ اپنا موبائل فون استعمال کر رہی ہوں گی......'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں...... میں جانتا ہوں کہ خواتین کو ڈرائیونگ کے دوران بھی فون پر بات چیت کرنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔''

''غلطی میری نہیں تھی......'' میگی بے ساختہ بولی۔

اس کا بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ گاڑی میں سے اپنا بیج اور کارڈ نکال کر اس پولیس والے کو دکھائے کہ وہ کتنی بڑی افسر ہے۔ اس کی نگاہیں کار میں بیٹھی اپنی ماں سے ٹکرائیں تو وہ اسے تنبیہی نظروں سے ہی گھور رہی تھی جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی ہو...... ''دیکھا، میں نے کہا تھا کہ پولیس والے معاملے میں شامل ہوئے تو خیریت نہیں رہے گی۔''

''یقیناً...... یہ 'آپ' کی غلطی نہیں ہوگی۔'' پولیس والے نے آپ لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے لہجے میں موجود طنزیہ انداز کو چھپانے کی بالکل بھی کوشش نہیں کی تھی۔

''وہ بے پروائی سے گاڑی چلا رہا تھا...... میں نہیں۔'' میگی نے تیزی سے کہا لیکن جیسے ہی الفاظ اس کے منہ سے نکلے، اسے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت بچگانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔

پولیس والا اپنی کوشش میں کامیاب ثابت ہوا تھا اور اس نے پہلے ہی ہلے میں میگی کو دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ہیلو سر......'' اس نے پک اپ والے سے کہا جو کہ اب ان کے قریب آکر میگی کی گاڑی کے مڑے تڑے بمپر کا جائزہ لے رہا تھا...... اس کا انداز ایسا تھا جیسے سمجھ ہی نہ پایا ہو کہ یہ سب کیسے ہوا؟ ''سر...... کیا آپ بے پروائی سے گاڑی چلا رہے تھے؟''

''خدا کی مار پڑے......'' میگی نے زیر لب کہا اور

بمشکل اپنی سانس روک کر ان الفاظ کی ادائیگی سے خود کو روکا جو کہ کسی صورت بھی شائستہ نہیں کہے جاسکتے تھے۔
اس کا دل کر رہا تھا کہ اس گھمنڈی اور خودسر پولیس والے کا سر توڑ دے..... وہ کسی کا سر توڑنا چاہتی تھی، پتا نہیں کتنی دیر سے یہ خواہش اس کے دل میں دبی تھی جو پولیس والے کے رویے کے بعد اچانک عود کر سامنے آگئی تھی۔
''میں نے ان کی گاڑی کراس کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے مجھے ٹکر ماری۔'' پک اپ والا بولا۔
''یہ جھوٹ ہے.....'' میگی کی ماں گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی حلق پھاڑ کر بولی۔
دونوں مرد ایک دم ہی چونک گئے..... انہیں اب اندازہ ہوا تھا کہ گاڑی کے اندر بھی ایک شخصیت وجود رکھتی ہے۔
''یہ تو کمال ہو گیا۔'' پولیس والا بولا۔ ''ہمیں واقعے کا عینی شاہد بھی مل گیا ہے۔''
''میرے پاس بھی گواہ ہے..... میری ماں پک اپ میں بیٹھی ہیں۔'' پک اپ والا بولا اور اپنی گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔
سب نے مڑ کر پک اپ کی جانب دیکھا۔ ایک استخوانی، سفید ٹانگ پسنجر سیٹ سے برآمد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ بوڑھی عورت پوری کوشش کے باوجود ابھی تک محض اتنا ہی خود کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو پائی تھی۔ اس کے چلنے کی چھڑی، دروازے کے ہینڈل میں اٹک گئی تھی۔ اس کا پاؤں زمین سے کوئی چھ انچ اوپر تھا اور اس میں پہنا سلیپر اس حالت میں تھا کہ اب گرا کہ تب گرا۔
''ہم..... یہ تو گھمبیر صورتِ حال ہو گئی ہے۔'' پولیس والے نے ہنکارا بھرا۔ اس کے چہرے پر ایک کمینی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ ''میرے خیال میں مجھے دونوں جانب کی کہانی سننی چاہیے تاکہ میں اندازہ لگا سکوں کہ کون سچ بول رہا ہے؟''
میگی تلملا کر رہ گئی..... وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس پولیس والے نے اپنی تربیت، کہاں سے مکمل کی تھی۔ کیونکہ کوئی بھی پولیس ٹریننگ اکیڈمی ایسی کمینی اور ضدی مسکراہٹ نہیں سکھاتی جو اگلے شخص کے تن بدن میں آگ لگا دے۔ یقیناً اسے کسی نے بتایا ہوگا کہ اس طرح کی مسکراہٹ مخالفین کے اعصاب پر بجلی بن کر گرتی ہے اور وہ مقابلے سے پہلے ہی مدافعانہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
میگی کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ ویسے بھی یہ ناممکن تھا کہ آپ کسی ایسے شخص کو دلائل دے کر اپنے حق میں کر سکیں جو پہلے سے ہی آپ کے مجرم ہونے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ ایسے لوگ نہ صرف اپنی بات کو ہی سچ سمجھتے تھے بلکہ اگر کوئی ان کی مخالفت کرے تو اس کا مذاق اُڑانے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ میگی ان سارے طریقوں سے کماحقہٗ واقفیت رکھتی تھی۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ پولیس والے اکھڑ مزاج ہو جاتے تھے اور نتائج کی پروا کیے بغیر ہی ملزمان کے ساتھ سخت رویہ رکھتے لیکن یہ کسی جہاں دیدہ افسر کا طریقۂ کار تو ہو سکتا تھا لیکن اس جوان پولیس والے جیسے نو آموز کا بالکل بھی نہیں۔ میگی کے نزدیک وہ پولیس والا اس صلاحیت کا اہل نہیں تھا اور اس وقت وہ طریقے آزمانے کی کوشش کر رہا تھا جو کسی تجربہ کار پولیس والے کے لیے مناسب تھے۔
پولیس والے کی وردی پر موجود تین پٹیاں اس بات کی واضح نشانی تھیں کہ وہ ابھی فرسٹ سارجنٹ کے عہدے پر بھی نہیں پہنچا اور جونیئر سارجنٹ ہے۔ جیسے ہی میگی نے پولیس والے کے نیم ٹیگ پر اس کا نام پڑھا، وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی کہ اب اسے اپنے تجربہ کار افسر ہونے کا بھی نمونہ دکھا ہی دے۔
''سارجنٹ بلیک..... یہ رگڑ کے نشان ہی صرف 'سچی کہانی' سنانے کے لیے کافی ہیں۔'' میگی نے کہا تو پولیس والا سیدھا ہو گیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی۔ یہ الگ بات تھی کہ کوئی اسے اس کے نام سے پکارے لیکن میگی نے باقاعدہ اس کے عہدے سے پکارا تھا۔ عام طور پر سڑک پر روکے جانے والے افراد اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ انہیں روکنے والا پولیس افسر ہے یا ڈپٹی، پٹرول مین یا محض سارجنٹ۔
''ٹھیک ٹھیک.....'' سارجنٹ بولا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''مجھے یہ رگڑ کے نشان دیکھنے سے پہلے آپ دونوں کے ڈرائیونگ لائسنس دیکھنے ہوں گے۔''
میگی تقریباً مسکرا کر رہ گئی۔ سارجنٹ نے صورتِ حال پر قابو پا کر اسے اپنے حق میں کرنے کے لیے ایک اچھی چال چلی تھی۔ میگی کو کوئی مسئلہ نہیں تھا چنانچہ اس نے اپنا لائسنس سارجنٹ کے حوالے کر دیا۔
پک اپ والے نے پہلے اپنی شرٹ کی جیبیں ٹٹولیں اس کے بعد وہ اپنی پتلون کی جیبوں کو تھپ تھپانے لگا۔ اچانک سے ہی ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔
''ہیرالڈ.....؟ ہیرالڈ.....؟''
سب اپنا کام روک کر مڑے اور پک اپ کی جانب دیکھا جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔ پسنجر سیٹ سے ابھی تک وہ

سفید ٹانگ لٹکتی نظر آ رہی تھی۔
تب میگی، اس کی ماں اور سارجنٹ بلیک سارے ہی ہیرالڈ کی جانب دیکھنے لگے جس کا چہرہ یکدم ہی سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ ابھی بھی اس آواز پر کوئی توجہ دینے کو تیار نہیں تھا، اس کا رویہ ویسا ہی تھا جیسے میگی اسے کھانے کے دوران دیکھ چکی تھی یعنی اپنی ماں کو نظرانداز کر کے اپنا کام کرتے رہنے والا جس کی وجہ سے کیتھی نے اسے 'اُلو کے پٹھے' کا خطاب دیا تھا۔ ہیرالڈ بوڑھی عورت کو ایک بار پھر نظرانداز کر رہا تھا۔ اس نے آواز سے توجہ ہٹا کر ایک پھولا ہوا بٹوا نکال لیا اور اس میں سے کچھ تلاش کرنے لگا۔
میگی کی ماں اِدھر اُدھر پھرنے لگی لیکن ابھی اس نے اپنی توجہ پولیس والے کی جانب ہی مرکوز رکھنا مناسب سمجھا۔ اس کی ماں کوئی چھوٹی بچی نہیں تھی جس پر مستقل نظر رکھنا ضروری ہو۔
سارجنٹ بلیک نے ان دونوں کے ڈرائیونگ لائسنس تھامے اور اپنی پٹرولنگ کار کی جانب بڑھ گیا۔ ہیرالڈ نے بھی سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے بغور دیکھنا شروع کر دیا تاکہ اندازہ لگا سکے کہ کون کون سے شواہد اس کے خلاف جا سکتے ہیں۔
''چچ...... چچ...... چچ۔'' اپنی گاڑی کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے تاسف آمیز آواز نکالی۔
میگی سلگ کر ہی رہ گئی کیونکہ اسے اپنی ماں کی یہ حرکت یاد آ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے غصہ آیا... اور اس کے بعد یہ حادثہ پیش آیا تھا۔
وہ اپنی جگہ پر ہی ٹھہری رہی...... وہ ہیرالڈ کو بتانا چاہتی تھی کہ اسے شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کا نقصان میگی کے مقابلے میں بہت کم ہوا تھا۔ میگی کی کار کے سامنے والے حصے میں سے ٹوٹی ہوئی دھات ایسے باہر نکلی ہوئی تھی جیسے کسی قاتل نے تیز دھار خنجر تانا ہو۔
''گاڑی تو برباد ہی ہو گئی......'' میگی نے مایوسی سے سوچا۔ نقصان اتنا زیادہ تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں اس حادثے کا الزام خود پر نہیں لے سکتی تھی ورنہ انشورنس کی مد میں اسے کافی خرچہ کرنا پڑتا۔
اپنے انہی خیالات میں مگن ہونے کی وجہ سے اسے بڑی دیر بعد احساس ہوا کہ اس کی ماں اپنی کمر پر ہاتھ جمائے، پک اَپ کے کھلے دروازے کے سامنے کھڑی ایسے سر ہلا رہی تھی جیسے اندر بیٹھی خاتون کی ہر بات سے متفق ہو۔ اچانک ہی وہ مڑی اور میگی کی جانب دیکھتے ہوئے اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔
''او خدایا...... یہ بوڑھی عورت کہیں زخمی نہ ہو گئی ہو۔'' میگی کے ذہن میں فوری طور پر بُرا خیال آیا۔
ہیرالڈ نے حادثے کے بعد اپنی ماں کو دیکھنے کی زحمت تک نہ کی تھی۔ میگی اب خود کو کوس رہی تھی کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی پک اَپ کے پاس پہنچی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو دونوں مرد حضرات کی توجہ کہیں اور ہی تھی۔
''کبھی کبھی مجھے اس سے ڈر لگتا ہے......'' بوڑھی عورت کیتھی سے مخاطب تھی لیکن اس کی خوف زدہ نگاہیں میگی کے پیچھے دیکھ رہی تھیں۔
''یہ صحیح نہیں ہے......'' میگی کی ماں نے بوڑھی عورت سے کہا اور پھر میگی کو اپنے ساتھ ٹھہرا دیکھ کر بولی۔''یہ کہہ رہی تھیں کہ وہ کبھی کبھی اسے مارتا بھی ہے یعنی جسمانی تشدد۔''
کیتھی نے ریٹا نامی بوڑھی عورت کے جسم کے کھلے حصوں پر ابھرے زخموں کی جانب اشارہ کیا تو وہ اپنے پتلے پتلے سفید بازو ایسے چھپانے لگی جیسے کوئی خطرناک مجرم اپنے خلاف شواہد چھپاتا ہے۔
''حادثے کا ذمّے دار وہی ہے کیتھی......'' ریٹا نے کہا۔''اس نے ہی اپنی گاڑی تمہاری کار میں دے ماری تھی......لیکن میں یہ سب باتیں اس کے سامنے کبھی بھی نہیں بول سکتی۔''
یہ کہنے کے بعد بوڑھی ریٹا اپنے کندھے مسلنے لگی جیسے وہ تکلیف سے دکھ رہے ہوں اور بلاؤز کے نیچے دیکھا جائے تو وہاں بھی نیل پڑے ہوں۔
میگی حیرت سے اپنی ماں اور ریٹا کو دیکھ رہی تھی جو ایسے گھل مل گئی تھیں جیسے بچپن کی سہیلیاں ہوں۔ پتا نہیں کیتھی اجنبیوں کو کیسے اتنی جلدی اپنا دوست بنا لیتی تھی جبکہ اپنی بیٹی کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔
''ریٹا بتا رہی تھی کہ بعض اوقات وہ رات کے وقت ہتھوڑا لے کر آ جاتا ہے۔'' کیتھی نے سرگوشی کی اور پھر اپنے اردگرد نظر دوڑاتے ہوئے اطمینان کرنے کے بعد گویا ہوئی۔ ''وہ اپنی ماں سے یہ بھی کہتا ہے کہ یہ اُس کی زندگی کی آخری رات ہو سکتی ہے اور وہ اس رات کی صبح نہیں دیکھ پائے گی۔''
''میرا بیٹا ہیرالڈ بہت مکار اور ظالم ہے۔'' ریٹا تقریباً کانپتے ہوئے بولی۔ اس کی انگلیاں اضطراب کے مارے مسلسل حرکت میں تھیں۔
''یہ کیا ہو رہا ہے......؟'' ہیرالڈ کی نگاہ اُن پر پڑی تو

وہ چلّایا اور اُن کی جانب تیزی سے بڑھا۔
''ہم تمہاری ماں کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔'' میگی نے بات بنائی۔ ''اس میں تو کوئی حرج نہیں؟''
''نہیں...... کوئی مسئلہ نہیں۔'' ہیرالڈ اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بہت جھوٹ بولتی ہیں...... بس ان کے جھوٹ سے بچنا۔''
یہ بات اُس نے ایسے کہی تھی جیسے وہ اس کی ماں کی کوئی خصوصیت ہو جسے تعارف کراتے ہوئے بتانا ضروری ہو۔ میگی کو یہ بات بہت عجیب لگی...... اپنی ماں کے بارے میں وہ بھی کوئی بہت اچھے خیالات نہیں رکھتی تھی لیکن ایسے کسی اجنبی کے سامنے وہ اپنی ماں کی تذلیل نہیں کر سکتی تھی...... جبکہ ہیرالڈ نے اپنی ماں کو بڑے آرام سے یوں سرِ عام جھوٹا کہہ دیا تھا جیسے یہ کوئی بڑی بات نہ ہو۔
''بڑے مذاقیہ ہو تم تو...... یہی بات ابھی تمہاری ماں کہہ رہی تھی۔'' کیتھی خود پر قابو نہ پا سکی اور بے اختیار بولی۔ ''کہ تم بہت جھوٹے ہو۔''
میگی اپنی ماں کو خبردار کرتے ہوئے اسے چپ ہونے کا اشارہ کرنا چاہتی تھی لیکن کیتھی پورے طمطراق سے ہیرالڈ سے مخاطب تھی۔
''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اب کی بار سوال سارجنٹ بلیک نے کیا تھا۔
''یہ کہہ رہی ہے کہ تم اس کے ساتھ مار پیٹ کرتے ہو۔'' کیتھی، ہیرالڈ کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ شاید میگی ان دونوں کے بیچ ٹھہری تھی جس کی وجہ سے اسے تحفظ کا احساس تھا۔
''کیتھی...... تم نے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو نہیں بتاؤ گی۔'' ریٹا بے اختیار چلّا اٹھی۔ اس کے انداز میں شدید گھبراہٹ نمایاں تھی۔
میگی نے ایک بار پھر اپنی ماں کی جانب رحم طلب نظروں سے دیکھا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن کیتھی کہاں باز آنے والی تھی۔
''ریٹا نے یہ بھی بتایا ہے کہ تم ہتھوڑا لے کر اسے ڈراتے ہو۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔
یہ صورتِ حال دیکھ کر سارجنٹ بلیک کے چہرے پر چھائی کمینی مسکراہٹ بالکل ہی غائب ہو چکی تھی جبکہ ہیرالڈ کا منہ بالکل لال پڑ چکا تھا۔ اب کی بار میگی جانتی تھی کہ یہ غصے کی وجہ سے سرخ ہو رہا نہ کہ شرمندگی سے...... وہ بار بار اپنی مٹھیاں کھول اور بند کر رہا تھا۔
''اوہ...... خدا کے لیے سمجھو۔'' ہیرالڈ نے ایک قہقہہ لگانے کی ناکام کوشش کی۔ ''میری ماں بہت بوڑھی ہو چکی ہیں اور یہ سب لوگوں سے ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔''
''واقعی......؟'' سارجنٹ بلیک نے رسان آمیز لہجے میں سوال کیا۔
میگی دیکھ سکتی تھی کہ اس نے ایک بار پھر اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ہیں لیکن اب کی بار یہ کوشش بروقت ہتھیار تھامنے کے لیے تھی۔
''دو دن پہلے یہی سب باتیں انہوں نے ڈاکیے کے بارے میں کی تھیں۔'' ہیرالڈ نے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ بھی ذرا اپنی عقل کو آواز دو کہ کس کا اعتبار کر رہے ہو...... یہ ایسے ہی جھوٹ بولتی ہیں۔''
میگی نے مڑ کر ریٹا کی جانب دیکھا جو اب اپنی سیٹ میں ایسے دبک گئی تھی جیسے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتی ہو۔ وہ اپنی چھڑی کو کانپتے ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کر رہی تھی جیسے جلد ہی اسے اپنے بچاؤ کے لیے کسی ہتھیار کی ضرورت پڑنے والی ہو۔
اگلے چند لمحات میں جو کچھ ہوا، وہ میگی کی سمجھ سے باہر تھا۔ ایک تربیت یافتہ افسر ہونے کے باوجود واقعات اس تیزی اور تسلسل سے پیش آئے کہ اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔ عام بات چیت پہلے تلخ کلامی میں اور پھر بعد میں گالم گلوچ میں تبدیل ہو گئی۔ ایسی ایسی باتیں کہی گئیں جن کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی تھی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔
سارجنٹ بلیک نے ہیرالڈ سے کہہ دیا کہ اُسے چند سوالات کے جواب دینے کے لیے تھانے جانا ہوگا۔
''مختصر تفتیش ہوگی...... اور کچھ نہیں۔''
''بہت ہو گئی یہ بکواس...... میں اب مزید ایک لفظ برداشت نہیں کروں گا۔'' ہیرالڈ نے تلملا کر کہا۔
ہیرالڈ یہ سب کہہ کر اپنی پک اپ کی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھ گیا...... اسے پروا نہیں تھی کہ وہ ایک پولیس والے کے حکم سے رُوگردانی کر رہا ہے...... اسے لگا تھا کہ اس بحث سے نجات پانے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ وہاں سے نکل لیا جائے۔
''رک جاؤ......'' کوئی سینئر افسر ہوتا تو اپنے دبنگ لہجے سے ہی ہیرالڈ کی طبیعت صاف کر دیتا لیکن سارجنٹ بلیک کو اپنی بات منوانے کے لیے ہیرالڈ کو اپنے بازو سے دھکیلنا پڑا۔

بدلے میں ہیرالڈ نے بھی کوئی خیال کیے بغیر سارجنٹ کو دھکا دے دیا اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔
اس سے پہلے کہ میگی ان دونوں میں بیچ بچاؤ کراتی...... ہیرالڈ سارجنٹ بلیک کے ایک زوردار دھکے کی بدولت اپنے پورے وجود کے ساتھ دھم سے سڑک پر گرا۔ گرتے ہوئے اس کا سر پوری شدت سے اس کی اپنی پک اپ کے دھاتی بونٹ سے ٹکرایا تھا۔ زمین پر گرتے ہی وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں...... کوئی بھی جنبش نہ ہونے کا احساس نمایاں تھا۔ میگی نبض دیکھے بغیر بھی بتا سکتی تھی کہ ہیرالڈ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

☆☆☆

کاغذی کارروائی مکمل کراتے ہوئے تین گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ میگی اپنی ماں کے ساتھ اب بوڑھی ریٹا کو اس کے گھر پہنچانے کی ذمے داری نبھا رہی تھی۔ رستہ دکھانے کی ذمے داری ریٹا کی تھی اس لیے اس کی ہدایات پر کئی موڑ کاٹنے کے باوجود وہ ابھی تک منزل پر نہیں پہنچ پائے تھے۔ میگی کو لگا تھا کہ ریٹا صدمے کا شکار ہے اس لیے ابھی تک راستہ صحیح سے نہیں پہچان پا رہی...... وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے اگلی ہدایت کی منتظر تھی۔
ریٹا نے تمام راستے...... کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ کیتھی نے پولیس اسٹیشن پر اس سے معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تھی کہ اگر کوئی اس کا جاننے والا ہے تو اسے فون کر کے بلایا جا سکتا ہے لیکن ریٹا نے انکار کر دیا تھا۔
اب بھی سفر کے دوران کیتھی نے پوری کوشش کی تھی کہ ریٹا کے کسی جاننے والے کا سراغ لگا لے لیکن اس کی ہر کوشش کو ریٹا نے انکار میں سر ہلا کر ناکام بنا دیا تھا۔
مزید کچھ دیر بھٹکنے کے بعد وہ بالآخر منزل پر پہنچ ہی گئے۔ گلی کے آخر میں واقع یہ ایک مختصر اور زرد رنگت کا حامل خوب صورت بنگلا تھا جس کے سامنے وسیع باغ موجود تھا۔ وہاں موجود شاہ بلوط کے درخت پوری شان کے ساتھ لہلہا رہے تھے۔
''پتا نہیں اب میں اپنے لڑکے کے بغیر کیا کروں گی؟'' ریٹا نے اچانک سے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ تو میرا آخری سہارا تھا۔''
یہ سن کر ایک دم ہی خاموشی سی چھا گئی۔ میگی اور اس کی ماں، دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا...... استعجاب ان دونوں کے چہرے پر نمایاں تھا۔ ریٹا نے بات ہی ایسی کی تھی کہ وہ دونوں حیرت سے گنگ رہ گئیں۔
''لیکن...... لیکن تم نے تو کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ مار پیٹ کرتا تھا۔'' کیتھی نے ایسے کہا جیسے کسی کو پرانی بات یاد کراتے ہوئے کہتے ہیں۔
''ارے نہیں نہیں......'' ریٹا تیزی سے بولی۔ ''ہیرالڈ جیسے معصوم لڑکے کسی پر ہاتھ اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔''
''تم نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ہتھوڑا لے کر تمہارے پیچھے دوڑتا تھا۔'' کیتھی اپنے حیرت آمیز غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
''ایسا کچھ بھی نہیں۔'' بوڑھی ریٹا گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ میگی اور کیتھی حیرت سے اس بڑھیا کو اترتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔
''میرا ہیرالڈ تو ہیرا تھا ہیرا...... وہ مجھے بھلا کوئی نقصان کیوں پہنچائے گا؟'' ریٹا گاڑی سے اترتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''وہ تو رذیل ڈاکیا ہے جو ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ ڈاک کے تھیلے میں ہتھوڑا چھپا کر لاتا ہے۔ اس نے ہی مجھے دھمکی دی تھی کہ کسی دن وہ میرا سر توڑ دے گا۔''
یہ سب کہہ کر اُس نے پوری شدت سے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔
میگی اور اس کی ماں سکتے کے عالم میں اس چالاک بڑھیا کو دیکھ رہی تھیں۔ حیرت کے مارے ان کی زبانوں پر جیسے تالے پڑ گئے تھے۔ زرد بنگلے کے پورچ تک بڑھیا پہنچی تو میگی نے دیکھا کہ اس کی چال ڈھال اب متوازن تھی...... اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی چھڑی میگی کی گاڑی میں ہی بھول گئی تھی اور اس کے بغیر ہی خراماں خراماں چلتی اپنے بنگلے میں داخل ہو گئی۔
میگی نے ایک گہری سانس لی اور اپنی گاڑی وہاں سے نکال لی۔ وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے یہ روڈ ٹرپ کرنے کا موقع ملا اور وہ اپنی ماں کو زیادہ قریب اور بہتر انداز میں جان پائی۔ بوڑھی ریٹا کے ساتھ تقابل کرنے کے بعد اس کا انگ انگ شکر گزار تھا کہ اس کی ماں کتنی ہی بے حس کیوں نہ ہو کم از کم ایسی ظالم نہیں تھی کہ اپنی ہی اولاد کی موت کا سامان کر دے اور بعد میں مگرمچھ کے آنسو بہا کر دنیا کے سامنے اچھی بن جائے۔ اپنی ماں کے ساتھ یہ روڈ ٹرپ بالکل بھی بُرا آئیڈیا نہیں رہا تھا۔

❖❖❖

قسط :17

شعلہ زن

روبینہ رشید

وہ شعلہ زن تھی یا جوالا مکھی... اس کے وجود میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا... اپنوں کی خود غرضی، دھوکے اور دل و جاں پر گزر جانے والی ناگہانی اس کے وجود کو تہ و بالا کر دینے والے لاوے کے مانند رقصاں تھی... رسوائی کی موت کو اس کا انجام ٹھہرایا گیا مگر مقدر اسے اپنے ساتھ لے اُڑا... اس کے راستے میں رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہمالیہ حائل تھے مگر وہ حاتم طائی کی طرح زندگی کی حسن آرا کے مشکل سوالات کے جواب تلاشتی رہی... ہر قیامت نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا... ہر افتاد اسے مضبوط بناتی گئی... پناہ اور بقا کی تلاش اسے مسلسل دوڑا رہی تھی... موت روپ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں تھی... وہ اپنی طاقت سے خود ناآشنا تھی... راہ میں آنے والے ہر پتھر کو وہ اپنے راستے سے ہٹا رہی تھی... اس کے باوجود اس بار آنے والا طوفان شدید تھا... اس میں ناکامی قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی... ایک ایسی قیامت جو کروڑوں افراد کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے...

ایک سادہ و معصوم نازک اندام دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں سارہ احمد چھوٹے سے گاؤں کی ایک نہایت عام سی لڑکی تھی جسے تین بہنوں میں سب چھوٹی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کا لاڈ پیار نہ ہونے کے برابر ہی ملا۔ گھر میں بھائی کی حکومت تھی۔ میرے پیروں سے گھر کی زمین اس وقت سرک گئی جب اسی بھائی نے غصّے میں کسی کو قتل کر دیا اور غیرت کے نام پر قتل کا بہانہ بنا کر سزا سے بچنے کے لیے مجھے بدنامی اور الزام کی کالک لگا کر موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور میرے ماں باپ نے بیٹے کو بچانے کی خاطر اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ اس شام میں نے گھر، گاؤں اور سب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور ٹرین میں سوار ہو گئی۔ ٹرین میں ایک شیطان ملا۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا اور کچھ پیسے لے کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی مگر اس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا، جان بچانے کی دوڑ میں، میں ایک کچی بستی میں پہنچی جہاں گندے نالے میں ایک چھوٹی بچی ڈوب رہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس بچی کو بچانے کے لیے نالے میں کود گئی۔ اس کی جان بچانے کے انعام کے طور پر مجھے اس کے گھر میں پناہ ملی۔ اس بستی میں منشیات کا دھندا زوروں پر تھا۔ مجھے پناہ تو ملی مگر میری تقدیر کی گردش میرے ساتھ تھی۔ پہلے مجھ پر اس بچی کے باپ کے قتل کا الزام لگا اور پھر وہاں پر خوف و ہراس پھیلاتی کالے جادو کی ماہر اماں سے میری جھڑپ ہو گئی۔ وہ اس بچی کے خون سے ایک خاص طاقت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بچی کو بچانے کی کوشش میں وہ جادوگرنی جل کر مر گئی۔ جس کے بدلے بستی کے بڑے بدمعاش نے مجھے وہیں قتل کرنے کا حکم سنایا۔ علاقے کے دوسرے ڈان نے اچانک کارروائی کر کے مجھے بچا لیا۔ اس نے مجھے اپنے اڈے پر قید کیا جہاں ہر طرف منشیات ہی منشیات تھی۔ میں اسے اس کے تمام تر بُرے ارادوں کے ساتھ ختم کرنے اور اس کے منشیات کے ذخیرے کو آگ لگا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو ہی رہی تھی کہ ایک افسر کے ہتھے چڑھ گئی۔ جہاں اس کے کرپٹ افسر نے مجھے آپاجی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ وہ آپاجی مجھے ٹرین میں ملی تھیں اور مجھے بہت اچھی لگی تھیں مگر درحقیقت آپاجی عصمتوں کی سوداگر تھیں۔ مجھے ان کے بنگلے پر ہر قسم کی تربیت فراہم کر کے امیروں کا دل خوش کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ آپاجی نے ایک رات مجھے ایک بارسوخ شخص کے محل پہنچا دیا۔ جہاں بڑی مشکلات اور جان لیوا کوشش کے بعد میں اسے چھری مار کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ میں جان بچانے کے لیے اندھادھند دوڑ رہی تھی کہ بڑی سڑک پر دوڑ لگا دی جہاں سامنے سے آنے والی کار کی ٹکر نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ یہ حادثہ میرے لیے زندگی کی نوید بن گیا۔ وہ گاڑی ڈاکٹر علی چلا رہے تھے۔ جو مجھے پہلے اسپتال اور پھر بابا کے پاس لے گئے۔ بابا کے گھر آ کر میری زندگی بدل گئی۔ ان پر ہونے والے قاتلانہ حملے میں میری کوشش اور بہادری نے ان کی جان بچانے میں

مدد کی۔ یہی ان سے میرا پہلا تعارف تھا جس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا، ان کی زندگی کی کہانی مجھ سے کچھ عجیب نہیں تھی۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہیں وہاں ایک کروڑ پتی یہودی ابراہام کی بیٹی سے محبت ہوگئی تھی۔ اس محبت نے بالآخر شادی کا روپ دھارا، ابراہام مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کے نہ ماننے اور مسلسل دھمکیوں کی وجہ سے وہ دونوں پاکستان آگئے۔ یہاں ان کی زندگی بہت شاندار اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔ اللہ نے انہیں ایک بیٹی سونیا عطا کی مگر اسی دوران ابراہام کے غنڈے ان کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں ان کی جان بچانے کی کوشش میں مریم نے اپنی جان دے دی اور وہ لوگ سونیا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بابا بمشکل اس غم سے کھڑے ہوئے اور اپنی بیٹی کی تلاش میں لندن پہنچے۔ کسی طرح وہ ابراہام کے محل میں گھسنے اور سونیا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ اسے لے کر باہر آ گئے تھے مگر آخری لمحوں پر ابراہام اور اس کے لوگوں نے انہیں شدید زخمی کر کے سونیا کو ان سے چھین لیا۔ وہ ان کو مار ہی ڈالتے مگر ان کے دوست نے کسی طرح انہیں بچایا اور پاکستان بھیج دیا۔ ابراہام کے محل سے انہیں دو خفیہ فائلیں ملی تھیں جس سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ ابراہام کے پاس موجود تمام دولت مریم کی ماں کی ملکیت تھی اور اس نے اس دولت کو مریم یا اس کی اولاد کے نام کر رکھا تھا۔ سونیا کے 25 سال کی ہونے تک وہ اس کا ولی تھا مگر اسے یہ ثابت کرتے رہنا تھا کہ مریم یا سونیا میں سے کوئی ایک اس کے پاس موجود ہے ابراہام سونیا کو اسرائیل میں کسی نامعلوم مقام پر لے گیا مگر بابا سے اس کا جھگڑا جاری تھا۔ بابا نے مجھے تعلیم د تربیت سے نکھارا، وہاں ان کے علاوہ ڈاکٹر علی اور کریم موجود تھے۔ کریم ایک فلسطینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے پورے خاندان کو یہودیوں نے مار ڈالا تھا اور بابا اسے کیمپ سے ساتھ لائے تھے۔ وہ فوج میں میجر رہا تھا۔ مارشل آرٹ کا ماہر تھا اور اب فوجی ٹریننگ کی ایجنسی چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر علی بابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ ماں باپ کے حادثے میں انتقال کے بعد اس کی ذمے داری بابا نے لے لی تھی۔ اب ان دونوں کے ساتھ میں بھی اس گھر کا فرد بن چکی تھی۔ ابراہام کے بابا کو ایک فون نے ہم سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بابا کو بتایا کہ اب وہ جلد ہی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے والا ہے اور یہ سب کرنے کے لیے اس نے ان کی بیٹی سونیا کو (جسے وہ مریم کہہ رہا تھا) تیار کیا ہے یہ سب وہی کرے گی۔ کریم اس معاملے کو فوراً مقتدر حلقوں تک لے گیا تھا انہی دنوں سڑک پر ایک بھکارن کے مشکوک انداز پر میں نے اس کا پیچھا کیا وہاں سے ملنے والا ایک سکہ مجھے فخرالدین کے دفتر لے گیا۔ وہ اور وہ بھکارن تاشی موساد کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہم نے ان کے کئی منصوبے ناکام کیے۔ اس دوران تاشی نے زہریلی گیس کے ذریعے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی مگر آخری لمحے پر کریم اور علی نے مجھے بچا لیا۔ پھر کریم کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب ہماری ان سے کھلی جنگ تھی۔ فخرالدین پکڑا گیا مگر غضنفر نے دلاور کے ذریعے اس کو قتل کرا دیا۔ ہم تینوں کو اس معاملے سے ہٹانے کے لیے غضنفر نے بابا کو بیگو استاد کے ذریعے اغوا کروایا مگر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ اور بابا کو چھڑا لیا گیا۔ اس دوران ہم نے ایک سراغ پر محنت کر کے تاشی کو پکڑ لیا اور اسے خفیہ ایجنسی کے دفتر پہنچا دیا۔ تب ہی مجھے معلوم ہوا کہ کریم بظاہر فوجی ٹریننگ ایجنسی چلا رہا ہے مگر وہ انڈر کور فوج ہے اور خصوصی خفیہ مشن پر کام کرتا ہے۔ تاشی کے غائب ہونے پر زورین اور غضنفر نے میرے اغوا کا فیصلہ کیا۔ ہمارے گھر کے باہر کیمرا لگایا گیا۔ اغوا کی اس کوشش میں وہ ناکام رہے اور سب کے سب کریم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ایک منصوبے کے تحت تاشی کو فرار ہونے میں مدد دی گئی۔ وہ ایک منچلے سے لفٹ لے کر اس کے گھر پہنچی جہاں غضنفر نے اسے ختم کرنے کے لیے دلاور کو بھیجا۔ تاشی وہاں ماری گئی، مقامی ٹیم کی مسلسل ناکامی کی وجہ سے ابراہام نے سونیا کو پاکستان بھیجا۔ شینا ایٹمی ہتھیاروں کی جانکاری کے لیے وہاں کے ایک اعلیٰ ترین افسر سے دوستی کرتی ہے بالآخر پکڑی جاتی ہے۔ تلاشی کے دوران اس کا فون پھٹ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ ابراہام کی ٹیم بھی جونز کی سرکردگی میں شہر میں موجود ہے وہ اس کی مدد سے پورٹ پر کیمیکل کے ذریعے سیکڑوں لوگوں کی موت کا باعث بنتے ہیں۔ اس پر ابراہام سے جھگڑے کے بعد سونیا گھر سے نکلی اور میری گاڑی سے اس کا حادثہ ہو گیا۔ میں اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ وقتی طور پر یادداشت کھو چکی تھی۔ دوسری طرف ابراہام نے خفیہ ایجنسیوں کی وجہ سے اس کی تلاش رکوا دی اور پہلی ٹیم نے تمام کام کرنے والوں کو گراؤنڈ کر دیا۔ دوسری جانب ابراہام کے لیے کام کرنے والا ڈیوڈ بابا جی بن کر ہزاروں افراد کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ انہوں نے 8 دہشت گردوں کی مدد سے بڑے فوجی چھاؤنی میں گھس کر اسلحہ خانہ، ائربیس پر قبضہ کر لیا اور اسٹاف کو یرغمال بنا کر ایٹمی ہتھیار حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہاں مجھے دلاور اور غضنفر نے اغوا کر لیا مگر اپنی خاص صلاحیت کی وجہ سے مجھے بہت جلد ہوش آ گیا اور میں غضنفر کو اٹھا لانے میں کامیاب رہی۔ فوجی چھاؤنی کے معاملے میں کریم کو بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ کریم اور اس کی ٹیم بالآخر چھاؤنی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اسی اثنا میں ابراہام اپنی کارروائی کو تیز تر کر دیتا ہے۔ شہر میں بم بلاسٹ ہوتے ہیں اور کافی تعداد میں ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ میں اسی مقام پر پرویز نامی لڑکے کو گرفتار کروا دیتی ہوں۔ انسپکٹر شمشیر اسے گرفتار کر کے تفتیش کرتا ہے۔ اور اس کی نشاندہی پر ڈاکٹر سلمان اور جمو کو گرفت میں لے لیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔
جو کچھ اس کے سامنے تھا، اس کا ان تمام حالات و معاملات میں اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ غصہ اس کی رگوں میں لہو کے مانند حرکت کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ جس سے وہ زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا، وہ وڈیو میں نہایت پُرسکون، مطمئن اور خوش نظر آرہا تھا جبکہ وہ اسے تڑپتا، سسکتا دیکھنا چاہتا تھا اور یہ لڑکی...... اس نے وڈیو روک کر اس کی تصویر کو دوبارہ ان لارج کیا۔ اس سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا تھا۔ کیا وہ اس کی بیٹی تھی؟ مگر پھر خود اس کے ذہن نے اس سوال کو رد کردیا۔ اس کی آخری معلومات کے مطابق اس نے دوبارہ شادی نہیں کی تھی تو پھر یہ کون تھی؟ جس نے ان سب کو پریشان کررکھا تھا۔
''اور یہ نااہل لوگ...... ناکارہ......'' وہ بڑبڑایا۔
''ان میں سے کسی نے آج تک مجھ سے اس کے بارے میں ذکر تک نہیں کیا...... اور مریم...... وہ تو ہمیشہ سے اس کے لیے پرابلم چائلڈ ہی رہی تھی۔ اپنی ماں کی طرح مسائل کھڑے کردینے والی...... 'مگر ان میں فرق ہے۔' اس کے دل نے اس کی تصحیح کی۔ اس کی بیٹی مریم اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرتی تھی۔ شادی کے فیصلے کے علاوہ اس نے کبھی اپنی من مانی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی ماں ... کے مانند نرم اور خاموش مزاج تھی۔ اس سے خوف زدہ رہنے والی مگر پھر ان ہی دونوں نے اسے اس کی زندگی کی بدترین شکستوں سے بھی ہمکنار کیا تھا، اس کا ذہن بولا۔ 'ایک نے کب اپنی ساری جائداد اپنی اولاد یا اس کی اولاد ورنہ ٹرسٹ کے نام کردی، یہ اسے معلوم ہی نہیں ہوسکا۔ اس وقت یہ سب اس کے لیے بہت اہم تھا اور مریم نے شادی اور مذہب تبدیل کرکے اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ سزا تو خیر ان دونوں کو ہی مل گئی تھی۔ سونیا کو اس نے خود موت کے شعلوں کے سپرد کیا تھا اور مریم اس کے بھیجے ہوئے افراد کی گولی کا نشانہ بنی تھی۔ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا بس اسے اس شخص سے دور کرکے اس کی نافرمانی کی سزا دینا چاہتا تھا مگر یہ تو وہ تھی جس نے اس فضول شخص کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دینے کی حماقت کرڈالی تھی اور اب یہ سونیا...... اس میں ماں کی شکل و صورت کے ساتھ خود ابراہام کا غصہ اور ضد بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اگر وہ اس ساری صورتِ حال کو اس کے سامنے لے آتی تو شاید حالات بہتر ہوتے۔ اب تو اسے لگ رہا تھا کہ شاید وہ بھی کسی ایجنسی کے ہاتھ لگ گئی ہے۔
بہرحال اب جو بھی تھا، اس نے سر جھٹکا، اب یہ اس کی ذاتی جنگ تھی، اسے یہ سب ٹھیک کرنا تھا اور اس سب کے لیے وہ روزین پر بھروسا نہیں کرسکتا تھا، اسے اس سب کے لیے وہاں کسی نہایت طاقتور شخص کی ضرورت تھی۔ کئی لوگ اس کی نظر میں تھے مگر وہ یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ اُبھری اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

فیروز سعید کو تیراکی بہت پسند تھی۔ اس وقت بھی اپنے محل جیسے گھر میں موجود اِن ڈور سوئمنگ پول کے نیم گرم پانی میں اپنے شوق کی تکمیل کررہا تھا۔
اس کا شمار ملک کے نامور کاروباری افراد میں ہوتا تھا۔ پیسا اس کا پہلا عشق تھا۔ پیسا اور ڈھیر سارا پیسا اس کی زندگی کا مقصد تھا اور اس کے حصول کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا تھا۔ آدمی ذہین تھا یوں اس کی دولت میں دن دونی رات چوگنی اضافہ ہوتا جارہا تھا مگر اس کے ذوق و شوق میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کے کئی کاروبار تھے مگر سب سے بڑا کاروبار کرسی کا غیر قانونی دھندا اور زمینوں پر قبضے کا تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ کس طرح پیسا کماتا ہے مگر اس کے باوجود اس کی پہنچ ملک کے تمام مقتدر افراد تک تھی۔ وہ سب اس کی شاندار بلکہ عظیم الشان دعوتوں میں نہایت ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے اور کسی بھی قسم کے ''مسئلے'' کا سامنا کرنے پر اس کی خدمات بھی حاصل کرتے تھے اور وہ بھی منہ مانگی قیمت پر (جو ضروری نہیں کہ پیسا ہی ہو) انہیں مکھن سے بال کی طرح اس مسئلے سے باہر نکال لاتا تھا۔
وہ تیرتے تیرتے اب کچھ تھکن سی محسوس کررہا تھا اس لیے آج وقت سے کچھ پہلے ہی پول سے باہر آگیا۔ جہاں کئی ملازم اس کی خدمت کے لیے مامور تھے۔
''یہ...... یہ کیسا ٹاول ہے؟'' وہ سامنے کھڑے ملازم کے ہاتھ سے تولیا لیتے ہوئے غرایا۔
''سر...... یہ...... یہ آپ کے لیے......'' ملازم ہکلا کر رہ گیا۔
''فرید کہاں ہے؟'' وہ دہاڑا۔ ''کیا اسے نہیں معلوم کہ میں رنگین تولیے استعمال نہیں کرتا؟'' اس کی آواز بلند ہوتے ہی فرید نامی ادھیڑ عمر ملازم چراغ کے جن کے مانند

باہر آ گیا۔

''صاب...... میں معافی چاہتا ہوں، آپ کے لیے کافی تیار کرنے گیا تھا...... یہ نیا ہے، غلطی سے یہ تولیا اٹھا لایا...... یہ لیجیے آپ کا تولیا۔'' اس نے سفید رنگ کا امپورٹڈ قیمتی تولیا اس کی جانب بڑھایا۔ اُس کے چہرے پر بھی گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

''جب تم جانتے ہو کہ ایسی کوئی بھی بات میرا موڈ خراب کر دیتی ہے تو اس کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟'' وہ جھڑک کر بولا۔ ''نئے ملازمین کی صحیح طرح ٹریننگ کے بعد انہیں میرا کام دیا کرو۔''

''جی صاب...... دوبارہ یہ غلطی نہیں ہو گی۔'' فرید گھگیاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کہیں تو میں اسے فارغ کر دیتا ہوں؟''

اس کے سوال پر فیروز نے سامنے کھڑے نوجوان کی جانب دیکھا۔ وہ واضح طور پر لرز رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کی ملتجی نگاہیں فرید پر جمی تھیں۔ فیروز کی جانب دیکھنے کی تو اس میں ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

''کیوں؟ کام کرنا چاہتے ہو یہاں؟'' فیروز نے براہِ راست اسے مخاطب کیا۔

''جی صاب...... صاب آئندہ کوئی غلطی نہیں ہو گی۔ بہت شرمسار ہوں...... بہت بہت ضرورت مند ہوں صاب......'' وہ بھیگی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

''دیکھو جو بھی تمہارا نام ہے......''

''صاب اکرم......'' وہ بولا۔

''ہاں اکرم...... یہ کوئی یتیم خانہ یا ایدھی سینٹر تو ہے نہیں...... ضرورت مند کا راگ میرے سامنے مت الاپنا...... صحیح کام کرو، حواسوں میں رہو اور آنکھیں کان کھلے رکھو تب ہی یہاں کام کر سکو گے۔''

''میں کروں گا صاب...... جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی......'' اس نے پوری یقین دہی کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک ہے پھر...... آزمائیں گے تمہیں بھی...... فرید اس کی ٹریننگ کرو...... نکالنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اس کے اندر جانے کے بعد اکرم نے اطمینان کی سانس لی اور فرید کی جانب دیکھا۔

''خوش قسمت ہے تو...... ورنہ اتنا غصہ آنے کے بعد صاب کسی کی نہیں سنتے۔'' فرید بولا۔ ''آئندہ کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے ورنہ تیرے ساتھ میں بھی نکالا جاؤں گا۔''

''نہیں ماموں، اب میں بہت محتاط رہوں گا۔'' اکرم نے جواب دیا۔

''یہ محتاط ہوا تو......؟'' فرید نے اسے گھُرکا۔ ''تجھے سمجھایا نہیں ہے کہ یہاں کسی کو ہمارے رشتے کا علم نہیں ہونا چاہیے...... ورنہ تجھے نوکری نہیں مل پائے گی اور میں بھی پھنسوں گا۔''

''ج...... جی......'' اس نے سر ہلایا اور دونوں عمارت میں داخل ہو گئے۔

''اب سر نہ ہلا...... ہاتھ چلا...... کچن میں خانساماں کے پاس جا کر کوئی کام دیکھ، میں کافی تیار کرتا ہوں۔ صاب کو ریڈی ہوتے ہی کافی درکار ہو گی۔''

فیروز سعید کی عادتیں اور معمولات میں کچھ چیزیں طے شدہ تھیں اور ان میں کسی قسم کا ردوبدل اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ یہ اس کے کافی پینے کا وقت تھا جس کے بعد اس کا دن شروع ہوتا تھا۔ اپنی پسندیدہ ریکلینر میں بیٹھ کر کافی کا سپ لے کر کپ اس نے میز پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس محل نما گھر میں اکیلا رہتا تھا، اس کی بیوی کافی عرصہ پہلے کینسر کا شکار ہو کر موت کی وادی میں جا سوئی تھی۔ ایک بیٹا تھا جسے اس نے خود ہی تعلیم کے لیے امریکا بھیجا اور پھر اسے وہیں سیٹ کرا دیا تھا۔ یوں تنہائی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ وہ جب چاہتا جیسا چاہتا، ساتھی اسے میسر آ جاتا تھا۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت کافی تھا۔ کام کاج کے لیے ڈھیروں ملازم تھے یوں زندگی چین سے گزر رہی تھی۔ آج وہ کوئی خاص پروگرام بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری بیل پر اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، اسکرین پر ایک انٹرنیشنل نمبر نظر آ رہا تھا، اس نے سیل کو کان سے لگا لیا۔

''فیروز سعید......'' دوسری جانب سے ایک بھاری آواز میں اس کا نام لیا گیا۔ آواز اور لہجہ کچھ شناسا سا تھے مگر وہ اسے پہچان نہیں پایا۔

''کون بات کر رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''لو...... تو تمہیں یاد نہیں رہا حالانکہ دو ماہ قبل نیویارک میں ہم نے کافی وقت ساتھ گزارا تھا اور تم نے اس علاقے میں ہر کام میں اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا تھا۔''

''اوہ...... آپ ابراہام بول رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل میں ابراہام ہی بات کر رہا ہوں بس آج کچھ بوجھو تو جانیں کھیلنے کا موڈ ہو گیا۔'' اس نے ہلکے سے قہقہے کے

ساتھ کہا۔

''ارے واہ...... یقین کیجیے آپ کی آواز سن کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے یاد رکھا، یہ سوچ کر خوشی دوبالا ہوگئی۔ آپ نے مجھے کال کرنے کے قابل سمجھا یہ میرے لیے عزت افزائی ہے محترم ابراہام......'' فیروز نے خوش دلی سے کہا۔ وہ امریکا اور لندن دونوں جگہ اس شخص کی دولت، پہنچ اور طاقت کا اندازہ کر چکا تھا ایسے میں وہ اس کے لیے کوئی بڑا فائدہ بن سکتا تھا۔ ''کیسے ہیں آپ؟ اور میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''سب اچھا ہے...... تم جانتے ہی ہو کہ ہمیں سب اچھا رکھنا خود آنا چاہیے تب ہی سب کچھ آپ کے کنٹرول میں رہتا ہے۔''

''بالکل سچ ہے، بہت اعلیٰ بات کی آپ نے۔'' وہ دل کھول کر سراہتا ہوا بولا۔

''مجھے یاد ہے کہ تم نے نیویارک کی آخری ملاقات میں شکایت کی تھی کہ ہم تمہیں کوئی موقع نہیں دیتے ورنہ تم بہت کچھ کر سکتے ہو...... تو یوں سمجھ لو کہ آج موقع کا موقع آ گیا ہے۔''

''واقعی...... یہ تو زبردست بات ہے، آپ حکم کریں صرف...... جو کچھ چاہیں گے لمحوں میں آپ کے سامنے ہو گا۔'' فیروز نے کہا۔

''وہ تو یوں بھی ہوتا ہی ہے۔ اس کے لیے مجھے تمہیں کال کرنے کی ضرورت نہیں...... تم جانتے ہو کہ ہمیں دنیا میں سب کچھ اپنے حساب سے ٹھیک رکھنے کے لیے مسلسل کام کرنا پڑتا ہے...... تمہارے بارے میں، میں سب کچھ جانتا ہوں...... مجھے تمہارے ملک میں اپنے معاملات صحیح کرنے کے لیے ایک اچھا ساتھی درکار ہے، میرا خیال ہے کہ تم ہمارے کام کے آدمی ہو۔'' وہ بولا۔ ''اب یہ تم پر ہے کہ تم اس خیال کو حقیقت بننے دیتے ہو یا یہ گمان ہی رہ کر ختم ہو جاتا ہے۔''

''آپ صرف حکم کریں...... میں ہر حد تک جا کر آپ کا کام کرنے کو تیار ہوں۔'' فیروز سعید بولا۔

''سوچ لو...... ہو سکتا ہے کہ یہ کام تمہارے ملک کے خلاف ہو؟''

''یہ تو میں سمجھ ہی گیا ہوں۔'' فیروز مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جب میں آپ سے پہلی بار ملا تھا اسی وقت سے میں یہ جانتا تھا کہ آپ بہت اونچی چیز ہیں...... میرے کچھ دوست ہیں جو کبھی کبھار کوئی کام دیتے ہیں مجھے...... آپ ان سے جان سکتے ہیں کہ فیروز زبان کا پکا ہے اور یہ بھی کہ اسے جیتنے کی عادت ہے...... اس لیے وہ جس کام میں ہاتھ ڈال دے، اسے کر کے چھوڑتا ہے۔''

''گڈ...... لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' ابراہام نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''سر...... انسان اکیلا پیدا ہوا ہے، اسے اپنا خیال پہلے رکھنا چاہیے...... رہ تو وہ کہیں بھی سکتا ہے۔'' فیروز نے جواب دیا۔

''گڈ...... تمہارے بارے میں ہماری معلومات اور تجزیہ صحیح ثابت ہوا، تم ہمارے کام کے آدمی ہو، فکر نہ کرو...... تمہیں اس کام کا معاوضہ تمہاری سوچ سے بھی بہت زیادہ ملے گا۔'' ابراہام اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے اب ملکی حکومت میں کوئی کردار چاہیے...... بہتر اور طاقتور......'' وہ بولا۔ ''ویسے تو یہاں سب دوست ہیں اور پیسا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر میرے یہ بظاہر دوست ہی میرے آگے آنے سے خوف زدہ ہیں اور میرے راستے کی رکاوٹ ہیں۔''

''فکر نہ کرو...... تمہارا طاقت میں آنا ہمارے لیے بھی بہتر ہوگا اس سے ہماری مشترکہ طاقت میں اضافہ ہوگا...... اور یہ کرنا ہمارے لیے ذرہ بھر بھی مشکل نہیں، اگر تم اپنے کام کے پکے نکلے تو تم اگلے سال اس ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ایک ہو گے۔ اگر کہیں تم نے غداری کی، دھوکا دیا یا کچھ بھی غلط کرنے کی کوشش کی تو پھر تمہیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔'' وہ صفاکی سے بولا۔

''میں ایسا کبھی نہیں کروں گا اور آپ اس بات کو آزما سکتے ہیں۔''

''گڈ...... تو پھر اس آزمائش سے کام کا آغاز کرتے ہیں۔'' ابراہام بولا۔ ''میرے دو آدمی اس وقت پولیس کی حراست میں ہیں، وہ میرے لیے اہم ہیں...... کیا تم انہیں وہاں سے نکال سکتے ہو؟''

''پولیس...... بالکل نکال سکتا ہوں۔ اگر آپ تھوڑی تفصیل بتا سکیں تو اور بہتر ہوگا۔''

''تفصیل کچھ دیر میں مل جائے گی جو اب تک معلوم ہوا ہے وہ بھی بتا دیا جائے گا۔'' ابراہام نے کہا۔ ''یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کام میں سب سے اہم کام ہوتا ہے...... مجھے وہ دونوں بندے بالخصوص جیمز لازمی طور پر درکار ہے...... انتہائی ناکامی کی صورت میں ان کا منہ بند کرنا ہو گا۔''

''میں سمجھ گیا ہوں، میں پہلے آپشن پر کام کروں گا انتہائی مجبوری میں دوسرا آپشن استعمال کروں گا......مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کام کل تک ہو جائے گا۔''

''سوچ لو فیروز......''

''سوچ لیا سر......آپ بالکل مطمئن ہو جائیں، اب باقی تمام باتیں اس کام کے بعد ہی کروں گا میں۔ کیونکہ لفظوں سے اہم عمل ہوتا ہے، میرا عمل آپ کو یقین دلا دے گا کہ آپ کا انتخاب غلط نہیں ہے۔''

''بہتر......تم سے ابھی کوئی رابطہ کرے گا اور ساری تفصیلات سے آگاہ کرے گا۔'' ابراہام نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

فیروز اس کا فون بند ہونے کے بعد بھی ایک لمحہ تعظیماً فون پکڑے رہا پھر اسے میز پر رکھ دیا۔ یہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے لیے تو کسی خواب کی تعبیر جیسا تھا۔ وہ سال میں ایک بار تو کم از کم امریکا جاتا ہی تھا وہاں کے مقتدر اداروں اور تھنک ٹینک وغیرہ کی تقریبات میں شرکت بھی کرتا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ طاقت کے حصول کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہیں دو تقریبات میں اس نے ابراہام اور اس کے اثر و رسوخ کو دیکھا تھا پھر آخری سفر میں وہ کافی دیر اس کے ساتھ بھی رہا تھا۔ وہ صرف ایک امیر شخص تھا، ایک بڑے اور بااثر تھنک ٹینک کا روحِ رواں تھا یا اس کے ساتھ ساتھ کسی خفیہ بڑے عہدے پر بھی فائز تھا۔ یہ وہ نہیں جانتا تھا مگر جو وہ جانتا تھا، وہ یہ تھا کہ نیویارک، واشنگٹن اور لندن کی اعلیٰ سطحی تقریبات میں لوگ اسے بادشاہ گر کہتے تھے اور اس سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھ کام کر کے وہ اپنے مزید خوابوں کی تعبیر حاصل کر سکتا تھا۔ یہ موقع بار بار ملنے والا نہیں تھا اور آج جب قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو رہی تھی تو اس کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔

وہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ پولیس کے حوالے سے اپنے تمام ''کانٹیکٹس'' پر غور کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس طرح اپنا کام نکال سکتا تھا مگر ابراہام جیسے شخص نے اسے یہ کام دیا تھا تو یقیناً جو بھی ہوگا وہ کوئی بڑے لیول کا مسئلہ تو ہوگا ہی اور اسے حل کرنے کے لیے اسے پوری پلاننگ کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ فون کی گھنٹی کے دوبارہ بجنے تک وہ اپنا لائحہ عمل کسی حد تک طے کر چکا تھا۔ اس فون سے اسے بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ دوسری جانب کوئی خاتون تھیں جس سے اسے معلوم ہوا تھا کہ ان کے مطلوبہ لوگ ڈی آئی جی انوسٹی گیشن شمشیر علی کی کسٹڈی میں تھے اور ان کے نام جیمز اور ڈاکٹر سلمان تھے۔ اب باقی کام اسے خود کرنا تھا۔ وہ ابراہام سے چوبیس گھنٹے میں اس مسئلے کے حل کا وعدہ کر چکا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے جو بھی کرنا تھا، راکٹ کی رفتار سے کرنا تھا۔ اس کے پاس وقت کم تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

''رفیق مجھے ڈی آئی جی انوسٹی گیشن شمشیر علی کے بارے میں سب کچھ جاننا ہے؟ کس کیس پر کام کر رہا ہے۔ آج کے پورے دن میں اس کی مصروفیت کیا ہیں، اس وقت وہ کہاں ہوگا اور یہ بھی کہ وہ کیسا آدمی ہے؟ تم سمجھ رہے ہونا اس کی پوری معلومات مجھے فوری درکار ہیں۔'' اس نے کال ریسیو ہوتے ہی کہا۔ ''اس کے لیے تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔'' اس نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی۔ اب وہ دوسرا نمبر ملا رہا تھا۔ دوسری جانب بیل جا رہی تھی مگر فون ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل سے پڑ گئے۔ دو بیلز مزید بجنے کے بعد اس نے کال کاٹ دی۔ فون بند ہونے کے دو لمحات بعد فون پھر بج اٹھا۔

''کہاں مر گئے تھے تم؟'' وہ کال ملتے ہی غرایا۔

''نیند میں بھی یہ یاد رکھو کہ میرا فون تمہیں دو تین گھنٹیوں پر اٹھا لینا ہے۔'' وہ سختی سے بولا۔ ''الرٹ رہنا......آج رات تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اور کال کاٹ دی۔ اس سب میں اس کی کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے میز کے ساتھ موجود گھنٹی پر انگلی رکھی۔

''جی صاب......'' دو لمحوں میں فرید اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''کافی گرم کر لو......'' وہ بولا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کے ہاتھ میں کافی کا تازہ کپ تھا۔ وہ بہت اطمینان سے سپ لے کر اپنی کافی ختم کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا؟ ضروری لوگوں کو اس نے جگا لیا تھا اور جس جادو سنگی سے وہ سب مسحور ہو جاتے تھے اس کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ اس نے فون اٹھایا۔ اس بار وہ کال نہیں ملا رہا تھا۔ اس نے اسکرین پر دکھتے ایک ایپ کو دبایا جو اسے خفیہ اسکرین تک لے گیا یہاں اسے دو بار پاس ورڈ کا استعمال کرنا پڑا۔ اب اس کے سامنے اس کا ایک اکاؤنٹ تھا۔ اس نے چند بٹن دبائے اور دو مخصوص اکاؤنٹس میں بھاری رقوم ٹرانسفر کر دیں۔ اس کے کام کو پہیے لگ گئے تھے۔ اسے بس اب اپنی انگلیاں چلانی تھیں باقی ساری کٹھ پتلیوں نے اس

کے ترتیب دیے ہوئے اسکرپٹ پر عمل کرنا تھا۔ ٹرن کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کے موبائل پر شکریہ کا پہلا پیغام چمکا۔ چند ہی لمحوں بعد دوسرا پیغام بھی موصول ہو گیا تھا۔ وہ مسکرایا اور کافی کے کپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ دوسری بار کافی سے محرومی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا اس نے کپ ہونٹوں سے لگایا۔ اس کا دماغ مسلسل حرکت میں تھا اور اس کی نظریں گھڑی پر تھیں، اسے جلد از جلد اس کام کو ختم کرنا تھا۔

☆☆☆

آج مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔'' میں نے چائے کے کپ کو میز پر رکھتے ہوئے گویا اعلان کیا۔

''اپنا گھر...... وہ ایدھی صاحب والا؟'' علی نے معصومیت سے پوچھا۔

''جی نہیں...... اپنا گھر جسے چھوڑ کر ہم یہاں آئے ہیں۔'' میں نے اسے گھورا۔ بابا دلچسپی سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ آج تمام دن میں اور بابا گھر پر ہی رہے تھے۔ کچھ دیر سونیا سے بھی بات چیت ہوئی تھی۔ علی اسپتال گیا تھا مگر بابا کے خیال سے جلد لوٹ آیا تھا۔ اس وقت ہم تینوں کافی عرصے بعد ایک ساتھ رات کے کھانے اور پھر چائے کا لطف اٹھا رہے تھے۔

''تو آپ کو یہاں کیا تکلیف ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی تکلیف نہیں مگر گھر پھر بھی یاد آتا ہے۔'' میں بولی۔ ''تمہیں نہیں آتا یاد...... تم نے تو مجھ سے بہت زیادہ وقت وہاں گزارا ہے۔''

''ہاں بالکل یاد آتا ہے۔'' اس بار وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''مگر میں سچ بتاؤں، میرے لیے گھر میری فیملی ہے جہاں بابا، کریم اور تم موجود ہو تو وہ جگہ گھر ہے، باقی کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ارے بابا علی ایسے بھی بول سکتا ہے۔'' میں نے حیرت کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''بول سکتا ہوں کیونکہ میں اس فیملی کے علاوہ دنیا میں کچھ بھی کھو دوں، مجھے کچھ زیادہ غم نہیں ہوگا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔ ''ہاں اگر بات میری فیملی پر آجائے تو پھر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے بیٹا۔'' بابا اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ''اور سچ بھی یہی ہے ہاں مگر جہاں بہت وقت گزرا ہو وہ جگہ بھی دل کے قریب ہو جاتی ہے......'' ابھی الفاظ ان کے ہونٹوں میں ہی تھے کہ صائمہ کی تیز آواز اور پھر چیخ کی آواز نے ہم سب کو گڑبڑا دیا۔

''کیا ہوا ہے صائمہ......؟'' میں نے بلند آواز میں کہا اور تیزی سے آواز کی سمت دوڑی۔ علی اور بابا بھی میرے پیچھے تھے۔ اس کی آواز بابا کے کمرے کی طرف سے آئی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو وہ کمرے کے درمیان کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا صائمہ......'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''وہ...... وہ بی بی......'' وہ ہکلائی۔

''ارے بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس کا بازو پکڑ کر پوچھا۔

''وہ...... وہ شاید مر گئی ہو گی۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کون مر گئی ہو گی...... کیا کہے جا رہی ہو؟'' میں اس بار تیز آواز میں بولی۔

''کیا ہوا بیٹا...... تم پہلے خود کو سنبھالو...... کیا کوئی گھسا ہے اندر؟ میں سیکیورٹی کو بلاؤں؟'' بابا نے شفقت سے پوچھا۔

''نن، نہیں بڑے صاب......'' وہ بولی۔ ''وہ...... وہ دیکھیے...... یہاں......؟'' اس نے بابا کے بستر کے دوسری جانب اشارہ کیا تو ہم تینوں بیک وقت اس جانب بڑھے۔ دو قدم آگے جا کر جو منظر ہمارے سامنے تھا، اس نے دو لمحوں کو میرے حواس بھی گم کر دیے تھے۔ بابا کے چہرے کا رنگ زرد سا پڑ گیا تھا۔ ان کے بستر کی دوسری جانب سونیا زمین پر الٹی پڑی ہوئی تھی اس کے بائیں بازو کے قریب ایک ریوالور موجود تھا اور وہ عجیب آڑھے ترچھے انداز میں زمین پر گری ہوئی تھی۔

''سونیا......'' میں لپک کر اُس کے قریب پہنچی۔ اس کی گردن پر مخصوص جگہ پر اپنی انگلیاں رکھیں اور گہری سانس لے کر اسے سیدھا کیا۔ وہ زندہ تھی۔

اسے بستر پر لٹانے میں میری مدد کرو۔'' میں نے صائمہ سے کہا۔ علی اتنی دیر میں اپنا باکس لے آیا تھا۔ اس نے اس کا معائنہ کیا اور پھر پاس پڑے پانی کے گلاس میں سے چند قطرے اس کے چہرے پر ڈالے۔ بالآخر اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

''شکر اللہ کا......'' اسے ہوش میں آتا دیکھ کر بابا بولے۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو تم؟'' علی نے اس کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''مم میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بمشکل بولی۔ ''میں یہاں کیسے آ گئی؟''

''یہ تو تمہیں بتانا چاہیے...... تم اپنے کمرے میں سو رہی تھیں اور اب ہمیں بابا کے کمرے میں بے ہوش ملی ہو۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''تم کو یاد ہے کچھ اس بارے میں؟''

''نہیں، مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔'' وہ بولی۔

''اٹس اوکے، اب تمہیں اپنے ذہن پر اتنا بھی زور دینے کی ضرورت نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ بگڑ جائے۔'' علی مجھے اشارہ کرتے ہوئے سونیا سے بولا۔ ''ایسا ہو جاتا ہے کبھی کہ انسان کو یاد نہیں رہتا تم تو پہلے ہی ایک پریشانی سے گزر رہی ہو...... اب کیسا محسوس کر رہی ہو...... کوئی گھبراہٹ تو نہیں ہے؟''

''نن نہیں...... سوری مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' وہ اُلجھتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ رات کافی ہو رہی ہے، سونیا کو اپنے کمرے میں جانا چاہیے...... کیوں بابا؟'' علی نے کہا۔

''میں ان کی دوا لے کر آتا ہوں۔'' علی کی بات سن کر وہ بستر سے کھڑی ہو گئی تھی۔

''ہاں بیٹا تم آرام کرو اور ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔'' بابا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحوں تک اُلجھے ہوئے انداز میں وہیں کھڑی رہی پھر دروازے کی جانب بڑھی۔ صائمہ اس کے ساتھ تھی۔

''تم چلو میں بھی آ رہی ہوں۔'' میں نے نرمی سے اسے کہا۔

''ہاں تم اسے دیکھ لو اور پھر آرام کرنا...... میں تو خود گھبرا گیا تھا۔'' بابا نے کہا۔

''بابا یہ آپ کا ریوالور ہے؟'' میں نے زمین سے ریوالور اٹھا کر بابا کی جانب بڑھایا۔

''ہاں یہ میرا ریوالور ہے، بیڈ سائڈ میں رہتا ہے۔ شاید اس نے وہیں سے اسے نکالا ہوگا۔'' وہ بولے۔

''مگر یہ خطرناک ہے اور پھر اس کا اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آنا...... درازوں سے سامان نکالنا اور وہ بھی ریوالور...... یہ سب مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' میں نے بمشکل اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میں جانتی تھی کہ شاید میری سوچ بابا کو پسند نہ آئے مگر موجودہ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ کسی بھی بات کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

''تمہاری فکر بجا ہے بیٹا مگر وہ خود اپنے قابو میں نہیں ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اگر اس کی یادداشت واپس ہی نہیں آئی تو اس کا کیا بنے گا؟ کیا یہ ساری عمر اسی طرح اندھیرے اُجالے میں ڈولتی رہے گی۔''

''ایسا نہیں ہوگا بابا۔'' علی نے دوبارہ اندر آتے ہوئے کہا۔ ''اس کی یادداشت کسی بھی وقت واپس آ سکتی ہے۔ اس دوران کا وقت ظاہر ہے کہ اس کے لیے مشکل ہے مگر اسے اس کے ساتھ جینے کی عادت تو کرنا ہی پڑے گی نا۔''

''اب کیسی ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''بہتر ہے، میں نے اسے انجکشن دے دیا ہے شاید اب تک سو بھی چکی ہو۔ صائمہ وہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے بیٹا اب تم لوگ بھی آرام کرو۔'' بابا نے کہا، وہ قدرے پریشان لگ رہے تھے۔

''بابا آپ پریشان نہ ہوں پلیز وہ ٹھیک ہے، یہ جو کچھ ہے یہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔'' علی ان کے قریب آ کر بولا۔

''میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کیا پتا یادداشت کی واپسی کے بعد میں اسے دوبارہ دیکھ بھی پاؤں یا نہیں مگر میری دعا یہی ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے، وہ سونیا ہے اس کے امکانات تو یوں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں مگر انسان تو ہے...... تم بھی میرے لیے پریشان نہ ہو، میں اس وقت سے واقف ہوں اور اس کے لیے تیار بھی۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔ ''چلو اب تم دونوں بھی بھاگو...... اب میں سونا چاہتا ہوں۔''

''آپ میرے بہادر بابا ہیں۔'' میں نے بابا کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

دلاور گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی چھٹی حس اسے مسلسل خطرے کے سگنل دے رہی تھی۔ سجاد کے قتل کے بعد اس نے ایک بار جمیز اور زورین سے رابطے کی کوشش کی تھی مگر اس کی کال ریسیو ہی نہیں ہوئی تھی نہ ہی بعد میں ان دونوں میں سے کسی کی کال آئی تھی۔ وہ گیسٹ ہاؤس میں قید رہ رہ کر تھک چکا تھا۔ اسے اس سب سے نکلنے کا صرف ایک ہی حل نظر آ رہا تھا۔ اسے کسی بھی طرح یہاں سے نکل جانا تھا۔ فی الحال فوری طور پر ملک سے کہیں باہر جانا ممکن نہیں تھا مگر وہ کسی چھوٹے شہر میں جا کر کچھ عرصے گمنامی اور خاموشی کی زندگی جی سکتا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ رقم موجود تھی مگر یہ اس کے حساب سے ناکافی تھی۔ یوں تو اس

کے بینک میں کچھ رقم موجود تھی مگر وہ یہ خطرہ لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں اس کی الماری میں موجود خفیہ خانے میں ایک بڑی رقم موجود تھی۔ اگر کسی طرح وہ اس رقم کو حاصل کر پاتا تو اگلا پورا سال اور اگر کفایت سے کام لیتا تو دو تین سال تک وہ کہیں بھی سکون سے رہ سکتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے علم میں نہیں تھا کہ غضنفر اس کے بارے میں کیا کچھ بتا چکا ہوگا، اگر وہ اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے تھے تو پھر یقیناً اس کے اپارٹمنٹ پر ان کی نظر ہو سکتی تھی۔ ایسی صورت میں وہاں جانا آ بیل مجھے مار کے مصداق تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا......

اس خیال پر وہ جتنا غور کر رہا تھا، اتنا ہی اسے وہ بہترین حل محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بالکل برابر والے اپارٹمنٹ میں ایک ریٹائرڈ پرنسپل رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کے انتقال کے بعد سے وہ وہاں تنہا ہی رہ رہی تھیں اگر وہ کسی طرح ان کے گھر میں پناہ لینے میں کامیاب ہو جائے تو پھر کسی وقت اپنے گھر میں داخل ہو سکتا تھا اور پھر رقم لے کر وہ وہاں سے نکل جاتا۔ 'اگر کوئی اس کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کر بھی رہا ہوگا تو وہ تمام فلیٹوں پر نظر تو نہیں رکھ رہا ہوگا۔' اس نے سوچا۔ وہ جتنا اس منصوبے پر غور کر رہا تھا وہ اسے اتنا ہی قابلِ عمل اور آسان محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر مزید غور وخوض کے بعد اس نے اس پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا اور ضروری سامان لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں اس نے ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی جس سے اس کی یہاں موجودگی کا شائبہ تک ہو سکے۔ اپنے حلیے میں اس نے قدرے تبدیلی کر لی تھی۔ وہ بلڈنگ میں داخل ہوا تو گیٹ پر موجود چوکیدار نے اسے آواز دی۔ وہ ایک لمحے کو ساکت سا ہو گیا تھا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' اس کے مڑنے پر اس نے پوچھا۔

''ففتھ فلور پر اشرف صاحب کے گھر جانا ہے۔'' اس نے دو فلور اوپر رہنے والے ایک صاحب کا نام لے لیا۔ چوکیدار اسے پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔

''ٹھیک ہے صاحب......'' وہ سر ہلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

دلاور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت وہاں خاصی چلت پھرت رہتی تھی جو دلاور کے لیے اچھا کیموفلاج تھی۔ وہ چند بچوں کے ساتھ ساتھ چلتا سیڑھیوں تک پہنچا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر عمارت کی پارکنگ تھی۔ اگر کوئی اس کے اپارٹمنٹ پر نظر رکھے ہوئے تھا تو اس کے لیے بہترین جگہ پارکنگ میں کھڑی گاڑی ہو سکتی تھی۔

سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی رفتار بڑھائی اور دوسری منزل پر پہنچ کر تیزی سے مسز فضل کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے اس کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ وہ ساٹھ سال سے اوپر کی خاتون تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر تھکن اور چڑچڑاہٹ نظر آ رہی تھی۔

''آرڈر کہاں ہے؟'' اس نے اسے کھڑا دیکھ کر دریافت کیا۔

''کیسا آرڈر......؟'' دلاور نے بے اختیار پوچھا۔

''تم کھانے کا آرڈر دینے نہیں آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''پھر کون ہو، کیا کام ہے؟''

''میں یہ دینے آیا تھا؟'' اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر ایک بار چاروں جانب دیکھا اس وقت یہاں اس فلور پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے بیگ سے ہاتھ باہر نکالا اور مسز فضل کو دھکا دے کر فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ اندر گھستے ہی اس نے مڑ کر دروازے کو بند کر کے لاک کر لیا تھا۔

''ک ک کون ہو تم؟ کیوں میرے گھر میں گھسے ہو؟ چور...... ہیلپ...... چور......'' وہ اس کے دھکے سے لڑکھڑا کے پیچھے ہوئی تھی مگر پھر خود کو سنبھالتے اور چلاتے ہوئے گیلری کی جانب لپکی۔ دلاور نے تیزی سے اسے پکڑنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ پھسل کر زمین پر جا گری مگر اس وقت بھی وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ دلاور نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تو اس نے اس کے ہاتھ کو اپنی نقلی بتیسی سے جکڑ لیا۔

''اوف...... تم یوں نہیں سمجھو گی۔'' وہ غرایا اور اسے گھسیٹتا ہوا اندر کمرے کی جانب لے جانے لگا۔ وہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔

''آواز بند ورنہ گلا گھونٹ دوں گا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''آہوں، اوں......'' وہ مسلسل خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دلاور نے اس کے منہ پر جمے ہاتھ کو مزید سختی سے دبایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن کو پکڑ کر مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ ایک لمحے میں اس کی تمام مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے دلاور کی جانب دیکھا اور پھر بے جان ہو کر اس کے ہاتھوں میں جھول گئی...... دلاور نے منہ بنا کر اسے وہیں چھوڑ دیا اور خود

کچن میں جا گھسا اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پانی پی کر باہر آیا تو مسز فضل کی بے جان نگاہیں اسے گویا خود کو گھورتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ جھٹکے سے کھڑا ہوا اور ان کی لاش کو پیروں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا بیڈروم میں لایا اور وہیں زمین پر چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے اب اندھیرا ہونے کا انتظار تھا اس صورت میں وہ اپنا کام بہ آسانی کر سکتا تھا۔ اس دوران وہ ایک کپ چائے کا تو پی ہی سکتا تھا، اس نے سوچا اور کچن کی جانب بڑھا عین اسی وقت کال بیل بج اٹھی۔ دلاور ایک لمحے کے لیے پریشان ہو گیا پھر اسے خیال آیا کہ وہ کھانے کے آرڈر کا انتظار کر رہی تھی۔ یقیناً دروازے پر وہی تھا۔ اس نے دروازہ نہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ ڈیلیوری بوائے چند بار بیل بجا کر واپس چلا گیا تب دلاور نے سکون کی سانس لی۔ فریج میں اسے پیزا کے کچھ ٹکڑے اور کھانے پینے کا دیگر سامان مل گیا۔ اس نے کھانا کھا کر اطمینان سے چائے بنائی پھر دستانے پہن کر وہاں سے اپنی موجودگی کے نشان مٹائے اور لاؤنج میں رکھے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

اندھیرا پھیلتے ہی اس نے اپنے آپریشن کا آغاز کر دیا۔ مسز فضل کے ایک بیڈروم کی بالکونی اس کے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے ملی ہوئی تھی۔ گھر میں داخلے کے لیے وہ اسے ہی استعمال کرنے والا تھا چونکہ یہ دونوں بالکونیاں پچھلی جانب کھلتی تھیں اس لیے وہاں زیادہ آمدورفت بھی نہیں تھی یوں وہ دروازے کا بھی استعمال کر سکتا تھا مگر اسے خوف تھا کہ شاید اس طرح وہ نگرانی کرنے والوں کو اگر وہ واقعی موجود تھے، خبردار کر سکتا ہے۔ یوں بھی کوریڈور میں لوگوں کی آمدورفت مسلسل جاری تھی۔ اس نے وہاں سے نکلنے سے قبل مسز فضل کی الماری سے ان کے طلائی زیورات نکال کر اپنے بیگ پیک میں ڈال لیے اور کمرے میں سامان بکھرا دیا۔ وہ اس سب کو ڈکیتی اور قتل کی واردات کا رنگ دینا چاہ رہا تھا۔ پورا منظرنامہ تیار کر کے وہ بالکونی کی جانب بڑھا۔

''گڈ بائے آنٹی......'' اس نے زمین پر پڑی مسز فضل کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور بالکونی کی دیوار پر پیر جما کر اپنی بالکونی کی گرل کو مضبوطی سے تھام لیا۔ صرف چند لمحوں میں وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھا۔ اس نے بیگ پیک سے گھر کی چابیاں نکالیں، بالکونی کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحے تک وہ اپنے گھر کے تمام کمروں میں گھوم کر گھر کو دیکھتا رہا، اسے اپنا گھر بہت پسند تھا اور اس نے اسے نہایت عرق ریزی سے سجایا تھا۔ قیمتی اینٹیکس، خوب صورت سنگ

فرنیچر سے بھی اس کی یہ جنت اب اسے چھوڑنی ہی تھی۔ اسے غضنفر پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ اس کی بات مان لیتا تو نہ وہ لڑکی بھاگنے میں کامیاب ہوتی نہ وہ پکڑا جاتا اور نہ ہی اسے اس طرح بے گھر ہونا پڑتا۔'' موقع ملتے ہی وہ اس لڑکی کو کھوج نکالے گا اور اس سے اس ساری تکلیف کا انتقام ضرور لے گا۔'' اس نے گویا اپنے آپ سے عہد کیا۔

جائزے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ الماری کے نیچے زمین کے ہم رنگ دراز اس کا خفیہ خانہ تھی۔ اس کی چابی وہ الماری میں لٹکے ایک خصوصی کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا کرتا تھا۔ اب بھی وہ چابی وہیں موجود تھی۔ اس نے چابی نکالی اور خفیہ خانہ کھولا، اس میں خاصی بڑی رقم موجود تھی۔ اس نے روپوں کی گڈیوں کو بیگ میں ڈالنا شروع کیا۔ اس نے چند گڈیاں ہی اندر رکھی تھیں کہ اس کے حساس کانوں میں کسی کھٹکے کی آواز سنائی دی، اس کے ہاتھ رک گئے اور اس کی ساری حسیات سماعت میں ڈھل گئیں۔

یہ یقیناً مرکزی دروازے کے کھلنے کی آواز تھی۔ اس نے بیگ پیک کو کندھے پر ڈالا اور دروازے کے قریب پہنچ کر باریک سی جھری سے لاؤنج میں جھانکا وہاں اس کے بدترین خدشات اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ دو افراد باقاعدہ چابی کے ذریعے دروازہ کھول کر اندر آ چکے تھے اور خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں نے جس مشاقی سے ریوالوروں کو تھام رکھا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ان کے لیے نیا کام نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ چور نہیں تھے یعنی اس کے گھر کی نگرانی جاری تھی اور اتنی سخت احتیاطی تدابیر کے باوجود انہیں اس کی آمد کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے مڑ کر اپنے کمرے کی بالکونی کو دیکھا اور پھر نہایت بے آواز انداز میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے اوپر لگی چٹخنی کو چڑھا دیا، اگر ان کے پاس اس گھر کی چابیاں موجود تھیں تو پھر اس کا قیمتی امپورٹڈ لاک اسے وقتی طور پر بھی بچانے کے قابل نہیں تھا مگر دروازے پر لگی مضبوط مگر پرانے انداز کی چٹخنی بہرحال اس کے لیے کچھ وقت کی مہلت فراہم کر سکتی تھی۔

''وہ اندر ہے...... کمرے میں......'' باہر موجود افراد نے اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود دروازہ بند ہونے کی آواز سن ہی لی تھی۔ وہ دونوں اس کمرے کی جانب لپکے تھے۔ دلاور کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ریوالور نکال کر ان دونوں کو اڑا دے مگر فی الحال یہ اس کے مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس

نے مڑ کر الماری کی جانب دیکھا اور تیزی سے بڑے نوٹوں والی مزید چار گڈیاں اپنے بیگ میں ڈالیں اور بالکونی کی جانب بڑھا اب اس کے پاس خفیہ خانے کو بند کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ بالکونی میں پہنچ کر وہ گرل پر چڑھا اور ساتھ موجود خوب صورت رنگوں سے سجے مضبوط پائپ پر پیر جما کر نیچے اترنے لگا۔ وہ اس معاملے میں بندروں کی طرح ماہر تھا۔ وہ تیزی سے پھسلتا ہوا نیچے اترا اور دوڑتا ہوا سڑک کی طرف بڑھا جہاں چند قدموں کے فاصلے پر اس کی گاڑی موجود تھی۔ وہ اپنی گاڑی تک پہنچ کر مڑا تو اسے بالکونی میں دو سائے نظر آئے۔ اب وہ ان کے فائر کی حد سے باہر تھا اور جب تک وہ نیچے اتر کر باہر آتے وہ یہاں سے بہت دور نکل چکا ہوتا۔ وہ ان کی بے بسی پر مسکرایا اور بیگ کو پچھلی نشست پر ڈال کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا...... وہ ابھی پوری طرح کار کے اندر بیٹھا بھی نہیں تھا کہ یکایک ایک موٹر سائیکل عین اس کے دروازے کے برابر میں رکی۔ اس پر دو افراد موجود تھے جن میں سے ایک کا چہرہ ہیلمٹ سے ڈھکا ہوا تھا جبکہ دوسرے نے سر پر کیپ اور منہ پر سیاہ ماسک پہن رکھا تھا۔ پچھلی سیٹ والا بائیک رکتے ہی بجلی کی سی تیزی سے اترا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا، اس نے اپنی پشت سے کچھ نکالا اور اگلے ہی لمحے ایک سیاہ بدصورت ریوالور کی نال عین اس کی پیشانی کے سامنے آموجود ہوئی۔ ''نکالو...... جو کچھ تمہارے پاس ہے نکالو'' وہ لڑکا تیزی سے بولا۔ وہ خود سخت ٹینشن میں محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا......؟ کون لوگ ہو تم......؟'' دلاور بولا، اسے اپنے پیچھے آنے والوں کی پریشانی تھی اور اوپر سے یہ عذاب نازل ہو گیا تھا۔ اس کا ریوالور اس کی جیب میں تھا مگر فی الحال وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

''تم نے سنا نہیں...... جیب خالی کرو...... بٹوا اور موبائل اور ہاں وہ بیگ بھی جو تم نے پیچھے ڈالا ہے...... جلدی ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔'' وہ بولا۔

''لو...... یہ پرس اور موبائل لے لو۔'' اس نے جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا کر رہے ہو، کیا کر رہے ہو؟'' اسے جیب کی جانب ہاتھ لے جاتے دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔

''پرس اور موبائل نکال رہا ہوں۔'' دلاور نے جواب دیا۔

''اور بیگ...... وہ بھی نکال جلدی......'' وہ غرایا۔

''اس میں کتابیں اور رپورٹس ہیں پلیز اسے چھوڑ دو۔ اس میں تمہارے مطلب کا کوئی سامان نہیں ہے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''ہمیں سکھا مت...... نیچے اتر...... سامان دے...... گاڑی سے دور ہٹ جا۔'' وہ احکامات جاری کیے جا رہا تھا اور ہاں کار کی چابی بھی دے...... ہمیں کوئی فلمی سین نہیں چاہیے۔''

دلاور اس کے چہرے پر نظریں جمائے کار سے باہر آیا اور جیب میں ہاتھ ڈالا جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں بھی ریوالور موجود تھا۔ ریوالور دیکھ کر وہ دونوں بگڑ گئے۔

''تو پاگل ہے...... دھوکا دیتا ہے۔'' موٹر سائیکل سوار غرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کرتا، دلاور نے ٹریگر دبا دیا مگر اسے ان کے بارے میں اندازہ لگانے میں ہلکی سی چوک ہو گئی تھی۔ اس کے ٹریگر دبانے سے قبل باہر کھڑے ہوئے ماسک مین نے بھی گولی چلا دی تھی۔ وہ گولی چلا کر تیزی سے ایک جانب ہٹا تھا۔ دلاور کے نپے تلے نشانے نے بہرحال اس کے بازو کو نشانہ بنا لیا تھا اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹا نہ ہوتا تو گولی یقیناً اس کے سینے کے پار ہو جاتی مگر اس کی چلائی ہوئی گولی سیدھی دلاور کے دل میں پیوست ہوئی تھی۔ اسے ایک زوردار جھٹکا سا لگا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے وجود میں کسی نے جلتا ہوا انگارا ڈال دیا ہو جو اس کی رگوں میں آگ پھیلاتا ہوا گزر رہا ہو...... اس نے بے یقینی سے اپنے سینے کی جانب دیکھا جہاں سے خون تیزی سے برآمد ہو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا جو اس کے ساتھ ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور ٹھک کی آواز کے ساتھ سڑک پر جا گرا، اردگرد موجود لوگ اب تیزی سے اس کی جانب آرہے تھے۔ کچھ لوگ اس سارے منظر کی لائیو کوریج میں بھی مصروف تھے۔ دلاور نے اپنی بے نور ہوتی آنکھوں سے لوگوں کے ساتھ ساتھ دو افراد کو بھی تیزی سے گاڑی کی سمت آتے دیکھا، ان کے ہاتھوں میں بھی ریوالور موجود تھے مگر اب اسے کسی بھی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ ریوالور گرنے کے بعد اس کے دونوں ہاتھ سینے پر آجمے تھے جہاں سے اٹھنے والا درد ہر لمحہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اب اس کے لیے سانس لینا ایک مشکل کام ہو رہا تھا۔ اس کے گھٹنے اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے مڑ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑے بیگ کی جانب دیکھنا چاہا مگر ممکن نہیں ہو سکا۔ وہ کسی کٹے ہوئے درخت کے مانند لہرا کر سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی بے نور

نگاہیں اب آسمان کو تک رہی تھیں اور وہ اپنی اصل منزل کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے کے اندر فیروز سعید کے پاس شمشیر اور اس کیس سے متعلق تمام معلومات پہنچ چکی تھیں۔ اس میں پولیس ڈپارٹمنٹ میں موجود اس کے دوستوں اور نمک خواروں دونوں طرح کے افراد کی کاوشیں شامل تھیں۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ دونوں کس جگہ پر ہیں اور ان کے ساتھ کون کون ڈیوٹی پر مامور ہے۔ اس سارے کام کے لیے اسے اپنے ٹھنڈے کمرے سے باہر قدم تک نہیں رکھنا پڑا تھا اور یہی اس کی طاقت تھی۔ اب اسے دو اہم کام کرنے تھے جن میں سے ایک کے لیے وہ اپنے ایک خاص کارندے کا منتظر تھا۔

''صاب......'' فرید کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''صاب...... فخر آگئے ہیں، کیا میں انہیں یہاں لے آؤں یا پھر انتظار کرنے کو کہوں؟'' جواب میں فرید نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''بلاؤ اُسے، میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔'' فیروز نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں بعد فرید کے ساتھ ایک گہری سانولی رنگت والا پستہ قامت شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سفید رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ چہرے سے ہی وہ سخت مزاج نظر آرہا تھا مگر جب وہ بولا تو اس کا انداز نہایت مؤدبانہ تھا۔

''آپ نے مجھے طلب کیا تھا مالک؟''

''ہاں، تم سے ایک ضروری کام ہے، کام کچھ خاص ہے اور تمہارے لیے تو روز کا کام ہے۔'' فیروز فرید کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس نے فخر احمد کو بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ ''خاص بات وقت ہے یعنی مجھے یہ کام کل صبح کی روشنی ہونے سے قبل ختم کرنا ضروری ہے۔''

''آپ حکم کریں...... آپ جانتے ہیں کہ میں اس کی تعمیل کروں گا۔''

''ہم...... فخر اس اسپتال میں ایک لڑکا پولیس کی تحویل میں موجود ہے۔ یہ ان کا خاص گواہ ہے، زخمی ہے مگر اس کی سخت نگرانی ہو رہی ہے۔ کسی کا اس تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔'' وہ ایک پرچی اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''صاحب کیا اُسے اڑانا ہے؟ آپ حکم دیں میں اس کا راستہ نکال لوں گا۔'' فخر نے جوش کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

''فخر بات کو پوری طرح سن لو۔ اسے اُڑانا نہیں ہے بلکہ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہیے۔ اسپتال کے پتے کے نیچے ایک اور پتا ہے، یہ اس کے گھر کا پتا ہے جہاں اب تک کی معلومات کے مطابق اس کی بیمار ماں موجود ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اسے اس کے لڑکے کے بارے میں تفصیلات معلوم ہیں یا نہیں مگر ایک ماں کو اس کی اولاد سے ملنے کے لیے روکنا مشکل ہے۔ تمہیں اس کی ماں سے ملنا ہے اور اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے بات کرے۔ اسے اپنے بیان سے منحرف ہونا ہے، جب اسے بلایا جائے تو وہ ہر بات سے انکار کردے۔ اس کے لیے تم ان کے موجودہ مسائل حل کر سکتے ہو، انہیں اچھا خاصا پیسا دو اور دھمکی بھی کہ اگر یہ کام نہ ہوا تو پھر کیا ہو سکتا ہے، یہ انہیں واضح طور پر بتا دینا۔''

''ٹھیک ہے باس، میں ابھی نکلتا ہوں۔ اس کی ماں سے مل کر اسے سب سمجھانے کے بعد اسے اسپتال لے جاؤں گا تاکہ وہ بے چاری اپنے بیٹے سے مل لے اور اسے تیار بھی کردے...... آپ اجازت دیں تو جب تک وہ اپنا بیان نہیں دے دیتا ہم اس کی ماں اور بہن بھائیوں کو اپنے پاس مہمان بنا کر رکھ لیں گے۔'' اس نے کہا۔ خباثت اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

''گڈ آئیڈیا اس طرح اس پر شدید دباؤ پڑے گا...... یہ ٹھیک رہے گا، تم نکلو...... فرید تمہیں ضرورت کی رقم دے دے گا اس سے ملتے جاؤ...... مگر ان کے حصے کی رقم ان تک پہنچنی چاہیے، سمجھ گئے نا؟'' فیروز نے سرد لہجے میں کہا۔

''آپ مطمئن رہیں سرکار...... میں کامیابی کی خبر لے کر واپس آتا ہوں۔''

''آنے کی ضرورت نہیں...... ایک کال کر دینا۔'' فیروز نے بے پروائی سے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ فخر اس کام کو بخوبی سرانجام دے لے گا۔ اس نے ان کے لیے ایسی ایسی زمینوں سے قبضے ختم کرائے تھے جہاں ہر کوئی کوشش کر کے ہار چکا تھا۔ یہ کام اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اپنے سیل کی جانب متوجہ ہوا...... اس نے ایک نمبر ملایا، رابطہ ہوتے ہی وہ بولا۔

''جی شریف صاحب...... میرا پیغام تو آپ تک پہنچ گیا ہوگا، یہ میرے خاص دوستوں کا معاملہ ہے۔''

''بالکل پیغام مل گیا اور آپ کے بھیجے ہوئے پھول

بھی۔" وہ رقم کو پھولوں سے تشبیہ دیتا ہوا بولا۔ "آپ کے دوست ہمارے لیے نہایت محترم ہیں، آپ بالکل مطمئن ہو جائیں۔ ویسے معاملہ تھوڑا سخت ہے اور اس سے زیادہ شمشیر علی کے ساتھ مسئلہ ہے...... زیادہ تعلیم بھی ماتھا گھما دیتی ہے نا سر تو اس پر بھی ایمانداری وغیرہ کا بھوت سوار ہے۔ اس پر وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اس کے اردگرد اپنا جالا بُن دیں، وہ اپنی جگہ تلملاتا رہ جائے گا۔"

"جو بھی طریقہ اختیار کریں، وہ آپ کی مرضی ہے۔ میری نظر نتیجے پر ہے، مجھے کل صبح وہ دونوں لاک اَپ سے باہر چاہئیں صاف اور الزامات سے بری۔" وہ بولا۔ "اگر وہ اتنا ہی سر پھرا ہے تو ایف آئی آر وغیرہ نہ کٹ چکی ہو؟ اس کا خیال رکھیں...... کیا ہے کہ مسئلہ تو وہ بھی نہیں ہے مگر پھر قصہ طویل ہو جاتا ہے بلاوجہ...... اور میں کہتا ہوں کہ جو بھی فائدہ کسی دوسرے کو پہنچ رہا ہو، وہ اگر آپ کو ہی مل جائے تو کیا حرج ہے؟ آخر دوستوں کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"آپ کا شکریہ، آپ فکر نہ کریں...... میں نے آپ سے کہا نا میں نے متعلقہ لوگوں کی جانب معاملات شروع کر دیے ہیں۔ ایف آئی آر اب درج نہیں ہو پائے گی۔" وہ یقین سے بولا۔

"دیکھ لیں، آپ کے مقابل ایک ڈی آئی جی ہے۔" فیروز نے گویا اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"سر آپ جانتے ہیں کہ میں کچا کام نہیں کرتا...... اور آپ کے بھیجے ہوئے پھول بھی لوگوں پر سحر طاری کر دیتے ہیں۔"

"پھولوں کی فکر نہ کریں۔ اگر آپ کو مزید درکار ہوئے تو اور مل جائیں گے بس کام ہماری مرضی کا ہونا چاہیے۔" فیروز نے کہا۔ "مجھے اس کی رپورٹ دیتے رہیں۔"

"بالکل سر، میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔ آپ بے فکر رہیں آپ کے دوستوں کا کام ہو جائے گا۔"

وہ بساط بچھا چکا تھا۔ پیادے اپنی چال چل رہے تھے۔ بادشاہ، وزیر، رانی، فیل، گھوڑے سب قطار اندر قطار موجود تھے۔ چند چالوں کے بعد بازی اس کے ہاتھ آنے والی تھی۔ یہ وہ جانتا تھا پھر بھی وہ کوئی گھر خالی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ ڈیل اس کے اور اس کی زندگی کے لیے بہت اہم تھی جس کی وجہ سے وہ خود جاگ کر اس پورے کھٹ راگ کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے گلاس میں اپنا پسندیدہ مشروب نکالا اور ایک ہی سانس میں گلے میں اتار لیا......

آنے والے دنوں میں اس کی طاقت میں ''سُپر'' کا اضافہ ہونے والا تھا۔ یہ سوچ کر وہ مسکرایا اور سامنے چلنے والے نیٹ فلیکس پر آتی مووی پر نظریں جمادیں۔

☆☆☆

شمشیر جانتا تھا کہ اس نے سانپوں کے بل میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔

ان لوگوں کی پہنچ کے بارے میں بھی اسے کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کے پاس ایک ڈیڑھ دن سے زیادہ کا وقت تھا۔ اگر وہ اس دوران کسی ٹھوس ثبوت کے حصول میں ناکام رہا تو وہ ڈاکٹر اور جیمز کو قید میں نہیں رکھ سکے گا اور نہ ہی ان سے تفتیش کر پائے گا۔ ان کے ہاتھ کہاں تک لمبے ہوسکتے ہیں، یہ وہ جانتا تھا اور پھر ان ہاتھوں کا سلیہ پرویز کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرا کر اس پورے معاملے کو ہی گمشدہ کرسکتا تھا۔ اسی لیے وہ پہلے مضبوط قانونی کارروائی کا بندوبست کرنا چاہ رہا تھا۔

تھانے پہنچ کر اس نے سب سے پہلے ان دونوں کو ایک الگ حوالات میں بند کروایا۔ ڈاکٹر سلمان بالکل خاموش تھا۔ جیمز بھی منہ سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا مگر اس کی نگاہوں کا طنزیہ انداز شمشیر کا بلڈ پریشر ہائی کرر ہا تھا۔

''محمود......'' اس نے دفتر پہنچتے ہی انسپکٹر محمود کو طلب کیا۔

''جی سر......'' اس نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر ایڑیاں بجائیں۔

''محمود ان دونوں کے خلاف ایف آئی آر درج ہونی ہے......اس کام کو فوری طور پر نمٹالو۔''

''مگر سر...... کیا تھوڑی تفتیش نہ کر لی جائے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بھی ضروری ہے مگر ان کو اس کیس میں بُک کرنا سب سے پہلے ضروری ہے، تم وہی کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔'' شمشیر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے سر۔'' اس کے کمرے سے جانے کے بعد اس نے اسپتال میں موجود اسٹاف میں سے جاوید کا نمبر ملایا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد فون ریسیو ہوا۔

''جاوید تم ڈیوٹی پر موجود ہو؟'' اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''جی سر......'' وہ بولا۔

''پھر کال ریسیو کرنے میں اتنی دیر......؟''

''سر میں ملزم کے کمرے میں تھا۔'' وہ بولا۔

''کیوں؟ تم وہاں کیا کررہے تھے وہاں سب انڈر کنٹرول ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یس سر۔'' وہ بولا۔ ''اصل میں ملزم کے گھر پر سارے معاملے کی خبر ہوگئی تھی تو اس کی ماں یہاں آئی ہوئی تھی۔'' وہ بولا۔

''اس کی ماں؟ لیکن میں نے تم سے کہا تھا نا کہ بغیر اجازت کوئی بھی اس سے نہیں مل سکتا؟'' وہ غرایا۔

''ج...... جی سر...... اصل میں وہ بہت رو پیٹ رہی تھی پھر اس سے اس کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے پہلے اس لڑکے سے بھی معلوم کرلیا تھا۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

''کیا تم سارا وقت اس کے ساتھ رہے تھے؟'' شمشیر کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔

''نہیں سر......تھوڑی دیر ان دونوں کو تنہائی میں بات کرنے دی تھی۔ اصل میں وہ عورت بیمار تھی، روئے جارہی تھی اور ملزم بھی اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا۔''

''وجہ کچھ بھی ہو، تمہیں اس حوالے سے پہلے مجھے فون کال کرنی چاہیے تھی۔'' شمشیر کو اس سارے معاملے میں نہ جانے کیوں کچھ غلط نظر آرہا تھا۔

''سر، میں نے آپ کو ٹرائی کیا تھا، فون نہیں لگا تو انسپکٹر صاحب سے بات کی تھی۔ ان کی اجازت سے ہی ہم نے اسے اس کے کمرے میں وڑنے (داخل ہونے) دیا تھا اور اکیلے میں بھی بات کرنے کی اجازت دی تھی۔''

''اوکے، میں اس سے بات کرتا ہوں اور اب کسی کو بھی میری اجازت کے بغیر ملزم سے ملنے کی اجازت نہیں ہے تم سمجھ گئے نا؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل سر۔'' وہ بولا۔ شمشیر نے کال بند کردی۔

اسے نہ جانے کیوں شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہورہا تھا۔ اس وقت اس کے کانوں میں اس لڑکی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے اسی وقت اس کی توجہ اس لڑکی کی حفاظت کی جانب دلائی تھی حالانکہ اس نے اسے جان سے ماردینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آخر وہ تھی کون؟ اس نے سوچا۔ پھر چند لمحوں بعد اس سوچ کو ذہن سے نکال دیا۔ اسے فی الحال ان دونوں کو دیکھنا تھا۔ اسپتال میں ہونے والے ٹیسٹ نے اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ اس لڑکے کو ایک انتہائی زود اثر نشہ دیا گیا تھا جس کے بعد وہ ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوسکتا تھا۔ ان دونوں کو اس وقت ان کا اصل استعمال معلوم نہیں تھا مگر اس نشے کے بعد اگر انہیں

معلوم ہوتا تب بھی وہ اس کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ پرویز کا بیان ہر اعتبار سے سچ ثابت ہوا تھا اور اس نے ڈاکٹر کی شناخت بھی کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جیمز کو بھی پہچان لے گا۔ یہ لوگ شہر میں مزید دہشت گردی کے واقعات میں بھی ملوث ہو سکتے تھے۔ فی الحال تو ان بم دھماکوں میں ہی ستر سے زیادہ افراد مارے گئے تھے جو کوئی چھوٹا جرم نہیں تھا مگر اس سب کے باوجود ان کا اعتماد دیدنی تھا جس کا واضح مطلب تھا کہ انہیں اپنے بچ نکلنے پر یقین تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے تو یہ ناممکن تھا۔ اس نے سوچا اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔

''محمود...... ایف آئی آر کا کیا ہوا؟ اس میں پرویز کے بیان کو شامل کرنا ہے۔''

''جی سر ابھی شاہنواز آرہا ہے، سر یہ اسی کا کام ہے جیسے ہی وہ آتا ہے، میں اس سے یہ کرواتا ہوں۔''

''کیوں ایف آئی آر تو تم بھی درج کر سکتے ہو، اس میں کیا مسئلہ ہے؟'' شمشیر نے اسے گھورا۔

''سر یہاں کام کا رش ہے اور پھر شاہنواز بھی ہے، وہ بُرا مانے گا۔''

''یہاں کسی کی شادی ہو رہی ہے جو ہم اچھا بُرا منانے کی فکر کر رہے ہیں۔ میں نے تمہیں حکم دیا تھا اس پر اب تک عمل درآمد کیوں نہیں ہوا؟'' وہ دہاڑا۔ ''اور اسپتال میں اس لڑکے کی ماں سے اس کی ملاقات کی اجازت تم نے دی تھی؟''

''ج ج جی سر...... جاوید وغیرہ نے بتایا کہ وہ بہت بیمار ہے اور بہت رو رہی تھی تو میں نے انسانیت کے ناتے اجازت دے دی سر......''

''مگر میں نے تمہیں یوں تو کبھی انسانیت کا اس طرح احساس کرتے نہیں دیکھا......'' شمشیر نے اسے گھورا۔ ''اب اس معاملے کو میں ذاتی طور پر دیکھ رہا ہوں۔ تم میں سے کوئی بھی اس حوالے سے کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔''

''جی بہتر سر...... جیسا آپ کا حکم۔'' وہ بولا۔

''ایف آئی آر پر کام شروع کرو۔'' شمشیر نے کہا۔ ''میں ان سے ایک ملاقات کر کے آرہا ہوں پھر میں خود ایف آئی آر لکھواؤں گا۔''

وہ یہ کہہ کر خصوصی حوالات کی جانب بڑھ گیا۔ یہ کوئی عام تھانہ نہیں تھا۔ پولیس کا ایک سب ہیڈ آفس تھا جہاں انویسٹی گیٹو ٹیم کام کرتی تھی۔ اس ٹیم کی اپنی حوالات تھیں۔ شمشیر حوالات پہنچا تو وہ دونوں خاموشی سے ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ شمشیر کو دیکھ کر حوالات کا دروازہ کھول دیا گیا اور اسے بیٹھنے کے لیے کرسی فراہم کر دی گئی۔

''تو...... اب کیا کہتے ہو تم دونوں؟'' اس نے باری باری ان دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ دونوں خاموش رہے تھے۔ ''اور تم ڈاکٹر تم تو اپنا کچا چٹھا خود سنا چکے ہو۔ میں یہ تو جانتا ہوں کہ تم دونوں ہمارے ملک میں کیا تباہی پھیلاتے رہے ہو، اب میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سب تم کس کے لیے کر رہے ہو۔ کون تم لوگوں کے لیے اتنے مہنگے علاقوں میں اتنے بڑے گھر اور اس کے اخراجات فراہم کرتا ہے اور یہاں تمہارے ساتھ اور کتنے لوگ اس گھناؤنے کام میں شریک ہیں۔''

جواب میں وہ بالکل خاموش رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ تم اس طرح آرام و سکون سے گفتگو کو پسند نہیں کرتے کیوں نہ میں تمہیں ان لوگوں کے سپرد کر دوں جن کے لیے زبان کھلوانا بہت آسان ہے، کیوں ڈاکٹر سلمان تم تو اس مرحلے سے تھوڑا بہت گزر بھی چکے ہو۔'' وہ مسکرایا۔

''ہم میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

''کم از کم بولنا تو جانتے ہو...... تمہارا یہ ساتھی تو شاید یہاں آکر بولنا ہی بھول گیا ہے۔''

''دیکھیے ہمیں اپنے وکیل سے بات کرنے کی اجازت ہونی چاہیے اس کے بعد آپ......'' جیمز نے بولنا شروع کیا۔

''واہ تمہارے ہاتھوں پر تازہ ترین دیکھو تو ستر سے زیادہ لوگوں کا خون ہے، سیکڑوں زخمی ہیں، کیا اس کے بعد تمہیں یہ انسانی سہولیات بھی درکار ہیں؟'' شمشیر اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ''تم کن ہواؤں میں ہو مسٹر جیمز، ہمارے لوگوں کا خون اتنا سستا نہیں کہ تم اسے پانی...... سمجھ کر بہاتے رہو۔'' شمشیر نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا تھا۔

''تم بولو گے تمہارا تو باپ بھی بولے گا...... اگر تمہیں کسی پر کوئی یقین ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے بچا لے گا تو یہ غلط فہمی ہے تمہاری...... پرویز کی گواہی، اس ڈاکٹر سلمان کا بیان اور فون پر تمہارا دوڑا آنا تمہارے خلاف پکے ثبوت ہیں۔''

''تم اینگری ینگ مین مت بنو...... اور میری بات غور سے سنو۔'' جیمز اپنا کالر چھڑاتے ہوئے بولا۔

''تمہیں اپنے ہر عمل پر غور کرنا چاہیے، ایک ذمے دار

افسر ہو تم...... اس لیے جو بھی الزام لگاؤ...... سوچ سمجھ کر لگاؤ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ تمہارے سامنے کون ہے۔"
"تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟" شمشیر نے اچانک اس کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ اسے اس چیز کی بالکل امید نہیں تھی۔ گھونسا پڑتے ہی وہ الٹ کر زمین پر گرا، اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر خون کو چھوا پھر بے یقینی سے شمشیر کی طرف دیکھا جس نے جھک کر اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا تھا۔
"کیوں یقین نہیں آ رہا ہے کہ تمہاری رعایا میں سے کوئی تم سے اس طرح بھی کوئی سوال کر سکتا ہے؟" وہ غرایا اور اس کا بازو تیزی سے موڑ کر اس نے اس کی گردن کو لاک لگا دیا تھا۔ جیمز کو اس سے نہ صرف سخت تکلیف ہو رہی تھی بلکہ سانس بھی رک رک کر آ رہا تھا۔
"تت تم یہ نہیں کر سکتے۔" وہ بمشکل بولا۔
"کیسا کوڑھ مغز انسان ہے تمہارا یہ دوست......" اس نے اس کی گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے سلمان سے کہا۔
"میں یہ کر رہا ہوں، تم ہی اِسے سمجھاؤ۔"
"پلیز...... پ پلیز......" جیمز نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا۔
"کس کے لیے کام کرتے ہو تم؟ پہلے مجھے اس سوال کا جواب چاہیے۔" وہ اس کی گردن پر گرفت کو بڑھاتے ہوئے بولا۔
"آہ...... اوہ......" جیمز کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں برآمد ہو رہی تھیں۔
"کس کے لیے کام کرتے ہو؟" شمشیر نے دوبارہ سرد لہجے میں پوچھا۔
"بتا...... بتاتا ہوں...... بتاتا ہوں۔" وہ بولا۔ اس کے جواب پر شمشیر نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ جیمز اپنی گردن پکڑے اب بھی دوہرا ہوا تھا۔ شمشیر کے خطرناک داؤ نے اس کے ہوش اُڑا دیے تھے اور وہ اس مہلت کو بہت سمجھ کر اپنے ذہن میں جوابوں کے تانے بانے بُن رہا تھا۔
"ہاں تو تم جواب دے رہے ہو یا میں کوئی اور طریقہ آزماؤں؟" شمشیر کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔
"مم میں بتاتا ہوں...... پپ...... پانی...... پانی ملے گا؟" وہ کھانستے ہوئے بولا۔
"مل سکتا ہے مگر جواب کے بعد۔" شمشیر غرایا۔
"مم مجھے پانی چاہیے...... میرا سانس اکھڑ رہا ہے۔"

وہ گلا پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔
"اسے پانی دے دو پلیز...... ایسا نہ ہو کہ اسے کچھ ہو جائے۔" سلمان نے پریشانی سے کہا۔
"اسے کچھ نہیں ہو گا اگر اس نے سچ بولنا شروع کر دیا تو...... دوسری صورت میں کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔" شمشیر نے سرد لہجے میں کہا اور ہاتھ کے اشارے سے سپاہی کو پانی لانے کے لیے کہا۔
"کیوں جیمز...... تکلیف ہو رہی ہے۔ یقین جانو کہ بم دھماکوں میں ٹکڑے ہو جانے والوں کو اس سے زیادہ تکلیف پہنچتی ہے جیسا کہ تم نے اس لڑکے کے ساتھ کیا جس کے ہاتھ میں موبائل دے کر موت بانٹنے کے لیے روانہ کر دیا تھا۔" وہ تلخ انداز میں بول رہا تھا۔
"مم میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" وہ بولا۔
اتنی دیر میں سپاہی پانی کا گلاس لے آیا تھا جسے اس نے منہ سے لگا کر لمحہ بھر میں خالی کر دیا تھا۔
"لگتا ہے کہ تمہاری یادداشت کی واپسی کے لیے مجھے کوئی خاص کام کرنا پڑے گا۔" شمشیر بولا۔ "مگر اس سے پہلے ایک بات سمجھ لو اگر تمہیں یہ گمان ہے کہ تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی یہاں تمہاری مدد کر سکتا ہے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" وہ پیچھے کھڑے اے ایس آئی مقصود اور شاہد کی جانب مڑا۔ "یوں لگتا ہے کہ جیمز بابو کی سمجھ میں تمہاری بات زیادہ آسانی سے آ جائے گی...... تم لوگ ان سے ملاقات کرو جب یہ بولنے پر راضی ہو جائیں تو مجھے اطلاع کر دینا۔" یہ کہہ کر اس نے حوالات سے باہر قدم رکھا...... پھر مڑ کر دیکھا، سلمان کا چہرہ خوف سے سفید پڑا ہوا تھا جبکہ جیمز کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب خوف نظر آ رہا تھا اور یہی خوف وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مقصود کی جانب دیکھا اور پھر سیدھا چلتا چلا گیا۔

☆☆☆

کریم اپنی آخری میٹنگ سے فارغ ہو چکا تھا۔ اب اس کا یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ خود بھی جلد از جلد گھر پہنچنا چاہ رہا تھا۔ اگرچہ انہوں نے بہترین تربیت یافتہ، نہایت جدید آلات سے لیس بین الاقوامی طاقت رکھنے والے دشمن کو زیر کیا تھا۔ ان کے ناپاک ارادوں کو ڈاٹ صفر بٹا صفر فیصد بھی پورا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پورے علاقے میں ان کی تنظیم اور طاقت کو بھی اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہوئے تھے مگر اس کے باوجود کریم وہ

اطمینان محسوس نہیں کر پارہا تھا جو کسی مہم کے کامیاب ہونے کے بعد دل و دماغ کو میسر آتا ہے۔

''کریم تمہاری فلائٹ کتنے بجے ہے؟'' کرنل بلال نے اس سے پوچھا۔ اتنے دنوں میں ان کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

''شام سات بجے۔'' کریم نے بتایا۔

''تو اس میں تو ابھی سات آٹھ گھنٹے پڑے ہیں۔ اتنا وقت کہاں گزارو گے؟ اگر کوئی پروگرام نہیں ہے اور کہیں بزی نہیں ہو تو میرے ساتھ چلو۔'' وہ بولا۔

''کہاں جارہے ہیں آپ......؟'' کریم نے پوچھا۔

''نشانہ بازی کرنے......'' وہ سادگی سے بولا۔

''نشانہ بازی کہاں؟'' کریم نے اسی کے انداز میں پوچھا۔

''کلب میں...... یہاں کا شوٹنگ کلب ورلڈ کلاس ہے، تمہیں مزہ آئے گا۔'' وہ بولا۔ ''کیا کہتے ہو؟''

''اب آپ نے میرے شوق کو جگا دیا اب تو جانا ہی پڑے گا۔'' وہ ہنسا۔

''تو چلو پھر...... آج دنیا کے بہترین نشانہ باز کا انتخاب کر ہی لیتے ہیں۔'' کرنل بلال نے قہقہہ لگایا۔

''دنیا کچھ زیادہ نہیں ہو گیا۔ ملک کے بہترین نشانہ باز پر بات طے کرتے ہیں۔'' کریم نے کہا۔

''بھئی ہماری تو دنیا پاکستان ہی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''بات تو سو فیصد درست ہے آپ کی۔'' کریم مسکرایا۔

کرنل بلال سے چند دنوں میں اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ کرنل کے والد اور چچا فوجی رہے تھے اور ان تین بھائیوں میں سے بھی دو فوج میں تھے۔ وہ خود کو یوں بھی سرتاپا فوجی کہا کرتا تھا۔

کلب واقعی بہت شاندار تھا۔ وہاں بہترین رائفلز کے ساتھ نشانہ بازی میں انہیں بہت لطف آیا۔ وہ دونوں صرف آدھے گھنٹے کے لیے وہاں گئے تھے مگر وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب وہ وہاں سے نکلے تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔

''بہت لطف آیا، میں یہ دوپہر ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' کریم نے کہا۔

''ہمیشہ یاد رکھنے میں ویسے تو کوئی حرج نہیں مگر ہم دوبارہ اور پھر دوبارہ ایسی دوپہریں اور شامیں گزار سکتے ہیں یار زندہ صحبت باقی۔'' کرنل بلال نے کہا۔

''انشاء اللہ...... ویسے یہ مناظر بہت خوب صورت ہیں اور بادل تو یوں لگ رہا ہے جیسے نیچے ہی آ گئے ہوں۔''

''ہاں میں بھی اکثر یہاں آکر دوربین سے خالقِ کائنات کی صناعی کو قریب کر کے دیکھتا رہتا ہوں، بہت لطف آتا...... تمہیں دوربین دوں؟''

''ہاں اگر ہے تو......'' کریم نے کہا۔

''بالکل ہے۔'' کرنل بلال نے قیمتی جدید دوربین اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ کریم دوربین کا فلیپ ہٹا کر اس سے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا اچانک اسے تھوڑے سے فاصلے پر موجود عمارت پر کوئی نظر آیا۔ اس نے اسے زوم کیا تو ایک لمحے کو حیرت نے اسے اپنے شکنجے میں دبوچ لیا۔ وہاں اس چھت پر کوئی تھا جس نے ایک جدید رائفل اٹھا رکھی تھی۔ کریم کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے رائفل کو سیٹ کیا اور اس سے نشانہ لگانے لگا۔ کریم نے دوربین کو مزید سیٹ کر کے اس کی رائفل کو زوم کیا...... اس رائفل کا رخ کہیں اور نہیں ان دونوں کی جانب تھا، وہ بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور قریب کھڑے بلال کو زور سے دھکا دیا۔ وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اس لیے سیدھا زمین پر آرہا۔

''ارے، ارے کریم یہ کیا حرکت ہے؟ کیا ہوا ہے؟'' وہ زمین پر گرتے ہی بولا۔

بلال کو دھکا دے کر خود کریم بھی نیچے جھک گیا تھا۔ وہ ابھی بلال کے سوالوں کا جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ ان کے بالکل پیچھے موجود درخت میں کھٹ کی آواز کے ساتھ کوئی چیز تیزی سے پیوست ہو گئی۔

''فائر...... یہ...... یہ تو گولی ہے......'' کرنل بلال نے کہا۔

''جی ہاں بلال وہاں اُس عمارت کے اوپر کوئی اسنائپر سے ہمیں نشانہ بنا رہا ہے۔'' کریم نے کہا اور جیب سے ریوالور نکال کر تیزی سے جیپ کی جانب بڑھا۔ کرنل بلال اس کے پیچھے تھا۔ ان کی حرکت کے ساتھ ہی دو اور خاموش فائر ہوئے تھے مگر وہ انہیں نشانہ بنانے میں ناکام ثابت ہوئے تھے۔ بلال کے جیپ میں گھستے ہی کریم طوفانی رفتار سے گاڑی کو آگے لے گیا تھا پھر سڑک پر سے اس نے یوٹرن لیا اور آگے بڑھا۔ اس بار اس کی منزل دوربین میں نظر آنے والی عمارت تھی۔ وہ جیپ انڈر گراؤنڈ بنی پارکنگ کے اندر لیتا چلا گیا...... گاڑی روک کر وہ دونوں لفٹ کی جانب لپکے۔ لفٹ کی رفتار ان دونوں کو مایوس کر رہی تھی۔ کئی لمحوں بعد بالآخر وہ چھت پر پہنچ گئے تھے۔ ان دونوں کے

ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ چھت کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''یہ...... یہ کہاں غائب ہو گیا؟'' کریم بڑبڑایا۔

''بلال میں اِس طرف سے آتا ہوں، تم اُس جانب سے چکر لگاؤ۔'' بلال نے اس کے حکم کے مطابق چھت پر چکر لگایا۔ کریم دوسری جانب سے گھوم کر آیا مگر چھت بالکل خالی تھی۔ وہ نامعلوم اسنائپر وہاں سے گدھے کے سر سے کانوں کے مانند غائب ہو چکا تھا۔ انہیں یہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ چھ سات منٹ لگے تھے اور اتنا وقت بہت کافی نہیں تو بہت زیادہ کم بھی نہیں تھا۔ چاروں جانب سے دیکھ لینے کے بعد کریم نے بلال کی جانب دیکھا۔

''چوٹ ہو گئی ہے کرنل......'' الفاظ بلال کے منہ میں تھے کہ انہیں چھت کے دروازے کی جانب سے کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی اور پھر کوئی تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''یہاں کوئی موجود ہے کرنل...... وہ ابھی یہیں ہے۔'' بلال نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور پھر وہ آگے پیچھے دروازے کی جانب لپکے۔ انہیں سیڑھیوں کے پہلے اسٹرہیس پر کسی کی جھلک نظر آئی جس نے گٹار باکس جیسا لمبا سا باکس کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔

''اے...... ہے رک جاؤ......'' کریم نے زور سے کہا اور ایک قدم میں کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ جو بھی تھا نہایت تیز رفتاری سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ کریم پوری جی جان سے اس کے پیچھے تھا۔ بلال اس کے پیچھے تھا۔ بالآخر دوسری منزل پر اس نے اسے آلیا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس سے گھوما کریم اب اس کے اتنے قریب تھا کہ ہاتھ لمبا کر کے اسے پکڑ سکتا تھا مگر وہ بھی مسلسل تیزی سے سیڑھیاں اترتا جا رہا تھا۔ دوسری منزل پر گھومتے ہوئے حملہ آور کا پیر پھسلا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اتنی مہلت کریم کے لیے کافی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے بلند ہوا، اس کی سخت طاقتور لات حملہ آور کی پیٹھ پر لگی اور وہ کئی سیڑھیوں سے پھسلتا ہوا درمیان میں بنے سائڈ پر جا گرا، کریم اگلے ہی لمحے اس کے سر پر جا پہنچا تھا۔ اس نے اسنائپر کو کندھوں سے پکڑ لیا۔

''بس تمہارا کھیل ختم۔'' وہ اسے اپنی جانب گھماتے ہوئے بولا۔ وہ کوئی مقامی شخص تھا۔ ''کون ہو تم اور یہ کیا کر رہے تھے؟'' اس نے سختی سے پوچھا۔

جواب میں اس نے اپنا گھٹنا کریم کے پیٹ میں دے مارا، وہ اوغ کی آواز کے ساتھ جھکا تو اس کے ہاتھ سے اس کا بازو نکل گیا اور وہ تیزی سے آگے کی جانب بھاگا۔ اس کا تھیلا اب وہیں رہ گیا تھا۔ کریم اس کے پیچھے تھا، اچانک حملہ آور کا پیر رپٹا اور وہ سر کے بل پھسلتا ہوا نیچے جا گرا۔ کریم اور بلال بھی تیزی سے نیچے پہنچے۔ وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ کریم نے اس کے قریب پہنچ کر گہری سانس لی۔ وہ بے حس وحرکت اسی طرح آڑا ترچھا پڑا تھا جبکہ بلال پولیس اور ایمبولینس کو فون کر رہا تھا۔

☆☆☆

شمشیر اپنے دفتر میں واپس لوٹا تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جاوید اور اسٹاف کے کافی لوگ سیٹوں پر نہیں تھے۔ اسے دفتر میں کچھ عجیب سے معاملات محسوس ہو رہے تھے۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی سوچ رہا ہوں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ یوں بھی وہ مسلسل دو روز سے بھاگ دوڑ میں تھا۔ چند لمحے بیٹھنے کے بعد وہ گھر کے لیے نکل گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ جیمز سے کچھ اُگلوانا آسان نہیں تھا۔ یقیناً اسے اب صبح کے بعد ہی کوئی رپورٹ ملنے والی تھی۔ اتنی دیر کی نینداس کے اعصابی نظام کے لیے ٹانک کا کام کر سکتی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ بستر پر گرا اور پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔

اس کی آنکھ فون کی مسلسل بجتی گھنٹی سے کھلی تھی۔ گہری نیند سے آنکھ کھلنے کے بعد چند لمحے اسے خود کو بحال کرنے میں لگے۔ اتنی دیر میں فون بند ہو گیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا فون پر آئی جی کے نمبر دمک رہے تھے اس سے قبل کہ وہ نمبر ملاتا فون دوبارہ بج اٹھا۔

''شمشیر کیسے ہو...... جوان......؟'' دوسری جانب آئی جی صاحب تھے۔

''شکر الحمدُللہ سر...... معذرت چاہتا ہوں آپ کی کال مس ہو گئی۔ میں صبح آ کر سویا تھا تو آنکھ دیر سے کھلی۔'' اس نے سامنے لگی گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو کہ صبح کے دس بجا رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں، میں چاہ رہا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، تم میرے دفتر پہنچ جاؤ۔'' وہ بولے۔

''او کے سر۔'' شمشیر نے جواب دیا۔ ''میں پہنچتا ہوں۔'' اس کے جواب کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی تھی۔

آئی جی صاحب کی کال کا مطلب کوئی ایمرجنسی تھی۔ شمشیر فوراً ہی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اندازے سے کچھ زیادہ ہی دیر سو گیا تھا اور اب آئی جی صاحب کے دفتر

طلبی کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے دفتر نہیں جا سکتا تھا۔ رات کا اسٹاف یوں بھی اب رخصت ہو چکا ہوگا۔ کیس کے متعلق معلومات اب آئی جی کے دفتر سے واپسی کے بعد ہی حاصل ہو سکتی تھیں۔ وہ گیارہ میں پانچ کم پر آئی جی کے دفتر پہنچ گیا تھا۔ ان کے دفتر میں ان کے علاوہ ایک صاحب اور موجود تھے۔ وہ انہیں نہیں پہچانتا تھا مگر ان کا حلیہ، رکھ رکھاؤ اور آئی جی صاحب سے بے تکلفی ان کی سماجی حیثیت کو ظاہر کر رہی تھی۔

''آؤ شمشیر...... بیٹھو۔'' وہ سامنے رکھی دوسری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ان سے ملو، یہ میرے پرانے دوست بیرسٹر شفیق ستار ہیں۔ شفیق یہ ہمارا نوجوان ڈی آئی جی نہایت صلاحیت مند ہے۔ ڈپارٹمنٹ کو ان پر اور ان جیسے افسران پر فخر ہے۔''

''شکریہ سر۔'' وہ بیرسٹر صاحب سے ہاتھ ملانے کے بعد آئی جی صاحب کی جانب دیکھ کر بولا۔

''سر میں باہر انتظار کر لیتا ہوں۔''

''نہیں، نہیں...... ہم یہاں تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' وہ بولے۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک اسائنمنٹ ہے مگر اس سے پہلے ایک اور ضروری کام نمٹانا ہے...... سنا ہے کہ تم نے کل دو افراد کو گرفتار کیا ہے؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی سر...... حالیہ بم دھماکوں کے کیس میں کچھ گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں، میرے پاس ان کے خلاف ثبوت موجود ہیں۔''

''کیسے ثبوت؟'' آئی جی صاحب نے پوچھا۔ بیرسٹر صاحب توجہ سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شمشیر ان کے سامنے باقی تفصیلات بیان کرنا نہیں چاہ رہا تھا مگر آئی جی صاحب کے سوال کا جواب بھی دینا ضروری تھا۔

''سر اُن کے خلاف گواہی موجود ہے جس کے بعد ہی میں نے انہیں گرفتار کیا ہے۔''

''کس کی گواہی......؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''تمہیں بیرسٹر صاحب کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اس کی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے بولے۔ ''یہ میرے پرانے دوست اور قابلِ بھروسا شخص ہیں اور فی الحال یہ اسی حوالے سے یہاں موجود ہیں۔''

''سر......'' شمشیر ایک لمحے کو رکا اب معاملہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ ''سر! جن دو لڑکوں کو ان دھماکوں میں استعمال کیا گیا تھا، ان میں سے ایک بچ گیا ہے۔ اس کے بیان پر ہم نے چھاپا مار کر ڈاکٹر سلمان نامی شخص کو گرفتار کیا تھا جو تفتیش میں سب کچھ قبول کر چکا ہے۔ اس نے مجھے رشوت دینے کی آفر بھی کی تھی اور ہمیں بے ہوش کر کے تھانے سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس کی نشاندہی پر دوسرے ملزم کو اٹھایا گیا ہے۔'' وہ بولا۔

''یعنی تمہارا...... اہم ترین گواہ یا پوائنٹ وہ لڑکا ہے...... تمہیں یقین ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی سر...... اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی دی گئی معلومات سچ ثابت ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر سلمان کا بیان اس کی تصدیق کرتا ہے۔''

''عام طور پر تفتیش کے دوران دیے گئے بیانات کمرائے عدالت میں قدم رکھتے ہی بدل جاتے ہیں اور یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔'' وہ سرد لہجے میں بولے۔ ''بیرسٹر صاحب اسی حوالے سے تشریف لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سارے معاملے میں یا تو تمہیں غلط معلومات فراہم کی گئی ہیں اور یا پھر تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے سر، میں نے ان سے خود تفتیش کی ہے۔'' شمشیر نے کہا۔ ''اور اگر بیرسٹر صاحب اس معاملے میں فریق ہیں تو پھر ہمیں ان کے سامنے اس حوالے سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔''

''شمشیر شاید یہ میں تم سے زیادہ بہتر جانتا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' وہ اسے گھور کر بولے۔ ''مجھے تمہاری صلاحیتوں پر ذرہ بھر شک نہیں ہے مگر کہیں کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں تو انہیں سمجھنے اور ان کے مطابق کام کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

''سر میرے پاس اس لڑکے کا اقبالی بیان موجود ہے جو اُن کے خلاف پکا ثبوت ہے، میڈیکل رپورٹ نے اس کے بیان کی تصدیق کی ہے جس کے مطابق اس کے خون میں نہایت زود اثر خطرناک نشے کی موجودگی کے ثبوت بھی ملے ہیں۔''

''مگر اس رپورٹ میں یہ تو تحریر نہیں ہے کہ وہ نشہ اسے ان ہی لوگوں نے فراہم کیا ہے، وہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی پر بھی الزام لگا سکتا ہے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے استعمال کیا جا رہا ہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں اس معاملے کو صحیح انداز میں دیکھنا ہوگا۔ اُس لڑکے کا دوبارہ بیان لینا ہوگا تب ہی تفتیش کی گاڑی آگے

بڑھ سکتی ہے۔ اگر وہ لوگ مجرم ثابت ہوتے ہیں تو پھر کوئی بھی اُن کی پشت پناہی نہیں کر سکے گا، کیوں بیرسٹر صاحب؟''

''جی بالکل، سو فیصد...... اگر وہ مجرم ہیں تو پھر میں اس حوالے سے کچھ بھی کہنے کا مجاز نہیں رہوں گا لیکن فی الحال میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کہیں کوئی گڑبڑ موجود ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میرا یہ خیال نہیں ہے۔'' شمشیر بولا۔

''شمشیر میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں اس سارے معاملے کو ری ویو کرنا چاہیے۔ اس لڑکے سے دوبارہ بیان لیا جا سکتا ہے۔ حقائق پر دوبارہ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اس دوران بیرسٹر صاحب کی ذاتی ضمانت پر تمہیں ان دونوں کو رہا کرنا ہوگا۔'' آئی جی صاحب کے الفاظ شمشیر کو حیران کر گئے تھے۔ دو جمع دو چار جتنے واضح حقائق کے باوجود جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کے اندیشوں کے عین مطابق تھا۔

''سر ایف آئی آر درج ہونے کے بعد تو آپ جانتے ہیں کہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوتا۔'' اس نے کہنا شروع کیا مگر آئی جی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ایف آئی آر ابھی درج نہیں ہوئی ہے۔'' وہ بولے۔ شمشیر غور سے ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں جاوید کے گریز کی وجہ بھی آ رہی تھی۔ یعنی یہ کھیل ان کی گرفتاری کے بعد سے ہی شروع ہو گیا تھا اور جو کچھ وہ محسوس کر رہا تھا، وہ اس کی غیر ضروری سوچ نہیں تھی۔ ''جیسا کہ میں نے کہا اس کیس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے اور تمہیں اس حوالے سے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''سر...... میں اس کیس کا انچارج ہوں۔ میری رائے کے مطابق ان دونوں کی رہائی سے ہم دہشت گردی کے ایک بڑے نیٹ ورک کا ثبوت کھو دیں گے۔'' شمشیر نے آئی جی صاحب کے موڈ اور تنبیہ کی پروا کیے بغیر کہا۔

''تم اس کیس کے انچارج تھے شمشیر، ہمیں اب ایک بڑے مسئلے میں تمہاری خدمات درکار ہیں اس لیے میں تمہیں فوری طور پر اس کیس سے علیحدہ ہونے کا حکم دے رہا ہوں، یہ اس سب کی وجہ سے نہیں ہو رہا، تمہیں اصل میں یہاں بلایا اسی مقصد سے گیا تھا۔ چیف منسٹر صاحب کو ایک خطرناک دھمکی کا سامنا ہے اور اس ہائی فائی کیس میں ڈپارٹمنٹ نے تمہیں نامزد کیا ہے۔'' وہ خشک لہجے میں بولے۔

''مگر سر......'' شمشیر نے کچھ کہنا چاہا۔

''شمشیر اِٹس این اے آرڈر۔'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولے۔ ''چیف منسٹر ہاؤس میں تمہاری ضرورت ہے اور ڈپارٹمنٹ تمہارا نام بھیج چکا ہے۔''

''او کے سر...... کیا فی الحال مجھے اپنے دفتر جانا ہے یا نہیں؟'' شمشیر نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

''تم بالکل جا سکتے ہو یوں بھی تم کل کے بعد سے اس کیس پر کام کر سکتے ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر پھر مجھے اجازت دیں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''او کے شمشیر، بیسٹ وشز......'' وہ مسکرائے۔

شمشیر آئی جی آفس سے نکلا تو اُس کے ذہن میں طوفان سا چل رہا تھا۔ کل رات سے یہ سب طے تھا اور اسی لیے خود اس کا اسٹاف اس کے حکم پر بھی ایف آئی آر کاٹنے پر تیار نہیں تھا۔ اب تو اسے مقصود وغیرہ کو دیے گئے کام کے بھی ہونے پر شک محسوس ہو رہا تھا اور پرویز، اس کے ذہن میں اسپتال میں موجود لڑکا آ گیا اور اس نے گاڑی کا رخ اسپتال کی جانب کر دیا۔

☆☆☆

جہاز نے ٹیک آف لے لیا تھا۔

کریم اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ آج ہونے والے واقعے نے اس کے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ کرنل بلال سے ملنے والی تازہ ترین تفصیلات کے مطابق حملہ آور کو اسپتال میں ہوش آ گیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس نے یہ سب کچھ اپنے بابا جی (ڈیوڈ) پر لگنے والے ''جھوٹے الزامات'' اور اُن کی موت کا بدلہ لینے کے لیے کیا تھا۔ اس سب میں جو چونکا دینے والی بات سامنے آئی تھی، وہ اس کے پاس اس جدید ترین رائفل کی موجودگی تھی۔ پہلے تو وہ اس کے بارے میں سوالات کے الٹے سیدھے جواب دیتا رہا تھا مگر پھر اس نے بتایا کہ اس نے رائفل کرائے پر لی تھی۔ جدید اور مہلک ہتھیار کا اس طرح بہ آسانی اور کرائے پر دستیاب ہونا ان دونوں کے لیے نئی خبر تھی۔ یہ سلسلہ جرائم کی آگ کو کس طرح تیز اور تیز بھڑکا سکتا تھا، یہ جاننا اور سمجھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں تھی۔

''وہ جو بھی کہہ رہا ہے، وہ سچ ہو سکتا ہے بلال مگر وہ کافی کچھ نہیں بتا رہا۔'' کریم کی بلال سے اس موضوع پر لابی میں فون پر بات بھی ہوئی تھی۔

''مثلاً؟'' بلال نے پوچھا۔

''مثلاً اگر اس نے رائفل کرائے پر لی تھی تو وہ اس

کے استعمال کے طریقہ کار سے کیسے واقف ہوا اور جس انداز میں اس نے ہم پر گولیاں برسائیں، وہ ایک ماہر کا طریقہ تھا۔ یہ طے ہے کہ وہ اس رائفل پر اس کا پہلا موقع ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ شوٹر ہے بلال۔" کریم نے کہا۔

"یہی میرا بھی تجزیہ ہے۔ ہم اس کیس کو مانیٹر کرتے رہیں گے۔" اس نے اسے یقین دہانی کرائی۔

"ٹھیک ہے، محتاط رہنا۔" کریم نے کہا۔

ڈیوڈ کی موت کے بعد سے اس علاقے میں اس کے پیروکاروں میں شدید غم وغصہ پایا جارہا تھا۔ اس کی حقیقت سے آشنائی کے باوجود ایک بڑی تعداد سچ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسے میں کسی نے یہ خبر بھی اُڑادی تھی کہ اسے جعلی مقابلے میں مار دیا گیا ہے جس کے بعد تو یہ باقاعدہ مہم سی بن گئی تھی۔ اس حملے نے ان کی یہ خوش فہمی دور کردی تھی کہ ڈیوڈ کے جانے سے اس علاقے میں ان کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ کریم نے گہری سانس لی، جنگ مسلسل جاری تھی۔

☆☆☆

شمشیر، پرویز کے کمرے میں پہنچا تو وہاں اس کا اسسٹنٹ ایس پی محمود پہلے سے موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے گھبرا گیا پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"سر مجھے ہیڈ آفس سے یہاں پہنچنے کا حکم ملا تھا۔" وہ سیلیوٹ مار کر بولا۔ شمشیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر سر ہلا کر پرویز کی جانب بڑھا جو تکیے کی ٹیک کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پیلاہٹ سے زیادہ شرمندگی پھیلی ہوئی تھی۔

"تم یہاں کیا کررہے ہو، میرا مطلب ہے کہ ہیڈ آفس کے آرڈر پر یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"سر ہمیں اس بچے سے بیان لینے کا حکم دیا گیا ہے۔" وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔

"بیان تو یہ پہلے ہی دے چکا تھا اور تمہیں یاد ہے نا کہ ہم نے اس بیان پر کارروائی کرکے اس ڈاکٹر کو پکڑا تھا؟"

"جی جی بالکل...... میرے تو علم میں تھا مگر جب اوپر سے حکم آجائے تو اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا...... اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا۔" وہ بولا۔

"تو پھر بیان لو...... یا لے چکے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"بیان ہوگیا ہے سر...... میرے حساب سے تو اس بے چارے کے ساتھ بُری ہوئی تھی۔"

"گڈ یعنی بیان ہوچکا ہے، کیا بیان دیا ہے پرویز نے اب......؟" اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ "اگر تمہیں بتانے یا سنانے میں کوئی اعتراض ہو تو میں پرویز سے ہی پوچھے لیتا ہوں۔" وہ اس کے بستر کی جانب مڑا۔

"نہیں، نہیں میں خود سنوائے دیتا ہوں۔" محمود نے کہا اور ہاتھ میں موجود ٹیپ ریکارڈر اور ہینڈ فری کو اس کی جانب بڑھادیا۔ شمشیر نے ہینڈ فری کانوں سے لگائی اور ٹیپ کا بٹن دبادیا۔ "سر میں اور میرا دوست احمد کام کی تلاش میں وہاں گئے تھے۔ ہم نے سوچا تھا کہ شاید کچھ کرنے کو مل جائے۔ اگر کام نہ ملا تو کچھ مدد وغیرہ مانگ لیں گے۔ میرا دوست کسی شخص سے بات کررہا تھا اور میں ریلی کے دوسرے کونے پر کسی اور سے مانگ رہا تھا۔ اسی دوران پہلا دھماکا ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے دوست احمد کو ہوا میں اڑتے دیکھا...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں ایک طرف بھاگا جارہا تھا۔" پرویز کی آواز شمشیر کی سماعت میں گونج رہی تھی اور اس کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ "اسی دوران دوسرا دھماکا ہوا جس کی وجہ سے میں زخمی ہوگیا۔ میرے کاندھے سے خون بہہ رہا تھا مگر میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ ڈر کی وجہ سے میں الٹا بھاگ رہا تھا۔ اس دوران میں کسی سے ٹکرایا...... انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟ میں بہت ڈرا ہوا تھا تو میں نے ہاں میں گردن ہلائی جس کے بعد پولیس والے مجھے یہاں اس اسپتال میں لے آئے۔ یہاں بھی مجھ سے یہ پوچھا گیا تھا تو میں نے اس لیے ہاں کہہ دیا تھا تاکہ اس بڑے اسپتال میں میرا اعلاج جاری رہ سکے۔ اگر انہیں سچ پتا چل جاتا تو وہ مجھے نکال دیتے۔ میری ماں بیمار ہے۔ میرے علاج کے لیے پیسے کہاں سے آتے اس لیے میں نے اس بات کا اعتراف کرلیا تھا کہ یہ سب میں نے کیا ہے ورنہ مجھے نہ تو بموں کے بارے میں کچھ علم ہے اور نہ ہی مجھے یہ سب کرنا آتا ہے۔" وہ غالباً سانس لینے کو رکا تھا۔ شمشیر نے سر کو افسوس کے عالم میں ہلایا اور ٹیپ بند کرکے محمود کے حوالے کردیا۔ اس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا پرویز کی جانب بڑھا۔ وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر سہم سا گیا تھا۔

"تم نے جھوٹ کیوں بولا پرویز؟ کیوں اپنے دوست احمد اور اتنے بہت سے افراد کے قاتلوں پر پردہ ڈال رہے ہو...... تم جانتے ہو کہ اس طرح وہ صاف بچ

جائیں گے؟"

"جی......" پرویز نے سر ہلایا۔ "پر صاحب انسان کیا کرسکتا ہے۔"

"کیا نہیں کرسکتا؟" اس نے آواز دبا کر کہا۔ "اگر تم یہ بیان نہ دیتے تو وہ بچ نہیں سکتے تھے۔"

"سر۔" محمود نے اس کے قریب آکر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"بس......" شمشیر نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "تم جو کرنے آئے تھے، وہ کام ہوگیا ہے محمود...... میں اسے ان۔ڈو (ختم) نہیں کررہا ہوں مگر مجھے اس سے بات کرنے کا حق تو حاصل ہے اور خواہ نام ہی کے لیے سہی مگر میں اب بھی تمہارا باس ہوں...... تم کمرے سے باہر جاسکتے ہو...... میں صرف پانچ منٹ اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"سر میں مجبور تھا اور مجبور ہوں...... نوکری میری ضرورت ہے آپ یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔" محمود نے سر جھکا کر کہا۔

"کیوں...... میں یہ بات کیوں نہیں سمجھ سکتا؟"

"کیونکہ سر آپ میری طرح ہینڈ ٹو ماؤتھ نہیں ہیں...... آپ کے پاس پیسا ہے...... آپ کو ہر ماہ بچوں کی فیس، ماں کی دوا گھر کا کرایہ اور خرچے کی فکر نہیں ہے...... مجھے اپنی نوکری بچانے اور بچائے رکھنے کے لیے جو بھی کرنا پڑے، میں کرنے پر مجبور ہیں۔" اس نے کہا۔

"او کے۔" شمشیر نے آہستگی سے کہا۔ "میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کروں گا، میں جانتا ہوں تم مجبور ہو...... کل بھی مجبور تھے جب تم نے میرے اصرار پر بھی ایف آئی آر کاٹنے میں تاخیری حربے استعمال کیے۔ بہرحال میں پانچ منٹ میں یہاں سے جارہا ہوں اور تم اس بات پر یقین رکھو کہ تمہیں مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" وہ اتنا کہہ کر پرویز کی جانب متوجہ ہوگیا جو غور سے ان دونوں کی بات سن رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم بھی مجبور ہوگے مگر تم نے یہ فیصلہ کب کیا؟ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں؟"

"اماں آئی تھیں، انہوں نے مجھے یہ کرنے کو کہا ہے صاب...... ورنہ میں کبھی ایسا نہیں کرتا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ "اس کے عوض اماں کا علاج ہوجائے گا اور اگر ہم ان کی بات نہ مانتے تو بہت بُرا ہوسکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے پرویز...... مگر جتنا بُرا یہ کرکے ہورہا ہے، وہ کوئی بھی نہیں سمجھ پارہا۔" شمشیر نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔ اس کے کمرے سے نکل کر وہ سیدھا اسپتال سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ اس وقت اس کا کسی سے کوئی بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک سچ کو کس آسانی اور مہارت سے جھوٹ اور جھوٹ کو سچ میں تبدیل کردیا گیا تھا، یہ دیکھ کر وہ حقیقی معنوں میں ششدر رہ گیا تھا۔ وہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کچھ نہیں کرپارہا تھا۔ اب اُسے اصل فیصلہ کرنا تھا جو خود اس کی ذات سے متعلق تھا۔ اسے یا تو اس سب کو تسلیم کرکے چیف منسٹر کی ڈیوٹی کرنا تھی یا اس سب کے خلاف ڈٹ جانا تھا۔ یہ تو وہ دیکھ ہی آیا تھا کہ اوپر سے نیچے تک سب ایک ساتھ کھڑے تھے۔ تھانے سے ان کی گرفتاری یا پکڑے جانے کے سارے ثبوت اگر کوئی تھے بھی تو یقیناً غائب کردیے گئے ہوں گے اور اس سب کو غلط فہمی کا نام دے دیا گیا ہوگا۔ مرکزی گواہ کو بیان سے منحرف کرالیا گیا تھا جس کے نتیجے میں اُس سمیت سب اس کیس سے نکل گئے تھے۔ درمیان کے تمام افراد کو یقیناً خرید لیا گیا تھا۔ اگر وہ اسٹینڈ لیتا بھی ہے تو وہ نہ تو کچھ ثابت کرپائے گا اور نہ ہی یہ جنگ جیت سکے گا۔ اس کے پاس اب کوئی گواہ باقی نہیں بچا تھا۔

اچانک اس کے تصور میں ایک آواز لہرائی۔ "خیال رکھیے گا......" وہ لڑکی اس نے چونک کر سوچا اگر وہ اسے مل جائے تو وہ اس کی مضبوط گواہ بن سکتی تھی مگر وہ اسے کیسے تلاش کرسکتا تھا۔ اس اتنے بڑے شہر میں اس کا پتا لگانا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا۔ اس کے پاس اُس کا نہ تو کوئی پتا ٹھکانا تھا اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔ وہ بے مقصد سڑکوں پر گاڑی چلاتا پھر رہا تھا پھر اس نے کار کا رخ گھر کی جانب کرلیا...... اس وقت اسے صرف سکون اور نیند کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

ابراہام صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا۔ کافی کے پہلے کپ کے ساتھ وہ اپنے خوب صورت ٹیرس پر سورج کی نرم شعاعوں سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس وقت اسے کسی کی مداخلت پسند نہیں تھی، تب ہی فون کی آواز پر اس نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔ یہ جونز کی کال تھی۔

"بولو......" ابراہام نے بٹن دبا کر کہا۔

"سر جیمز کا فون آیا تھا۔ اسے اور ڈاکٹر سلمان کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے۔" اس کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔

"گڈ...... اس کا مطلب ہے کہ میرا انتخاب درست

ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''جی سر......'' جونز نے پوچھا۔

''اوکے۔'' وہ بولا۔ ''ان دونوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی جگہ اور سب کچھ تبدیل کرلیں...... جب تک انہیں نیا حکم نہ ملے انڈر گراؤنڈ رہیں۔'' اس نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ اس کی کال کاٹ کر اس نے دوسرا نمبر ملایا۔

''صبح بخیر جناب ابراہام......'' دوسری جانب سے فیروز کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''امید ہے آپ تک خبر پہنچ چکی ہوگی۔''

''ہاں پہنچ گئی ہے اور اطمینان بھی ہوا کہ میرا انتخاب بالکل صحیح ثابت ہوا۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''بہت شکریہ......'' وہ ہنس کر بولا۔

''فیروز ہمارے پاس وہاں بہت کام ہے، آج سے تم اس سب کے ذمے دار ہو، ہماری وہاں کی ٹیم اس وقت تقریباً ختم ہو چکی ہے صرف دو بہترین ایجنٹ موجود ہیں جو تم سے رابطہ کرلیں گے۔''

''بہتر شکریہ...... بہت شکریہ سر۔''

''گفتگو کرنے کے محفوظ آلات وغیرہ آج تم تک پہنچ جائیں گے اور ایک بڑا فنڈ تمہیں جاری کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد میں تمہیں آگے کا پروجیکٹ بتاؤں گا۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ وہ میرے لیے بے حد اہم ہے یوں سمجھو کہ اگر تم نے میرا یہ کام میری مرضی کے مطابق سرانجام دے لیا تو تمہیں منہ مانگا انعام مل سکتا ہے، یعنی اقتدار میں اہم حصہ......''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں اور رہوں گا باقی میں الفاظ سے زیادہ عمل سے آپ کو اپنے کام کا ثبوت دوں گا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ''اس کے صلے کے طور پر جو مجھے درکار ہے، وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں...... تم ایمان داری سے اپنا کام کرو، نتائج دو اور پھر دیکھو کہ تم کہاں پہنچتے ہو......'' ابراہام نے ان جملوں کے ساتھ کال بند کر دی۔

وہ اب کچھ مطمئن ہوگیا تھا، احمد اور اس کے ملک کے بارے میں جو اس نے سوچ رکھا تھا، وہ ان سب کو لازماً ملے گا، اس نے سوچا اور اس بار اس ساری مہم کو وہ خود دیکھے گا۔ اسے مریم کی تلاش تھی اور اس سے بھی قبل اسے اس لڑکی سے نمٹنا تھا مگر اس وقت سب سے اہم اس کی کافی اور سکون آور میڈیسن تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں، گہری سانسیں لیں اور کافی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

☆☆☆

سونیا آج صبح سے خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔

اُس نے آج دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے سب کے ساتھ ہی پی تھی، مجھ سے گپ بھی لگائی تھی۔ بابا سے بھی باتیں کی تھیں۔ حتیٰ کہ آج اس نے میرے لیے خود گرین ٹی بھی بنائی تھی۔ اس سب کے بعد میں نے ہی اسے بصد اصرار کچھ آرام کرنے کی غرض سے کمرے میں بھیجا تھا۔

''علی آج سونیا بہت بہتر لگ رہی ہے۔'' علی کا فون آیا تو میں نے اسے رپورٹ دی۔

''یہ اچھی خبر ہے مگر اسے زیادہ اسٹریس نہیں لینا چاہیے۔'' علی بولا۔

''اسی لیے میں نے اسے آرام کرنے کے لیے بھیج دیا ہے، کافی ڈاکٹر تو میں بھی بن ہی چکی ہوں۔''

''ہاں، کافی کی ڈاکٹر بن سکتی ہو تم اگر تھوڑی پریکٹس کرلو...... سچ ہے بھائی یہ کوئی آسان کام تو ہے نہیں...... کس کس اقسام کی کافیاں بنائی جا رہی ہیں، ان پر دل دماغ کی تصویریں بھی لگ رہی ہیں اور ڈاکٹر کے کلینک سے بہت زیادہ بہتر کاروبار بھی چلتا ہے ان کا......'' وہ تفصیل سے رائے دیتے ہوئے بولا۔

''صحیح بات ہے اور ڈاکٹروں کا تو مجھے معلوم نہیں مگر تمہارے پاس واقعی کوئی کام نہیں ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔

''اب یہ غلط بات ہے۔'' وہ بولا۔ ''چلو شام کو ملتے ہیں، سنا ہے شام کو بابا کے ولی عہد بھی تشریف لا رہے ہیں۔''

''ہاں بابا نے بتایا......'' میں مسکرائی۔

''یعنی تمہیں ڈائریکٹ خبر نہیں ملی...... گھور پاپ ہے یہ تو...... اس بار گلدان سر پر مار ہی دینا۔'' وہ بولا تو کریم سے پہلی ملاقات کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ کس قدر احمق تھی میں......

''چلو اب زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے، مل کر اس کا کوئی حل نکالیں گے۔'' علی اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

سبقت

فاطمہ حسام

ہر سیر کے لیے سوا سیر ضرور ہوتا ہے... یا پھر اونٹ جب تک پہاڑ تلے نہیں آتا... خود کو ہی پہاڑ سمجھتا ہے... برسات کی بھیگی رات میں پیش آنے والا سنسنی خیز واقعہ... جہاں دو فنکار آمنے سامنے تھے... اب دیکھنا یہ تھا کہ کون کس پر سبقت لیتا ہے...

بنا اجازت گھر میں داخل ہونے والے ایک اجنبی کی گرم جوشی......

رات پوری طرح بھیگ چکی تھی...... محاورتاً بھی اور عملاً بھی کیونکہ وہ موسم برسات کی ایک موسلا دھاری شب تھی۔ بارش کسی بھی طور رکنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتی تھی مگر وہ اپنا سر اوکھلی میں ڈال چکا تھا اور وہ بھی موسلوں کی پروا کیے بغیر لہٰذا تھمنے یا پیچھے ہٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے محض دس منٹ میں اپنی مطلوبہ اشیا کو تلاش کرنے کے بعد لائن اَپ کرلیا۔ اب انہیں فائنل ٹچ دینے کا مرحلہ تھا۔ اس نے کام کے آغاز کا سوچا ہی تھا کہ گھر کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور اُسے کسی کی آمد کی توقع بالکل نہیں تھی۔ اس نے سوچا۔ ”ہوسکتا ہے، یہ کوئی پڑوسی ہو۔ اور تو کسی کو ادھر کا رخ نہیں کرنا تھا اور وہ بھی آدھی رات کو...... ناممکن!“

اس دوران میں اطلاعی گھنٹی ایک بار پھر بج چکی تھی۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ باہر جا کر دیکھے لیکن پھر اس نے اپنے اس ارادے کا گلا گھونٹ دیا۔ ”پڑوسی بھلا اس برستی بارش میں کیوں گھنٹی بجائیں گے۔“ اس نے خود کو سمجھایا۔ ”جو

بھی ہے، خود ہی مایوس ہو کر واپس چلا جائے گا۔ مجھے اپنے کام پر دھیان دینا چاہیے کیونکہ وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔''

مزید دو، تین بار گھنٹی بجی پھر خاموشی چھا گئی۔ گویا اس کے اندازے کے مطابق، گھنٹی بجانے والا مایوس ہونے کے بعد واپس لوٹ گیا تھا۔ اس نے سکھ کی سانس لی اور اپنے ضروری کام میں لگ گیا۔

اچانک اُسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ کام چھوڑ کر اس آواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ گیٹ کے بند ہونے پر کسی انسان کے دبے قدموں چلنے کی مخصوص آواز تھی۔ اس کے تن بدن میں بے چینی سی پھیل گئی۔

''میں نے تو گھنٹی کی آواز کو مسلسل نظر انداز کیا تھا......''

وہ متوحش انداز میں سوچنے لگا۔ ''پھر گیٹ کے بند ہونے کی آواز کیسی؟ اور اس سے بھی زیادہ ضروری یہ سوال کہ گھنٹی بجانے والے کے لیے گیٹ کھولا کس نے تھا؟ اور...... اور اب یہ کس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے؟

وہ کوئی کمزور دل یا ضعیف الاعتقاد انسان نہیں تھا کہ اس پُراسرار صورتِ حال سے خوف زدہ ہو جاتا۔ اسے ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی اس کے رنگ میں بھنگ ڈالنے آ ٹپکے۔ اسے جلد از جلد اپنا کام نمٹانا تھا۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب اس کے اندر اور باہر اطمینان کا بسیرا ہو اور...... فی الحال، اس کا سکون بُری طرح متاثر ہو چکا تھا۔

''مجھے باہر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ ''اس کے بعد ہی میں اپنے کام کو آگے بڑھاؤں گا۔''

اس نے کمرے میں پھیلی چیزوں کو غور سے دیکھا پھر دروازے کو لاک کرنے کے بعد وہ بنگلے کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے بیرونی حصے میں پہنچ گیا اور اسی وقت وہ اس کی نگاہ میں آ گئی۔

وہ انتہائی پُرکشش اور دلکش تھی اور بارش میں پوری طرح بھیگی ہوئی۔ اس کا سراپا ایک حسین گل دستہ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنے لباس کے اوپر سفید لیب کوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں ایک سیاہ چرمی بیگ بھی تھا۔ وہ اپنے پہناوے اور وضع قطع سے کوئی ڈاکٹر لگتی تھی۔ وہ اس کی رعنائی کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔

یہ گرفتاری چند لمحات کی تھی۔ اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ ''یہ وقت جذباتی انداز میں سوچنے کا نہیں ہے۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔ ''میں نے جو اہم کام شروع کیا ہے، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا زیادہ ضروری ہے۔''

اس نے دل کی ایک نہیں سنی اور دو قدم آگے بڑھ آیا۔

اس دوران میں وہ بھیگی ہوئی آتش بازی محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ ابھی تک اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔ اب اسے مخاطب کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے بہ آواز معتدل پکارا اور ستون کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ ''میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے آواز میں اعتدال برقرار رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

وہ چونکی، ٹھٹکی اور اضطراری لہجے میں بولی۔ ''آئی ایم سوری...... میں بلا اجازت گھر کے اندر داخل ہو گئی......'' پھر اس نے ایک خطرناک چھینک ماری اور نزلہ زدہ آواز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کئی بار ڈور بیل بجائی مگر آپ نے کوئی رسپانس ہی نہیں دیا۔''

''میں کانوں پر ہیڈ فون لگائے بیٹھا تھا۔'' اس نے ایک ریڈی میڈ بہانے سے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ ''اس لیے ڈور بیل کی آواز میری سماعت تک نہیں پہنچ پائی۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ کو موسیقی بہت پسند ہے۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولی اور اپنی بات کے اختتام پر ایک اور زوردار چھینک ماری۔

اس نے گول مول جواب دیا۔ ''ہاں...... بالکل...... جسے میوزک سے لگاؤ نہ ہو، اسے میرے خیال میں انسانوں میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے۔''

''بہت خوب ہے'' وہ ایک مزید چھینک کے ساتھ اسے سراہتے ہوئے بولی۔ ''آپ بڑی گہری باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے خیالات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک نیک دل، پُرخلوص اور ہمدرد انسان ہیں...... مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگوں کی مدد کرنے والے...... ہیں نا؟''

اس نے بات مکمل کرنے کے بعد سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ اس حسین دل رُبا کی نشیلی آنکھوں میں مدد کی اپیل کو بڑے واضح طور پر پڑھ سکتا تھا۔ وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

''بے شک...... کیوں نہیں۔ آپ کی خوفناک چھینکوں سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ اگر آپ کچھ دیر اور کھلے میں کھڑی رہیں تو آپ کو تیز بخار ہو جائے گا کیونکہ نزلے اور زکام کی لپیٹ میں تو آپ آ ہی چکی ہیں۔''

''اگر کوئی وقت نہ ہو تو ہم اندر بیٹھ کر بات کریں۔'' وہ بڑے لگاوٹ سے بولی۔ ''آپ نے بالکل درست کہا۔ یہ برسات ایک ڈاکٹر کو مریض بنانے پر تلی بیٹھی ہے۔''

وہ جب سے اس کی نظر میں آئی تھی، اس کا دل بے طرح اسی کے لیے دھڑک رہا تھا۔ اچھی شے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سب کو اچھی لگتی ہے۔ بارش میں شرابور وہ ڈاکٹر بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کے لیے ہر کسی کا دل مچل سکتا تھا۔

''کوئی دقت یا پریشانی نہیں ہے۔'' اس نے دماغ کی حقیقت پسندانہ چیخ پکار کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے دل کی سن لی۔ ''آپ اندر آسکتی ہیں۔''

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج میں پہنچ گئے۔

''بیٹھ جائیں اطمینان سے۔''

وہ ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''پھر بات کرتے ہیں آرام سے۔''

''نہیں بیٹھ سکتی۔'' وہ ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ کے لاؤنج کا فرنیچر بہت قیمتی ہے اور میں ایڑی سے چوٹی تک بُری طرح بھیگی ہوئی ہوں۔ آپ کا صوفہ خراب ہو جائے گا۔'' پھر اس نے گردوپیش میں نگاہ دوڑائی اور اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''آپ مرزا صاحب کو بتا دیں کہ میں آئی ہوں۔ ان کی نئی فزیوتھراپسٹ۔ اگر انہوں نے ٹریٹ منٹ لینا ہوگا تو اچھی بات ورنہ میں واپس چلی جاؤں گی۔''

''کون مرزا صاحب؟'' اس نے اُلجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ مرزا صاحب جو اس بنگلے میں رہتے ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تین ماہ پہلے ان پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اب وہ روبہ صحت ہیں کیونکہ دیگر ادویات کے ساتھ ہی نہایت پابندی سے ان کی فزیوتھراپی بھی ہو رہی ہے۔ ان کا جو دایاں بازو فالج سے متاثر ہوا تھا، وہ تھوڑا بہت کام کرنے لگا ہے۔ مجھ سے پہلے ایک دوسری فزیو اُن کے ٹریٹ منٹ کے لیے یہاں آیا کرتی تھیں۔ میں پہلی بار آئی ہوں کیونکہ میں نے جس فزیو کا ذکر کیا، وہ چھٹی پر ہے اس لیے میڈیکل سینٹر والوں نے مجھے بھیجا ہے۔ امید ہے......'' وہ ایک مرتبہ پھر چھینکی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی پوزیشن واضح کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔''

''آپ کی وضاحت تو میری سمجھ میں آگئی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں یہی کہوں گا کہ آپ غلط ایڈریس پر آگئی ہیں۔ اس گھر میں کوئی مرزا صاحب نہیں رہتے۔''

''کیا یہ بنگلا نمبر ''آر۔فورٹی'' نہیں ہے؟'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوئی۔

''بے شک! یہ مسلم آباد کا بنگلا نمبر آر۔فورٹی ہی ہے۔''

''کیا کہا آپ نے...... مسلم آباد؟''

''بالکل!'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''اس وقت آپ مسلم آباد کے ایک بنگلے میں کھڑی ہیں۔''

''او مائی گاڈ......'' وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔''

وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیسی گڑبڑ؟''

''میں جن مرزا صاحب کی ٹریٹ منٹ کرنے آئی ہوں، وہ مسلم ٹاؤن کے بنگلا نمبر آر۔فورٹی میں رہتے ہیں۔'' وہ خجالت آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ سب رکشا والے کی غلطی ہے۔ میں نے مسلم ٹاؤن کہا اور وہ مجھے مسلم آباد لے آیا۔ مجھے راستوں کی زیادہ پہچان نہیں ہے۔ بارش میں بھیگتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے بنگلا نمبر ''آر۔فورٹی'' تلاش کیا تھا اور یہاں تو ساری کہانی ہی الٹی ہوئی ہے۔'' اس نے یکے بعد دیگرے کئی زوردار چھینکیں ماریں پھر منت ریز لہجے میں بولی۔ ''کیا آپ مجھے کوئی تولیا دے سکتے ہیں تاکہ میں اپنے بال تو خشک کرسکوں۔ ان گیلے بالوں کے ساتھ تو میں لمبی بیمار پڑ جاؤں گی۔''

''او کے......!'' یہ کہتے ہوئے وہ لاؤنج سے نکل کر بیڈ روم کی سمت بڑھ گیا۔

چند منٹ کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک اسٹینڈرڈ سائز ٹاول اور ایک باتھنگ گاؤن تھا۔ وہ اس بھیگی ہوئی پٹاخا لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''آپ میرے ساتھ آئیں......''

وہ بے چون و چرا اُس کے ساتھ ہولی۔ وہ اسے ایک بیڈ روم کے اٹیچڈ باتھ کے پہلو میں بنے ہوئے واشنگ ایریا میں لے آیا۔ وہاں تین اسٹیپ والی واشنگ مشین اور اس سے متعلق دیگر سازوسامان رکھا ہوا تھا۔

''آپ اس بیڈ روم کو اندر سے لاک کر کے باتھنگ گاؤن پہن لیں اور اپنے بھیگے ہوئے لباس کو واشنگ مشین کے ڈرائر میں سُکھا کر زیب تن کرلیں۔ اس کام میں آپ کو زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تب تک میں لاؤنج میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔''

''آپ کا بہت شکریہ جو اس مصیبت کی گھڑی میں میرے کام آرہے ہیں۔'' وہ تشکرانہ انداز میں بولی۔ ''میں چند منٹ میں فریش اَپ ہو کر آتی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ روم سے نکل

گیا۔

☆☆☆

وہ لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھا اپنے آپ سے ایک خیالی جنگ لڑ رہا تھا۔ یہ جنگ دراصل اس کے دل و دماغ میں چھڑی ہوئی تھی۔ اس کا دل اس طرح دار فزیوتھراپسٹ کے حسن کی شادابی اور جوبن کی نایابی میں گویا اٹک کر رہ گیا تھا۔ دوسری جانب اس کا دماغ شدید ترین اُلجھن کا شکار تھا۔ وہ پہلی فرصت میں اس راستہ بھٹکی ہوئی اَن جان لڑکی کو چلتا کرنے کے حق میں تھا۔

''تم اپنے فرض سے غفلت برت رہے ہو۔'' دماغ نے کہا۔ ''کسی اجنبی کا یہاں رکنا تمہارے کام میں کوئی بڑی رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ اسے فوراً رخصت کرو اور اپنے ادھورے کام پر لگ جاؤ...... سمجھ گئے نا؟''

''میں سب اچھے سے سمجھتا ہوں اور میری نظر میں اپنے کام ہی کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ تم مجھے فرض شناسی کے زیادہ لیکچر نہ پلاؤ۔'' اس کے دل نے دماغ کو کرارا جواب دیا۔ ''میں اس وقت محض ایک انسان ہونے کے ناتے ایک دوسرے انسان کی مدد کر رہا ہوں۔ وہ باہر آتی ہے تو میں کوئی رائیڈ منگوا کر اسے رخصت کر دوں گا۔''

دل اور دماغ ایک ہی سلطنت کے دو حکمراں ہیں اور اس سلطنت کا نام ہے...... انسان! اسی لیے انسان چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ پستا رہتا ہے کیونکہ یہ دونوں سلطان کبھی آپس میں اتفاق نہیں کرتے۔

وہ لاؤنج میں آئی تو خاصی نکھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے اپنے لباس کو ڈرائر میں خشک کرنے کے بعد پہن لیا تھا اور بیڈروم کے ڈریسنگ سے اپنے چہرے اور سر کے بالوں کو بھی ایک نئی تازگی دے دی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر صوفے پر بیٹھی تو اس نے معتدل انداز میں پوچھا۔

''آپ بنگلے کے اندر کیسے داخل ہوئی تھیں؟''

اس سوال نے کافی دیر سے اس کے دماغ میں اتھل پتھل مچا رکھی تھی کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اندر آتے ہوئے اس نے بنگلے کے گیٹ کو بند کر دیا تھا۔

''میں نے بارش میں بھیگتے ہوئے بڑی مشکل سے ''آر۔ فورٹی'' بنگلا تلاش کیا تھا۔'' اس نے رسانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''کئی بار کی کوشش کے بعد بھی جب ڈوربیل پر، بنگلے کے اندر سے کوئی برآمد نہیں ہوا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اتنی خواری کے بعد میں ناکام و نامراد واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے گیٹ کے وسطی حصے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تو گیٹ کھل گیا۔ شاید اس گیٹ کو بند کرنے کے بعد اندر سے کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ بہرکیف، میں نے اندر داخل ہونے کے بعد گیٹ کو پراپر انداز میں بولٹ کر دیا ہے۔''

اس نے اتنے دل نشین پیرائے میں وضاحتی بیان دیا تھا کہ وہ سوچ میں پڑ گیا اور اس کا دل اسی نتیجے پر پہنچا کہ شاید وہی گیٹ کو کنڈی لگانا بھول گیا تھا۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ رکشے والے نے آپ کو مسلم ٹاؤن کے بجائے مسلم آباد کیوں پہنچا دیا؟'' اس نے اپنی تسلی کی خاطر ایک اور اہم سوال کیا۔ ''یہ دونوں علاقے ایک دوسرے کی مخالف سمت میں واقع ہیں اور ان کے درمیان دس سے بارہ کلومیٹرز کی دوری بھی حائل ہے۔ کیا رکشا ڈرائیور میپ کو فالو نہیں کر رہا تھا؟''

''بس، یہیں پر مجھ سے غلطی ہو گئی۔'' وہ متذبذب نظر سے اسے دیکھتے ہوئے ایک زوردار چھینک کی معیت میں بولی۔ ''اس وقت نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا اس لیے میں اپنے لیے کسی رائیڈ کو منگوا نہ پائی اور میڈیکل سینٹر سے باہر نکل کر میں نے رکشا پکڑ لیا۔ اس کے بعد کی......'' اس نے میکانکی انداز میں رک کر ایک اور دھواں دھار چھینک ماری پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''کہانی تو میں آپ کو سنا ہی چکی ہوں۔''

''آپ کو اس وقت آرام کی شدید ضرورت ہے۔'' اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اِن چھینکوں کے تیور بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ایک معنی خیز ادا سے بولی۔ ''مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ ابھی تو خیر بارش بہانہ بن گئی ہے ورنہ نزلے اور چھینکوں کا ایسا اٹیک مجھے مہینے، دو مہینے میں آتا ہی رہتا ہے اور میں اس کا علاج بھی جانتی ہوں۔''

''آپ ڈاکٹر ہیں......'' اس نے کہا۔ ''ظاہر ہے، آپ سے زیادہ بیماریوں اور میڈیسنز کے بارے میں اور کون جانتا ہوگا۔''

''میں وہ والی ڈاکٹر تھوڑی ہوں......'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ایک فزیوتھراپسٹ اور فارماسسٹ بھی اپنے نام کے ساتھ ''ڈی آر'' لگانے کا پورا حق رکھتا ہے جیسا کہ پی ایچ ڈی کرنے والا کوئی شخص بھی خود کو ڈی آر یعنی ''ڈاکٹر'' ہی لکھتا ہے۔''

''سمجھ گیا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

کہیں ٹرین نہ نکل جائے!

''میں اس فرق کو سمجھ سکتا ہوں۔ آپ اپنی ان سرکش چھینکوں کے علاج کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''اوہ ہاں......'' وہ اپنی لانبی پلکوں کو کسی تتلی کے پروں کے مانند حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''اس کیفیت میں اگر ایک کپ کافی مل جائے تو مزہ آجائے گا۔ اس کے بعد میں اپنے لیے کوئی رائیڈ منگواؤں گی، پھر یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میں نے آدھی رات کے وقت آپ کو ڈسٹرب کیا، اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔''

حُسن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ غم زدگی اور خواست گاری کے عالم میں فسوں گر اور فزوں تر ہوجاتا ہے۔ ''ڈسٹرب ہونے والی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ کے کام آکر مجھے خوشی محسوس ہورہی ہے۔'' پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کسی فرمانبردار ملازم کے انداز میں کہا۔ ''آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔''

وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

اس بنگلے کا کچن امریکن انداز کا ایک اوپن کچن تھا جو لاؤنج کے عین سامنے واقع تھا۔ کچن کی فلورنگ فینسی ٹائلز سے کی گئی تھی جبکہ لاؤنج کی فلورنگ میں ووڈن بلاکس استعمال کیے گئے تھے۔ وہ کافی کے لیے پانی چڑھانے لگا تو بِن بلائی مہ جبیں کی نقرئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''میرے لیے کافی ودھ آؤٹ شوگر......''

''اوہ......'' وہ پوچھے بِنا نہ رہ سکا۔ ''کیا ذیابیطس کا ایشو ہے؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''میں آرٹیفیشل شوگر سے بچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ چائے، کافی میں ''ٹی۔ سویٹز'' کا استعمال کرتی ہوں۔''

''زبردست!'' وہ ستائشی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے آپ اتنی فٹ ہیں۔''

وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے باکی سے استفسار کیا۔ ''کیا واقعی......؟''

''آئی ایم ناٹ جوکنگ......'' وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنی پوری زندگی میں آپ جیسی جاذبِ نظر اور دلکش عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ آپ کے حُسن اور خوب صورتی نے مجھے متاثر کیا ہے۔''

''آپ بڑی دلچسپ اور شاعرانہ باتیں کرتے ہیں۔'' وہ بہ دستور اس کے چہرے کو تکتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں جاننا چاہوں گی کہ آپ کرتے کیا ہیں...... میرا مطلب ہے، آپ کا پروفیشن کیا ہے؟''

''میں کئی ایک ڈیرنگ کام کرتا ہوں۔'' وہ کافی کی تیاری کے ساتھ ہی اس سے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''جیسا کہ جوئے شیر لانا، اپنے کوٹ کی جیب یا ہیٹ کے اندر سے کبوتر برآمد کرنا، سڑک پر لیٹ کر اپنے اوپر سے گاڑی گزارنا، بند تالے کو پھونک مار کر کھولنا...... وغیرہ ہم!''

''اوہ...... تو یوں کہیں نا کہ آپ خطروں کے کھلاڑی ہیں؟'' وہ ایک ادا سے بولی۔

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''میں جب چینج کرنے اندر گئی تھی تو میں نے کوریڈور اور بیڈروم کی دیواروں پر مختلف فوٹو فریمز آویزاں دیکھے ہیں جن میں ایک مرد، ایک عورت اور اُن کے دو بچے نظر آتے

ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''زیادہ تر اُن بچوں کے انفرادی فوٹوز ہیں مگر آپ کی ایک بھی تصویر مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ آپ جس قسم کے ڈیرنگ کام کرتے ہیں، اس کے مطابق تو اس گھر کے ہر حصے میں آپ کے کارناموں کو اُجاگر کرنے والے فوٹو فریمز ہی نظر آنا چاہئیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں نا؟''

''نہیں، آپ بجا فرما رہی ہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''اور اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔''

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں وہ خاص وجہ جاننا چاہوں گی۔'' وہ اس کی باتوں میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''کوئی حرج ہے اور نہ دقت یا دشواری۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ نے اس گھر کی دیواروں پر جو تصاویر دیکھی ہیں، وہ میرے بڑے بھائی اور ان کی بیوی اور دونوں بچوں کی ہیں کیونکہ یہ بنگلا انہی لوگوں کا ہے۔ وہ لوگ ایک شادی میں شرکت کرنے اسلام آباد گئے ہیں۔ تین روز کے بعد اُن کی واپسی ہے۔ میرا یہاں کراچی میں ایک شو تھا اس لیے کسی ہوٹل میں قیام کرنے کے بجائے میں بھائی کے بنگلے میں ٹھہر گیا ہوں۔''

''اچھا...... تو یہ بات ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کراچی کے نہیں ہیں؟''

''میرا تعلق لاہور سے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کبھی میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ پھر میں آپ کو اپنے ایوارڈز، ٹرافیز اور فوٹو گرافز وغیرہ دکھاؤں گا۔''

''کیوں نہیں، ضرور۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرا جب کبھی بھی لاہور جانا ہوا، میں آپ سے ملاقات کی خاطر آپ کے دولت کدے پر ضرور حاضری دوں گی۔''

''یو آر موسٹ ویلکم!'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں کیونکہ گرما گرم خوشبودار وخوش ذائقہ کافی تیار ہو چکی ہے۔''

''گڈ!'' وہ چہک کر بولی۔

وہ ایک ٹرے میں دو مگ کافی اور ایک پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر لاؤنج میں آ گیا۔ ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھا اور ایک مگ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور ٹرے کو اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لیجیے جناب...... کافی وِدھ آؤٹ شوگر اینڈ وِدھ فریش واٹر......''

''واؤ......'' وہ ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بولی۔ ''کافی کی خوشبو تو مست ہے۔''

''اس کا ذائقہ بھی مست ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ اچھا کیا کہ آپ ایک گلاس پانی بھی لے آئے۔'' وہ اپنے سیاہ چرمی بیگ کو کھولتے ہوئے بولی۔ ''میں کافی کے ساتھ ایک اینٹی الرجک ٹیبلٹ بھی لے لیتی ہوں۔ اس سے مجھے چھینکوں سے تو فوراً نجات مل جائے گی۔''

''وہ تو مل چکی......'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پچھلے تین منٹ میں آپ نے ایک بھی چھینک نہیں لی۔''

''آں...... چھی ی ی ی......'' اس کی بات مکمل ہوتے ہی وہ خوفناک انداز میں چھینک اٹھی اور نزلہ زدہ آواز میں بولی۔ ''لگتا ہے، یہ آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے۔'' وہ گول مول انداز میں بولا۔ ''اب تو مجھے بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔ آپ پہلی فرصت میں اینٹی الرجک ٹیبلٹ لیں اور دوسری فرصت میں کافی پی لیں ورنہ آپ کا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

پھر اس نے ایک اینٹی الرجی ٹیبلٹ کو پانی کے بڑے سے گھونٹ کے ساتھ نگلا اور بیگ میں سے ایک ننھی سی مستطیل ڈبیا نکال لی۔ اس سگریٹ لائٹر سائز کی ڈبیا کے اندر ''ٹی ڈ سویٹ ٹیبلٹس'' بھری ہوئی تھیں۔ ایسی ماچس کی شکل کی ڈبیا شوگر کے پیشنٹس اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور پھیکی چائے میں دو ٹیبلٹس ڈال کر اپنی مٹھاس کی تشنگی کو مٹاتے ہیں اور وہ بھی کسی نقصان کے بغیر۔

اس نے ڈبیا کے فلپ اوپنر کو سلائیڈ کر کے اس میں سے تین ننھی منی گولیاں نکال کر اپنے سامنے رکھے ہوئے کافی کے مگ میں ڈال دیں پھر اپنے لیب کوٹ کی جیبوں کو تھپتھپاتے ہوئے فکرمندی سے بولی۔

''او...... مائی گاڈ!''

''کیا ہوا؟'' وہ پریشانی کے عالم میں مستفسر ہوا۔

''میں اپنا سیل فون اندر بیڈروم میں بھول آئی ہوں۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''پلیز...... آپ وہ فون لا کر مجھے دے سکتے ہیں۔ کافی ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے لیے رائیڈ بھی منگوانا ہوگی۔''

''کیوں نہیں، ضرور......'' وہ یک لخت اٹھ کر کھڑا ہو

گیا۔ ”میں آپ کا سیل فون ابھی لے کر آتا ہوں۔“
کافی کے دونوں مگ ایک ہی سائز، ایک ہی ساخت اور ایک ہی کلر اینڈ ڈیزائن کے تھے۔ وہ لاؤنج سے نکل کر جیسے ہی بیڈ روم میں داخل ہوا، اس نے اپنے کافی کے مگ کو اس کے کافی کے مگ سے تبدیل کرلیا پھر بڑے اطمینان سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا چہرہ فاتحانہ مسکراہٹ سے چمک رہا تھا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے سے پہلے، اس کے درِ سماعت پر کسی ہیوی ڈیوٹی گاڑی کے انجن کی مہیب آواز نے دستک دی۔ وہ کوئی ٹرک تھا جو وہاں سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں مضبوط رسیوں کی جکڑ میں تھے اور وہ لاؤنج کے ووڈن فلور پر بے یارومددگار پڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں بھی کپڑے کا ایک گولا سا بنا کر ٹھونس دیا گیا تھا تاکہ ہوش میں آنے کے بعد وہ چیخ پکار کے قابل نہ رہے۔

”اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا؟“ پریشانی کے عالم میں اس نے خود سے سوال کیا۔ ”میں نے تو اس بن بلائی مہمان نازنین کی کافی میں بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی تاکہ وہ دو تین گھنٹوں کے لیے اٹاغفیل ہو جائے اور میں اس بنگلے میں اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤں۔“

اتنا سوچنے کے بعد اس کا دماغ دکھنے لگا۔ اسے اپنا سر ماؤنٹ ایوریسٹ کے مانند بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے لاؤنج میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس وقت لاؤنج میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں کا نفیس اور جدید قیمتی فرنیچر اور دیگر بیش قیمت سامان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

”لگتا ہے، جب میں اس کا سیل فون لینے بیڈ روم کی طرف گیا تھا تو اس آفت کی پرکالہ نے کافی کے مگ تبدیل کر دیے تھے۔ ان سنگین لمحات میں اس کا دماغ درست سمت میں سوچ رہا تھا۔“ میں نے واپس آنے کے بعد کافی پینا شروع کر دی تھی مگر اس دوران میں وہ اپنے مگ سے ایک بھی سپ لیے بغیر مجھے باتوں میں اُلجھانے میں مصروف تھی اور میں گدھا گھونٹ پر گھونٹ کافی پیے جا رہا تھا اور وہ بھی، وہ کافی جس میں، میں نے خود بے ہوشی کی دوا ملائی تھی۔ اس بھولی بھٹکی ہوئی نقلی مصیبت زدہ فزیوتھراپسٹ نے میری چال مجھ ہی پر لوٹا دی ہے۔“

وہ نادان اپنے زاویے سے بالکل ٹھیک سوچ رہا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جس پری وش میں دل اٹکا بیٹھا تھا، اس نے چال لوٹاتے وقت تین ننھی منی گولیاں بہ طور ”مارک اَپ“ بھی شامل کر دی تھیں کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ کافی پہلے سے ”ریڈی“ ہے۔

”مجھے سب سے پہلے اپنے ہاتھ پاؤں کی بندشوں کو کھولنا ہوگا۔“ اس نے انقلابی انداز میں خود کلامی کی۔ ”باقی کام بعد میں......“

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں وہ لوٹیں لگا کر کچن تک پہنچا پھر بہ وقت تمام ایک تیز دھار چھری کی مدد سے وہ اپنی بندشوں کو کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کام الفاظ میں جتنی آسانی سے بیان کر دیا گیا ہے، اس کی مشکل اور اذیت کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو زندگی میں بھی ایسے حالات سے گزرا ہو۔

آزاد ہوتے ہی وہ اس بیڈ روم کی جانب لپکا جہاں وہ ”فزیوتھراپسٹ“ کی آمد سے قبل مصروفِ کار تھا۔ اس نے مذکورہ بیڈ روم کو لاک کر دیا تھا لیکن اب اس کمرے کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ سلگتے دماغ اور دھڑکتے دل کے ساتھ بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس پر جیسے کوئی ایٹم بم آن گرا۔

اس بنگلے کو ٹارگٹ کرنے سے پہلے اس نے تسلی بخش انداز میں اپنا خفیہ ہوم ورک مکمل کیا تھا اسی لیے وہ کامیابی کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ اس بنگلے کے مختلف حصوں میں محفوظ کیے گئے تمام طلائی زیورات، قیمتی جواہر، پرائز بانڈز اور کرنسی نوٹوں کو اس نے ایک جگہ جمع کر لیا تھا اور اس بے بہا خزانے کو وہ اپنے بیگ میں بھر کر وہاں سے رفوچکر ہونے ہی والا تھا کہ فزیوتھراپسٹ کے روپ میں وہ بدبخت لیڈی ڈکیت وہاں آ ٹپکی تھی اور اس کے ”منتخب“ کیے ہوئے مال کے علاوہ بنگلے کا تمام قیمتی سامان بھی کسی ٹرک پر لاد کر وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔

”وہ حسین چڑیل تو میری بھی ماں نکلی......“ اس نے نفرت بھرے انداز میں سوچا۔ ”وہ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ جس مقصد سے یہاں آئی تھی، میں بھی اسی نیت کے ساتھ اس بنگلے میں داخل ہوا تھا مگر افسوس کہ میں اُس کی چال میں آ گیا......آہ......“

اس سے زیادہ اُس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جسے وہ ایک مصیبت زدہ لڑکی سمجھا تھا، وہ اس پر پیشہ ورانہ سبقت لے گئی تھی۔

❖❖❖

بادِ سموم

عکس فاطمہ

پائدار اور دیرپا رشتوں میں بھی دراڑ پڑ ہی جاتی ہے... آزمائش کی یہ فیصلہ کن گھڑیاں کسی عذاب کے مانند اپنے نشان چھوڑ جاتی ہیں... وہ بھی دشواریوں کا مقابلہ کررہی تھی اور مشکل ترین آزمائش سے گزر رہی تھی...

آرام و آسائش بھری زندگی کو بادِ سموم سے آلودہ کرنے والے عوامل کی کارفرمائی

سطح سمندر سے نو ہزار فٹ کی بلندی پر، ضلع ایبٹ آباد کے شمال مشرقی علاقے گلیات ریجن کے اندر، ہمالیہ کے قدموں میں واقع وہ ہل اسٹیشن اپنے سخت سرد موسم کے باعث ٹھنڈیانی کہلاتا تھا۔ دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں کوئی سیاح اس جنت نظیر ہل اسٹیشن کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ یہ دو ماہ ٹھنڈیانی کا آف سیزن شمار ہوتے تھے۔ کاروبارِ سیاحت ایک طرح سے ٹھپ ہو کر رہ جاتا تھا۔ چاروں جانب کوہ و دمن میں برف کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا

تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا پورا اہلِ اسٹیشن اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے برف کی سفید چادر اوڑھے سو رہا ہو۔

اس من چلی فیملی نے اپنی تفریح کے لیے ٹھنڈیانی کے آف سیزن ہی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ماہِ دسمبر کا آخری عشرہ تھا جب وہ لوگ ایک ہفتے کے ٹور پر اس صحت افزا اہل اسٹیشن کی سیر کو نکلے تھے۔ ایک رات ایبٹ آباد میں، اپنے فیملی فرینڈز کے ہاں گزارنے کے بعد اگلے روز وہ ٹھنڈیانی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

''اگر تم چاہو تو میں ایک کار مع ماہر ڈرائیور آپ لوگوں کو دے دیتا ہوں۔'' میزبان ریٹائرڈ کرنل جمشید خان نے پُرخلوص انداز میں پیشکش کی۔ ''آپ پہلی مرتبہ ٹھنڈیانی جارہے ہیں' میرا ڈرائیور آپ کے لیے ایک بہترین گائڈ ثابت ہوگا۔''

عادل ملک نے جلدی سے کہا۔ ''خان صاحب! میں آپ کی محبت اور اپنائیت کو سمجھ سکتا ہوں اور دل سے اس کی قدر بھی کرتا ہوں لیکن ہم لوگ یہ پورا ہفتہ بالکل تنہائی اور سکون سے گزارنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا، ٹھنڈیانی کے ایک نزدیکی ہوٹل میں ہماری بُکنگ ہے۔ ہمارے گھومنے پھرنے کے لیے اسی ہوٹل نے گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کر رکھا ہے۔ آپ سے ملنا ضروری تھا اور یہ مدیحہ کی ضد بھی تھی اسی لیے ہم نے آپ کو ٹچ کرلیا۔''

عادل ملک کی بیوی مدیحہ دراصل کرنل جمشید خان کی اہلیہ رخشندہ کی دوست تھی۔ عادل اور جمشید کی جان پہچان کا ذریعہ ان کی نصف بہتریں۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ لوگ مدیحہ کی فرمائش پر ہی ایک رات کے لیے ایبٹ آباد میں رک گئے تھے۔ ویسے بھی ٹھنڈیانی جانے کے لیے انہیں ایبٹ آباد ہی سے گزرنا تھا اس لیے بھی عادل ملک اپنی بیوی کی بات ماننے کے لیے فوراً ہی راضی ہوگیا تھا۔

''یہ تو آپ کی مہربانی ہے جو ہمارے غریب خانے کو رونق بخشی۔'' جمشید خان نے کہا۔ ''چلیں، آپ کو جیسے سہولت ہو، اس کے مطابق انجوائے کریں۔ میں اپنے ڈرائیور کے ذریعے آپ کو اس ہوٹل تک پہنچوا دیتا ہوں جہاں آپ کو... اِسٹے کرنا ہے۔ اُمید ہے، اتنی سی خدمت کا موقع آپ مجھے ضرور دیں گے۔''

وہ تینوں جمشید خان کی اس پُرخلوص آفر کو ٹھکرا نہ سکے اور اس کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل روانہ ہوگئے۔ عادل ملک اور مدیحہ شاہ کے ساتھ ان کی اکلوتی پندرہ سالہ بیٹی جیا بھی تھی جسے وہ پیار سے ''بے بی'' کہا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں جیا کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہی تھی۔ اسے علاج کے لیے کئی روز تک اسپتال میں ایڈمٹ رہنا پڑا تھا۔ اب وہ کافی بہتر تھی۔ یہ ایک ہفتے کا ''ٹھنڈیانی ٹرپ'' دراصل اس کا جشنِ صحت یابی تھا جو مدیحہ کے پُرزور اصرار پر ترتیب دیا گیا تھا کیونکہ جیا کے اندر مدیحہ کی جان تھی۔

☆☆☆

مدیحہ شاہ اگرچہ پڑھنے میں بہت اچھی تھی تاہم ایف ایس سی کے امتحانات میں وہ اتنی پرسنٹیج حاصل نہیں کرسکی تھی جو کسی میڈیکل یونیورسٹی میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر بننے کے لیے ضروری ہوتی ہے لہٰذا اس نے اپنے والد سکندر شاہ کے مشورے پر ڈی فارم میں داخلہ لے لیا تھا۔ ڈی فارمیسی کرنے والا بھی ڈاکٹر ہی کہلاتا ہے، اگرچہ وہ براہِ راست مریضوں کا علاج نہیں کرتا بلکہ وہ کسی مریض کے علاج کے لیے استعمال کی جانے والی ادویات تیار کرتا ہے یعنی وہ ایک فارماسسٹ کی حیثیت سے کسی دواساز کمپنی میں کام کرتا ہے۔ اگر مالی حالات اچھے ہوں تو اپنی فارماسیوٹیکل کمپنی بھی کھول سکتا ہے۔

سکندر شاہ نے اپنی اکلوتی بیٹی کو ڈی۔ فارم کرنے کا مشورہ ایک خاص وجہ سے دیا تھا اور وہ وجہ تھی اس کا ذاتی بزنس۔ جب مدیحہ اپنی پرسنٹیج کو لے کر اُداس تھی تو سکندر نے شفقت بھرے انداز میں اسے سمجھایا تھا۔

''بیٹا! ہمارا مقصد انسانوں کی خدمت کرنا ہے اور اس نیک کام کے لیے ہمارا ڈاکٹر ہونا ضروری نہیں۔ تم ڈی فارمیسی میں ایڈمیشن لے لو اور بزنس میں میری مدد کرو۔ میں جو فارماسیوٹیکل کمپنی چلا رہا ہوں، اس میں مجھے ایک قابلِ اعتبار معاون کی اشد ضرورت ہے اور تم سے زیادہ قابلِ اعتماد میرے نزدیک اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

باپ کا مشورہ ٹھیک سے بیٹی کی سمجھ میں بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے پاپا۔ آپ جیسا کہہ رہے ہیں، میں ویسا ہی کروں گی۔''

یوں باپ بیٹی کی محبت اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں رہی اور پانچ سال میں مدیحہ نے ڈی۔ فارمیسی کی پڑھائی مکمل کرکے یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرلی۔ وہ اپنی اسٹڈی کے دوران میں بھی کچھ دیر کے لیے فیکٹری چلی جایا کرتی تھی تاکہ فارمیسی کے کام کو سمجھ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے امتیازی نمبروں سے ڈی۔ فارم کیا تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد وہ فل ٹائم اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔

بیٹیاں جوان ہو جائیں تو ماؤں کو اُن کی شادی کی فکر

ستانے لگتی ہے۔ مسز سکندر شاہ یعنی زاہدہ بیگم اب تک اس لیے خاموش بیٹھی تھی کہ مدیحہ کی یونیورسٹی کی پڑھائی چل رہی تھی۔ جیسے ہی مدیحہ نے ڈگری حاصل کی، زاہدہ نے اپنے شوہر سے کہا۔

''مدیحہ جوانی کی عمر سے آگے نکلتی جارہی ہے۔ بس، اب اس کی شادی ہوجانا چاہیے۔''

''تم تو جوانی نکل جانے کا ذکر اس طرح کررہی ہو جیسے ہماری بیٹی بوڑھی ہونے جارہی ہے۔'' سکندر نے بیزاری سے کہا۔ ''وہ ابھی ابھی تو پڑھائی کے جنجال سے نکلی ہے۔ بے چاری کو ذرا سکھ کی چند سانسیں تو لینے دو...... میری معصوم بچی۔''

''تمہاری یہ معصوم بچی پورے چوبیس سال کی ہوچکی ہے۔'' زاہدہ بیگم ہاتھ کو ہوا میں گھماتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے وقتوں میں چودہ، پندرہ یا زیادہ سے زیادہ سولہ سال کی عمر میں بیٹی کو رخصت کردیا کرتے تھے۔''

''وہ اچھا وقت تھا۔'' سکندر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''انسان دو وقت کی روٹی پر قانع تھا۔ آج کل کی طرح اس کی یہ لمبی چوڑی خواہشیں اور ضرورتیں نہیں تھیں مگر اب انسان کو ہر سہولت اور ہر آسائش چاہیے اور...... یہ سب حاصل کرنے کے لیے انسان کا صاحبِ حیثیت ہونا ضروری ہے...... اور حیثیت دار بننے کے لیے بہت زیادہ لکھائی پڑھائی اور کمائی کرنا پڑتی ہے جس میں ایک عمر نکل جاتی ہے۔''

''ہمارے پاس کس شے کی کمی ہے شاہ جی......'' زاہدہ بیگم نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کوئی ایسا شریف سا لڑکا دیکھو جو ہماری بیٹی کو خوش رکھ سکے۔ باقی جہاں تک حیثیت کا معاملہ ہے تو ہم اپنی بیٹی کے خوش گوار مستقبل کے لیے اس لڑکے کو حیثیت دار بنانے میں کسی قسم کی کنجوسی نہیں کریں گے۔''

''تمہارا آئیڈیا مجھے پسند آیا۔'' سکندر نے تعریفی نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ''لیکن اس میں ایک کمی ہے۔''

''کیسی کمی......کون سی کمی......؟'' وہ چونکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''لڑکا شریف ہونے کے علاوہ انتہائی فرماں بردار بھی ہونا چاہیے۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اور اگر اس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''وہ کس لیے؟'' بے ساختہ زاہدہ کی زبان سے نکلا۔

''ہم بہ آسانی اسے گھر داماد بنالیں گے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''اس طرح مدیحہ ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہے گی۔ ہم ایسا کرسکتے ہیں کیونکہ بقول تمہارے...... ہمارے پاس کس شے کی کمی ہے۔''

''بہت دور کی کوڑی لائے ہو شاہ جی۔'' زاہدہ دلچسپی بھری نظر سے اپنے خاوند کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بس، تم آج ہی سے کسی ایسے داماد کی تلاش شروع کردو۔ ایک دو سال میں مدیحہ کی شادی ہوجانا چاہیے۔ یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے کہ ہماری بیٹی شاد و آباد رہے۔ کبھی کوئی دکھ اسے چھو کر بھی نہ گزرے۔''

''آمین!'' سکندر شاہ نے تہِ دل سے کہا۔ ''میری پہلی اور آخری تمنا بھی یہی ہے کہ مدیحہ اپنے قدموں پر کھڑی ہوکر ایک خوش حال اور کامیاب زندگی گزارے۔ میں اس کے درخشاں مستقبل کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہوں۔''

بیٹی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سکندر کافی جذباتی ہوگیا تھا۔ زاہدہ کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔

☆☆☆

کوزہ گلی کے علاقے میں، ایوبیہ روڈ پر مرینہ ان کے نام سے ایک عالی شان گیسٹ ہاؤس تھا۔ انہیں یہیں پر پانچ روز تک قیام کرنا تھا جس کے لیے انہوں نے پہلے سے بکنگ کرا رکھی تھی۔ کرنل (ر) جمشید خان کا ڈرائیور انہیں گیسٹ ہاؤس پہنچانے کے بعد واپس ایبٹ آباد چلا گیا تھا۔

یہ چونکہ آف سیزن تھا اس لیے انہیں بہ آسانی یہاں کی بکنگ مل گئی تھی۔ انہوں نے دیکھا، گیسٹ ہاؤس میں کوئی خاص چہل پہل نہیں تھی۔ بس، انہی کی طرح کے چند ایک سرپھرے مہمان وہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور یہ ان کے لیے اچھا ہی تھا۔ وہ اپنے گھر سے اتنی دور کوئی ہلا گلا کرنے نہیں پہنچے تھے۔ ان کی آمد کا مقصد جیا کو ذہنی اور روحانی طور پر سکون پہنچانا تھا اور اس کام کے لیے یہاں کا ''آف سیزن'' زیادہ مناسب اور سودمند تھا۔ بے بی (جیا) جس کٹھن علاج سے گزری تھی، وہ موت کو چھو کر واپس آنے کے مترادف تھا۔ عادل ملک تو امید کھو بیٹھا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ جیا بچ پائے گی لیکن مدیحہ کو یقینِ کامل تھا کہ بیماری اس کی بے بی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس کی کوشش اور بے بی کی ہمت موت کو بھی شکست دینے میں کامیاب ہوجائے گی اور واقعتاً ایسا ہی ہوا بھی تھا...... جیا زندہ سلامت ان کے ساتھ تھی۔

ٹھنڈیانی کے گرد و نواح میں درجنوں ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس ہیں مگر آف سیزن کے باعث زیادہ تر نے اپنا کاروبار تو سمیٹ لیا تھا اور یا پھر محدود کردیا تھا البتہ نامی گرامی بڑے ہوٹل اپنی سروس جاری رکھے ہوئے تھے۔ مرینہ ان کا شمار بھی

انہی میں ہوتا ہے۔

اس گیسٹ ہاؤس میں سیٹل ہونے کے بعد مدیحہ نے ہوٹل کے منیجر سے ایک طویل سنجیدہ ملاقات کی تھی تاکہ وہ وہاں پر اپنے قیام کو تسلی بخش بنا سکیں، ایک دم محفوظ اور آرام دہ۔

''ارشاد صاحب!'' مدیحہ نے منیجر کو مخاطب کیا۔ ''جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ ہم لوگ پانچ روز تک آپ کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔ آپ نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ سیر و تفریح کے لیے آپ ہمیں ایک کار مع ڈرائیور فراہم کریں گے؟''

بات کے اختتام پر مدیحہ شاہ نے سوالیہ نظر سے منیجر ارشاد عباسی کی طرف دیکھا تو وہ رسان بھرے لہجے میں بولا۔

''مرینہ ان میں آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی میڈم۔ وائی فائی کی سروس چوبیس گھنٹے ہے۔ کمرے گرم رکھنے کے لیے ہیٹر کا انتظام ہے۔ علاوہ ازیں کھانے پینے سے لے کر گرم پانی اور لانڈری تک کی تمام سہولیات آپ کے ایک اشارے پر حاضر کر دی جائیں گی۔ جہاں تک گاڑی کا معاملہ ہے تو......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے آپ کے لیے ایک، اے ون کنڈیشن کی چمچماتی ہوئی ٹویوٹا کرولا۔ ایکس ایل آئی کا انتظام کر دیا ہے۔ ڈرائیور کا نام بشیر احمد ہے۔ بشیر کو ان پہاڑی راستوں پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک عمر ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام کا ماہر ہے۔ مجھے یقین ہے، بشیر احمد آپ لوگوں کو ایک ذرا سی بھی تکلیف یا پریشانی نہیں ہونے دے گا۔''

''ویری گڈ!'' مدیحہ نے ستائشی نظر سے ارشاد عباسی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں بشیر احمد سے ملنا چاہوں گی۔''

''ضرور...... کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں ابھی اسے یہاں بلاتا ہوں۔''

''آج کا دن تو ہم اپنے کمرے میں آرام کریں گے۔'' مدیحہ نے بتایا۔ ''کل صبح ٹھنڈیانی کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔''

''جیسی آپ کی خوشی۔'' ارشاد عباسی نے کہا۔ ''میں نے آپ لوگوں کے روم میں ایک ایکسٹرا بیڈ لگوا دیا ہے۔ امید ہے، وہ روم اور اس کی ہر شے آپ کو پسند آئی ہوگی۔''

عادل ملک نے مرینہ ان میں ایک کشادہ ڈبل بیڈ کمرا بک کرایا تھا اور مدیحہ کی فرمائش کے مطابق ہوٹل عملے کو اس روم میں ایک ایکسٹرا بیڈ لگانے کی ہدایت کر دی تھی۔ ویسے تو اس روم میں بچھا ہوا کنگ سائز ماسٹر بیڈ ان تینوں کے لیے کافی تھا لیکن مدیحہ کے پروگرام کے حساب سے ڈبل بیڈ پر اسے اور جیا کو سونا تھا جبکہ ایکسٹرا سنگل بیڈ عادل ملک کے آرام کے لیے لگوایا گیا تھا جو اپنی نفاست اور دبازت میں کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ عدل ملک کو وہ بیڈ پسند آیا تھا۔

''ہر چیز پرفیکٹ اور شاندار ہے عباسی صاحب!'' مدیحہ نے منیجر کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''خصوصاً واش روم کی کشادگی اور صفائی لائقِ تحسین ہے۔''

''شکریہ میڈم!'' منیجر نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

جس دوران میں ارشاد عباسی، مدیحہ سے بات کر رہا تھا، اس نے میسج کر کے بشیر احمد کو بھی وہیں بلا لیا تھا۔ مدیحہ نے بشیر کا مختصر سا انٹرویو کیا اور مطمئن ہونے کے بعد اسے اگلی صبح گاڑی کے ساتھ تیار رہنے کے لیے کہہ دیا پھر وہ جیا اور عادل کے ہمراہ اپنے کمرے میں آگئی۔

منیجر سے تمام تر گفتگو مدیحہ شاہ ہی نے کی تھی اور یہ سب پہلے سے طے تھا۔ وہ جیا کے حوالے سے بہت زیادہ حساس اور محتاط تھی۔ عادل ملک ایک ماں کے جذبات اور احساسات کو یہ خوبی سمجھتا تھا اس لیے اس نے مدیحہ کے پروگرام میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی تھی۔ اسے یہ سب نارمل لگا تھا۔

☆☆☆

سکندر شاہ کو اپنی مرضی کا داماد تلاش کرنے میں کم و بیش دو سال لگ گئے تھے۔ بالآخر اس کی مراد بر آئی۔ راشد بیگ ایک ایسا شخص تھا جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور وہ دل و جان سے گھر داماد بننے کو بھی تیار تھا۔ سکندر نے اس کے اخلاق اور عادات کا بھی بہ غور جائزہ لیا اور اسے پاس کر دیا۔ سکندر نے گرین سگنل دیا تو زاہدہ بیگم بھی تیار ہو گئیں۔ وہ تو پہلے ہی مدیحہ کی شادی کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اس سنہری موقع کو بھلا وہ کیسے ضائع کر سکتی تھی۔

شادی کے وقت مدیحہ شاہ کی عمر چھبیس سال اور راشد بیگ کی عمر تیس سال تھی۔ عمروں میں چار سال کا تفاوت آئیڈیل تھا۔ روزِ اول ہی سے میاں بیوی میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ سکندر شاہ اور زاہدہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ انہوں نے جیسا سوچا تھا، انہیں بہ عین ویسا ہی داماد مل گیا تھا۔ اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی۔

ان میاں بیوی کے اطمینان اور سکون پر تقدیر طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی کیونکہ ان دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جسے خوش قسمتی سمجھ کر خوش ہو لیے تھے، وہ بدبختی بن کر انہیں خون کے آنسو رلانے والی تھی۔

شادی کے ایک سال بعد مدیحہ نے جیا کو جنم دیا۔ اولاد

کے بعد ان کی زندگی میں صحیح معنوں میں بہار آگئی تھی۔ راشد بیگ اپنی بیٹی کو بہت زیادہ چاہتا تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور چار سال گزر گئے۔ جب جیا ساڑھے چار سال کی ہو چکی تو ایک تباہ کن طوفان نے مدیحہ کے دروازے پر دستک دی۔ سکندر شاہ نے ایک روز تنہائی میں اس سے انتہائی اہم ملاقات کی۔

''بیٹا جی! میں نہیں جانتا، اس بات کا تم پر کیا اثر ہوگا لیکن میں جو گڑبڑ دیکھ رہا ہوں، اسے تم تک پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔'' سکندر نے نرم لہجے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں، کھل کر کہیں پاپا......''

مدیحہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آپ کس قسم کی گڑبڑ کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''اس گڑبڑ کا تعلق تمہارے شوہر راشد بیگ سے ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''میں سمجھی نہیں پاپا؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے باپ کو دیکھا۔

''راشد بیگ فیکٹری کے اکاؤنٹس کے ساتھ شیطانی چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔'' سکندر نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''میں پچھلے تین ماہ سے اس کی حرکتوں کو نوٹ کر رہا ہوں اور میں نے کچھ چیزیں پکڑی بھی ہیں جو راشد بیگ کے خلاف جاتی ہیں۔''

راشد بیگ مدیحہ سے شادی کے بعد گھر داماد کی حیثیت سے سکندر شاہ کے بنگلے ہی میں رہائش پذیر ہو گیا تھا اور کسی ہونہار داماد کی طرح اس نے اپنے سسر کا ہاتھ بٹانے کے لیے پابندی کے ساتھ روزانہ فیکٹری جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اپنی محنت، ایمان داری اور وفا شعاری کی بدولت اس نے جلد ہی سکندر شاہ کے دل و دماغ میں اپنے لیے ایک معتبر مقام پیدا کر لیا تھا۔ سکندر شاہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا۔ مختلف شعبوں میں راشد بیگ کی عمدہ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے بالآخر سکندر نے اکاؤنٹس اور کیش کا ڈپارٹمنٹ اس کے سپرد کر دیا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد سکندر کو احساس ہو گیا کہ اس نے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کر ڈالا ہے۔ راشد کی ہیرا پھیری کا شک ہوتے ہی اس نے نہایت خفیہ طریقے سے اس کی نگرانی شروع کر دی۔ چند ماہ کی محنت کے بعد وہ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ راشد بیگ، اس کا گھر داماد بڑی ڈھٹائی اور صفائی کے ساتھ فیکٹری کو چونا لگا رہا تھا۔

سکندر کے سنسنی خیز انکشاف نے مدیحہ کو گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے گمبھیر انداز میں باپ سے سوال کیا۔

''پاپا! راشد بیگ اب تک کتنے کا گھپلا کر چکا ہے؟''

''ایک محتاط اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ کا حساب نہیں مل رہا۔'' سکندر نے جواب دیا۔ ''میرے پاس ایسے ٹھوس ثبوت ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ یہ غبن راشد بیگ ہی نے کیا ہے۔ اگر تم کہو تو میں وہ ثبوت دکھانے کو تیار ہوں۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں پاپا۔'' وہ قطعی انداز میں بولی۔ ''میں اپنی ذات سے بھی زیادہ آپ پر بھروسا کرتی ہوں۔ آپ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ میری نظر میں ایک روشن سچائی ہے۔ آپ نے اگر راشد بیگ کی کسی بے ایمانی کو پکڑا ہے تو بس...... یہی حقیقت ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں مستفسر ہوئی۔

''اب کرنا کیا ہے پاپا......؟''

''ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔'' سکندر نے معتدل انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک...... راشد کو بٹھا کر اس سے کھلی بات کریں۔ ثبوت دکھا کر اس سے کہیں کہ ہم نے اس کی چوری پکڑ لی ہے اور یہ کوئی اچھی روش نہیں۔ اسے جتنے بھی پیسوں کی ضرورت ہو، بتا کر اور مانگ کر لے سکتا ہے۔ یوں چوری کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ نمبر دو......'' آگے بڑھنے سے پہلے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''ہم خاموشی سے اس کی کمینگی کا تماشا دیکھتے رہیں......!''

''ایسے کیسے چپ چاپ، ہاتھ پر ہاتھ رکھے تماشا دیکھتے رہیں؟'' مدیحہ نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا اندھی لگی ہوئی ہے؟''

''میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں بیٹا جی۔'' سکندر شاہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''پھر تم ہی بتاؤ، کیا کیا جائے؟''

''میں راشد بیگ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے مگر اس سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔'' سکندر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ ذہن میں رکھنا کہ وہ تمہارا شوہر اور جیا کا باپ ہے۔ اگر بات بگڑ گئی تو کوئی بھی طوفان کھڑا ہو سکتا ہے۔ میں نے ابھی تک اس بارے میں تمہاری ماں کو کچھ نہیں بتایا۔''

"یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا ہے پاپا۔" وہ ستائشی نظر سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ فکر نہ کریں، میں طریقے سلیقے سے بات کروں گی۔"

"میں بڑے سے بڑا مالی نقصان برداشت کر سکتا ہوں مگر تم ماں بیٹی کی خوشیوں کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔" سکندر نے روہانسی آواز میں کہا۔ "اس لیے اپنے شوہر سے سوچ سمجھ کر بات کرنا بیٹا جی......!"

"میں نے کہا نا، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں آپ کا بیٹا بن کر اس معاملے کو خوش اسلوبی سے ہینڈل کرلوں گی۔"

"اللہ تمہیں کامیابی دے۔" سکندر نے دعائیہ انداز میں کہا۔

جب بدنصیبی گھر دیکھ لے تو پھر انسان بیٹھے بٹھائے مشکل میں آجاتا ہے۔ سکندر کی دعا اثر لائی اور نہ ہی مدیحہ کا، سچویشن ہینڈل کر لینے کا دعویٰ پورا ہو سکا۔ چند روز بعد ایک مناسب موقع دیکھ کر مدیحہ نے اس ٹاپک پر راشد بیگ سے بات کی تو وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

اس شام دونوں میاں بیوی کے بیچ پہلی بار جھگڑا ہوا۔ وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے بدنام و رسوا کرنے کے لیے کوئی سازش بنی گئی ہے...... اس بدمزگی کے نتیجے میں راشد بیگ چند دن تک منہ پھلائے گھومتا رہا۔ مدیحہ نے سکندر کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ باپ بیٹی اس مسئلے کا کوئی پائیدار حل تلاش کرنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ ایک غیر متوقع اور ناقابلِ یقین واقعہ پیش آگیا...... راشد بیگ اچانک کہیں غائب ہوگیا تھا۔

وہ باپ بیٹی اس تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھنے کی سعی میں معروف ہی تھے کہ دو ورز بعد مدیحہ شاہ کے نام کوریئر سروس سے راشد بیگ کا ایک پیکٹ موصول ہوا۔ جب مدیحہ نے اس پیکٹ کو کھولا تو اس کے اندر سے راشد بیگ کے جلے بھنے خط کے علاوہ ایک ایٹم بم بھی برآمد ہوا...... اس ایٹم بم کا نام تھا...... طلاق نامہ!

مدیحہ نے ڈائیوورس پیپرز کو ایک طرف رکھا اور راشد کی چٹھی کھول کر پڑھنے لگی۔ اس کم ذات نے بکواس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا تھا۔ تحریر نہایت ہی مختصر مگر دل و جگر میں آگ بھر دینے والی تھی۔

"مدیحہ! جب تمہیں مجھ پر اعتماد ہی نہیں تو ایک ساتھ رہنے کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ میں نے تمہیں آزاد کر دیا ہے۔ آج کے بعد ہمارے راستے جدا ہیں۔ تمہیں، تمہاری دولت مبارک ہو۔"

مدیحہ نے وہ خط اور طلاق نامہ سکندر کو دکھایا۔ پھر یہ معاملہ زاہدہ بیگم تک پہنچا۔ یوں گھر کے اندر ایک نامعلوم سی افسردگی پھیل گئی۔

آئندہ دو روز میں سکندر نے فیکٹری کے حسابات کو باریک بینی سے چیک کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ راشد نے فیکٹری کے اکاؤنٹس میں لگ بھگ تیس لاکھ کی خرد بُرد کی تھی۔ سکندر شاہ نے مدیحہ کو ان تلخ حقائق سے آگاہ کرنے کے بعد الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ راشد کو ایسی بے ایمانی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میں نے تو دل و جان سے اسے اپنا بیٹا مان لیا تھا اسی لیے اکاؤنٹس اور کیش کے معاملات اس کے ہاتھ میں دے دیے تھے۔ تیس کیا، وہ اگر مجھ سے ساٹھ لاکھ بھی مانگتا تو میں کوئی سوال کیے بغیر اسے یہ رقم فراہم کر دیتا...... آہ!"

"پاپا! انسان اپنی اصلیت کو زیادہ عرصے تک چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔" مدیحہ نے باپ کی دل شکستگی کے پیشِ نظر کہا۔ "جلد یا بہ دیر اس کی اوقات کھل کر سامنے آہی جاتی ہے۔ آپ راشد جیسے کم ظرف شخص کے لیے خود کو پریشان نہ کریں۔ ہمارا جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیں کہ ہم کسی بڑے ناقابلِ تلافی نقصان سے بچ گئے...... خس کم، جہاں پاک!"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا جی۔" سکندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جیا کو کسی بھی صورت یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ اس کا باپ ہمیں کون کون سا دکھ دے کر گیا ہے۔" مدیحہ نے تاکیدی انداز میں کہا۔ "وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ہم اسے جو بھی کہانی سنائیں گے، وہ یقین کرلے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔" سکندر نے کہا۔ "ہم جیا کو بہ آسانی سمجھالیں گے۔"

پھر جیا کے لیے یہ کہانی تیار کی گئی کہ اس کے پاپا راشد بیگ کو کمپنی کے کسی ضروری کام سے بیرونِ ملک جانا پڑ گیا ہے۔ وہ بہت جلدی لوٹ آئے گا۔ جیا کا معصوم ذہن اس کہانی سے بہل گیا۔ مدیحہ ہر روز جیا کو ایک سے ایک قیمتی کھلونا دلانے لگی۔ وہ کھیل کود میں مگن ہوگئی۔ پھر چند روز کے بعد جیا کو بتایا گیا کہ بیرونِ ملک ایک حادثے میں اس کا باپ ہلاک ہوگیا ہے۔ وہ چند روز تک اداس رہی پھر نارمل ہوگئی۔ مدیحہ اس کا اتنا زیادہ خیال رکھ رہی تھی کہ کچھ ہی عرصے میں وہ باپ کی

کسی کو بھول گئی۔ راشد بیگ اس کے لیے بس، ایک یاد بن کر رہ گیا۔

مدیحہ نے بڑی سمجھ بوجھ کے ساتھ جیا کو سنبھال لیا تھا اور اب وہی اس کی زندگی کا محور اور مرکز تھی۔ اس نے خود کو جیا کے ساتھ معروف کر لیا۔ بس اس کی یادداشت میں ایک اذیت ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئی تھی کہ راشد اسے ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔ اسے تیس لاکھ کے نقصان کا ایک ذرا سا ملال نہیں تھا مگر راشد کی مستردی اس کے لیے سوہانِ روح بن کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

مرینہ اِن کا بیرونی ماحول، رگوں میں خون منجمد کر دینے والا تھا۔ ہر جانب برف ہی برف اور ہر طرف ٹھنڈ ہی ٹھنڈ تھی اور یہی ٹھنڈیانی کا طرۂ امتیاز بھی تھا۔ وہ اصل ہل اسٹیشن سے ابھی گیارہ کلومیٹرز دور کوزہ گلی کے ایک گیسٹ ہاؤس میں تھے مگر یہاں بھی موسم کی شدت میں کوئی کمی یا نرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ درجۂ حرارت منفی بارہ ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس تھا۔ وہ لوگ مرینہ ان کے کمرے میں بڑے سکون سے لیٹے ہوئے تھے۔ جان دار ہیٹر کی بہ دولت یہ احساس ناپید ہو گیا تھا کہ گیسٹ ہاؤس کے باہر کس کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے۔

مدیحہ نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ”عادل! اگر میں ایک لائٹ آن چھوڑ دوں تو تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ تمہاری نیند میں خلل تو نہیں پڑے گا؟“

”مجھے اتنی زور کی نیند آ رہی ہے کہ ایک لائٹ کیا، تم اس کمرے میں روشن لائٹس کا جمعہ بازار بھی لگا دو تو میں ایک دم مزے سے سوتا رہوں گا۔ ویسے بھی......“ اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر معنی خیز انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں اس وقت آپ دونوں ماں بیٹی کے ڈسپوزل پر ہوں۔ تم چاہے جو بھی سلوک کرو، مجھے گوارا ہے...... گڈ نائٹ!“

یہ سچ ہے کہ ٹھنڈیانی آنا خالصتاً مدیحہ کا پروگرام تھا۔ عادل نے شروع میں اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کہیں اور سیر و تفریح کے لیے چلتے ہیں۔ اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں ٹھنڈیانی ہی کیوں......؟ لیکن مدیحہ کی ضد آمیز اصرار کے سامنے اس نے سپر ڈال دی تھی اور کسی فرمانبردار شوہر کے مانند وہ اپنی نصف بہتر کو فالو کرتا چلا آ رہا تھا۔

مدیحہ نے بھی اسے ”گڈ نائٹ“ کہنے کے بعد کمرے کی فاضل لائٹس آف کر دیں۔ بس، ایک لائٹ کو آن رہنے دیا تھا۔ وہ واپس بستر پر آئی اور جیا کے برابر میں لیٹ گئی۔ جیا کافی کمزور ہو گئی تھی۔ بستر پر آتے ہی وہ آنکھیں بند کر لیتی تھی اور عموماً اسی حالت میں سو بھی جاتی تھی۔ اس تکلیف دہ علاج نے اس کے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس پر اکثر نقاہت طاری رہتی تھی اور دیکھنے والے کو یہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔

مدیحہ نے سوتی ہوئی جیا کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے، پھر آیۃ الکرسی پڑھ کر اس کے چہرے پر پھونک دی۔ اس کے بعد اپنا ایک بازو جیا کے اوپر دراز کر کے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ اپنی بیٹی کی حفاظت اس طرح کر رہی تھی جیسے کوئی مرغی اپنے چوزوں کو چیل سے بچانے کے لیے ہمہ وقت چوکنا رہتی ہے۔ اس کی کڑی نگرانی کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ آکسیجن کو جیا کے پھیپھڑوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بھی مدیحہ سے اجازت لینا پڑتی ہے۔

☆☆☆

راشد بیگ کی کمینگی کے بعد مدیحہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔ اسے شادی کے نام سے جیسے نفرت سی ہو گئی تھی لیکن زندگی اتنی آسان نہیں جتنا ہم اسے سمجھ لیتے ہیں۔ اس نے ہمارے لیے کیا سوچ رکھا ہوتا ہے، اس کی ہمیں مطلق خبر نہیں ہوتی اور جب کوئی غیر متوقع چیز ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے تو ہم حیرت سے پکار اٹھتے ہیں۔

”یہ کیا ہو گیا...... کیسے ہو گیا...... کیوں ہو گیا......؟“

لگ بھگ ڈھائی سال پہلے یعنی راشد بیگ کے دفع ہو جانے کے کوئی آٹھ نو سال بعد ایسا ہی ایک واقعہ مدیحہ کے ساتھ بھی پیش آیا اور یہ واقعہ تھا...... اس کی زندگی میں عادل ملک کی انٹری۔ اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عادل کی طرف کیسے مائل ہو گئی۔ عادل ملک میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی کسی بیوی کو تمنا ہوتی ہے۔ شاندار مقناطیسی شخصیت، وجاہت، ذہانت، صحت اور تعلیم۔ وہ چند روز ہی میں مدیحہ کے اتنا قریب آ گیا کہ مدیحہ کو اپنی شادی نہ کرنے کی قسم توڑنا پڑی۔ اس نے سکندر شاہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ سکندر نے عادل سے ایک بھرپور ملاقات کی۔ اس کے بعد باپ بیٹی اس موضوع پر سنجیدہ بات چیت کرنے بیٹھ گئے۔

”ہاں تو پاپا!“ مدیحہ نے سکندر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا کیا فیصلہ ہے؟“

”شادی کرنا تمہارا جائز شرعی حق ہے۔“ سکندر نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں تم سے تمہارا یہ حق چھین نہیں سکتا۔“

''میں اپنے لیے آپ کی محبت کو بڑی اچھی طرح سمجھتی ہوں پاپا۔'' مدیحہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ عادل سے مل چکے ہیں۔ آپ کو میرا انتخاب کیسا لگا؟''

''عادل میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں وہیں پر چند ایک خرابیاں بھی ہیں۔'' سکندر نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''پاپا! میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''مجھے بتائیں، آپ نے عادل میں کون کون سی خرابی دیکھی ہیں؟''

''وہ گھر داماد بننے کے لیے تیار نہیں۔'' سکندر نے کہا۔

''یہ خامی نہیں، خوبی ہے پاپا۔'' وہ عادل کی حمایت میں بولی۔ ''آپ اسے عادل کی خودداری سمجھ لیں۔ آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر میں اس گھر سے رخصت ہو گئی تو آپ اکیلے ہو جائیں گے۔ ممی کے چلے جانے کے بعد آپ بہت زیادہ خاموش اور بجھے بجھے سے رہنے لگے ہیں۔''

سات سال پہلے زاہدہ بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ شریکِ حیات کی ابدی جدائی نے سکندر کو اندر سے توڑ دیا تھا۔ اس نے اپنی رفیقِ سفر کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔

''یہ ایک کھلی سچائی ہے کہ اگر تم رخصت ہو کر کسی دوسری جگہ چلی گئیں تو میرے لیے زندگی خاصی دشوار ہو جائے گی۔'' سکندر نے بیٹی کی بات کے جواب میں کہا۔ ''میں تمہارا اور جیا کا عادی ہو چکا ہوں لیکن میرے تحفظات ذرا دوسری قسم کے ہیں۔''

''میں عادل کو اس بات کے لیے راضی کر لوں گی کہ وہ اس بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر رہائش اختیار کر لے تاکہ صبح شام آپ سے ملاقات ہوتی رہے۔'' مدیحہ نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''لیکن میں آپ کے تحفظات کے بارے میں ضرور جاننا چاہوں گی؟''

''جیا تیرہ سال کی ہو چکی ہے۔'' سکندر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں کہا۔ ''اگر اس کی نانی زندہ ہوتی تو میں اسے اپنے پاس رکھ لیتا..... وہ اگرچہ تیرہ سال کی ہے مگر اپنی اچھی صحت کی بنا پر اٹھارہ انیس کی لگتی ہے..... تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

''میں آپ کے خدشات کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں پاپا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ اپنی جگہ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں لیکن آپ کو بتاتی چلوں کہ جیا کے سلسلے میں عادل سے میری تفصیلی بات ہو چکی ہے بلکہ میں نے جیا کو اس سے ملوا بھی دیا ہے۔ عادل کو بچوں سے بہت محبت ہے۔ وہ بے بی کو اپنی سگی بیٹی کی طرح رکھے گا۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔''

''جب سب کچھ تم طے کر چکی ہو تو مجھے تمہارے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' سکندر نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''لیکن میرے ایک مشورے کو ذہن نشین کر لو۔ میں نے عادل کی آنکھوں میں ایک عجیب سی منفیت دیکھی ہے۔ اگر زندگی میں کبھی تمہیں محسوس ہو کہ وہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے تو پہلی فرصت میں اس سے جان چھڑا لینا۔''

''پاپا! آپ نے دو سال کی تلاش کے بعد میرے لیے راشد بیگ دریافت کیا تھا.....'' وہ سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کڑوے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے مختلف تجربات سے گزارنے کے بعد اسے ''اوکے'' کیا تھا لیکن اس ساری چھان پھٹک کا جو نتیجہ برآمد ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔

''انسان کو ہر کام خود ہی کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی کے کچھ معاملات کو وقت، حالات اور اللہ پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔''

مدیحہ نے عادل سے شادی کرنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے پاس سکندر شاہ کے ہر اعتراض اور ہر سوال کا جواب بھی موجود تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''اللہ تمہارا حامی و ناصر بیٹا جی.....!''

ایسے نازک اور کٹھن مواقع پر ایک باپ کے پاس، اپنی اولاد کو دینے کے لیے دعاؤں کا تحفہ ہی رہ جاتا ہے۔ سکندر نے تہِ دل سے دعا کی کہ پروردگار مدیحہ کے فیصلے کو درست اور اس کے خدشات کو غلط ثابت کر دے۔

☆☆☆

ناشتا انہوں نے اپنے کمرے میں منگوا کر کیا تھا۔ عادل صبح والی چائے میں دو قطرے کسی ٹانک کے ملا کر پیا کرتا تھا۔ اس کے بقول، وہ اعصاب کو قوت دینے والا ایک کرشماتی ٹانک تھا۔ عادل کا دعویٰ تھا کہ اس ٹانک کے صرف دو قطرے اسے دن بھر ہشاش بشاش اور چاق چوبند رکھتے تھے۔

ناشتے کے اختتام پر جب عادل چائے پینے لگا تو اس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ ''تم نے وہ ٹانک تو میری چائے میں ڈال دیا ہے نا؟''

یہ ذمے داری مدیحہ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اس

نے ڈی فارمیسی کر رکھا تھا۔ ادویات کے بارے میں وہ کسی ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے زیادہ جانکاری رکھتی تھی۔ عادل جو ٹانک استعمال کرتا تھا، وہ ایلوپیتھک تھا اور نہ ہی ہومیوپیتھک بلکہ اسے ہربل کہا جاسکتا تھا۔ مدیحہ نے اس کا فارمولا دیکھ کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ اس کے اندر کوئی مضرِ صحت اجزا شامل نہیں تھے۔ عادل نے وہ ٹانک مدیحہ کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ ناشتے والی چائے میں اس کے دو قطرے ٹپکا دیا کرے۔

''میں بھلا اپنی ذمّے داری سے کیسے غفلت برت سکتی ہوں۔'' عادل کے استفسار کے جواب میں اس نے کہا۔ ''آپ چائے پی کر دیکھو۔ چند ہی منٹ میں تمہارے بدن کے اندر کرنٹ نہ دوڑنے لگے تو پھر بات کرنا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہم باہر نکلنے والے ہیں۔ اس ٹھنڈے ٹھار برفیلے موسم میں یہ ٹانک مجھے حرارت دیتا رہے گا۔''

انہوں نے ناشتا کیا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ ڈرائیور بشیر احمد گیسٹ ہاؤس کی لابی میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تینوں نئی نکور ٹویوٹا۔ ایکس ایل آئی میں بیٹھے اور گیسٹ ہاؤس سے ٹھنڈیانی کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایبٹ آباد سے ٹھنڈیانی ہل اسٹیشن ساڑھے سینتیس کلو میٹرز کے فاصلے پر ہے جبکہ مری نہ ان سے محض گیارہ کلو میٹرز۔ اگر یہ زمینی ہموار سفر ہو تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں یہ فاصلہ طے کیا جاسکتا ہے مگر وہ چکردار پہاڑی راستہ تھا اور برف سے تقریباً ڈھکا ہوا پھر مسلسل چڑھائی کے باعث بھی بشیر احمد نے کار کی رفتار کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے مطابق، وہ لوگ کم و بیش بیس منٹ میں ٹھنڈیانی ہل اسٹیشن کے مین پوائنٹ پر پہنچ جاتے۔

اس سفر کے دوران میں گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بشیر احمد انہیں ٹھنڈیانی کی تاریخ اور جغرافیے سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ سب اس کی فراہم کردہ دلچسپ معلومات سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ لوگ مری نہ ان اور ٹھنڈیانی کے تقریباً وسط میں تھے کہ عادل نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مدیحہ! مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے.....''

''میں سمجھ گیا۔'' بشیر نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے کہا۔ ''اتنی زیادہ بلندی پر آکسیجن کا تناسب کم ہو جاتا ہے اور بعض لوگوں کو اس سے پرابلم ہو جاتی ہے، خصوصاً دل کے مریضوں کو..... آپ کہیں ہارٹ پیشنٹ تو نہیں ہیں؟''

بشیر نے یہ سوال براہِ راست عادل ملک سے کیا تھا جو اس کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مدیحہ اور جیا عقبی نشست پر براجمان تھیں۔

''نہیں بھائی، ایسی کوئی بات نہیں۔'' عادل نے ڈرائیور کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''میرا دل بہت مضبوط اور صحت مند ہے۔ پتا نہیں، اچانک میرے پھیپھڑے کیوں سکڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ آکسیجن کو قبول نہیں کر رہے اسی لیے مجھے سانس لینے میں بڑی مشکل ہو رہی ہے۔''

''اگر آپ کو دل کا عارضہ نہیں تو پھر آپ کی اس حالت کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے.....'' بشیر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

مدیحہ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

''سر! فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' بشیر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''دائیں بائیں، آگے پیچھے بلند و بالا پہاڑ اور چکردار مسلسل چڑھائی کے سفر کی وجہ سے بھی بعض لوگوں کو چکر آنے لگتے ہیں اور کمزور معدہ افراد تو الٹیاں بھی کرنے لگتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اگر سر پچھلی سیٹ پر چلے جائیں تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

بشیر کی تجویز پر فوراً عمل کیا گیا۔ فرنٹ سیٹ خالی ہو گئی۔ عادل ملک عقبی نشست پر مدیحہ اور جیا کے ساتھ بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

بشیر احمد کا سارا فلسفہ اور پہاڑیات کا علم و تجربہ اس وقت خاک میں مل گیا جب پچھلی سیٹ پر پہنچنے کے باوجود بھی عادل کی کیفیت میں کوئی بہتری نمودار نہیں ہوئی بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ بُری حالت میں چلا گیا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''مدیحہ! کرنل صاحب کو..... فون لگاؤ..... میری طبیعت بہت زیادہ..... خراب ہو رہی ہے..... اگر مجھے فوری طور پر طبی امداد..... نہ ملی تو میرا دل..... بند ہو جائے گا..... اور پھیپھڑے..... تم اندازہ نہیں لگا سکتی ہو کہ میں..... کس تکلیف سے گزر رہا ہوں۔''

جتنی دیر میں عادل ملک کی بات پوری ہوئی، مدیحہ اپنی دوست رخشندہ کو کال کر چکی تھی۔ رابطہ ہونے پر مدیحہ نے رخشندہ کو عادل کی، تیزی سے بگڑتی ہوئی حالت کے بارے میں بتایا۔ اتفاق سے اس وقت کرنل (ر) جمشید خان گھر میں موجود تھا۔ رخشندہ نے فون کرنل کو تھما دیا۔ جمشید نے سچویشن کو کنٹرول کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"بھابی! ٹھنڈیانی یا اس کے گردونواح میں ایسا کوئی جدید میڈیکل سینٹر نہیں ہے جو اس ایمرجنسی کو ہینڈل کر سکے۔ مجھے یقین ہے کہ زیادہ بلندی کی طرف جاتے ہوئے ملک صاحب آکسیجن کی کمی کے باعث ایسی کیفیت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آپ لوگ فی الفور ایبٹ آباد آجائیں۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"شکریہ جمشید بھائی!" مدیحہ نے غم میں ڈوبی ہوئی تشکرانہ آواز میں کہا۔ پھر ٹیلی فونک رابطہ موقوف کرنے کے بعد بشیر سے کہا۔

"بشیر احمد! ہمیں کسی بھی طرح، جتنی جلدی ممکن ہو، ایبٹ آباد پہنچادو۔ تم جتنا کہو گے، ہم ایکسٹرا پے کر دیں گے۔"

بشیر احمد نے گہری سنجیدگی میں سر کو اثباتی جنبش دی، پھر گاڑی کو یوٹرن دے کر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

☆☆☆

عادل ملک سے مدیحہ کی شادی کو سوا سال ہی گزرا تھا کہ اسے ایک گہرے دلی صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ سکندر شاہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا تھا۔ مدیحہ کی والدہ زاہدہ بیگم کے انتقال کو کئی سال بیت چکے تھے۔ سکندر کی موت نے اسے صحیح معنوں میں یتیم کر دیا تھا۔

عادل ملک کے اصول اور مدیحہ کی خواہش کے تال میل سے انہوں نے مدیحہ کے میکے کے انتہائی نزدیک ایک بنگلا کرائے پر دیکھ لیا تھا۔ اس طرح عادل کی اصولی ضد بھی پوری ہو گئی تھی اور مدیحہ کو اپنے باپ کا اور سکندر شاہ کو اپنی بیٹی کا قرب حاصل ہو گیا تھا۔ سکندر کے انتقال کے بعد وہ لوگ واپس اسی بنگلے میں آگئے جہاں مدیحہ پیدا ہوئی تھی، اس کا بچپن کھیلا تھا اور وہ پڑھ لکھ کر جوان ہوئی تھی۔ اسی بنگلے میں مدیحہ نے ایک خوب صورت بیٹی جیا کو بھی جنم دیا تھا۔

جہاں اس آبائی رہائش گاہ کے ساتھ ان گنت خوش گوار یادیں جڑی ہوئی تھیں وہیں پر مدیحہ نے کئی ایک صدمے بھی جھیلے تھے جیسا کہ راشد کا دغا دے جانا، اس کے نام کے ساتھ "مطلقہ" کا منحوس لیبل چسپاں ہو جانا اور اس کی ممی زاہدہ بیگم کا داغِ مفارقت دے جانا اور اب پاپا کی دائمی جدائی...... ان میں سے کوئی بھی صدمہ اپنی شدت اور زہرناکی کے حوالے سے معمولی نہیں تھا لیکن مدیحہ کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دوبارہ اپنے آبائی گھر آنے کے بعد اسے ایک ایسی سوہانِ روح اذیت سے گزرنا پڑے گا جو گزشتہ تمام صدمات پر بھاری پڑ جائے گی۔

ایک ماہ پہلے جیا نے خودکشی کی کوشش کر ڈالی تھی۔

مدیحہ نے پیار، محبت، توجہ، تعلیم، عیش، آرام...... الغرض اس دنیا کی ہر نعمت اپنی بیٹی پر نچھاور کر رکھی تھی۔ ایسی سہولیات کے ساتھ ٹھاٹ کی زندگی گزارنے والی کوئی جوان اور خوب صورت لڑکی اگر اپنی جان لینے کی کوشش کرے تو سننے والے کا ذہن مختلف نوعیت کے خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے جن میں سے ہر ایک خیال اپنی سنگینی اور خطرناکی میں دوسرے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

جیا نے خود کو ختم کرنے کے لیے خواب آور گولیوں کی پوری بوتل اپنے معدے میں اتاری تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ عادل ملک اور مدیحہ گھر میں موجود نہیں تھے۔ عادل ایک کاروباری ٹرپ پر دبئی گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی تین چار روز بعد تھی اور مدیحہ حسبِ معمول اپنی فیکٹری میں تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا یا پھر جیا کی خوش نصیبی کہ مدیحہ کو کسی ضروری کام کے لیے گھر آنا پڑا اور جیا کی پُراسرار، خطرناک اور معنی خیز بے ہوشی اس کی پکڑ میں آگئی۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر سلیپنگ پلز کی خالی بوتل دیکھ کر مدیحہ پلک جھپکتے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔

اپنی جان لینے کی کوشش کرنا، قابلِ دخل اندازی پولیس فعل ہے۔ یہ بات مدیحہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ فی الفور جیا کو گاڑی میں ڈال کر اپنی ایک دوست ڈاکٹر کے پرائیویٹ اسپتال لے گئی۔ اگر وہ کسی اور اسپتال کا رخ کرتی تو یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس بن جانا تھا۔ پولیس کی جیب بھر کر معاملہ رفع دفع تو کیا جا سکتا تھا لیکن اس پروسس میں جو پریشانی، خواری اور بدنامی ہوتی، مدیحہ اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر صندل کالج کے زمانے میں اس کی کلاس فیلو ہوا کرتی تھی۔

ڈاکٹر صندل نے جیا کو ایسے ٹریٹ کیا جیسے یہ اس کی اپنی بیٹی کا معاملہ ہو۔ پہلی فرصت میں جیا کا معدہ صاف کیا گیا، ڈرپ تو مسلسل لگی ہوئی تھی اور اس میں حسبِ ضرورت انجکشنز بھی ڈالے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صندل کی مہارت اور تجربے کے طفیل کچھ ہی دیر کے بعد جیا کو ہوش آگیا تھا لیکن مدیحہ نے اس وقت تک اس سے کوئی سوال نہیں کیا جب تک جیا کی جسمانی اور ذہنی کیفیت نارمل نہیں ہو گئی۔

کم و بیش دس بجے رات مدیحہ اس کے بیڈ کے ساتھ کرسی ڈال کر بیٹھ گئی پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بڑے دُلار سے پوچھا۔

"بے بی...... اس اقدام کی نوبت کیوں آئی؟"

جواب میں جیا کی آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی۔

''میری جان! میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔'' وہ جیا کے ہاتھ کو ہلکے ہلکے دباتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔ ''میں تمہارے لیے پوری دنیا سے ٹکرا سکتی ہوں۔ مجھے بتاؤ، کس دکھ نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ تمہاری زندگی میں ایسی کون سی کمی تھی؟ میں سچائی تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ۔''

''آپ میں حوصلہ ہے۔'' جیا کے ہونٹ کپکپائے۔ ''حقیقت جاننے...... اور...... سچ سننے کا......؟''

''یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو جیا......؟'' مدیحہ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''مجھ سے زیادہ تمہارا ہمدرد اور کون ہو سکتا ہے؟''

''آپ کو تو اپنی فیکٹری اور دوسرے شوہر ہی سے فرصت نہیں۔'' جیا نے عجیب سی نظر سے مدیحہ کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھ پر اس گھر میں کچھ بھی بیت رہی ہو، آپ کی بلا سے۔''

مدیحہ کے ذہن میں جیسے کوئی ایٹمی دھماکا ہوا۔ وہ جیا کا ہاتھ چھوڑ کر کمرے سے باہر آئی پھر اسٹاف نرس کو ہدایت کی۔ ''میں اپنی بیٹی کے ساتھ مکمل تنہائی میں تھوڑا وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ جب تک میں خود نہ بلاؤں، کوئی ڈاکٹر، کوئی نرس حتیٰ کہ اسٹاف کا کوئی بھی بندہ کمرے کے اندر نہیں آنا چاہیے۔''

''او کے میڈم!'' نرس نے شائستگی سے کہا۔ ''آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔''

مدیحہ نے کمرے میں آنے کے بعد دروازہ بند کیا، احتیاطاً ڈور ہینڈل کے سینٹر میں موجود ناب کو دبا کر کمرے کو لاک بھی کر دیا اور دوبارہ جیا کے پاس آ بیٹھی۔ پہلے کی طرح اس نے اپنی بیٹی کے ہاتھ کو تھام لیا اور گہری سنجیدگی سے بولی۔

''تم میرے حوصلے اور ہمت کو اچھی طرح جانتی ہو۔ میں تمہاری خاطر موت سے بھی لڑ سکتی ہوں۔ کیا کوئی موت سے بھی زیادہ خطرناک اور بے رحم ہو سکتا ہے؟''

''مما......!'' وہ بلک پڑی۔ ''وہ موت سے بھی زیادہ بھیانک، سفاک اور کمینہ ہے۔ آپ کو کچھ پتا نہیں...... آپ نے تو اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں......''

''بے بی! تم ہوش میں تو ہو؟'' مدیحہ نے تیز آواز میں کہا۔ ''میں...... میں تمہاری طرف سے آنکھیں بند کر لوں گی؟ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے، کیا کہہ رہی ہو...... اس گھر میں تم پر ایسی کیا بیت رہی ہے جس نے تمہیں خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا؟ تین افراد کی فیملی ہے ہماری۔ تمہیں مجھ سے شکایت ہے یا عادل سے۔ ہم میں سے کون موت سے بھی زیادہ بھیانک، سفاک اور کمینہ ہے؟''

''آپ کا دوسرا شوہر......'' جیا نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مدیحہ کے تو جیسے پاؤں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ وہ جیا کی فطرت اور عادت سے اچھی طرح واقف تھی۔ جیا اس سے جھوٹ نہیں بولتی تھی لیکن اس وقت جیا نے جس انداز میں عادل ملک کی جانب اشارہ کیا تھا، وہ مدیحہ کو چکرا دینے کے لیے کافی تھا۔

مدیحہ نے جیا کے آنسو پونچھے اور ہر قسم کا تسلی دلاسا دے کر اسے تحفظ اور رازداری کا کامل یقین دلانے کے بعد سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''بے بی! مجھے کھل کر بتاؤ، عادل نے تمہارے ساتھ ایسا کیا کر دیا جو تم خود کو ختم کرنے جا رہی تھیں؟ میں سب کچھ سچ سننا چاہتی ہوں......''

آئندہ پندرہ منٹ میں جیا نے اپنی جو بپتا سنائی، اس نے مدیحہ کے ہوش اڑا دیے۔ اسے اپنا وجود کرچی کرچی ہوتا محسوس ہوا۔ جیا کے آخری الفاظ نے تو مدیحہ کا جگر خون کر دیا۔

''مما! وہ مجھے سیکس ڈول بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ میں مجبوری میں ڈر کر، ایک حد تک اس کے قریب گئی ہوں مگر وہ اس حد سے آگے گزرنے کا خواہش مند ہے۔''

''تمہاری مجبوری اور ڈر کا سبب کیا ہے؟'' مدیحہ نے پھنکار سے مشابہ آواز میں استفسار کیا۔ ''تم ایک حد تک بھی اس کے نزدیک کیوں گئیں؟ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں......؟''

''وہ ایک شاطر بلیک میلر اور ڈرگ پیڈلر ہے مما......'' جیا نے جھرجھری لیتے ہوئے بتایا۔ ''اس کے پاس میری اور آپ کی عریاں ویڈیو کلپس ہیں۔ وہ نانا جان کی فارماسیوٹیکل کمپنی کی آڑ میں اپنا ڈرگز کا دھندا بھی چلا رہا ہے۔ آپ بہت ہی بھولی اور بے وقوف عورت ہیں مما۔ وہ ہم سب کو تباہ کر دے گا۔ اس نے دبئی جانے سے پہلے مجھے دھمکی دی تھی کہ تین چار دن میں اچھی طرح سوچ لوں۔ اگر میں نے اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کیا تو وہ یہ سارے ویڈیو کلپس آن لائن ڈال دے گا۔''

''ایک منٹ......!'' ان اذیت ناک لمحات میں بھی مدیحہ نے اپنے حواس کو مختل نہیں ہونے دیا تھا۔ ''تم نے کیسے یقین کر لیا کہ اس شیطان کے پاس تمہارے اور میرے

عریاں ویڈیو کلپس ہیں۔ کیا اس نے یہ کلپس تمہیں دکھائے ہیں؟''

جیا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اس کمینے نے وہ ویڈیو کلپس ریکارڈ کیسے کیے؟'' مدیحہ نے پوچھا۔

''واش رومز کے اندر ہڈن مائیکرو کیمراز لگا کر۔'' جیا نے جواب دیا۔ ''کیونکہ وہ تمام ویڈیو کلپس ہمارے شاور لینے کے اوقات کے ہیں۔ اس کے علاوہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر سنسنی خیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اس بدذات نے میرے اور آپ کے سیل فونز سے، ہمارے علم میں لائے بغیر شہر کے بعض ڈرگ پیڈلرز (منشیات فروش) کو کالز بھی کی ہیں۔ بعد میں ہمارے فونز سے ڈائلڈ کالز کا ریکارڈ صاف کر دیا مگر ان ڈرگ پیڈلرز کے سیل فونز میں ہماری اِن کمنگ کالز کا ریکارڈ موجود ہے۔ ایسا وہ متعدد بار کر چکا ہے۔ ان میں بعض ڈرگ پیڈلرز اسی کے بندے ہیں جب میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے سارے کالے کرتوت آپ کو بتا دوں گی تو اس نے کسی درندے کے مانند غرا کر کہا تھا۔ ''اگر تم نے میرے خلاف زبان کھولی تو تم ماں بیٹی کی عریاں ویڈیو تو سوشل میڈیا پر وائرل ہوں گی ہی اس کے ساتھ ہی میں تم لوگوں کی ڈرگ پیڈلرز کو کی جانے والی کالز کا ریکارڈ اپنے ایک جاننے والے پولیس آفیسر کو دے کر تم دونوں کو ایسے خطرناک کیس میں فٹ کراؤں گا کہ تم آٹھ دس سال کے لیے جیل چلی جاؤ گی۔ پھر بنگلا، کاریں، بینک بیلنس اور فیکٹری سب میرا ہو جائے گا۔'' وہ ایک بار پھر متوقف ہوئی۔ اس کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''مما! میں ڈر گئی تھی۔ مجبور ہو گئی تھی۔ میرے ذہن پر اتنا زیادہ دباؤ تھا کہ میں نے خود کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

صورتِ حال روزِ روشن کے مانند عیاں ہو چکی تھی۔ مدیحہ کافی دیر تک جیا کو تھپکتی رہی۔ جب جیا کی حالت نارمل ہو گئی تو اس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

''بے بی! میری بات دھیان سے سنو اور میں جو کہوں، من و عن اس پر عمل کرنا ہے...... عمل کرو گی نا؟''

''جی مما! ضرور کروں گی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''تمہارے نانا جان بڑے گیانی تھے بے بی۔'' مدیحہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آج پاپا مجھے بے طرح یاد آرہے ہیں۔ جب میں اس انسان نما بھیڑیے سے شادی کر رہی تھی تو پاپا نے مجھے ایک نصیحت کی تھی۔ ''میں نے عادل کی آنکھوں میں ایک عجیب سی منفیت دیکھی ہے۔ اگر زندگی میں کبھی تمہیں محسوس ہو کہ وہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے تو پہلی فرصت میں اس سے جان چھڑا لینا۔'' مجھے لگتا ہے، عادل سے جان چھڑانے کا وقت آ گیا ہے۔''

جیا نے بے یقینی سے مدیحہ کی طرف دیکھا اور پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ''آپ یہ سب کیسے کریں گی مما؟''

''اسی کی طرح شاطر دماغی سے...... میں ایک کوالیفائڈ اور کامیاب فارماسسٹ ہوں، کوئی گھسیارن نہیں۔'' مدیحہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''اور اس زہریلے کھیل میں تم میری مدد کرو گی اپنی لازوال اداکاری کی مدد سے......او کے؟''

''او کے مما......'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

عادل ملک دبئی سے لوٹا تو اسے پتا چلا کہ جیا کو کورونا ہو گیا ہے لہٰذا پندرہ روز کے لیے اسے ڈاکٹر صندل کے اسپتال میں قرنطینہ میں رکھا گیا ہے۔ اپنی دوست ڈاکٹر صندل سے ''سیٹنگ'' کرنے کے بعد مدیحہ نے فون کر کے عادل کو جیا کی بیماری کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس طرح دو ہفتے کے بعد جیا اسپتال سے ڈسچارج ہوئی اور مدیحہ کے بے حد اصرار پر وہ لوگ ''ٹھنڈیانی یاترا'' پر نکل کھڑے ہوئے تھے اور اس ٹور کے دوران میں مدیحہ نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی جیا کو خود سے جدا نہیں کیا تھا۔

جب آپ کے گرد و پیش کا ماحول تعفن زدہ ہو جائے اور اس پر مستزاد بادِ سموم بھی چلنے لگے تو بعض کٹھن فیصلے لینا ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ مثل مشہور ہے لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے اور زہر کا تریاق بھی زہر ہی سے تیار کیا جاتا ہے۔

تیاری زہر کی ہو یا تریاق کی، یہ کام کسی فارماسسٹ سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مدیحہ نے ایک ایسا بے رنگ، بے بو، بے ذائقہ ''ٹانک'' تیار کر لیا تھا جس کے صرف دو قطرے اگر چائے میں ملا کر پی لیے جائیں تو آدھے گھنٹے کے اندر پھیپھڑے سکڑ کر اخروٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ دنیا کا کوئی بھی لیبارٹری ٹیسٹ، اس ''ٹانک'' سے ہلاک ہونے والے شخص کے وجود میں اس کی موجودگی کو ثابت نہیں کر سکتا۔

مدیحہ نے سکندر شاہ کی زندگی میں تو اس کی بات نہیں مانی تھی لیکن اپنے پاپا کی نصیحت کو نہ صرف یاد رکھا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کر کے دکھا دیا تھا۔

❖❖❖

کہانی

نسرین خام

کبھی کبھی لگتا ہے کہ انسانی زندگی کسی الماری کی طرح ہے... جس مین طرح طرح کا سامان بھرا ہو... اس الماری میں کبھی اپنا سامان نکلتا ہے تو کبھی دوسروں کا... ایک ایسی ہی عورت کا ماجرا... جس کی زندگی تقریباً کسی الماری کے مانند تھی... جس میں سے ہر روز ایک نئی کہانی برآمد ہوتی تھی... اس بار جو کہانی پیش کررہی تھی... اس کا مرکزی کردار وہ خود تھی...

رشتہ سود و زیاں میں ہو جانے والے تجربات کا حساب.....

ہر شخص کی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ آپ کسی کی کہانی سے کما حقہٗ واقف بھی ہوں۔ خاور کی بیوی ہر روز اُسے ایک نئی کہانی سنایا کرتی تھی۔ جب بیوی کی اوٹ پٹانگ کہانیاں سن سن کر اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو اس نے دونوں کانوں کے درمیان نلکی ڈال کر بہ یک وقت ان کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس ''نلکی'' کی برکت سے خاور کا مسئلہ حل ہو گیا تھا لیکن یہ کہانی سنسنی خیز اور فکر انگیز تھی اس لیے وہ رافیہ کی بات پر توجہ دینے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔

خاور سائٹ ایریا میں واقع، پینٹ بنانے والی ایک فیکٹری میں بہ طور مشین آپریٹر کام کرتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک کی تھی لیکن وہ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے اکثر چھٹی کے بعد تین چار گھنٹے اوور ٹائم بھی کیا کرتا تھا چنانچہ گھر پہنچتے تک رات کے دس تو بج ہی جایا کرتے تھے۔

''آج ایک عجیب بات ہوئی ہے۔'' وہ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو رافیہ نے اضطراری انداز میں کہا۔

رافیہ کی عمر چالیس کے آس پاس تھی اور وہ ایک گھریلو عورت تھی۔ خاور عمر میں اس سے کم و بیش پانچ سال بڑا تھا۔ ان کی شادی کو چودہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا مگر ابھی تک وہ لوگ اولاد ایسی نعمت سے محروم تھے۔

''تمہاری تو ہر کہانی ہی عجیب ہوتی ہے۔'' خاور نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ''میں توجہ سے تمہاری بات سنتا ہوں، اس پر غور بھی کرتا ہوں مگر مجال ہے کہ کبھی کچھ پلے بھی پڑا ہو۔''

''میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم نے مجھے سمجھ رکھا ہے۔'' وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی۔ ''میری تعلیم زیادہ نہ سہی لیکن اللہ نے مجھے سوچنے اور سمجھنے والا دماغ دے رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں کچھ دیکھوں اور اسے سمجھ نہ پاؤں۔''

''تو تم نے نیا کیا دیکھ لیا ہے؟'' خاور نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''میں نہیں، وہ مجھے دیکھتا ہے۔'' رافیہ نے جواب دیا۔

خاور کا نوالے والا ہاتھ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''وہ کون......؟''

''ہمارا سامنے والا پڑوسی۔'' رافیہ نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھے گھورتا رہتا ہے۔''

''تم ڈاکٹر ریاض کی بات کر رہی ہو؟'' خاور نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے سامنے والے فلیٹ میں تو ریاض صاحب ہی رہتے ہیں اور انہیں میں نے ایک بُردبار اور شریف النفس انسان پایا ہے۔ وہ ایسی عامیانہ حرکت نہیں کر سکتے۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ارے ڈاکٹر صاحب نہیں، میں پیچھے والے پڑوسی کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''وہ جو چند دن پہلے برابر والی بلڈنگ میں رہنے آئے ہیں۔''

''اوہ...... اچھا......'' خاور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ان کی رہائش ''سن شائن'' اسکوائر کے سیکنڈ فلور پر تھی۔ یہ بلڈنگ کے پچھلے حصے کا فلیٹ تھا۔ اس کے بعد گندی گلی تھی۔ گلی کی دوسری طرف ''اسٹار'' پلازا نام کی رہائشی عمارت تھی، مطلب مذکورہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ سن شائن اسکوائر اور اسٹار پلازا کا پچھواڑا آمنے سامنے تھا اور ان دونوں عمارتوں کے بیچ میں گندی گلی واقع تھی۔ رافیہ نے جس پڑوسی کا ذکر کیا تھا، وہ اسٹار پلازا کے سیکنڈ فلور کا رہائشی تھا۔

''اوہ اچھا...... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' رافیہ نے ضدی لہجے میں پوچھا۔ ''میں تمہیں ایک اہم بات بتا رہی ہوں اور تم ''اوہ، اچھا'' کہہ کر اپنے خیالوں میں گم ہو گئے ہو؟''

''تمہیں میری نیت پر شک کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔'' وہ کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔ ''خیالوں میں، میں نہیں تم گم ہوئی ہو۔ میں تو پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا تھا اسی لیے خاموش ہو گیا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ تم آگے کچھ بولو۔''

وہ اسے ٹٹولتی نظر سے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''خاور! تم سچ کہہ رہے ہو نا؟''

''تمہاری قسم...... میں نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ ہمارے پیچھے والی بلڈنگ میں جو نئے لوگ آئے ہیں، وہ صاحب اپنی گیلری میں کھڑے ہو کر مجھے گھورتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں آئی بات......؟''

گندی گلی کی چوڑائی لگ بھگ دس فٹ رہی ہو گی اور یہی تفاوت دونوں عمارتوں کے بیچ بھی تھا۔ دونوں فلیٹس کی عقبی گیلریز کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ تھا۔ ان زمینی حقائق کی روشنی میں خاور نے کہا۔

''یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے، وہ بندہ کسی کام سے اپنی گیلری میں آیا ہو اور اس کی تم پر نظر پڑ گئی ہو۔''

''پہلے میں بھی اسے ایک اتفاق ہی سمجھی تھی۔'' رافیہ نے کہا۔ ''لیکن جب یہ اتفاق روزانہ ہی ہونے لگا تو میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی اور آج میں نے تم سے بات کر لی ہے کیونکہ اس مسئلے کو تم کو ہی حل کرنا ہے۔''

''کیا وہ بندہ صرف تمہیں گھورتا ہی ہے یا اُس نے کبھی کوئی نازیبا یا رکیک حرکت بھی کی ہے؟'' خاور نے ایک اہم سوال کیا۔

''ابھی تک تو اس نے کوئی بے ہودہ حرکت یا اشارہ نہیں کیا۔'' رافیہ راست گوئی سے کام لیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اُس کے گھورنے سے مجھے بہت بے چینی محسوس ہوتی ہے جیسے اُس کی

نظر میرے وجود کے آر پار ہو رہی ہو۔"

"اس کا سب سے آسان حل تو یہ ہے کہ جب وہ بندہ اپنی گیلری میں آئے تو تم اپنی گیلری میں موجود نہ رہا کرو۔" خاور نے ایک منطقی بات کی۔ "دو چار روز میں خود ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"یہ حقیقت ہے کہ آمنے سامنے گھروں کے دروازے ہوں یا گیلریز، اس سے بے پردگی کے روشن امکانات ہوتے ہیں۔" خاور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "لیکن سردست یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں ان صاحب سے جھگڑا کرنے نکل کھڑا ہوں۔ تم مجھے تھوڑا ٹائم دو تا کہ میں اس بندے کا تاریخ جغرافیہ معلوم کرلوں۔ تم چند روز تک میری تجویز پر عمل کرو۔ اگر میری گھر میں موجودگی کے دوران میں وہ شخص گیلری میں آ کر تمہیں گھورنے کی کوشش کرے تو تم فوراً مجھے بتانا۔"

"ٹھیک ہے تم جو کہہ رہے ہو، میں وہ کر کے دیکھتی ہوں۔" رافیہ نے مفاہمت آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن میں نے ایک خاص بات نوٹ کی ہے خاور۔"

وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "کون سی خاص بات؟"

"تم جب فیکٹری چلے جاتے ہو، اس کے بعد وہ اپنی گیلری میں آتا ہے۔" رافیہ نے بتایا۔ "میں نے مغرب کے بعد کبھی اسے اپنی گیلری میں ٹہلتے نہیں دیکھا۔"

"ہوں۔" خاور نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ "چلیں، ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ تین روز بعد میری ہفتہ وار تعطیل ہے۔ میں گھر میں کسی ایسی جگہ بیٹھ جاؤں گا جہاں سے اُس بندے کی گیلری مجھے صاف دکھائی دے مگر میں اسے نظر نہ آؤں۔ تم کسی کام کے بہانے تھوڑا وقت اپنی گیلری میں گزارنا۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

"تمہارا یہ آئیڈیا مجھے پسند آیا خاور۔" وہ توصیفی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے، میری کوئی بات تو تمہیں اچھی لگی۔"

"ایسا نہیں ہے خاور کہ مجھے تمہاری باتیں اچھی نہ لگیں۔" وہ جلدی سے صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن...... بس، مجھے تمہاری بعض باتوں سے شدید اختلاف ہوتا ہے۔"

خاور نے مختصراً کہا۔ "اختلاف رائے اچھی چیز ہے۔"

وہ کھانا ختم کر چکا تھا۔ رافیہ نے برتن سمیٹنے کے بعد کچن کی راہ لی تو وہ اپنے فلیٹ کی گیلری میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک بیڈروم، ایک ڈرائنگ روم اور ننھے منے کامن روم پر مشتمل ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جو ان میاں بیوی کی ضرورت کے لیے کافی تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اور اطمینان کی بات یہ تھی کہ یہ فلیٹ ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ ایک طرح سے مذکورہ فلیٹ خاور کی زندگی بھر کی جمع پونجی تھی۔

وہ لگ بھگ پندرہ منٹ تک اپنی گیلری میں کھڑے ہو کر سامنے والے فلیٹ کی گیلری کو دیکھتا رہا۔ مذکورہ گیلری کی چھت میں نصب بلب آن تھا اور اس کی روشنی گیلری کے ہر حصے کو اُجاگر کر رہی تھی۔ خاور جب تک وہاں موجود رہا، اس نے سامنے والی گیلری میں کسی کی آمد و رفت نوٹ نہیں کی۔ اُس طرف مکمل سناٹا اور خاموشی تھی۔ وہ بیڈروم میں آ گیا۔ دن بھر فیکٹری میں کام کرتے ہوئے وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ اگلی صبح اسے پھر ڈیوٹی پر جانا تھا لہٰذا بیڈ پر لیٹ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تا کہ ایک گہری، پُرسکون اور تھکن اتار نیند لے سکے۔

☆☆☆

یہ ٹھیک ہے کہ رافیہ کی سنائی ہوئی اکثر کہانیاں بے وزن اور بے معنی ہوا کرتی تھیں اور خاور ان پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا لیکن یہ جو "اسٹار پلازا" والے نئے کرائے دار کا قصہ تھا اس نے خاور کو گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ کسی غیر مرد کا اس کی بیوی کو گھورنا بعد ازاں کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔

خاور ایک امن پسند اور صلح جُو انسان تھا۔ لڑائی جھگڑے کے معاملات سے وہ ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتا تھا اسی لیے اس نے رافیہ سے چند دن کی مہلت لی تھی تا کہ وہ اپنے طور پر اس نظرباز بندے کے بارے میں تحقیق کر سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلد بازی میں کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھے جسے واپس لینا مشکل ہو جائے۔

"اسٹار پلازا" میں خاور کا ایک شناسا شخص رہتا تھا جس کا نام تو مشتاق تھا مگر ہر چھوٹا بڑا اسے "مشتاق بھائی" کہہ کر پکارتا تھا۔ مشتاق، خاور والی فیکٹری ہی میں کام کرتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں تھی۔ خاور نے اگلے روز لنچ اور نماز کے وقفے میں مشتاق سے بات کی۔

"ہاں، تم جس فلیٹ کی بات کر رہے ہو، اس میں ایک ہفتہ پہلے نئے کرائے دار آئے تو ہیں۔" خاور کے استفسار کے جواب میں مشتاق نے بتایا۔ "وہ کل تین افراد ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر مرد، ایک اس سے کچھ بڑی عورت اور ایک جوان لڑکی۔"

"میں ان لوگوں کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا

ہوں مشتاق بھائی۔'' خاور نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''خاص طور پر اس مرد کے بارے میں......''

مشتاق نے اُلجھن زدہ نظر سے خاور کو دیکھا اور پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''آں...... ہاں...... خیریت ہے۔'' خاور گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''بس، میں اس فیملی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

مشتاق نے بےیقینی سے اس کی طرف دیکھا مگر کسی قسم کی پوچھ تاچھ نہیں کی اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، مجھے ایک دن دو۔ اس موضوع پر ہم کل بات کریں گے۔''

خاور نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنے کام سے لگ گیا۔

اُس رات جب وہ گھر آیا تو رافیہ نے اسے بتایا۔ ''وہ منحوس ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' خاور نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے کہنے کے مطابق، آج میں پورا دن گیلری کی طرف نہیں گئی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اپنے گھر میں رہتے ہوئے میں نے اس کی گیلری پر کڑی نگاہ رکھی ہے۔''

''پھر......'' وہ رافیہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اضطرابی لہجے میں بول اٹھا۔ ''پھر تم نے کیا دیکھا؟''

''میں وہی تو بتانے جارہی تھی کہ تم بیچ میں بول پڑے۔'' رافیہ نے شاکی نظر سے اسے گھورا۔

''ٹھیک ہے، میں اب مداخلت نہیں کروں گا۔'' خاور نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''وہ تھوڑی دیر گیلری میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا پھر بیچ میں رک کر ہماری گیلری کی طرف تکنے لگتا۔ آج میں اسے ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی شاید اسی لیے وہ میری صورت دیکھنے کے لیے بےچین ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے ہلکے سُروں میں سیٹی بھی بجائی تھی جیسے مجھے بلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اسے گنگناتے ہوئے بھی سنا۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو وہ گا رہا تھا...... او جانے والے! ہو سکے تو لوٹ کے آنا......''

''حد ہو گئی۔'' خاور نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو کوئی بہت ہی بےشرم انسان ہے۔ یہ فیملی والی بلڈنگز میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ لفنگا کہیں کا۔''

''خاور! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' رافیہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ اگر میں اسے گیلری میں دکھائی نہ دی تو کہیں وہ ہمارے فلیٹ ہی میں نہ گھس آئے۔''

''تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' خاور نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس بدذات پر کام شروع کر دیا ہے۔''

''کیا...!'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر مستفسر ہوئی۔ ''خاور! تم کون سے کام کی بات کر رہے ہو؟''

''میرا ایک جاننے والا ''اسٹار پلازا'' میں رہتا ہے۔'' خاور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس کی ڈیوٹی لگا دی ہے کہ وہ ان نئے کرائے داروں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھے دے۔ کل وہ مجھے تفصیلات سے آگاہ کرے گا۔''

خاور نے مشتاق کا نام لیا اور نہ ہی رافیہ نے پوچھا کہ اس نے اپنے کون سے شناسا کو اس تاڑو کی جاسوسی پر لگایا ہے۔ ان حالات میں اسے صرف اپنی پڑی ہوئی تھی۔

''تم نے اپنے جاننے والے کو یہ تو نہیں بتایا کہ تم مذکورہ معلومات کس مقصد کے لیے حاصل کر رہے ہو؟'' رافیہ نے استفسار کیا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل نہیں۔''

''اور اس نے پوچھا بھی نہیں؟''

''ابھی تک تو نہیں۔''

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''خاور! اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کرو۔ میں اس نامراد کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرنے لگی ہوں۔''

''میں نے کہا نا، تمہیں فکرمند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔'' خاور نے ہمت بندھانے والے انداز میں کہا۔ ''بس، ایک دو دن کی بات ہے۔ میں اس مسئلے کا کوئی پائیدار حل نکال لوں گا۔ تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

''ایک تم ہی تو ہو اس دنیا میں جس پر میں اندھا اعتماد کرتی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ویری گڈ!'' خاور نے ستائشی نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''انشاء اللہ! میں ہمیشہ تمہارے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

وہ تشکرانہ نظر سے اسے تکنے لگی۔

''جب تک میں اس بندے کا کوئی کامل بندوبست نہیں کر لیتا، تم کو میری غیر موجودگی میں فلیٹ کے داخلی دروازے کو اندر سے لاک رکھنا ہے۔'' خاور نے تاکیدی انداز میں کہا۔

"میں سمجھ گئی۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"اور دن بھر گیلری کی طرف بھی نہیں جانا۔" خاور نے مزید کہا۔ "وہاں کا اگر کوئی ضروری کام ہو تو اسے رات میں مکمل کر لینا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔" رافیہ نے کہا پھر پوچھا۔ "میں دن میں، اپنے گھر میں رہتے ہوئے اس کی گیلری کا نظارہ تو کر سکتی ہوں نا؟"

"ہاں، اس میں کوئی حرج نہیں۔" خاور نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس طرح ہمیں اُس کی حرکات وسکنات کا پتا چلتا رہے گا لیکن ایک بات کا تمہیں خاص طور پر خیال رکھنا ہے۔"

"کون سی بات؟" رافیہ نے پوچھا۔

"کسی بھی صورت میں تمہیں اُس کی نگاہ میں نہیں آنا۔"

"نہیں آؤں گی۔"

"بس، باقی میں سنبھال لوں گا۔"

رافیہ توصیفی نظر سے خاور کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

آئندہ روز لنچ بریک میں خاور دوبارہ مشتاق سے ملا اور رسمی علیک سلیک کے بعد اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"مشتاق بھائی! کیا خبریں ہیں......؟"

"اس بندے کا نام مقصود احمد ہے۔" مشتاق نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "شاید کسی بینک میں کام کرتا ہے مگر آج کل طبیعت کی خرابی کے باعث وہ بینک نہیں جا رہا۔ اس کے ساتھ جو عورت ہے وہ اس کی بڑی بہن ہے اور اس کا نام شاہدہ ہے جو اپنے بیمار بھائی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ شاہدہ ایک بے اولاد بیوہ ہے اور وہ لڑکی......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا... ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "وہ مقصود کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کا نام انیلا ہے، وہ کسی بزنس اسکول سے "سی اے" کر رہی ہے۔"

"اس بندے کا فیملی سیٹ اَپ تو خاصا معقول ہے۔" خاور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" مشتاق نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں...... کیوں نہیں۔" وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ "پوچھو مشتاق بھائی، آپ سے بھلا کیا پردہ۔"

"تم یہ تفتیش کیوں کر رہے ہو؟" مشتاق نے ایک جائز سوال کیا۔ "تمہیں مقصود اور اُس کی فیملی سے اتنی دلچسپی کس لیے ہے؟"

مشتاق، خاور کے لیے بھروسا مند تھا۔ اس نے مشتاق کو ہمیشہ اپنا خیر خواہ پایا تھا اس لیے اس نے مشتاق کو سب سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ آئندہ پانچ منٹ میں وہ مشتاق کو مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کر چکا تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیوی کسی وہم کا شکار ہو گئی ہو۔" پوری بات سننے کے بعد مشتاق نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم اکثر رافیہ کی بے سروپا باتوں کے قصے سناتے رہتے ہو اور اس میں اس بے چاری کا کوئی زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"شادی کے بعد عورت کی اولین خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ صاحبِ اولاد ہو جائے۔ اگر دو تین سال میں کوئی بچہ نہ ہو تو وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹری علاج کے علاوہ مختلف ٹوٹکے اور دم درود کا سلسلہ بھی چل نکلتا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں مشتاق بھائی......" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

"پہلے مجھے اپنی بات مکمل کرنے دو خاور۔" مشتاق نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "پھر تم جو چاہو، بولنا......"

"جی...... ٹھیک ہے۔" خاور نے کسی فرمانبردار بچے کے مانند کہا۔

"تمہاری شادی کو چودہ سال ہو گئے ہیں مگر ابھی تک تم لوگ دو سے تین نہیں ہوئے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو مگر اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ بے اولاد ہو۔" مشتاق نے سمجھانے والے انداز میں گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مشہور محاورہ ہے کہ...... 'بارہ سال کے بعد تو گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں......' مگر یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ چکا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ رافیہ نے اولاد سے محرومی والے خلا کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور وہ اسی تشنگی بلکہ مایوسی کی کیفیت میں رہتے ہوئے مختلف کہانیاں بُنتی رہتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود نے اپنی گیلری میں ٹہلتے ہوئے رافیہ کی طرف دیکھا ہو لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ اس کی نیت میں کوئی فتور ہو۔ یہ ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے خاور......"

"مشتاق بھائی! یہ سارے زاویے میرے ذہن میں بھی ہیں۔" خاور نے کہا۔ "میں رافیہ کی نفسیات اور ذہنی حالت سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ صبح شام اس کی احمقانہ حرکتوں سے میرا واسطہ رہتا ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ یہ سب رافیہ کی کوئی غلط فہمی ہے لیکن جب اس نے مجھے سیٹی اور گانے والی بات بتائی تو میں حد سے زیادہ فکر مند ہو گیا۔"

"سیٹی اور گانا......" مشتاق نے اُلجھن زدہ نظر سے اس

کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ’’یہ کون سی بات ہے؟‘‘
’’کل جب سارا دن رافیہ اپنی گیلری کی طرف نہیں گئی تو وہ...... آپ نے اس کا کیا نام بتایا ہے...... ہاں مقصود...... تو مقصود، رافیہ کو دیکھنے کے لیے بہت بے قرار ہو گیا۔ اس نے کئی بار اپنی گیلری میں ٹہل لگائی، رافیہ کو متوجہ کرنے کے لیے سیٹی بجائی اور ایک پرانا حزنیہ گانا بھی گایا۔‘‘
’’کون سا گانا؟‘‘ مشتاق نے بے ساختہ پوچھا۔
’’او جانے والے! ہو سکے تو لوٹ کے آنا......‘‘ خاور نے جواب دیا۔
’’اوہ خدایا۔‘‘ مشتاق نے اپنا سر تھام لیا۔
’’مشتاق بھائی! اب آپ کیا کہتے ہیں؟‘‘ خاور نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔
’’دونوں میں سے کوئی ایک ضرور پاگل ہے۔‘‘ مشتاق نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
’’کون دونوں؟‘‘ خاور ہونقوں کے مانند مستفسر ہوا۔
’’رافیہ اور مقصود!‘‘ مشتاق ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ’’یا تو اولاد کی محرومی نے رافیہ کی نفسیات میں کوئی ٹیڑھ پیدا کر دی ہے جس کے باعث مقصود کا اپنی گیلری میں آنا اسے مشکوک لگنے لگا ہے اور یا پھر مقصود کا دماغ چل گیا ہے جو وہ اس قسم کی چھچھوری حرکتیں کرتا پھر رہا ہے۔‘‘
’’میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں مشتاق بھائی۔‘‘ خاور تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ’’آپ نے بتایا ہے کہ مقصود کسی نوعیت کی بیماری میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے وہ آج کل بینک بھی نہیں جا رہا۔ کیا اس بیماری کا تعلق اس کے دماغ سے تو نہیں ہے؟‘‘
’’اس کی بیماری کا نام ہے...... جذباتی صدمہ۔‘‘ مشتاق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ’’مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ مائرہ بلڈ کینسر ایسے موذی مرض میں مبتلا تھی۔ مقصود اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ جہاں تک اس کے بس میں تھا، اس نے مائرہ کا علاج کرایا مگر وہ اسے بچا نہ پایا۔ مائرہ کی موت نے مقصود کے احساسات اور جذبات کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ ایک بینک آفیسر تھا اور بینک کے کام کے لیے انسان کے دماغ کا درست ہونا بہت ضروری ہے مگر مائرہ کی ابدی جدائی نے اس کے دماغ کا ستیاناس کر دیا تھا لہٰذا بینک والوں نے اسے ایک بھاری رقم دے کر وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا ہے۔ بس، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ مقصود کے بارے میں یہ معلومات بھی میں نے اپنی بیوی کے ذریعے نکلوائی ہیں۔ وہ کل رات مقصود کی شاہدہ آپا سے جا کر ملی تھی۔ یہ ساری باتیں شاہدہ ہی نے تمہاری بھابی کو بتائی ہیں۔ اس میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے، اس کا انحصار شاہدہ کی صوابدید پر ہے۔‘‘
’’مقصود کا دکھ واقعی بہت بڑا ہے۔‘‘ خاور نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اپنی گیلری میں کھڑے ہو کر دوسروں کی بیویوں کو میلی نظر سے دیکھے، انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے سیٹیاں بجائے اور گانے گائے۔ میں اس کی ان واہیات حرکتوں کو برداشت نہیں کر سکتا مشتاق بھائی۔‘‘
’’تمہیں برداشت کرنا بھی نہیں چاہیے۔‘‘ مشتاق نے خاور کے جلالی تیور دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’میری مانو تو تم ایک کام کرو......‘‘
’’کون سا کام؟‘‘ خاور نے ترنت پوچھا۔
’’ابھی تک تم رافیہ کی سنائی ہوئی کہانی کو لے کر چل رہے ہو۔‘‘ مشتاق نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ’’کسی دن تم گھر میں رک کر اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھو۔ اگر تمہیں بھی لگے کہ مقصود، رافیہ کی خاطر اپنی گیلری میں آتا ہے اور اس کے دکھائی نہ دینے پر وہ سیٹیاں بجاتا ہے اور گانے وغیرہ بھی گاتا ہے تو پھر مقصود کا جرم ثابت ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی تم مقصود کو نکیل ڈالنے کا کوئی جامع منصوبہ بنا سکتے ہو۔‘‘
’’میں پرسوں چھٹی والے دن یہ تجربہ کرنے والا ہوں۔‘‘ خاور نے بتایا۔ ’’میں نے اس بارے میں سوچ رکھا ہے۔‘‘
’’بہت خوب!‘‘ مشتاق اطمینان بھرے انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔
پھر وہ دونوں گفتگو کی بساط لپیٹ کر اپنے اپنے ڈپارٹمنٹس کی سمت بڑھ گئے۔

☆☆☆

اُس شام خاور فیکٹری سے گھر لوٹا تا رافیہ نے درجنوں سوالات کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ پچھلے دو تین روز سے اس نے اپنے دونوں کانوں کے بیچ فٹ ٹکی کو ’’نکال‘‘ دیا تھا لہٰذا وہ رافیہ کی بات پر فوکس کرنے لگا تھا۔
’’پہلے مجھے بتاؤ کہ آج کا دن کیسا رہا؟‘‘ وہ اس کے سوالات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ’’اس کے بعد میں اپنی سناؤں گا۔‘‘
’’میں تمہاری ہدایات کے مطابق آج بھی دن بھر گیلری کی طرف نہیں گئی۔‘‘ رافیہ نے اکتاہٹ بھرے انداز میں بتانا شروع کیا۔ ’’وہ کل کی طرح آج بھی گیلری میں ٹہلتے ہوئے میرا انتظار کرتا رہا۔ میں اُس کی بے تابی کو چھپ کر دیکھتی رہی۔ آج

اس نے سیٹی نہیں بجائی بلکہ ہماری گیلری کی جانب رخ کر کے اس نے ایک دوسرا غمگین گانا گایا...... ''چھپ گیا کوئی رے دور سے پکار کے۔ درد انوکھے ہائے دے گیا پیار کے......'' میں اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں اور اس پر نگاہ جمائے بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مایوس ہو کر اپنے فلیٹ کے اندر چلا گیا۔''

''آہ، بے چارہ۔'' خاور ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''تم نے اسے بے چارہ کیوں کہا؟''

''وہ اپنی مرحوم بیوی کے غم میں نڈھال ہے۔'' خاور نے کہا۔ ''ایسے شخص کو لاچار اور بے چارہ نہیں کہیں گے تو پھر کیا کہیں گے؟''

''خاور! یہ اچانک تمہیں اس بدمعاش کے ساتھ ہمدردی کیوں ہو گئی ہے؟''

''اس کی داستانِ الم سن کر......''

''اوہ...... ہاں!'' وہ اس طرح چونکی جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ''آج تمہارا دوست تمہیں اس آوارہ شخص کے بارے میں کچھ بتانے والا تھا نا۔'' اس نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''مجھے بھی بتاؤ، تم کون سی نئی خبریں لے کر آئے ہو؟''

جواب میں خاور نے رافیہ کو مشتاق سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد رافیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''بے چارے کے ساتھ بہت بُرا ہوا مگر اب وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اگر کل کلاں میں اس دنیا میں.... نہ رہوں تو کیا تم بھی پرائی عورتوں سے اس لوفر کی طرح آنکھیں چار اور باتیں ہزار کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاؤ گے؟''

بے ساختہ خاور کے منہ سے نکلا۔ ''ہرگز نہیں۔''

''تو پھر مقصود کو بھی ایسی گھٹیا حرکتیں نہیں کرنا چاہئیں نا۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''کیا اُسے اس بات کا بھی احساس نہیں ہے کہ اس کی ایک جوان بیٹی بھی ہے۔ کل اگر کوئی اوباش انیلا کو غلیظ نظر سے دیکھنا شروع کر دے تو کیا وہ برداشت کر پائے گا؟''

''میرا خیال ہے...... نہیں۔'' خاور نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، کوئی بھی باپ یہ برداشت نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر ہم کیوں برداشت کریں۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں جلد از جلد اس مردود کی کمینگی کا سدِباب کرنا ہوگا۔''

''بالکل کریں گے۔'' خاور نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے تمہیں صرف ایک دن اور صبر کرنا ہوگا۔''

''میں سمجھی نہیں؟'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

''پرسوں میری ہفتہ وار تعطیل ہے۔'' خاور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ناشتے کے بعد میں اپنے موبائل فون کے ساتھ کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤں گا اور تم مختلف کاموں کے بہانے وقفے وقفے سے گیلری کی طرف جانا مگر اس کی جانب بالکل نہیں دیکھنا۔ وہ تمہیں اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے سیٹی بجائے یا گانا گائے یا کوئی اور اوچھی حرکت کرے، میں وہ سب اپنے موبائل میں ریکارڈ کر لوں گا۔ اُس کے جرم کا ثبوت ہمارے پاس محفوظ ہو جائے گا۔ اس کے بعد سوچیں گے، آگے کیا کرنا ہے۔''

''میں نے تو اس سے پہلے ہی سوچ لیا ہے۔'' رافیہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' خاور نے سوالیہ نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے ایسا کیا سوچ لیا ہے؟''

''ہم اس ٹھوس ثبوت کے ساتھ مقصود کی آپا شاہدہ کے پاس جائیں گے اور چھوٹے بھائی کی غیر نصابی سرگرمیوں کا وڈیو اسے دکھائیں گے۔'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولی۔ ''ہم اس سے صاف صاف اور دوٹوک بات کریں گے، کوئی گھماؤ پھراؤ نہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم شاہدہ سے کہنا کہ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ یہاں سب بہو، بیٹیوں والے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بھائی کو سمجھا کر راہِ راست پر لے آئے تو اس سے اچھی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ بہ صورت دیگر...... ہم پہلے ''اسٹار پلازا'' کی یونین سے مقصود کی شکایت کریں گے اور وہ بھی پکے ثبوت کے ساتھ۔ بلڈنگ کمیٹی نے اگر اس بدمعاش کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا تو پھر مجبوراً ہمیں متعلقہ تھانے میں اس شیطان کی باقاعدہ رپورٹ درج کرانا پڑے گی۔''

''گڈ آئیڈیا۔'' خاور تعریفی نظر سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ تمہارے دماغ میں بھی ایسی باتیں آ سکتی ہیں۔''

رافیہ نے میٹھی خفگی سے اسے گھورا۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' وہ نگاہ چُرا کر جلدی سے بولا۔ ''اس آئیڈیا پر عمل کرنے سے ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''ان شاء اللہ!'' وہ پورے تیقن سے بولی۔ ''لیکن اس نیک کام کے لیے ہم پرسوں کا انتظار کیوں کریں۔''
''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''
''یہ کام کل بھی تو کیا جا سکتا ہے۔''
''تم جانتی ہو، کل مجھے فیکٹری جانا ہوگا۔'' خاور نے حتمی انداز میں کہا۔ ''آج میں نے اوور ٹائم نہیں کیا اور سرِ شام گھر آ گیا ہوں۔''
''جہاں ستیاناس، وہاں سوا ستیاناس۔'' وہ جنونی انداز میں بولی۔ ''آج تم نے اوور ٹائم نہیں کیا، کل تم اصل ٹائم نہیں کرو گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ بس، کل تم فیکٹری سے چھٹی کر رہے ہو۔ بیماری کا بہانہ کر دینا۔ کل کی تاریخ میں ہم نے اس کام کو ہر صورت نمٹانا ہے خاور۔''
رافیہ کے فیصلے میں اس قدر توانائی اور عزم بھرا ہوا تھا کہ خاور نے اس کے آہنی ارادے کے سامنے ہپر ڈال دی۔

☆☆☆

رات کے آٹھ بجے تھے۔ خاور اور رافیہ، مقصود احمد کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑے تھے۔ آج دن میں خاور نے مقصود کا بے چینی اور بے قراری بھرا وڈیو ریکارڈ کر لیا تھا۔ مقصود نے اپنی گیلری میں ٹہلتے ہوئے کئی بار رافیہ کی طرف دیکھا تھا۔ ٹھنڈی آہیں بھری تھیں اور ایک دکھی گانا بھی گایا تھا۔ ''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے۔ ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے......''
یہ سارا مواد مقصود کی ناشائستگی کا پردہ فاش کرتا تھا۔ خاور کو پوری امید تھی کہ اس وڈیو کلپ کو دیکھ کر شاہدہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور وہ اپنے نصف صدی عمر کے بھائی کے ایسے کان مروڑے گی کہ آئندہ کبھی اسے گیلری میں آنے کی جرأت نہیں ہوگی۔
دستک کے جواب میں دروازہ ایک جوان العمر لڑکی نے کھولا اور سوالیہ نظر سے انہیں دیکھنے لگی۔
''آپ انیلا ہو نا؟'' خاور نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔
''جی...... مگر آپ کون ہیں؟'' انیلا نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔
''میرا نام خاور ہے اور یہ میری بیوی رافیہ ہیں۔'' خاور نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''ہم برابر والی بلڈنگ میں رہتے ہیں۔ ہم مقصود صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔''
''مگر بابا تو سو رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' خاور نے معتدل انداز میں کہا۔
''تو پھر ہم وہ اہم بات آپ کی پھپھو سے کر لیتے ہیں...... شاہدہ پھپھو تو گھر میں موجود ہیں نا؟''
انیلا کے جواب دینے سے پہلے ہی اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ''انیلا! دروازے پر کون ہے؟''
مشتاق کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، اس گھر میں صرف تین ہی افراد رہتے تھے۔ انیلا ان کے سامنے کھڑی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ مقصود احمد سو رہے ہیں تو یقیناً انیلا سے استفسار کرنے والی وہ عورت پھپھو شاہدہ ہی ہو سکتی تھی۔
''پھپھو! برابر والی بلڈنگ سے دو افراد آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' انیلا نے اپنی پھپھو کے سوال کے جواب میں بتایا۔
ایک منٹ سے بھی پہلے پھپھو شاہدہ دروازے پر آ گئی...... اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے بہ غور خاور اور رافیہ کا جائزہ لیا اور شائستہ لہجے میں بولی۔
''میں آپ کو پہچان نہیں پائی کیونکہ اس بلڈنگ میں آئے ابھی ہمیں چند روز ہی ہوئے ہیں۔ بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔''
''ہم عقبی جانب واقع ''سن شائن اسکوائر'' نامی عمارت میں سالہا سال سے رہ رہے ہیں۔'' خاور نے بتایا۔ ''آپ سے ایک سیریس میٹر پر بات کرنا ہے۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں کیونکہ یہاں کھڑے کھڑے ڈسکس کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''
''سیریس میٹر......'' شاہدہ نے متوحش لہجے میں کہا۔
''جی بالکل۔ یہ بہت ہی حساس اور نازک معاملہ ہے۔'' رافیہ نے شاہدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہاں کھڑے ہو کر بات کریں گے تو آس پڑوس والے بھی سنیں گے اور میرے خیال میں یہ آپ کے لیے بالکل اچھا نہیں ہوگا۔''
رافیہ کی بات شاہدہ کی سمجھ میں بیٹھ گئی اور اس نے فوراً سے پیشتر ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں جا بٹھایا۔ وہاں ایک صوفے اور سینٹر ٹیبل پر اکاؤنٹس، ٹیکس اور بزنس سے متعلق کئی کتابیں اور نوٹ بکس موجود تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی آمد سے پہلے انیلا یہیں بیٹھ کر اپنے ''سی اے'' کی اسٹڈی کر رہی تھی۔
''آپ لوگ ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟'' شاہدہ نے خوش اخلاقی کے تقاضے نبھاتے ہوئے اُن جان مہمانوں سے پوچھا۔
''کچھ بھی نہیں۔'' خاور نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''اگر

آپ ٹھنڈے دل سے ہمارے گرم دماغ کی بات سن لیں گی تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

شاہدہ نے عجیب سی نظر سے انیلا کی طرف دیکھا۔ انیلا کے چہرے پر اسے اُلجھن کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ "مہمانوں" کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کی بات کو بالکل نہیں سمجھ پائی......"

"ہم دراصل آپ کے پاس ایک سنگین شکایت لے کر آئے ہیں۔" رافیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور اس شکایت کا تعلق آپ کے بھائی مقصود سے ہے۔"

"مقصود سے بھلا کسی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔" شاہدہ باری باری ان دونوں میاں بیوی کی صورتیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کے عقبی روم کی گیلری سے ہمارے فلیٹ کی عقبی گیلری بالکل صاف نظر آتی ہے۔" خاور تیکھے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یوں سمجھ لیں کہ دونوں گیلریز کے درمیان صرف دس فٹ کا فاصلہ ہے......"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔" شاہدہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔ "لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ دو فلیٹس کی گیلریز کا آمنے سامنے ہونا مقصود کی ذات سے کیا تعلق رکھتا ہے؟"

"بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔" خاور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ آپ کا بھائی اپنی گیلری میں کھڑے ہو کر میری بیوی کو میلی نظر سے دیکھتا ہے، سیٹیاں بجاتا ہے اور سیڈ سونگ گاتا ہے......"

"ہم شریف اور عزت دار لوگ ہیں اس لیے آپ کے بھائی کی شکایت لے کر یہاں آ گئے ہیں۔" رافیہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "ذرا تصور کریں کہ اگر ہم علاقے کے تھانے میں چلے جاتے تو پولیس آپ کے بھائی کا کیا حشر کرتی؟"

جب تک خاور اور رافیہ اپنی بات مکمل کرتے، شاہدہ نفی میں گردن ہلاتی رہی تھی۔ انیلا کے چہرے اور آنکھوں میں بھی بے یقینی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

"آپ لوگ ایک بے بنیاد بات کر رہے ہیں۔" ان کے خاموش ہونے پر شاہدہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"ہم بے بنیاد کچھ بھی نہیں کہہ رہے......" خاور طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تم پھپھو جان کو ان کے بھائی کے کالے کرتوتوں والا وڈیو دکھاؤ ذرا؟" رافیہ نے کہا۔ "پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

خاور نے اپنے سیل فون کو آپریٹ کرنے کے بعد فون... شاہدہ کی جانب بڑھاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "لیں، دیکھ لیں مضبوط بنیاد پر کھڑا ہوا ایک ٹھوس ثبوت۔"

شاہدہ نے جس دوران میں وہ وڈیو کلپ دیکھا، اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا رہا مگر ان میں سے کوئی ایک رنگ بھی ندامت، حیرت، پریشانی یا پشیمانی کا نہیں تھا۔ بالآخر اس نے سیل فون خاور کو تھمایا اور انیلا کی جانب دیکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولی۔

"تم اپنے بابا کو جگا کر یہاں لے آؤ اور ہاں...... ان کا ہاتھ نہیں چھوڑنا۔ مقصود ابھی تک اس فلیٹ کے اندرون سے اچھی طرح واقف نہیں ہوا۔"

خاور اور رافیہ نے اُلجھن زدہ لہجے میں بہ یک وقت پوچھا۔ "اس کا کیا مطلب ہوا؟"

شاہدہ نے انیلا کو جو ہدایات دی تھیں، وہ ان دونوں کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ قبل اس کے کہ شاہدہ ان کے مشترکہ استفسار کا جواب دیتی، انیلا، مقصود کا ہاتھ پکڑے ہوئے بیڈ روم سے باہر نکلی۔

"بیوی کی موت نے مقصود کے دماغ کو الٹا کر رکھ دیا تھا اور سب سے زیادہ بُرا اثر اس کی بینائی پر پڑا ہے۔" شاہدہ کی آواز بازگشت کے مانند کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ "دماغی معاملات تو قابو میں آ گئے ہیں مگر آنکھوں کی روشنی ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔ یہ روشنی اور تاریکی کے احساس کے سوا اور کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ بس، اپنے بیڈ روم میں بیٹھا روتا رہتا ہے یا پھر مائرہ کی یاد میں آہیں بھرتا رہتا ہے۔ مائرہ اور بصارت اسے چھوڑ کر سدا کے لیے رخصت ہو گئی ہیں......"

خاور اور رافیہ جیسے شرم سے زمین میں گڑ گئے تھے۔ وہ ایک ایسے شخص کی شکایت لے کر وہاں آئے تھے جو اپنی چہیتی بیوی کی ابدی جدائی کے غم میں اندھا ہو چکا تھا۔ اس کڑوی سچائی سے آشنا ہونے کے بعد ان کے وہاں ٹھہرنے کا جواز باقی نہیں رہا تھا لہٰذا وہ اٹھے اور شرمندگی کے بوجھ سے جھکی ہوئی گردنوں کے ساتھ واپس آ گئے۔

ہر شخص کی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ آپ کسی کی کہانی سے کماحقہ، واقف بھی ہوں اور یہ بھی لازم نہیں ہے کہ کوئی آپ کو اپنی مکمل کہانی سنا دے۔

❖❖❖

پھول اور بھول

غلام قادر

زندگی ہر ایک کے لیے مسرت... دل لگی اور فرصت کا لامتناہی سلسلہ نہیں ہوتی... بعض کو پلک جھپکائے بغیر فکر میں لمبی لمبی راتیں گزارنا پڑتی ہیں... اسے طوفانِ بادوباراں اور خشک ہواؤں سے بچانا پڑتا ہے... مگر کہیں نہ کہیں زندگی میں تندخو اور تباہ کن دشمن سے واسطہ پڑ جاتا ہے... بچاؤ کی تمام تر ترکیبیں رائگاں چلی جاتی ہیں... دوستوں کے ساتھ بے فکری کی زندگی گزارنے والے نرم ملائم... پھولوں جیسی نزاکت رکھنے والے کرداروں کا احوال... پھول اور بھول کی راہداریوں میں گم ہو جانے والے قصّے...

معمولی رخنے سے در آنے والی تند و سرد ہوا کی قیامت خیزیاں......

چھ ماہ بعد اُن کا فون آیا تھا۔ میں نے اسکرین پر اُن کا نام اور نمبر دیکھ کر ریسیو کیا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے سوال پوچھ لیا۔

''یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' دوسری جانب سے لیزا کی والدہ کی آواز آئی۔

''آپ پہلے دن میں ایک بار ضرور فون کرتی تھیں اب چھ ماہ سے فون ہی نہیں کیا تو یہ معلوم کرنا ضروری تھا۔''

''جب میں کراچی میں تھی اب اسلام آباد میں ہوں۔'' لیزا کی والدہ نے کہا۔ ''پھر تمہیں رِنگ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیزا کا نمبر اٹینڈ نہیں ہوتا تھا تو میں تمہارے ذریعے اس کی خیریت لے لیتی تھی۔'' انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میں یادوں کے سمندر میں اترتا چلا گیا۔

لیزا میرے بچپن کی دوست ہی نہیں، پڑوسی بھی تھی۔ پہلی جماعت سے ہم ساتھ اسکول جاتے تھے۔ ابتدا میں کبھی میرے والد اور کبھی لیزا کے والد ہم دونوں کو اسکول ڈراپ کرنے جاتے تھے پھر ہم میٹرک میں آئے تو لیزا کے والد نے لیزا کے لیے ایک چھوٹی گاڑی لے لی، لیزا نے ڈرائیونگ سیکھ لی اور وہ مجھے چھوڑتے ہوئے اپنے اسکول جانے لگی۔

ہمارے اسکول پاس ہی تھے صرف درمیان میں ایک سڑک تھی۔ دونوں کے اسکول چرچ کے اسکول تھے۔ میں سینٹ پیٹرک میں تھا اور لیزا سینٹ جوزف کی طالبہ تھی۔

اسکول سے ہم کالج میں پہنچے تھے کہ لیزا کے والد کا اسلام آباد ٹرانسفر ہو گیا۔ ایک ہفتے کے اندر وہ اسلام آباد چلے گئے اور وہاں مکان وغیرہ کا بندوبست کر کے انہوں نے بیگم اور بیٹی کو بھی بلوا لیا مگر ماں کے جانے کے بعد بھی لیزا اسلام آباد نہیں گئی۔ ''میرے امتحان ہیں ماما۔'' اس نے

ماں سے کہا۔
''مگر تم رہو گی کہاں؟'' اس کی ماں نے کہا۔
لیزا نے تاخیر کے بغیر کہا۔ ''میں خاور کے گھر رہ لوں گی''
''اور میری والدہ نے فوری طور پر اس کی منظوری بھی دے دی۔
''دونوں ایک ہی کلاس میں ہیں، اچھا ہے ایک دوسرے کی مدد کرلیں گے۔'' میری والدہ نے کہا تھا۔
''یہ کیا مدد کرے گی بلکہ الٹا اس کا وقت بھی ضائع کرے گی۔'' لیزا کی مما نے کہا۔
''ایسی بات نہیں ہے آنٹی۔'' میں نے کہا۔
''آپ تو ہمیشہ اسے فیور کرتی ہیں۔'' لیزا نے کہا۔
''کیوں نہ کروں میرا بیٹا جو ہے۔'' لیزا کی والدہ نے کہا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔
''آپ کہنا کچھ اور چاہ رہی تھیں لیکن زبان سے کچھ اور نکلا۔'' لیزا نے کہا اور اس کی والدہ نے اسے گھور کر دیکھا۔
''بس میرا فیصلہ ہے تمہیں تمہارے نانا کے پاس چھوڑ کر جاؤں گی۔'' لیزا کی والدہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔
''کبھی بھی نہیں۔'' لیزا نے جواب دینے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔
''بچپن میں تو تم بھاگ بھاگ کر اُن کے گھر جاتی تھیں اور کئی کئی دن وہاں رہتی تھیں۔'' لیزا کی ماں نے کہا۔
''جب میں چھوٹی تھی۔'' لیزا کا جواب تھا۔
''تو اب کیا فرق آگیا تم میں؟'' لیزا کی والدہ نے ترش لہجے میں کہا۔
''کاش میں آپ کو سمجھا سکتی کہ میں وہاں کیوں نہیں رہوں گی۔'' لیزا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''اگر تمہارے پاپا نے سوال کر دیا کہ اس گھر میں کیوں چھوڑ کر آئی ہو جہاں ایک جوان لڑکا موجود ہے؟''
لیزا کی ماں نے ایک دوسرے زاویے سے وار کیا۔

"پاپا ایسا کوئی سوال نہیں کر سکتے۔" لیزا اپنی ضد پر قائم تھی۔

"تم کیسے اتنے وثوق سے یہ کہہ سکتی ہو؟" لیزا کی ماں نے ایک اور سوال کر دیا۔

"وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور مجھ سے زیادہ وہ خاور کو جانتے ہیں۔" لیزا کے لہجے میں یقین تھا۔

"تمہاری اس سلسلے میں بات ہوئی تھی اپنے پاپا سے؟" لیزا کی والدہ کے لہجے میں شک تھا۔

"ایک بار نہیں کئی بار بات ہوئی تھی۔" لیزا نے ایسی بات کی تھی جو مجھے بھی نہیں معلوم تھی۔

"کیا بات ہوئی تھی؟" والدہ نے ایک اور سوال کر دیا اور لیزا انہیں خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"آپ کو کیوں بتاؤں؟" کچھ دیر تحمل کے بعد اس نے کہا۔

"اس وقت تو تم بچی نہیں تھیں جب ضد کر کے نانا کے ساتھ یونان گئی تھیں اس وقت تو تم چودہ کراس کر چکی تھیں۔"

"وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی اور جب تک زندہ رہوں گی اپنی اس غلطی کو بھگتتی رہوں گی۔" لیزا نے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" لیزا کی ماں نے چڑنے والے انداز میں کہا۔

"کاش آپ کے پاس حقیقت جاننے والی آنکھ ہوتی تو آپ جان سکتیں کہ میں اپنے آنسو پی کر کسی سے کچھ کہے بغیر ہنستی اور مسکراتی تھی۔" لیزا نے کہا۔

"اب یہ بیکار کی ضد ختم کرو اور گاڑی میں بیٹھو، میں تمہیں وہیں چھوڑوں گی جس کا میں نے فیصلہ کیا ہے۔" لیزا کی ماں نے کہا۔

"اوور مائی ڈیڈ باڈی۔" لیزا کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

"بہن آپ بھی یہ بحث چھوڑ دیں اگر لیزا وہاں نہیں جانا چاہ رہی تو آپ کیوں ضد کر رہی ہیں؟" اماں نے پہلی بار مداخلت کی۔

"وہاں میری بہن ہے جو کالج میں لیکچرار ہے، وہ اس کی مدد کرے گی۔" لیزا کی والدہ بھی اپنی ضد پر جمی ہوئی تھیں۔

"وہاں آپ کی بہن ہے تو یہاں میری بیٹی ہے وہ بھی کیمسٹری میں ایم ایس سی کر چکی ہے۔" اماں نے کہا۔ پھر بولیں: "جہاں وہ خاور کو پڑھا دیتی ہے، وہ اسے بھی پڑھا دے گی۔" اماں نے کہا۔

"جاؤ اپنا بیگ لے آؤ۔" لیزا کی ماں کی آواز میں شکست نمایاں تھی۔

"جو کچھ تم سوچ رہی ہو ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔" لیزا کی ماں نے اس وقت کہا تھا جب لیزا اپنا بیگ کھینچتے ہوئے ہمارے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ اپنی جیت پر مسکرا رہی تھی یا اپنی ماں کی شکست پر مسکرائی تھی۔ میں نے مزید کچھ جانے بغیر لیزا کی ماں کے ہاتھ سے چابی لی اور ائرپورٹ کی طرف چل پڑا۔

"خاور آہستہ......" مین روڈ پر میں نے رفتار بڑھائی تو لیزا کی والدہ نے کہا، وہ پسنجر سیٹ پر تھیں۔

"کبھی آپ نے لیزا کے ساتھ سفر کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ جتنی تیز ڈرائیونگ کرتی ہے، اس سے مجھے خوف آتا ہے منع کرتی ہوں لیکن وہ میری بات سنتی ہی کب ہے ابھی کی بات لے لو اس نے تمہارے گھر رکنے کی اپنی ضد پوری کر ہی لی ورنہ تم بتاؤ کہ نانا کے گھر رکنے میں اسے کیا تکلیف تھی؟" لیزا کی ماں نے کہا۔

"کوئی تو بات ہو گی جس کے لیے اس نے اتنی سختی سے انکار کیا تھا۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ رفتار میں کسی حد تک کمی کر لی۔

میں نے دبے لفظوں میں لیزا کی حمایت کی تو آنٹی کی پیشانی پر بل آ گئے۔ "آخر ہو نا تم اس کے دوست۔" لیزا کی والدہ نے کہا۔ "اس کی حمایت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔" انہوں نے کہا۔

"آپ جانتی ہیں کہ یہ سچ نہیں ہے۔" میں نے دبے لفظوں میں ان کی تردید کی تو ان کی پیشانی کی سلوٹیں بڑھ گئیں۔

"تم کوئی ایک مثال دے سکتے ہو کہ تم نے اس کے فیصلے سے انکار کیا ہو؟" ان کا لہجہ نہ جانے کیوں تیز ہو گیا۔

"ایک نہیں ایک ہزار مثالیں دے سکتا ہوں کہ میں نے اس کا فیصلہ مانا ہے۔" میں نے کہا اور ان کا منہ بن گیا۔

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے لیزا کی خواہش کا احترام کیا۔" آنٹی نے تیکھے لہجے میں پوچھا تھا۔

"اگر یہ نہیں ہے تو آپ ہی بتا دیں کہ وجہ کیا تھی؟" میں نے کہا اور آنٹی مجھے گھور کر رہ گئیں۔

"تم صرف یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم اُس کے کس حد تک فرمانبردار ہو سکتے ہو۔" لیزا کی والدہ نے اپنا نقطۂ نظر

بتایا۔
''اب یہ بھی بتا دیں کہ اس کی فرمانبرداری کے لیے مجھے کیا حاصل ہوگا۔'' میں نے سوال کیا لیکن آنٹی کچھ دیر کے لیے خاموش رہیں۔
''اس سے فوری طور پر جو حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ تم نے حاصل کرلیا۔'' آنٹی نے کچھ دیر کے بعد کہا تھا۔
''یہی کہ اُس نے آج آپ کی بات نہیں مانی۔'' میں نے کہا۔
''یہ تو ایک مثال ہے لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ وہ کسی اتوار کو زور دینے کے باوجود چرچ نہیں جاتی البتہ تمہاری بہن کے ساتھ مذہبی محفلوں میں ضرور جاتی ہے۔'' آنٹی نے کہا۔
''آپ یہ تو نہیں کہہ رہیں کہ اسے چرچ جانے سے میں روک رہا ہوں؟'' میں نے کہا۔
''میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم روک رہے ہو بلکہ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اسے مجبور بھی نہیں کررہے کہ وہ چرچ جائے۔'' آنٹی نے کہا۔
''دیکھیں ہم اس بحث میں اُلجھ گئے تو آپ کی فلائٹ نکل جائے گی جبکہ میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو وقت سے پہلے ائرپورٹ لاؤنج تک پہنچا دوں۔'' میں نے کہا اور آنٹی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔
''اسی لیے تم نے رفتار بڑھائی تھی۔'' انہوں نے سوال کیا اور میری گردن اثبات میں ہل گئی اور وہ ہنسنے لگیں۔
''غلطی میری ہے مجھے گاڑی میں بیٹھتے ہی تمہیں بتا دینا چاہیے تھا کہ لیزا کے پاپا نے اپنے دوست سے کہہ رکھا ہے، وہ میرا بورڈنگ کارڈ نکلوا کر رکھیں۔'' آنٹی نے اپنی غلطی مان لی تھی اس لیے بحث کی گنجائش نہیں رہی تھی۔
ہماری کار ائرپورٹ میں داخل ہی ہوئی تھی کہ ایک صاحب تیزی سے کار کی سمت بڑھے۔ وہ کسٹم کی وردی میں تھے اس لیے مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہی وہ صاحب ہیں جن سے لیزا کے والد نے بورڈنگ کارڈ کے لیے کہا ہوگا۔
''آپ اکیلی ہیں؟'' ان صاحب نے لیزا کی والدہ نے کہا۔ ''ہم سے تو کہا گیا تھا کہ دو بورڈنگ کارڈ نکلوانے ہیں۔'' ان صاحب نے بورڈنگ کارڈ لیزا کی والدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔
''میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ آنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔'' آنٹی نے کہا۔
''تو گھر پر اکیلی رہیں گی؟'' ان صاحب نے دوسرا سوال کیا۔
''نہیں وہ ہمارے پڑوسی ہیں ان کے یہاں رہے گی۔'' لیزا کی والدہ نے کہا۔
''آؤ خاور۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ خاور ہے ہمارے پڑوسیوں کا لڑکا اور اس کی ایک بڑی بہن بھی ہے جو ایم ایس سی کرچکی ہے اور آج کل اس کی شادی کی تیاریاں ہورہی ہیں۔'' آنٹی نے میرا اور اپنا کا ایک ساتھ تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔
''تم کس کلاس میں ہو بیٹا؟'' ان صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔
''لیزا کی طرح یہ بھی انٹر کے امتحان کی تیاری کررہا ہے۔ بچپن سے یہ دونوں دو مختلف اسکولوں میں لیکن ایک ہی کلاس میں ہیں۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی آنٹی نے کہہ دیا۔
''یہ بچپن کی دوستیاں جوانی میں کچھ بھی رنگ دکھا دیتی ہیں۔'' ان صاحب نے کہا۔
میں کہنے والا تھا کہ لیزا کی والدہ نے خود ہی جواب دے دیا۔ ''یہ بہت شریف بچہ ہے اور میری بیٹی بھی زمانے کی اونچ نیچ اچھی طرح سمجھتی ہے۔'' لیزا کی ماں نے جو ائرپورٹ میں داخلے تک بیٹی کی برائیوں میں مصروف تھیں، اچانک ہی اپنی بیٹی کی بھی تعریف کرنی شروع کردی۔
''آنٹی میں چلوں، گھر پر میرا انتظار ہورہا ہوگا۔'' میں نے ان سے اجازت لی اور آگے بڑھ گیا۔
میں کار میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ لیزا کا فون آگیا۔ ''یار مما کو بائی روڈ اسلام آباد چھوڑ کر آؤ گے؟'' لیزا نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔
''لیلیٰ کے تو کُتّے کو بھی پیار کرنا پڑتا ہے وہ تو پھر تمہاری ماں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تم نے جس بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی توقع کم از کم میں تم سے نہیں کررہا تھا۔'' میں نے کہا۔
''تو تم کیا توقع کررہے تھے کہ جو وہ کہہ رہی تھیں، وہ میں مان لیتی۔''
''اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔'' میں نے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔
''بعد میں شکایت نہ کرنا۔'' لیزا نے کہا اور میں فقرے پر غور کیے بغیر مسکرا دیا اور کار آگے بڑھا دی۔
میری شروع سے یہ خواہش تھی کہ میں انجینئر بنوں لیکن جب ہم نویں جماعت میں آئے اور میں نے لیزا سے

اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔
''نہیں، تم انجینئر نہیں ڈاکٹر بنو گے۔'' پھر اس نے میرے فارم پر پری انجینئرنگ کاٹ کر اپنے ہاتھوں سے پری میڈیکل لکھا تھا۔ میں نے اس کی وجہ معلوم کرنی چاہی تو اس نے کہا۔ ''تم ڈاکٹر ان لیے بنو گے کہ میں بھی ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔''
گھر پہنچا تو وہاں واقعی تمام لوگ ڈائننگ ٹیبل پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ابا ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آئے تھے۔
''کہاں رہ گئے تھے؟'' میں کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ اپیا نے سوال کیا۔
''اگر آپ ائرپورٹ پچھلی گلی میں بنوا دیتیں تو مجھے دیر ہوتی نہ آپ کو انتظار کرنا پڑتا۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہاں موجود تمام چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔
''چلو ہاتھ دھو کر میز پر آ جاؤ۔'' امی نے کہا اور میں نے فوری طور پر واش روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔
''یہ ہر کھانے سے پہلے آپ ہاتھ دھونے کا کیوں کہتی ہیں؟'' مجھے اپیا کی آواز سنائی دی۔
''بیٹا سنت ہے۔'' امی نے جواب میں کہا۔
''امی ہم چمچے سے کھاتے ہیں تو پھر آپ ہاتھ کیوں دھلواتی ہیں؟'' اپیا نے سوال کیا۔
''اپیا ریلیجن کی ہر بات میں لاجک نہیں ڈھونڈا کرتے۔'' امی کے بجائے لیزا نے جواب دیا۔
''دیکھا کتنی سمجھ دار ہے میری بچی۔'' امی نے لیزا کی تعریف کی۔
''ایک تو آپ نا امی دنیا کے ہر شخص میں تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتی ہیں سوائے میرے اور بھائی کے۔'' اپیا نے شکایت کی۔
''جو تعریف کے قابل ہوتا ہے، اسی کی تعریف کی جاتی ہے۔'' امی کا جواب تھا۔
''یہ بتائیں کہ ارشد میں آپ کو ایسی کیا قابل تعریف بات نظر آئی کہ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر واپس کروا کر اس گھونچو سے میری شادی کروا رہی ہیں؟'' اپیا نے کہا اور امی بھڑک اٹھیں۔
''کون سی بات اس میں ایسی ہے جو قابلِ تعریف نہیں ہے امریکا میں ہے ہارٹ سرجن ہے۔ اپنا اسپتال ہے وہاں اور کیا چاہیے تمہیں؟'' امی نے بیٹھے بیٹھے اپیا کی کلاس لے لی تھی اور اپیا منہ بنا کر رہ گئیں۔

''آپ اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ وہ ہارٹ سرجن ہے، اس کا اپنا اسپتال ہے وہاں' آپ نے دیکھا ہے وہ اسپتال یا اسے ہارٹ سرجری کرتے ہوئے۔ وہ مجھے ہارٹ سرجن تو کیا ڈاکٹر بھی نہیں لگتا۔ پورا گھونچو ہے گھونچو۔''
''اپیا پلیز۔'' لیزا نے بھی اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا۔
''تم کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو، کچھ ہوتے ہیں جو پیدائشی ناشکرے ہوتے ہیں۔'' امی نے اپنی ادھوری کلاس پوری کی۔
''تمہارے لیے میں نے اِس ناشکری کے کمرے میں ہی بیڈ بچھوا دیا ہے۔''
''میں صرف اس صورت میں اسے اپنے کمرے میں آنے دوں گی جب یہ اسے ارشد بھائی نہیں بلکہ گھونچو کہے گی۔'' اپیا کی توپوں کا رخ اب لیزا کی طرف ہو گیا۔
''میں تو کبھی بھی نہیں کہوں گی۔'' لیزا نے جواب دیا۔
''تو پھر اپنا بیڈ لے جا کر باہر لان میں لگا دو۔''
''آپ کے یہاں مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا ہے۔'' لیزا نے مصنوعی غصے کے ساتھ امی سے شکایت کی۔
''تم اس کی بکواس ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو، آخر قدرت نے تمہیں دو کان کس لیے دیے ہیں۔''
''مگر زبان تو ایک ہی دی ہے۔'' لیزا نے کہا۔
''وہ اس لیے کہ اچھی باتیں کرو، ہونے والے شوہر کے لیے اچھی باتیں کرو۔'' امی نے کہا۔
''اسے بُرے نام دو، جیسے گھونچو کی طرح کے نام نہ دو۔'' لیزا نے بات آگے بڑھائی۔
''مگر امی کے ساتھ اب تم میری نانی نہ بن جانا۔''
''آئندہ تم نے مجھے یہ نام دینے کی کوشش کی تو میں سب ادب لحاظ بھول جاؤں گی۔'' لیزا نے کہا۔
''تمہارا مطلب ہے نانی کہا تو......'' اور لیزا نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ اور اپیا کے چہرے پر حیرانی طاری ہو گئی۔
''اپیا اس بحث کو چھوڑو اور یہ پتا کرو کہ ایس پی صاحب ابھی تک کیوں نہیں آئے عام طور پر تو وہ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاتے ہیں۔'' میں نے گفتگو کا رخ موڑنے کی غرض سے کہا تھا اور اس میں کامیاب بھی رہا۔
''ان کا فون آیا تھا کہ انہیں آج آنے میں دیر ہو جائے گی۔'' امی نے بتایا۔

میرے ابا ایس پی نہیں تھے لیکن اُن کی سخت طبیعت کی وجہ سے اپیا نے انہیں یہ عہدہ دیا تھا اور پھر مجھ سمیت سب اس لفظ کو دہرانے لگے تھے اور اب تو ابا بھی جانتے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی فیملی انہیں کس نام سے پکارتی ہے۔

امی کی وضاحت کے ساتھ ہی ہم سب کے چہروں پر اطمینان آ گیا تھا کہ اتنی دیر میں باہر سے ہارن کی آواز آ گئی۔ ''لو آ گئے تمہارے ایس پی صاحب۔'' امی نے ہارن کی آواز پہچانتے ہوئے کہا اور پھر وہ کمرے میں آ ہی گئے۔

''ارے لیزا بیٹیا بھی موجود ہے۔'' انہوں نے سب سے پہلے لیزا کو ہی مخاطب کیا۔

''میرے علم میں ہوتا تو میں تمہارے لیے کچھ لیتا ہوا آتا۔'' ابا نے کہا۔

''فکر نہ کریں اب یہ کافی روز ہمارے سر پر مسلط رہے گی۔ کل یا پرسوں یا اس کے بعد کسی دن بھی تحفہ لے آئیے گا۔'' اپیا نے کہا۔

''نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے، یہ بھی لیزا کا اپنا گھر ہے جتنے دن چاہے رہ سکتی ہے۔'' ابا نے کہا۔

''تھینک یو انکل۔'' لیزا نے ابا کا شکریہ ادا کیا۔

''چاہتی تو میں یہ تھی کہ اپنے آخری سانس تک یہیں قیام کروں لیکن کچھ مجبوریاں ایسی ہیں کہ میں یہ نہیں کر سکتی۔'' لیزا نے کہا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں تمہاری مجبوری۔'' ابا نے کہا۔

''نہیں انکل آپ کچھ نہیں سمجھ سکتے۔'' لیزا کے چہرے پر اداسی تھی۔

''چلو میں غلط سہی تم ہی سمجھا دو کہ کیا مجبوری ہے۔''

''ابھی نہیں بلکہ یہ راز تو قبر میں میرے ساتھ جائے گا۔'' لیزا نے کہا۔

''کیسی لڑکی ہے، یہ اتنی سی عمر میں مرنے اور قبر میں جانے کی بات کر رہی ہے۔ زندہ رہنے کی بات کر لڑکی...... مجھے دیکھو آتے ہوئے طوفان کو دیکھ کر میں ہنس رہی ہوں اور امریکا جانے کی تیاریاں کر رہی ہوں۔'' اپیا نے کہا۔

''ہاں بیٹا سیما صحیح کہہ رہی ہے۔'' ابا نے کہا اور لیزا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم لوگوں نے کھانا کھا لیا؟'' ابا نے سوال کیا۔ پھر بولے ''چلو تم سب کو اچھی سی کافی پلواتا ہوں۔'' ابا نے کہا۔

''نہیں، انکل آئسکریم۔'' لیزا نے کہا۔

''یہ کون سا موسم ہے آئسکریم کا؟'' اماں نے دخل اندازی کی۔

''سردیوں میں ہی آئسکریم کھانے کا مزہ آتا ہے۔'' لیزا نے کہا۔

''جب میں اسلام آباد جاؤں گی تو برف باری کے دوران پاپا کو لے کر آئسکریم کھانے جاؤں گی اور اس وقت تک کھاتی رہوں گی جب تک اس دکان میں ایک کپ بھی آئسکریم ہوگی۔''

''اس سے پہلے ہی دکان والا تمہیں دکان سے نکال دے گا یا تمہارے پاپا کھینچ کر باہر لے آئیں گے کہ آج جتنی اوپر کی آمدنی ہوئی تھی تم ان سب کی آئسکریم کھا گئی ہو۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاپا رشوت نہیں لیتے۔'' لیزا نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا۔

''رشوت نہیں لیتے تو کسٹم میں کیوں ہیں، کسی شریفانہ ڈپارٹمنٹ میں ٹرانسفر کیوں نہیں کروا لیتے؟'' میں نے کہا اور لیزا کا منہ بن گیا۔

''اب باتیں ہی کرو گے یا گاڑی میں جا کر بیٹھو گے تاکہ ہم آئسکریم کھانے جا سکیں۔'' ابا نے کہا اور ہم سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ سب سے آخر میں اٹھنے والی امی تھیں۔

ہم پشاوری آئسکریم پہنچے تو ہر ایک نے اپنے اپنے پسندیدہ فلیور کی آئسکریم منگوائی۔ سب نے اپنا آرڈر دیا۔

''میرے اور خاور کے لیے پستہ لائیں۔'' لیزا نے کہا۔

''میرا آرڈر بھی تم نے دے دیا۔ میرا آج جی چاہ رہا تھا کوئی دوسرے فلیور کے لیے۔'' میں نے مصنوعی احتجاج کیا۔

''تمہیں بچپن سے جانتی ہوں تم پستہ کے علاوہ اور کوئی فلیور لے ہی نہیں سکتے۔'' لیزا کے لہجے میں اعتماد تھا اور وہ کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

''لیکن آج میرا دل نہیں چاہ رہا تھا پستہ آئسکریم کھانے کا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے پستہ آئسکریم پر لگا کر اب اپنا فلیور تبدیل کر رہے ہو۔'' اس بار لیزا کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''اسی طرح اُلجھتے رہے تو زندگی کیسے گزار پاؤ گے۔'' اپیا نے دخل دیا۔

''اللہ نہ کرے کہ میں اس کے ساتھ زندگی گزاروں۔'' لیزا نے کہا اور میں اسے گھور کر رہ گیا۔ لیزا کی

بات نے مجھے غصہ دلا دیا تھا۔
''کیا کمی ہے مجھ میں؟'' میں نے کسی قدر طیش سے کہا۔
''تم اس زمین پر اعلیٰ ترین مخچو ہو۔'' لیزا نے کہا اور ساتھ ہی ایک قہقہہ بھی لگایا تھا۔
''یہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔
''مخچو اسے کہتے ہیں جو اٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے انجینئر بننے کا خواب دیکھتا ہو لیکن پھر کسی کے کہنے پر میڈیکل لائن کی طرف چل دے۔'' لیزا نے ایک ایسی بات کی تھی جس سے میں کھول اٹھا تھا۔
''اور کس نے مجھے مجبور کیا تھا یہ کرنے کے لیے؟'' میں نے سوال کیا اور لیزا ہنس دی۔
''میں نے تو مشورہ دیا تھا تم چاہتے تو انکار کر سکتے تھے۔'' لیزا نے کہا۔
''میں بھی اسے انجینئر دیکھنا چاہتا تھا مجھے تو اب پتا چلا کہ یہ سب تمہاری کارستانی تھی۔'' ابا نے کہا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔
''انکل میں نے تو یونہی مذاق میں کہا تھا۔'' لیزا منمنائی۔
''ابھی میں کل ہی کالج جا کر وہ فارم نکلواتا ہوں جس پر تم نے پری انجینئرنگ کاٹ کر پری میڈیکل لکھا تھا۔'' میں نے کہا۔
''اوکے بابا تم مخچو نہیں ہو اب تو خوش۔'' لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بیٹا وہ مذاق کر رہی ہے ویسے بھی وہ ہماری مہمان ہے۔'' ابا نے لیزا کی حمایت کی۔
''آپ اسے مہمان کہہ رہے ہیں یہ بلائے جان ہے۔'' میں نے کہا اور میز پر بیٹھے تمام لوگ مسکرا دیے۔
''تم سے شادی نہ کرنے کا ابھی چند لمحوں پہلے اعلان کر کے تمہاری جان پر ہر آنے والی بلا دور کر دی۔''
''خاور...... خاور کہاں کھو گئے؟'' میں یادوں کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک آنٹی کی آواز مجھے ماضی سے حال میں لے آئی۔
''بس آنٹی یونہی ذرا ماضی میں چلا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔
''سمجھ سکتی ہوں تمہارا دکھ۔'' آنٹی کی آواز آئی۔
''جب ہم اب تک نہیں سنبھل سکے تو وہ تو تمہارے بچپن کی دوست تھی۔ زیادہ وقت تو تم دونوں ساتھ گزارتے تھے۔''
آنٹی کا انداز تسلی دینے والا تھا۔
''وہ حادثہ ایسا تو نہیں تھا کہ ہم تین برسوں میں اسے بھلا دیں۔'' میں نے کہا۔
''خاور میں چاہتی ہوں کہ تم دو دن کے لیے سہی لیکن اسلام آباد آ جاؤ۔'' آنٹی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔
''کوئی خاص بات ہے؟'' میں نے سوال کیا۔
''اتنی خاص کہ میں چھ ماہ بعد تمہیں فون کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔'' آنٹی نے کہا اور میں ماضی میں جاتے جاتے رہ گیا۔
''کیا لیزا کے حوالے سے کوئی بات ہے؟'' میں سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔
''تم اسلام آباد آؤ گے تو تفصیل سے بات ہو گی۔'' انہوں نے کہا۔
''صحیح پہنچ رہے ہو تم لیکن پہلے وعدہ کرو کہ تم ایک دو روز میں آ رہے ہو۔'' لیزا کی والدہ کا اصرار بڑھ رہا تھا۔
''پہلے بتائیں کہ گفتگو لیزا کے بارے میں ہو گی نا؟'' میں نے اصرار کیا۔
''اب تم سے میں گائنی پرابلمز پر تو بات نہیں کر سکتی کیونکہ ابھی تم میڈیکل اسٹوڈنٹ ہو ڈاکٹر نہیں بنے ہو۔'' آنٹی نے کہا۔
''میں ابھی جا کر کل کے لیے سیٹ بک کرواتا ہوں لیکن میں آپ کے گھر پہنچوں گا کیسے؟''
''تم سیٹ بک کروا لو تو مجھے میسج کر دینا میں خود ائرپورٹ آؤں گی۔'' آنٹی نے کہا اور میں مطمئن ہو گیا۔
''ایک بات بتائیں آپ اپیا کی شادی میں کیوں نہیں آئیں جبکہ ہم نے لیزا کے ایکسیڈنٹ کے بعد تقریباً سال بھر تک اپیا کی شادی ملتوی بھی کی تھی۔'' میں نے سوال کیا۔
''تمہاری اپیا کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا دکھ مجھے بہت زیادہ ہے بلکہ سچ پوچھو تو مجھ سے زیادہ دکھ تمہارے انکل کو ہے۔ وہ مجھے مجبور کرتے رہے کہ ہم صبح جائیں گے اور شام کو واپس آ جائیں گے۔ لیکن میں کہتی رہی کہ میں وہاں گئی تو میرے غم پھر سے تازہ ہو جائیں گے۔'' آنٹی نے کہا۔
''ہم سب کو آپ کے آنے کا بہت انتظار تھا۔'' میں نے کہا۔
''میں نے بھی کئی بار اپنے دل کو سمجھایا تھا لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود میں دل کے آگے ہار گئی۔'' آنٹی نے کہا۔

''تمہارے والد نے جتنی بار فون کیا تھا، وہ ہر بار مجھ سے یہی کہتے رہے ہمیں سب سے اچھے دوستوں سے محروم کر رہی ہو لیکن یقین کرو کہ تین سال میں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ میری آنکھیں نہ بھیگی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''لیزا کوئی ایسی ہستی نہیں تھی کہ اسے یوں آسانی سے بھلایا جاسکے۔'' میں نے کہا اور مجھے فون پر ان کی سسکی کی آواز سنائی دی تھی۔

''یہ تو جب سے ڈونا آئی ہے، اس سے میرا غم کچھ کم ہوا ہے۔'' آنٹی نے کہا۔

''یہ کون ذات شریف ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ڈونا میری بہن کی بیٹی ہے یعنی لیزا کی کزن ہے لندن سے آئی ہے وہاں وہ میڈیکل کے فائنل ایئر میں ہے۔'' آنٹی نے ڈونا کا تعارف کروایا تھا۔

''مجھے یاد آیا کہ لیزا نے چند بار اس کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ بھی ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔'' میں نے یادداشت کے کسی گوشے سے کھرچ کر ڈونا کو یاد کیا۔

''تم اس سے ملو گے تو تمہیں خوشی ہوگی۔'' آنٹی نے کہا۔

''لیزا کے بعد کوئی بھی لڑکی مجھے متوجہ نہیں کر سکی ہے۔'' میں نے یہ کہا نہیں کیونکہ لیزا کا ذکر کر کے میں ان کے اور اپنے دکھ میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں خاموش ہی رہا۔

''میں تمہارے میسج کا انتظار کروں گی۔ آج کل ویسے بھی تمہارے انکل ٹریننگ پر گئے ہوئے ہیں۔''

''ویسے جو بات تم سے کرنے والی ہوں اس کی ہوا بھی انہیں لگنے نہیں دوں گی اور تم سے بھی یہی درخواست ہے کہ اسے راز میں ہی رکھنا۔'' آنٹی کے اس آخری فقرے نے مجھے بُری طرح اُلجھا دیا۔

''ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ لیزا کی والدہ اپنے شوہر سے چھپانا چاہتی تھیں بلکہ ہوا بھی نہ لگنے دینے کی بات کر رہی ہیں لیکن مجھ سے شیئر کرنے پر اصرار ہے۔ انہی سوالات کو ذہن میں لیے گھر پہنچا تو اپیا کی یاد آئی۔ میں بچپن سے لے کر لڑکپن تک اپنا ہر مشورہ ان سے ہی کرتا تھا مگر وہ امریکا جا چکی تھیں اپنے شوہر کے پاس۔ میں نے کچھ سوچا اور اپیا کے نمبر ڈائل کر دیے اور انہیں تمام باتیں بتا دیں۔ میری بات ختم ہوئی تو اپیا کا واعظ شروع ہو گیا۔

''میں بھی کہوں کہ اتنے دنوں بعد میری یاد کیسے آ گئی۔'' اپیا نے کہا۔

''ابھی پچھلے ہفتے ہی تو بات ہوئی تھی۔'' میں نے کہا اور اپیا کی ہنسی کی آواز آئی۔

''دس روز ہو گئے ہیں اس بات کو۔'' اپیا نے کہا اور میں ہنس دیا۔

''آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اب آپ امریکا میں ہیں اور مسز ارشد ہیں۔ وہ جو آپ کی شادی سے پہلے ہم گھنٹوں ساتھ رہتے تھے اب نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کہا۔

''چلو مان لیتی ہوں اب بتاؤ کہ کیسے فون کیا ہے؟'' انہوں نے کہا اور میں نے تمام باتیں دہرا دیں۔

''اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟'' اپیا نے بات کی گہرائی میں جانے کے بجائے اپنے روایتی لاابالی پن کا مظاہرہ کیا۔

''آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اب مجھ سے سات سال چھوٹا بھائی مجھے سمجھائے گا کہ اصل بات کیا ہے۔'' اپیا نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

''یار اگر آنٹی تمہیں بلا رہی ہیں تو اسلام آباد چلے جاؤ۔'' اپیا نے کہا — ''جب تک تم وہاں جاؤ گے نہیں اور یہیں کراچی میں بیٹھ کر اندازے لگاؤ گے تو کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا اور تم ابا کے فون کا بل بڑھاتے رہو گے۔'' اپیا نے کہا اور مجھے غصہ سا آنے لگا۔

''میں نے اپنے موبائل سے فون کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اپنے موبائل سے کیا ہو یا گھر کے نمبروں سے آخر بوجھ تو ابا پر ہی آئے گا۔'' اپیا نے کہا اور میں نے مزید کچھ کہے لائن کاٹ دی تھی۔ میں نے اسلام آباد کے لیے ٹکٹ بک کرنے کے لیے فون کرنے شروع کیے لیکن کہیں سے مثبت جواب نہیں ملے تب میں نے ابا کو فون کر دیا۔

''ابا میں آپ کے آفس آ رہا ہوں۔'' رابطہ ہوتے ہی میں نے کہا۔

''میں دفتر میں نہیں ہوں سائٹ پر آیا ہوا ہوں لیکن خیریت تو ہے۔'' ابا نے سوال کیا۔

''کل کے لیے اسلام آباد کا ایک ٹکٹ چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیریت کیا وزیراعظم نے ملاقات کے لیے بلوایا ہے؟'' ابا نے کہا۔ ابا نے اپیا کا لہجہ اپنایا تھا بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اپیا نے جو کچھ سیکھا تھا، وہ ابا سے ہی سیکھا تھا۔ میں نے ابا کو بھی آنٹی سے ہونے والی گفتگو بتائی۔ ''تم دفتر اتنے سے کام کے لیے آ رہے ہو۔'' ابا نے کہا۔

"میں تمام ائرلائنز سے رابطہ کر چکا ہوں لیکن کہیں جگہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔ تم گھر جاؤ۔"

ٹکٹ ملتے ہی میں نے تفصیلات لیزا کی والدہ کے نمبر پر بھیج دی تھیں۔ گھر آکر میں نے امی سے کہا۔ "ایک چھوٹے سوٹ کیس میں دو سوٹ پیک کر دیں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے ان کے کیوں وغیرہ کے جوابات دیے۔

"شادی میں تو آئے نہیں اب کام پڑا ہے تو تمہیں بلا رہے ہیں۔" امی نے پیکنگ کے دوران بڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی شکایات اپنی جگہ لیکن میں اس سے اتفاق نہ کر سکا کہ کام پڑ گیا تو بلوا رہے ہیں۔

"مجھ سے انہیں کیا کام ہو سکتا ہے۔" میرے ذہن نے سرگوشی کی لیکن میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو اپیا کے جانے کے بعد خالی ہوا تو میں نے اسے اسٹڈی بنا لیا تھا۔

میں نے شیلف سے کتابیں نکالیں اور بیڈ پر بیٹھ کر ہی پڑھنے لگا۔ ابا اور اپیا کے ساتھ لیزا نے بھی اس عادت پر مجھے کئی بار ٹوکا تھا لیکن میں نے اپنی عادت قائم رکھی تھی۔

اگلے ہفتے سے ایگزام شروع ہو رہے تھے اور مجھے اس کی تیاری بھی کرنی تھی۔ میں کتاب کھول کر دیکھتا رہا لیکن ذہن میں لیزا اٹکی اس لیے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک میرے منہ سے نکلا۔

"لیزا تم کیوں چلی گئیں؟" مجھے معلوم تھا کہ آواز لیزا سمیت کسی تک نہیں پہنچے گی لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن پر ایک سکون طاری ہوتا چلا گیا۔ انٹر کے امتحانات سے قبل ہم تین بندے ایک کمرے میں ہوتے تھے۔ لیزا، اپیا اور میں، کبھی وہ کمرا اپیا کا ہوتا تھا جہاں لیزا بھی مقیم تھی اور کبھی وہ دونوں میرے کمرے میں آ جاتی تھیں۔ اپیا ہم دونوں کی رہنمائی کرتی تھیں لیکن زیادہ توجہ ان کی لیزا کی طرف ہوتی تھی اور جب ہوتی تھی تو طنز کے تیر چلانے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔

"ایک بار اگر ڈھائی فیصد مارکس زیادہ آ گئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پڑھائی پر توجہ نہ دو۔" وہ کہتی تھیں۔

"دو ڈھائی فیصد نہیں چار پرسنٹ مارکس میرے بہتر ہیں۔" میں کہتا تھا۔

"اب کی بار اتنے ہی فیصد مارکس اس کے زیادہ ہوں گے۔" اپیا کہتی تھیں اور لیزا اس دوران مسکراتی رہتی تھی۔

انٹر کے امتحانوں کے چوتھے روز لیزا نے اسلام آباد جانے کے لیے کہا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ ہمیں بائی روڈ جانا چاہیے۔ "وہ کیوں؟" اپیا نے جو ہر معاملے میں لیزا کا ساتھ دیتی تھیں، اس بار سوال کیے بغیر نہیں رہ سکیں۔

"سولہ سو کلومیٹر کا سفر ہے۔" اپیا نے کہا تھا۔

"تو کیا ہوا ڈرائیور بھی تو تین ہیں۔" لیزا اپنی بات پر اڑی رہی تھی۔

"تم گاڑی چلاؤ گی تو میں کبھی بھی اس میں نہیں بیٹھوں گا۔"

"اس کی وجہ؟" اپیا نے سوال کیا۔

"اتنی تیز گاڑی چلاتی ہے۔" میں نے کہنا چاہا لیکن لیزا نے مجھے کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"اسکول اور پھر کالج میں ہی تمہیں لے جاتی رہی ہوں۔" لیزا نے کہا۔

"شہر میں بھی تمہاری اسپیڈ اتنی ہوتی تھی کہ میں کانپتا رہتا تھا کہ اب گاڑی لگی اور اب لگی......" میں نے کہا۔ "ہائی وے پر تو میں کبھی بھی تمہارے ہاتھ میں اسٹیئرنگ آنے نہ دوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں اور اپیا گاڑی میں جائیں گے، تم پیدل آ جانا۔" لیزا نے کہا۔

"اس سے بہتر یہ نہیں کہ جہاز کا ٹکٹ لو اور دو گھنٹوں میں گھر پہنچ جاؤ۔" میں نے کہا۔

"یہ میں بھی جانتی ہوں لیکن ہائی وے سے جانے میں اپنے ہی مزے ہیں۔" لیزا نے کہا تھا۔ سارے راستے نظارے کرتے اور رکتے ہوئے سفر کا کیا مقابلہ ہوائی سفر سے۔" لیزا نے کہا اور مجھے محسوس ہوا کہ اپیا کا ووٹ بھی اس کی حمایت میں آنے والا ہے اور پھر میرا شبہ صحیح ثابت ہوا۔

"بات تو اس کی غلط نہیں ہے۔"

"اپیا تم بھی لوٹا ہونے میں دیر نہیں کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"لوٹا ہونے میں فائدہ یہ ہے کہ ہمیشہ اقتدار میں رہتے ہیں۔" اپیا نے کہا تھا۔

"شکر ہے تمہارا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے کہا اور اپیا کے ساتھ لیزا نے بھی قہقہہ لگایا۔

"تم نے شکست سامنے دیکھی تو لوٹا ہونے کا طعنہ دینے لگے۔" لیزا نے کہا۔

"میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ تمہیں ڈرائیونگ نہیں

ملے گی۔'' میں بھی اپنی بات پر اڑ گیا تھا۔
''تمہارے علاوہ ہر ایک میری ڈرائیونگ کی تعریف کرتا ہے۔'' لیزا نے تنک کر کہا۔
انہی خیالوں میں جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر میں نے سونے کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ کھانے کے لیے امی آئیں لیکن میں نہیں جاگا جب ابا نے آ کر جگایا تو میں اٹھ گیا۔
''اٹھ جاؤ اذان ہو چکی ہے۔'' انہوں نے مجھے اٹھتا دیکھ کر کہا۔
''تم تو کہہ رہے تھے کہ پلک نہیں جھپکاؤں گا اور ایسے سوئے کہ ڈنر کے لیے اٹھنا بھی گوارا نہیں تھا۔''
میں نے اٹھنے میں دیر نہیں کی اور نہ باتھ روم میں وقت لگایا۔ نماز بھی تیزی سے پڑھی اور اٹیچی لے کر باہر جانے ہی والا تھا کہ امی کی آواز آئی۔ میں ناشتا لگا رہی ہوں کھا کر جانا۔ جلدی جلدی چند لقمے منہ میں ڈالے اور باہر نکل آیا۔ ڈرائیور کار لیے کھڑا تھا۔ ''تم پیچھے جاؤ کار میں ڈرائیو کروں گا۔'' میں نے کہا اور وہ بغیر کچھ کہے پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔
جب ہم ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے تو پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں بورڈنگ کارڈ لینے چلا گیا۔
بورڈنگ کارڈ لے کر ویٹنگ لاؤنج میں آیا تو فلائٹ میں ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میں کچھ ہی دیر میں اونگھ گیا۔ اس وقت اٹھا تھا جب مجھے کندھے سے جھنجوڑا گیا تھا۔
میں جہاز میں سوار ہوا تو ائرہوسٹس نے رہنمائی کی۔ میری نشست ونڈو سیٹ تھی۔ درمیان والی نشست پر ایک جانی پہچانی شکل نظر آئی تھی۔ میں ان دونوں خواتین سے بچتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں جہاز کے ٹیک آف کا اعلان ہوا اور میں نے جہاز کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھ بند کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ برابر سے آواز آئی۔
''رات سوئے نہیں تھے کیا؟'' وہ جانی پہچانی شکل والی لڑکی سوال کر رہی تھی۔
''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے کہا۔
''مطلب یہ کہ آپ ویٹنگ لاؤنج میں بھی سو رہے تھے اور اب بھی سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔
''آپ کون؟'' میں نے سوال کیا۔ کہنا میں یہ چاہ رہا تھا کہ میں سوؤں یا جاگوں آپ کون ہوتی ہیں سوال کرنے والی۔ لیکن دو لفظ کہہ کر رک گیا۔
''آپ مجھے نہیں جانتے۔'' اس نے پلٹ کر پوچھا۔
''آپ معروف ہستی ہیں؟'' میں نے سوال کیا اور وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہی ہو۔
''میں کویتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور مجھے یاد آ گیا کہ شکل جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی۔
''آپ شاعرہ ہیں۔'' مجھ میں اچانک اپیا سما گئی تھیں۔
''میں فلم ایکٹریس ہوں۔'' اس نے کہا۔
''پاکستانی۔'' میں نے فوراً ہی ایک اور سوال کیا۔
''جی۔'' اس نے اس انداز میں جواب دیا جیسے مجھے کھا جائے گی۔
''معاف کیجیے گا میں فلمیں نہیں دیکھتا۔'' میں نے وہ کہا جو حقیقت نہیں تھی۔ پھر اس میں مزید جھوٹ کا تڑکا لگایا۔
''پاکستانی فلم تو بالکل نہیں دیکھتا۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے کے بعد نگاہ دوسری جانب کر کے بیٹھ گئی تھی۔
جہاز نے ٹیک آف کیا اور میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اونگھنے میں مصروف ہو گیا اور پھر اس وقت اٹھا جب کویتا نے مجھے اٹھایا۔
''اٹھ جائیں صبح ہونے والی ہے۔'' اس کی آواز میرے کانوں میں آئی تھی۔ میں نے اٹھنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔
ہم سیڑھیاں اتر کر بس کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک شخص آگے بڑھا، اس کا رخ کویتا اور اس کے ساتھ والی خاتون کی طرف تھا۔ ''آپ اس طرف آ جائیں۔'' اس نے ساتھ کھڑی کوسٹر کی جانب اشارہ کیا تھا۔ مجھ سے کہا نہیں تھا لیکن میں بھی کوسٹر کی جانب بڑھ گیا۔ ہم تینوں کو سب سے آخری سیٹ پر جگہ ملی تھی۔ میرے برابر والی سیٹ پر کویتا کے ساتھ والی خاتون بیٹھی تھی۔
''آپ واقعی پاکستانی فلمیں نہیں دیکھتے۔'' اس نے سوال کیا۔
''سچ یہ ہے کہ بہت کم پاکستانی فلمیں دیکھتا ہوں لیکن آپ کی ہدایات میں بننے والی فلم ''مٹھی بھر چاول'' دیکھی تھی۔'' میں نے کہا ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ وہ جس نے

اپنا نام کوبتا بتایا تھا، اس کے کان پوری طرح ہماری طرف لگے ہوئے تھے۔
''اس فلم میں یہ بھی تھیں۔'' خاتون نے کہا۔
''ان کا رول شاید وہ تھا جو فلم میں آپ کے پہلے شوہر کی بیٹی تھی۔'' میں نے کہا اور میرے ساتھ بیٹھی خاتون ہنس پڑی تھیں لیکن کوبتا کا منہ بن گیا تھا۔
''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس نے کہا اور اب میرا منہ بن گیا۔
''آپ دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔'' اس نے کہا۔
''آپ کہتی ہیں تو شاید ایسا ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ڈاؤ میڈیکل میں تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں، خاور میرا نام ہے۔'' میں نے کہا اور وہ خاتون جو مجھ سے بات کر رہی تھیں، اس نے کہا۔ ''تو آپ فیوچر کے ڈاکٹر ہیں۔'' اور میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ کوسٹر رکی تو بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی کوسٹر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کوسٹر کے دروازے پر ایک ہجوم سا بن گیا تھا اس لیے میں رک گیا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ اپنا نمبر دیں گے۔'' اس... خاتون نے کہا تھا جو میرے ساتھ والی سیٹ پر تھی۔
''کیوں اگلی فلم میں مجھے کاسٹ کریں گی؟'' میں نے سوال کیا۔
''ابھی سوچا نہیں لیکن ہوسکتا ہے قسمت یاوری کرے اور رول نکل بھی آئے۔'' اس نے کہا۔
''میں اپنے پروفیشن میں انٹرسٹڈ ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔
''کوئی خاص وجہ؟'' اس نے ایک اور سوال کر دیا۔
''ایک ایسی ہستی کی یہ خواہش تھی جو اب اس دنیا میں نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے رکنے سے پیچھے والے تمام افراد رک گئے تھے اور اُن کے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں یہ سب پسند نہیں آرہا تھا۔
میں لاؤنج میں پہنچا تو لیزا کی والدہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ''یہ خاتون مجھے بلا کر کہاں رہ گئیں۔'' میں نے ابھی سوچنا ہی شروع کیا تھا کہ مجھے اپنے برابر سے آواز آئی۔
''ہیلو آئی ایم ڈونا۔'' میں نے آواز کی جانب نگاہ کی تو وہ ایک دُبلی پتلی مگر لمبی لڑکی تھی۔ مجھ سے قد میں شاید دو تین انچ کم تھی جبکہ میں چھ فٹ ایک انچ کا تھا۔
''تو تم ہو ڈونا۔'' میں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ نے کیسے جانا؟'' اس نے سوال کیا۔
''کل آنٹی سے بات ہو رہی تھی تو انہوں نے ذکر کیا تھا کہ میری بھانجی لندن سے آئی ہے، اس کا نام ڈونا ہے۔'' میں نے کہا۔
''بس اتنا ہی بتایا تھا؟'' ڈونا نے سوال کیا۔
''انہوں نے کہا تھا کہ ڈونا کی آمد کے ساتھ ہی لیزا کی جدائی کا صدمہ کم ہو گیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے ہر روز میری آنکھیں بھیگ جاتی تھیں لیکن اب ایسا نہیں ہے مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ڈونا تقریباً لیزا کی ہم شکل ہے۔'' میں نے کہا اور ڈونا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آگئی تھی۔
''تو لیزا کا منگیتر مجھے اپنی منگیتر کا ہم شکل کہہ رہا ہے۔''
''ایک بات کی تصحیح کر دوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیزا میری منگیتر نہیں صرف دوست تھی۔ ہم دونوں کا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ مجھے میڈیکل کی جانب مائل کرنے والی بھی وہی تھی۔ اگر وہ زندہ رہ جاتی تو شاید ہماری دوستی کسی رشتے میں بدل جاتی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔'' میں نے کہا۔
''تمہارا مطلب ہے کہ لیزا تمہاری گرل فرینڈ تھی۔'' ڈونا نے کہا۔ میں نے اس کی تردید کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔
''تم یورپ میں رہی ہو تمہارے یہاں گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کے معنی کچھ اور ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے صرف دوست تھے۔ ہمارے درمیان کوئی راز، راز نہیں ہوتا تھا مگر ایک خاص حد سے کبھی آگے نہیں بڑھے تھے۔'' ''یہ آنٹی کہاں رہ گئیں۔'' میں نے اچانک رک کر سوال کیا۔
''وہ رات گھر نہیں آئی تھیں کسی سرجری میں مصروف تھیں۔ صبح آٹھ بجے انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔ میں اُس وقت سو رہی تھی مگر جب انہوں نے کہا کہ خاور آرہا ہے تو میں جلدی جلدی تیار ہوئی اور فلائٹ کے آنے سے پہلے ائرپورٹ پہنچ گئی۔'' ڈونا نے کہا۔
ہم باتیں کرتے ہوئے وہاں تک آگئے تھے جہاں ڈونا نے کار پارک کی تھی۔ ڈونا نے ڈکی کھولی اور میں نے اپنا اٹیچی اس میں رکھا اور پھر اگلی سیٹ کی طرف بڑھا۔ ڈونا نے پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی پھر آہستہ آہستہ ہم ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلے۔
''یہ تم میں اور لیزا میں دوسرا فرق ہے۔''

"اور وہ کیا ہے؟" ڈونا نے سوال کیا۔

"لیزا کار اسٹارٹ کرتے ہی ایک سو بیس کے ہندسہ چھونے کی کوشش کرتی تھی مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔"

"یہ تو تھا دوسرا فرق پہلا فرق کیا تھا؟" ڈونا کا سوال تھا۔

"وہ تمہارے مقابلے میں دبتے ہوئے رنگ کی تھی۔ تم یورپ سے آئی ہو اس لیے سرخ و سپید ہو۔"

"میں تو اُسے کلو کہتی تھی۔" ڈونا نے کہا۔

"کالی تو وہ کہیں سے نہیں تھی۔ تم اسے کھلتا ہوا گندمی رنگ کہہ سکتی ہو۔ تمہاری بات ہوتی تھی اُس سے۔"

"کبھی واٹس ایپ پر اور کبھی کمپیوٹر پر۔" ڈونا کا جواب تھا۔

"کبھی میرا ذکر ہوتا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے تو یوں لگنے لگا تھا کہ تمہارے سوا کوئی ذکر ہی نہیں تھا اُس کے پاس...... خاور نے یہ کہا، خاور نے وہ کہا۔" ڈونا کا جواب تھا۔ "جب پہلی بار تم نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا، وہ بھی اس نے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جب خاور نے مجھے چھوا تو میں کانپ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے آگے بڑھا تو میں روک پاؤں گی یا نہیں اگر اس نے مجھے پروپوز کر دیا تو میں کس طرح انکار کر پاؤں گی۔" اس نے کہا تھا۔

"اس نے مجھ سے تو کبھی یہ بات نہیں کی۔" میں نے کہا۔

"وہ اس لیے کہ اگر وہ انکار کرتی تو اسے اس کی وجہ بھی بتانا پڑتی جو وہ کبھی نہیں چاہتی تھی۔" ڈونا نے کہا۔

"جب تم اتنی باتیں جانتی ہو تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ مجھے اسلام آباد کیوں طلب کیا گیا ہے؟" میں نے کہا اور اس کی نظریں جھک گئیں۔

"اس کا جواب تو وہی دے سکیں گی جنہوں نے تمہیں یہاں بلوایا ہے، میں فی الوقت اتنا بتا دیتی ہوں کہ آنٹی کا خیال ہے کہ لیزا حادثے کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اُس نے خودکشی کی ہے۔" ڈونا نے ایک ایسی بات کی کہ میں اپنی جگہ کانپ کر رہ گیا۔

"پولیس کا کہنا تو یہ ہے کہ کار اسپیڈ میں تھی اور سامنے کنٹینر کو دیکھ کر وہ قابو نہ کر پاسکی اور کار کھڑے ہوئے کنٹینر میں گھس گئی۔"

"آپ نے دیکھی تھی وہ کار حادثے کے بعد؟" ڈونا نے پوچھا۔

"ہماری فیملی حادثے کے اگلے روز ہی پہنچی تھی۔ کار واقعی اس حالت میں تھی کہ لوگوں کا کہنا سچ ہی محسوس ہوا تھا کہ کار کو کاٹ کر لاش نکالی گئی تھی۔"

"تو آنٹی یہ سمجھ رہی ہیں کہ لیزا نے خود کار ٹکرائی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"صرف یہ ایک بات نہیں ہے، بہتر ہوگا کہ آنٹی آجائیں تو تم خود اُن سے بات کر لینا۔"

"کیا بات کروں کہ جو کچھ آپ سمجھ رہی ہیں ویسا نہیں ہے۔"

"تم جتنے اُن کے خلاف بات کرو گے، وہ تمہاری ہر دلیل مسترد کر دیں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میری اُن سے کم بحث ہوئی ہوگی لیکن جب انہوں نے لیزا کی ڈائری میرے سامنے رکھی اور وہ بل دکھائے جو وہ سائیکاٹرسٹ کو دکھاتی رہی تھی تو مجھے بھی ان کی باتوں پر یقین آتا چلا گیا۔"

"تمہیں لیزا نے بتایا ہوگا کہ کراچی سے ہم نے اسلام آباد تک بائی روڈ سفر کیا تھا......"

"بتایا تھا کہ ابتدا میں آپ اُس کے ڈرائیو کرنے کے مخالف تھے کہ جو لڑکی شہر میں اس رفتار سے گاڑی چلاتی ہو، وہ ہائی وے پر کہیں نہ کہیں گاڑی مار دے گی مگر نواب شاہ سے گھوٹکی تک اسی نے کار چلائی تھی۔"

"یہ سچ ہے کراچی سے ہالا تک اپیا نے کار چلائی تھی اور وہاں سے مورو تک میں نے ڈرائیونگ کی تھی اور مورو سے آگے لیزا کار چلاتی رہی تھی۔"

"آپ کو اُس کی ڈرائیونگ میں کوئی خامی نظر آتی تھی؟" ڈونا نے سوال کیا اور میری گردن نفی میں ہل گئی۔

"کار وہی تھی جو حادثے میں تباہ ہوئی تھی۔ دراصل وہ کار لیزا کے والد کی تھی جو وہ کراچی چھوڑ آئے تھے اور لیزا اسے اسلام آباد پہنچانا چاہ رہی تھی۔"

"یقینی طور پر کراچی سے نکلنے سے پہلے کار کی سروس ہوئی ہوگی اس کا آئل اور بریک آئل بھی تبدیل ہوا ہوگا؟" ڈونا نے سوال کیا۔

"یہ سب تو معمول کی بات تھی اور تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو حادثہ ہمارے سفر کے دوران تو نہیں ہوا ہم تو خیریت سے اسلام آباد پہنچ گئے تھے، حادثہ تو ہمارے اسلام آباد سے جانے کے بھی کئی روز بعد ہوا تھا۔" میں نے کہا اور ڈونا کے چہرے پر اُلجھن واضح طور پر نظر آرہی تھی۔

ہم ایف سکس تھری میں داخل ہو چکے تھے جب ڈونا کے موبائل پر کال آئی تھی۔

”جی آنٹی۔“ اس نے فون ریسیو کرتے ہی کہا تھا۔
”جی خاور میرے ساتھ ہیں۔ ہم دومنٹ میں آپ کے گیٹ پر ہوں گے۔ کسی ملازم سے کہہ کر گیٹ کھلوا دیں۔“ ڈونا نے کہا۔
ڈونا نے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دیا تو گیٹ کسی اور نے نہیں خود آنٹی نے کھولا تھا۔
”ٹھیک ہو بیٹا۔“ انہوں نے رسمی انداز میں کہا اور پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ ”کاش وہ سب کچھ مجھے پہلے بتا دیتی۔“ میرے سینے سے لگ کر روتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔
”کیا بتا دیتی؟“ میں نے سوال کیا۔
”وہ بتانے ہی میں نے تمہیں اتنی دور بلوایا ہے لیکن پہلے تم اندر تو چلو پھر آرام سے بیٹھ کر تمام رازوں میں تمہیں شریک کروں گی۔“ آنٹی نے کہا اور ہم دونوں یعنی میں اور ڈونا اُن کے پیچھے چل دیے۔
”آنٹی، ڈونا کہہ رہی تھیں کہ آپ لیزا کے واقعے کو حادثہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ آپ اسے خودکشی قرار دے رہی ہیں۔“ میں نے کہا اور آنٹی نے ڈونا کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔
”میں نے تم سے کہا تھا کہ خاور کو کچھ نہیں بتانا۔“ خالہ نے اپنی بھانجی سے کہا۔
”میں نے اسے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔“ ڈونا نے اپنی صفائی دینی چاہی لیکن آنٹی اس کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔
”میں نے کہا تھا جو کچھ بتاؤں گی، وہ میں خود بتاؤں گی۔“ آنٹی نے کہا تھا۔
”چلیں پھر شروع کردیں۔“ میں نے کہا اور آنٹی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔
”اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو پہنچے ہو، کچھ دیر آرام کرو کچھ کھالو پھر میں بتانا شروع کرتی ہوں۔“
”آنٹی بالکل بھوک نہیں ہے۔“ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔
”اتنا سفر کر کے آئے ہو تو بھوک کیسے نہیں ہے۔“ آنٹی نے زور دینے والے انداز میں کہا۔
”گھر سے ناشتا کر کے نکلا تھا پھر فلائٹ میں بھی کچھ کھالیا۔“ میں نے کہا۔
”ہاں ان کا ناشتا بھی بھرپور ہوتا ہے۔“ آنٹی نے مجھ سے اتفاق کیا اور میں نے شکریہ ادا کیا۔

”ڈونا، نگینہ سے کہو کہ اچھی سی چائے بنا دے۔“ آنٹی نے ڈونا سے کہا۔
”نگینہ سے کیوں، میں خود بنا کر لاتی ہوں چائے۔“
وہ چائے بنانے کے لیے گئی اور میں اس سوچ میں ڈوب گیا پتا نہیں لندن میں پلنے والی چائے کیسے بنائے گی کیونکہ یورپ میں تو تعویذ والی چائے پی جاتی تھی مگر جب چائے آئی تو وہ خالص پاکستانی چائے تھی۔
”چائے بنانی کس سے سیکھی تم نے؟“ میں نے سوال کیا۔
”صرف چائے ہی بنانی نہیں سیکھی بلکہ بہت سی پاکستانی ڈشز بھی لیزا مجھے سکھا کر گئی ہے۔“ ڈونا کا جواب تھا۔
”مگر تم تو اس سے پہلے پاکستان آئی ہی نہیں۔“ میں نے کہا تو آنٹی اور ڈونا دونوں ہنس دیں۔
”سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے ڈاکٹر صاحب۔“ ڈونا نے کہا۔
”لیزا جب سے اسلام آباد آئی تھی، روز اسکائپ پر ایک نئی ڈش سکھاتی تھی۔“ ڈونا نے کہا تھا۔
”کبھی میرے ہاتھ کی بنی بریانی کھا کر دیکھیے گا۔ دعوے سے کہتی ہوں کہ ایسی بریانی اس سے پہلے آپ نے کبھی نہیں کھائی ہوگی۔“ ڈونا نے اپنی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
”میں دو دن کے لیے ہوں یہاں پر کل ہی ٹرائی کرتے ہیں تمہارے ہاتھ کی بریانی۔“ میں نے کہا۔
”یہ سچ کہہ رہی ہے۔“ آنٹی نے اس کی حمایت کی۔
”چلیں کل ثابت ہو جائے گا، وہ کیا کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، پڑھے لکھے کو فارسی کیا۔“
”جب سے تم ائرپورٹ پر ملی ہو اپنی اردو سے متاثر کر رہی ہو مگر اب اونٹ پہاڑ کے نیچے آہی گیا۔“ ”تم ایسا کرو پاکستانی مرد سے شادی کی پلاننگ کرو۔“ میں نے مشورہ دیا۔
”تم کرو گے مجھ سے شادی۔“ ڈونا نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔
”ڈونا پلیز یہ لندن نہیں ہے۔“ آنٹی نے کہا ان کا انداز تنبیہ کرنے والا تھا۔
”جانتی ہوں کہ یہ یو کے نہیں، پاکستان ہے۔“ ڈونا نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کہا۔
”ہر ملک کے اپنے رسم و رواج اور اپنا کلچر ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"وہ کچھ بھی نہیں ہوتا ہوگا جو لیزا کے ساتھ ہوا تھا۔" ڈونا بولڈ تھی۔ مغربی ماحول میں پلی بڑھی تھی اس لیے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے دیر نہیں کرتی تھی لیکن اس کی بات سے مجھے بات کرنے کا سرا مل گیا۔

"کیا ہوا تھا لیزا کے ساتھ؟" میں نے سوال کیا اور کمرے میں ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔

"بات میں اس وقت سے شروع کروں گی جب تم اور تمہاری اپا لیزا کو یہاں چھوڑ کر جہاز سے واپس گئے تھے۔" آنٹی نے کہنا شروع کیا۔ "دو دن تو میں نے برداشت کیا، یہی سمجھتی رہی کہ سفر کی تھکن ہے اتر جائے گی لیکن جب پانچ روز گزر گئے اور رات میں دیر تک اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہی تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"لیزا بیٹی کیا بات ہے؟" لیکن اس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ "کچھ نہیں مما یونہی ذہن پر بوجھ ہے۔" لیزا نے کہا۔ "کس بات کا بوجھ؟" میں نے سوال کیا تو اس نے کہا۔ "کاش میں آپ کو بتا سکتی کیونکہ میرے بتانے کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔" اس نے کہا۔

اس کے اگلے روز میں اسے نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس لے گئی مگر وہاں سے واپسی پر اس کی حالت سدھرنے کے بجائے اور بگڑنے لگی تھی۔ پہلے تو رات کے کسی پہر کمرے کی لائٹ بند ہو جاتی تھی لیکن سائیکاٹرسٹ کے پاس سے آئی تو صبح تک جاگنے لگی تھی اور دن میں بھی اس کی حالت عجیب سی رہتی جس چیز پر نظر ڈالتی تھی وہیں جم کر رہ جاتی تھی۔ ساتھ ہی وہ کچھ بڑبڑانے بھی لگی تھی۔ میں ایک بار پھر اسے لے گئی اب کی بار اس نے تین گھنٹے اس کے ساتھ سٹنگ کی تھی اور ساتھ ہی کچھ دوائیں بھی دی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ سکون کی دوا دے رہا ہوں۔ کچھ بھی ہو مجھے رپورٹ ضرور کریں۔

اس رات پہلی بار اس نے دوا کھا کر کہا۔ "مما مجھے نیند آ رہی ہے، میں سونا چاہتی ہوں۔" لیکن رات کے دو بجے ہوں گے کہ ہمیں اس کی چیخیں سنائی دیں۔ یہ جہاں ہم بیٹھے ہیں یہ اسی کا کمرا ہے اور میرا اور تمہارے انکل کا کمرا اوپر ہے فرسٹ فلور پر مگر ہمیں اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ چھوڑ دے مجھے وحشی درندے۔" میں اور تمہارے انکل بھاگتے ہوئے اس کمرے تک آئے تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود کو کسی سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو، ہم دونوں نے مل کر اسے قابو کیا لیکن اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ چھوڑ دے مجھے۔ تجھے کرائسٹ کا واسطہ دیتی ہوں مجھے چھوڑ دے۔ ہم برابر والے کمرے میں جہاں کچھ دیر پہلے ہم بیٹھے تھے جا کر لیٹ گئے اور نگینہ سے ہم نے کہا کہ وہ یہیں لیزا کے پاس رہے۔ صبح ہوتے ہی میں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور اس نے بھی آنے میں دیر نہیں کی۔"

"کیا ہوا تھا بچی رات میں؟" ڈاکٹر نے لیزا سے سوال کیا لیکن وہ کچھ دیر خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھتی رہی پھر کہا "کیا ہوا تھا؟"

"وہ سوال اتنا عجیب و غریب تھا کہ میں اور تمہارے انکل ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نگینہ کی آنکھوں میں بھی الجھن تھی پھر کچھ دیر بعد وہ بولی۔۔۔ "صاحب جی میرا خیال ہے چھوٹی بی بی کسی سائے کی لپیٹ میں آ گئی ہیں۔ آپ کرسچن لوگ ہو، پتا نہیں آپ کو یقین ہے یا نہیں ان باتوں پر لیکن ایک بابا ہے جو مزار پر ہی رہتا ہے نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے نہ کچھ کہتا ہے اگر آپ لوگ کہیں تو میں اس بابا کو لے آؤں۔ وہ بابا یقینی طور پر چھوٹی بی بی کو ٹھیک کر دے گا۔ تمہارے انکل تو سوچ میں ڈوبے رہے لیکن میں نے کہا ڈرائیور کو لے جاؤ اور اس بابا کو لے آؤ۔"

"مجھے اپنی بیٹی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہے۔ بابا اگر صحیح کر سکتا ہے تو بابا ہی سہی میں نے اتنا کہا ہی تھا کہ نگینہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر تو ایک انجکشن لگا کر چلا گیا ساتھ ہی کہہ گیا اب یہ بہت دیر سوئے گی پھر جب یہ اٹھے تو اس سے معلوم کریں کہ یہ کون سا راز چھپا رہی ہے آپ اس کے ماں باپ ہیں اور بچیاں اپنے والدین سے بہت قریب ہوتی ہیں جب تک یہ اپنا وہ راز نہیں بتائے گی، اس کے ذہن پر اسی طرح بوجھ رہے گا اور اس بوجھ کے ہوتے ہوئے کوئی دوا بھی پوری طرح کام نہیں کر سکے گی۔ ڈاکٹر انجکشن لگانے کے کچھ دیر بعد چلا گیا۔ اور لیزا سو گئی تھی۔

اس کے سونے کے کچھ دیر بعد نگینہ اور ڈرائیور اس بابا کو لے کر آئے تھے۔ وہ ایک عجیب سا افیمی سا شخص تھا۔ عجیب بے ہنگم سی داڑھی بھی تھی کہیں سے تراشیدہ اور کہیں سے بغیر تراش کے۔"

"میڈم یہ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔" نگینہ نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا اور میں خاموشی سے اس بابا کو دیکھتی رہی جنہوں نے گھر میں داخل ہوتے ہی اللہ ہو کی صدا بلند کی تھی اور پھر چاروں کونے میں کچھ کچھ سونگھتے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نگینہ سے کہا کوئلے دہکا کر لا تو نگینہ نے معذرت کر لی۔

"بابا کوئلے تو گھر میں نہیں ہیں۔" نگینہ کا اتنا کہنا تھا

کہ بابا اچانک جلال میں آ گئے۔

''یہ کس طرح کا گھر ہے یہاں کوئلے تک نہیں ہیں۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''بی بی کوئلے تو گھر میں رکھا کریں۔'' میں نے تو جواب نہیں دیا لیکن نگینہ بول پڑی۔

''بابا جب ہر کام گیس سے ہو جاتا ہے تو کوئلے کیوں رکھیں۔'' اور بابا کے جلال میں اور اضافہ ہو گیا۔

''مجھے پہلے بتا دیتیں تو میں کوئلے بھی ساتھ لے آتا۔ آخر پانچ سو کا لوبان بھی تو لایا ہوں۔'' انہوں نے ایک چھوٹی سی پوٹلی اپنے بیگ سے نکالی تھی جو اُن کے کاندھے سے لٹکا ہوا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو بلوایا اور اس سے کہا جلدی سے جا کر کچھ کوئلے لے آؤ۔ ڈرائیور نے پہلے تو مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی ایسی چیز کی فرمائش کر دی ہو جو زمین پر ناپید ہو پھر سر جھکا کر چلا گیا۔

''کتنی دیر میں لاؤ گے؟'' بابا جی نے جاتے ہوئے ڈرائیور کو روک کر پوچھا۔ ''یہی قریب میں اسمبلی کی عمارت کے پیچھے جو آبادی ہے وہاں سے مل جائے گا تمہیں کوئلہ اور سنو پانچ کلو سے کم نہ لانا۔'' بابا جی نے باقاعدہ ہدایات دینی شروع کی تھیں جیسے وہی اس گھر کے مالک ہوں۔

''اب جاؤ اور جلدی سے لے کر آؤ۔'' بابا جی نے ڈرائیور کو ایک اور ہدایت دی۔

جتنی دیر میں کوئلے آتے بابا جی نے کونوں میں جا کر سونگھنے کا عمل جاری رکھا پھر وہ اس کونے میں رک گئے جس کے دوسری طرف لیزا کا کمرا تھا اور پھر وہیں رک کر دیر تک سونگھتے رہے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بہت زبردست سائے کی لپیٹ میں آ گئی ہے آپ کی بیٹی۔'' بابا جی نے کہا۔

''لیکن کوئی بات نہیں ایسے بہت سے دیکھے ہیں۔''

''کیا دیکھیں ہیں؟'' میں سوال کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''ایک بھٹکی ہوئی آتما ہے کسی ہندو بدذات کی۔'' بابا جی نے کہا۔

''بابا جی اب کیا ہوگا؟'' نگینہ نے سوال کیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے، ایک گھنٹے کا عمل ہے اور پھر یہ اس بچی کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔'' بابا جی نے کہا۔

''چھوٹی بی بی ٹھیک تو ہو جائیں گی؟'' نگینہ نے ایک اور سوال کیا۔

''سو فیصد صحیح ہو جائیں گی۔'' بابا جی کے لہجے میں یقین تھا جس سے کچھ دیر کے لیے میں بھی متاثر ہوئی تھی۔

کوئلے آئے اور نگینہ انہیں دہکا کر لے آئی تو بابا جی نے اپنی پوٹلی سے وہ قیمتی لوبان نکالا اور اسے دہکتے ہوئے کوئلوں پر ڈالا۔ فوراً ہی اس میں سے اتنا دھواں نکلا کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ میں نے نگینہ سے کہا یہ درمیانی دروازہ بند کر دو کہیں لیزا اس دھوئیں سے ڈسٹرب نہ ہو۔

''دروازہ بند نہ کرنا۔'' بابا کی گرج سنائی دی تھی۔

''بابا جی بچی سو رہی ہے اس کمرے میں وہ ڈسٹرب ہوگی۔''

''یہ دھواں بچی کو نہیں بدذات کو ڈسٹرب کرے گا اور وہ بچی کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔'' بابا جی کا کہنا تھا اور میں خاموش رہی۔ اگرچہ غصہ تو مجھے بہت آیا تھا کہ ایک مجہول سا بوڑھا میرے گھر میں مجھ پر حکم چلا رہا تھا لیکن اسے ناراض کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتی تھی۔ کوئلے دہکتے رہے اور بابا اس پر لوبان چھڑکتے رہے۔ دھواں اتنا ہو گیا کہ وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا تو تھوڑی دیر میں نگینہ میرے پاس آئی۔ ''بابا جی پوچھ رہے ہیں کہ چھوٹی بی بی نے حال ہی میں کوئی لمبا سفر کیا ہے؟'' تو میں نے جواب میں کہا۔ ''لیزا اور ہمارے پڑوس کے بہن بھائی بائی روڈ کراچی سے اسلام آباد آئے تھے۔'' نگینہ نے یہی بات جا کر انہیں بتائی تو وہ خود باہر آ گئے۔ ''یہ پنڈت وہیں سے آیا ہے۔'' بابا جی نے کہا تھا۔

''مگر ان دونوں کو تو کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے کہا تھا۔

''انہوں نے ایسی کوئی چیز پہنی ہوگی کہ یہ بھٹکی آتما ان سے دور رہی ہوگی۔''

''دونوں کے گلے میں ایک زنجیر نما لاکٹ رہتا ہے۔'' میں نے کہا تھا لڑکے کے گلے میں یا عباس اور بیٹی کے گلے میں یا فاطمہ کے لاکٹ رہتے ہیں۔''

''سید زادے ہیں۔'' بابا جی نے سوال کیا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''سیدزادوں سے بھٹکی ہوئی روحیں دور بھاگتی ہیں۔'' بابا جی نے کہا اور میں مطمئن ہو گئی۔

''بابا جی اب تو لیزا کو کوئی خطرہ نہیں؟''

بابا جی نے کہا۔ ''اب کیسا خطرہ جو خطرہ تھا، وہ میں نے ختم کر دیا ہے بس اب جب وہ بیدار ہو تو اس کے گلے میں یہ دھاگا ڈال دینا پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔'' بابا جی رخصت ہوئے اور نگینہ ان کے ساتھ گئی لیکن کچھ ہی دیر میں واپس آ گئی۔ ''بابا جی کہہ رہے ہیں اپنی بیگم صاحبہ سے کہیں کہ کچھ تو ہدیہ کریں۔'' نگینہ نے کچھ رکتے ہوئے کہا۔

''کتنے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو زیادہ مانگ رہے تھے لیکن انہیں ہزار روپے پر منا کر آئی ہوں۔'' نگینہ نے کہا۔

''تم نے تو کہا تھا بابا جی کسی سے نہ کچھ لیتے ہیں نہ مانگتے ہیں۔'' میں نے کہا تو نگینہ کچھ بوکھلائی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''میں نے جو دیکھا تھا وہی بیان کیا تھا۔'' نگینہ نے رکتے رکتے کہا۔

''اور اب تم نے یہ بھی دیکھ لیا۔'' میں نے کہا۔ میرے لہجے میں اس کے لیے ڈانٹ بھی تھی لیکن ساتھ ہی ڈرائیور کو بلایا کہ بابا جی کو وہاں چھوڑ آؤ اور نگینہ کو واپس لے آنا۔'' ڈرائیور سر جھکا کر چلا گیا اور نگینہ اس کے ساتھ ہی گئی تھی اور میں بھی جو کسی حد تک مطمئن ہو گئی تھی اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی اور یہی میری پہلی اور آخری غلطی تھی۔ نگینہ واپس آئی تو مجھے وہاں نہ پا کر جہاں وہ مجھے چھوڑ کر گئی نہ پایا تو سیدھے اوپر میرے پاس آئی۔

''بیگم صاحبہ'' اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''بی بی صاحبہ، وہ چھوٹی .... بی بی صاحبہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔''

''میں اوپر آئی تو وہ سو رہی تھی۔ یہ اچانک کہاں چلی گئی؟'' میں نے کہا تو نگینہ نے کہا۔

''بیگم صاحبہ کار بھی نہیں ہے۔'' میں بھاگی بھاگی نیچے آئی تو واقعی لیزا بستر پر نہیں تھی۔ میں نے چوکیدار کو بلوایا تو اس نے بتایا۔

''بی بی وہ چھوٹی بی بی نے کار نکالی اور تیزی سے نکل گئی تھیں۔ میں نے کار کے سامنے آ کر انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کار مجھ پر چڑھا دی تو میں ہٹ گیا۔'' چوکیدار کے بیان کے بعد میں نے لیزا کے نمبر پر فون کرنا شروع کیا مگر ہر بار یہی جواب ملتا تھا کہ آپ کے مطلوبہ نمبروں سے رابطہ ممکن نہیں۔ کئی بار اس طرح کے فقرے سننے کے بعد میں نے لیزا کے ڈیڈی سے رابطہ کیا۔ انہوں نے جو جواب دیا۔ اسے سن کے میں وہیں دھڑام سے گر گئی۔''

ابھی آنٹی یہیں تک پہنچی تھیں کہ نگینہ نے آ کر بتایا، وہ خاتون آئی ہیں جو پرسوں بھی آئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی ہے۔'' یہ سنتے ہی آنٹی اپنی جگہ سے اٹھ کے چلی

سُکھی گھرانہ

بیوی: دیکھو ناں، ہمارے پڑوسی نے 50 انچ کا LED ٹی وی خریدا ہے آپ بھی خرید لائیے ناں.....؟

شوہر: ارے ڈارلنگ جس کے پاس تم جیسی خوبصورت بیوی ہو......وہ کیوں کر فالتو کا وقت TV دیکھنے میں برباد کرے گا.....؟

بیوی: ''اوہ آپ بھی ناں......ابھی آپ کے لیے پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔''

بیوی: ''آپ میری سالگرہ کا دن کیسے بھول گئے۔''

شوہر: ''بھلا تمہاری سالگرہ کا دن کوئی کیسے یاد رکھے تمہیں دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا کہ تمہاری عمر بڑھ رہی ہے......!''

بیوی: (آنسو پونچھتے ہوئے) ''سچی......آپ کے لیے کھیر بنا کر آتی ہوں۔''

(شوہر بیوی میں جھگڑا ہو رہا تھا)

بیوی: ''میں پورا گھر سنبھالتی ہوں، کچن کو سنبھالتی ہوں، بچوں کو سنبھالتی ہوں، تم کیا کرتے ہو......؟''

شوہر: ''میں خود کو سنبھالتا ہوں......تمہاری نشیلی آنکھیں دیکھ کر......''

بیوی: ''آپ بھی ناں......

''چلو بتاؤ آج کیا بناؤں آپ کی پسند کا......؟''

ایک سکھی گھرانے کے آزمودہ فارمولے

سیالکوٹ سے طاہر محمود کے فارمولے

گئیں۔ ڈونا بھی اٹھ گئی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف چل دی۔ یہ ایک لمبی سی گلی تھی جو گھر کے پچھلی طرف نکلتی تھی پھر کچن کے راستے ہم دونوں دوبارہ گھر میں آئے لیکن ڈونا رکی نہیں اور نہ ہی اس نے میرا ہاتھ چھوڑا۔ وہ مجھے لے کر اس کمرے میں آئی تھی جس کا ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب کچھ تو کم کر دیں۔'' مجھے خاتون کی آواز آئی۔

''فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔'' لیزا کی والدہ کی آواز آئی۔

''آپ کو رقم عزیز ہے یا اپنے خاندان کی عزت۔'' ان کی آواز میں تکبر تھا۔

''ظاہر ہے خاندان کی عزت۔'' وہی آواز دوبارہ آئی۔ چند لمحوں بعد اس عورت نے پوچھا۔

''تو کل میں کس وقت آؤں؟'' اس نے کہا۔

''صبح گیارہ بجے تک آ جائیں۔'' آنٹی نے سرد انداز میں کہا۔

''تو آپ ہماری بکنگ کر لیجیے گا۔'' اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میں نے صوفے کھسکنے کی آوازیں سُنیں۔ ڈونا مجھے وہاں سے نکال کر واپس اسی کمرے میں لے آئی جہاں ہم پہلے موجود تھے۔

''یہ سب کیا تھا؟'' میں نے ڈونا سے سوال کیا۔

''ایک گائناکولوجسٹ کی اپنے کلائنٹ سے گفتگو تھی، تم اتنے نادان تو نہیں ہو۔'' ڈونا نے کہا۔

''میرا سوال یہ نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آنٹی نے یہ سب کب سے شروع کیا، کراچی میں تو ایسی نہیں تھیں وہ۔'' میں نے کہا اور ڈونا کے چہرے پر ایک نامعلوم سی مسکراہٹ آ گئی۔

''میں یہ تو نہیں جانتی کہ انہوں نے کب سے یہ کام شروع کیا ہے یا کراچی میں یہ کیسی تھیں۔ ڈونا نے کہا۔'' مجھے تو آئے ہوئے چند دن ہوئے ہیں لیکن اتنا میں نے ضرور پڑھا ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں اس فقرے کا مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہیں تفصیل سے سمجھاتی ہوں۔'' ڈونا نے کہنا شروع کیا۔ ''اتنا تو تم جانتے ہو کہ لیزا میری کزن تھی یعنی خالہ کی بیٹی تھی۔''

لیزا کی ماں میری والدہ کی چھوٹی بہن ہیں۔'' ڈونا نے کہا اور چند لمحوں کے لیے رک گئی۔

''آنٹی کی ایک ہی شادی ہے لیکن میری ماں نے چھ ماہ میں تین شادیاں کیں۔'' ڈونا نے دوبارہ سے کہنا شروع کیا۔

''یعنی ہر شوہر کے ساتھ دو ماہ۔'' میں مسکرایا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' ڈونا نے تردید کی۔

''امی کی پہلی طلاق میری وجہ سے ہوئی تھی۔'' ڈونا نے کہا۔

''کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔'' میں نے کہا اور ڈونا مسکرا دی۔

''پہیلیاں نہیں بجھوا رہی ہوں، وہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں جو حقیقت ہے لیکن جسے نہ لیزا کے ذہن نے قبول کیا نہ اس کی ماں مان رہی ہے۔'' ڈونا نے عجیب سے لہجے میں کہا مگر ابھی وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ لیزا کی والدہ واپس آ گئیں۔

''ہاں تو ہم کہاں تھے؟'' انہوں نے آتے ہی سوال کیا۔

''آپ اُس وقت یہ بتا رہی تھیں کہ آپ نے انکل کو فون کیا۔''

''وہ کمپیوٹر اور موبائل کے استعمال میں بہت آگے تھے مگر جب تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ لیزا کی لاش کار میں پھنسی ہوئی تھی پھر ان کے سامنے ہی کار کے دروازے کاٹے گئے اور لیزا کی میت اسپتال پہنچائی گئی۔ اسپتال جاتے ہوئے ہی انہوں نے مجھے فون کیا کہ سب ختم ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھالا اور ڈرائیور کو لے کر اسپتال پہنچی۔'' آنٹی نے کہا۔

''وہاں میرا اور تمہارے انکل کا اس طویل رفاقت میں پہلا اختلاف ہوا تھا۔ تمہارے انکل پوسٹ مارٹم کروانے کے حق میں نہیں تھے جبکہ میں پوسٹ مارٹم کروانے کے حق میں تھی۔''

''میں عینی شاہدین سے مل چکا ہوں، ان سب کا کہنا یہ تھا کہ ٹینکر بائیں جانب کھڑا تھا کہ یہ کار جسے یہ لڑکی چلا رہی تھی، اس نے ٹینکر کو بُری طرح ہٹ کیا تھا۔'' تمہارے انکل کا کہنا تھا جبکہ میری دلیل یہی تھی کہ میں ڈاکٹر ہوں اور ہم نے یہ پڑھا ہے کہ موت کی ظاہری وجہ کوئی بھی ہو پوسٹ مارٹم لازمی ہوتا ہے لیکن کاش میں وہ پوسٹ مارٹم نہ کرواتی۔''

''ایسی کیا بات ہوئی کہ آپ پوسٹ مارٹم کروانے پر پچھتا رہی ہیں آنٹی؟'' ڈونا نے سوال کیا۔

''جس نے پوسٹ مارٹم کیا، وہ ایک خاتون تھی اور پولیس سرجن سے پہلے اس نے میرے انڈر کچھ دن کام کیا

تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تو اس نے یہی لکھا تھا کہ دماغ پر شدید چوٹ آنے سے موت ہوئی ہے لیکن آہستہ سے اس نے مجھے بتایا کہ موت کے وقت تمہاری بیٹی کنواری نہیں تھی۔'' آنٹی نے کہا۔

''اور آپ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کی ہلاکت حادثے کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس نے خودکشی کی ہے؟''

''میں بتا چکی ہوں کہ سائیکاٹرسٹ نے ہم سے کہا تھا کہ اس کے ذہن پر بہت بڑا بوجھ ہے لیکن وہ شیئر نہیں کر رہی۔ جب تک وہ یہ راز شیئر نہیں کرے گی کوئی دوا اس پر اثر نہیں کرے گی لیکن ہمیں اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ ہم اُسے وہ راز شیئر کرنے پر راضی کر سکتے۔ چار دن پہلے جب میں اس کی الماری کی صفائی کر رہی تھی تو اس کارٹن میں سے جو تم لوگ کراچی سے لائے تھے، ایک ڈائری ملی تھی۔ اُس نے ہم میں سے کسی سے بھی راز شیئر نہیں کیا لیکن اس کی ڈائری نے راز شیئر کر لیا۔''

''کیا تھا اُس ڈائری میں؟'' میرے انداز میں شدت تھی۔

''یہ تمہیں ڈونا بتا سکتی ہے۔'' آنٹی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اچھا سا پیزا کھلاؤ گے تو میں وہ راز تم سے شیئر کرلوں گی۔'' ڈونا بھی اپنی آنٹی کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔

''کھلا دوں گا لیکن......'' میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''چلو پھر......'' ڈونا یہ کہتے ہوئے باہر کی جانب چل پڑی۔ ڈونا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''ہم راحت بیکری پہنچے تو ڈونا نے ہی پیزا اور کولڈ ڈرنک کے آرڈر دیے۔

''اب شروع ہو جاؤ۔'' ڈونا نے پہلا لقمہ ہی لیا کہ میں بول اٹھا۔

''کیا بتاؤں؟'' ڈونا نے سوال کیا۔

''پہلے تو یہ بتاؤ کہ آنٹی نے یہ جو نیا کام شروع کیا ہے، یہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے یہی سوال آنٹی سے کیا تھا تو اُن کا جواب تھا کہ لیزا کے ذہن پر جو دباؤ تھا، وہ میں نہیں چاہتی کسی اور لڑکی کے ذہن پر رہے اس لیے سب کچھ جانتے ہوئے وہ یہ کر رہی ہیں۔'' ڈونا کا جواب تھا۔

''اور وہ دباؤ کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم نے اکثر سنا اور پڑھا ہے کہ معصوم بچوں اور بچیوں کو سب سے بڑا خطرہ قریبی قابلِ بھروسا رشتے داروں اور ملازمین سے ہوتا ہے۔ یہ خطرات مغرب میں زیادہ اور مشرق میں کم ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں اور لیزا ایک ہی شخص کا شکار ہوئی تھیں۔ میں نے پاپا کو بتا دیا اور پاپا نے نانا کو دس منٹ میں گھر خالی کرنے کے لیے کہا اور نانا کہتے رہ گئے کہ وہ رات کے اس پہر لندن میں کہاں جائیں گے مگر پاپا نے کہا جو کچھ آپ نے کیا ہے، یہ اس کی کم سے کم سزا ہے۔ مما نے اس پر وہ ردِعمل دیا جو شاید انہیں نہیں دینا چاہیے تھا پھر یہ بات اتنی بڑھی کہ پاپا اور مما میں علیحدگی ہو گئی۔'' ڈونا نے کہا۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جب میں کم عمر تھی اور نانا لندن آئے ہوئے تھے کسی سرکاری دورے پر اور اُن کا قیام ہمارے گھر پر ہی تھا۔''

''انہوں نے کیا حرکت کی تھی؟'' میں نے کہا۔

''پاپا اور مما صبح سویرے اپنے اپنے دفاتر چلے جاتے اور میں اسکول چلی جاتی تھی۔ مما اور پاپا کی واپسی شام چھ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی اور میں چار بجے تک گھر آجاتی تھی۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا میں اپنے کمرے میں یونیفارم تبدیل کر رہی تھی کہ نانا وہاں آگئے۔ میں آدھے کپڑے تبدیل کر چکی تھی کہ وہ آگے بڑھے اور مجھے گود میں لے لیا۔ شروع میں تو میں کچھ نہیں سمجھی لیکن جب انہوں نے نازیبا حرکتیں شروع کیں تو میں نے انہیں دھکا دے دیا۔ وہ گرے تو نہیں لیکن میں اُن کی گرفت سے نکل آئی۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' نانا نے سوال کیا اور میں کھول اٹھی۔

''آپ کو شرم نہیں آتی ایسی گندی حرکت کرتے؟'' میں نے کہا۔

''میں نے ایسا کیا کیا ہے؟'' نانا نے بے غیرتی سے کہا تھا۔

''یہ بھی میں بتاؤں کہ آپ نے کیا کیا ہے؟'' میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا تھا۔

''میں آپ کی شکایت کروں گی۔'' میں نے کہا اور وہاں سے نکل آئی لیکن ہوا یہ کہ مما معمول سے پہلے آگئیں اور نانا نے اپنی بیٹی سے میری شکایت کر دی اور وہ مجھ پر ناراض ہونے لگیں۔ میں نے کہا آپ نہیں سنیں گی تو میں پاپا

سے شکایت کر دوں گی مگر انہوں نے کہا میں تو صرف اُن کی بیٹی ہوں لیکن آج جو تمہارے پاپا ہیں اس کے پیچھے میرے والد کا سرمایہ ہے جس رقم سے انہوں نے کاروبار شروع کیا، وہ ابتدائی سرمایہ میرے والد نے دیا تھا۔''

ان کے اس طرح کہنے پر میں خوف زدہ ہو گئی تھی لیکن پاپا ابھی کار سے اترے بھی نہیں تھے کہ میں ان کے پاس پہنچ گئی اور پاپا غصے سے لال ہو گئے۔ وہ مما کو آواز دیتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے اور پھر جیسے ہی مما ان کے سامنے آئیں تو پاپا نے کہا اپنے باپ سے کہو فوراً یہاں سے چلے جائیں۔''

مما نے مجھے یوں گھورا جیسے میں نے کوئی بڑا گناہ کر دیا ہو۔ ''آپ ایک بچی کی بات کا یقین کر کے ایسا فیصلہ کر رہے ہیں۔'' مما نے اعتراض کیا اور پاپا مزید بھڑک گئے۔

''کیا تم نے نہیں سنا کہ قریبی اور قابلِ اعتماد لوگ ہی سب سے بڑا خطرہ ہوتے ہیں۔'' پاپا نے کہا۔

''آپ آرام سے میرے والد سے بات تو کر سکتے ہیں۔'' مما نے کہا۔

''تم مجھے اتنا بے غیرت سمجھتی ہو کہ میں اس پر بات کروں گا۔'' پاپا نے کہا۔ ''شکر کرو کہ وہ میرے سامنے نہیں ہے ورنہ......'' پاپا غصے سے کانپ رہے تھے۔

''ورنہ کیا آپ انہیں قتل کر دیتے؟'' مما نے کہا۔

''میں نے جو کہا ہے، وہ اپنے باپ سے کہہ دو ورنہ میں پولیس بلوالوں گا۔'' پاپا نے کہا۔

مما اس کے بعد بھی خاموش نہیں ہوئیں۔ ''میرے باپ اس گھر سے گئے تو میں بھی تم سے طلاق لے لوں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے تم ابھی اور اسی وقت اپنے باپ کے ساتھ جا سکتی ہو۔'' پاپا نے کہا تھا اور پھر کچھ دیر بعد مما کے والد نے ہمارا گھر چھوڑ دیا۔ مما ان کے ساتھ نہیں گئیں لیکن اپنی ایک دوست کو فون کر کے بلوالیا اور نانا، مما کی اس دوست کے گھر شفٹ کر گئے۔''

''تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو، میرا سوال تو کچھ اور تھا اور جس کے لیے میں نے تمہیں پیزا کھلایا اور کولڈ ڈرنک پلائی ہے۔''

''میں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں کہ کچھ اسی طرح کی کیفیت سے لیزا ابھی گزری تھی۔ میں نے تو شکایت کی اور پاپا نے اس پر کارروائی بھی کی لیکن لیزا نے اس معاملے کو چھپا کر رکھا اور ان کی ہمتیں اتنی بڑھیں کہ وہ اپنی سب سے قیمتی شے کھونے کے بعد بھی خاموش رہی۔''

''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''لیزا کی اس ڈائری سے جو اس کے کارٹن سے نکلی تھی جس میں اس نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کے ساتھ کب کیا ہوا تھا۔'' ڈونا نے کہا۔

''اب سے پہلے کیا لیزا سے تمہاری بات ہوئی تھی؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

ڈونا کچھ سوچ میں ڈوب گئی۔

''اس وقت جب لیزا ضد کر کے تمہارے یہاں رکی تھی، اس سے ایک روز قبل میری بات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ بھی تمام بات اپنی ممی اور پاپا سے کر لے لیکن اس نے کہا، تم چاہتی ہو کہ میرے والدین میں بھی تمہارے والدین کی طرح علیحدگی ہو جو میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی۔'' لیزا نے کہا تھا۔

''ضروری تو نہیں تھا کہ ویسا ہی ہوتا جو لیزا نے یہ بات سب سے راز میں رکھی۔'' میں نے کہا۔

''آنٹی نے جس خاتون کو کل بلایا ہے، وہ کام کہاں کریں گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''جس کمرے میں ہم موجود تھے اور جہاں سے باتیں سنی تھیں اس پر غور نہیں کیا تھا۔'' ڈونا نے جواب میں کہا۔

''ایک بیڈ تھا جیسا اسپتالوں میں ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ مشینیں نہیں دیکھیں... جس سے ہر کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔'' ڈونا نے کہا۔

''کیا لیزا کے والد یہ سب جانتے ہیں؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''یہ بتاؤ کہ کیسے ممکن ہے کہ بیوی اتنے بڑے غیر قانونی کام کر رہی ہو اور شوہر لاعلم ہو؟'' ڈونا کا جواب تھا۔

''کیا وہ بھی......'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا لیکن ڈونا میرا مطلب سمجھ گئی۔

''پیسے کی ہوس ایسی چیز ہے کہ کوئی شخص اس کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔'' ڈونا نے کہا۔

''تو کیا تم بھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''فی الحال تو میری تمام توجہ تعلیم کی طرف ہے لیکن شاید مستقبل میں بھی اس طرح کے کام نہ کروں۔'' ڈونا نے

تیزی سے کہا۔

''میری مرحومہ والدہ بہت کچھ چھوڑ گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے اور تیسرے شوہروں نے بھی بہت کچھ چھوڑا ہے۔ خاص طور پر ان کے دوسرے شوہر نے جو پاکستانی تھے اور کنسٹرکشن کے بزنس سے وابستہ تھے۔ انہوں نے مجھے بیٹی کا پیار دیا تھا۔''

''تم نے اپنے ان والد سے کیا سیکھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ جو اردو بول رہی ہوں، یہ سب ان کی عنایت ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مجھے نماز سکھائی اور قرآن پڑھایا۔ اب میں تین چوتھائی مسلمان ہوں۔''

''مکمل مسلمان کب تک ہو جاؤ گی؟'' میں نے کہا اور ڈونا نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

''میں نے تم سے سوال کیا تھا جس کا جواب اب تک تم نے نہیں دیا۔''

''میں تو سوال ہی بھول گیا۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تم سے سوال کیا تھا جس کے جواب میں آنٹی نے مجھے لیکچر سنا دیا تھا کہ ہر علاقے کی تہذیب ہوتی ہے، کلچر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔'' ڈونا نے کہا اور میرے ذہن میں ڈونا کا سوال تازہ ہو گیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، میرا جواب کیا ہونا چاہیے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیا میں لیزا سے بری ہوں؟'' ڈونا نے سوال کیا۔

''آپ نے خود کہا تھا کہ میں لیزا کی تقریباً ہم شکل ہوں۔ بعد میں جو فرق آپ نے میرے اور لیزا میں بتائے تھے، وہ بھی مجھے اُس سے سپیریئر بنا رہے تھے۔''

''اگر میں انکار کر دوں تو......؟'' میں نے کہا اور ڈونا کا مسکراتا ہوا چہرے اچانک تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

''ایک اور فرق جو تم میں اور لیزا میں ہے وہ یہ کہ لیزا کے ساتھ جو زیادتی ہوتی رہی اس کے باوجود اس میں نسوانی حُسن کی کمی تھی لیکن تم میں وہ کمی بھی نہیں ہے مگر......'' میں نے بات مکمل نہیں کی۔

''تو کیا؟'' ڈونا بولی۔

''یہ کہ تم نے کہا تھا کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔''

''اس سے کیا مطلب ہے؟'' ڈونا کا سوال تھا۔

''اس کا مطلب یہ کہ میں تم سے شادی نہیں کر رہا۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں سفیر مرحوم کی قسم کھا کر یقین دلاؤں تو......'' ڈونا نے کہا۔

''یہ کون ذات شریف ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میری ماں کے دوسرے شوہر تھے۔ جن کا سوگ میں نے اس طرح منایا تھا کہ ان کی سگی بیٹی ہوتی تو وہ بھی نہ مناتی۔'' ڈونا نے کہا۔

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟'' میں نے کہا اور ڈونا مسکرانے لگی۔

''ایسا ہوا تو میں آپ کو قتل کرنے کی زحمت نہیں دوں گی بلکہ خود کو رہنے نہیں دوں گی۔''

''میں امید کرتا ہوں کہ تمہیں اپنی یہ بات یاد رہے گی۔'' میں نے کہا اور ڈونا کا چہرہ روشن ہو گیا اور وہ مسکرانے لگی۔

''اگر ہم اس وقت مجمع میں نہ ہوتے میں تمہارے گلے لگ جاتی یا تمہیں گلے لگا لیتی۔'' ڈونا نے کہا۔

''ایک اور بات میں کلیئر کر دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' ڈونا نے سوال کیا۔

''جب ہم شادی کر لیں گے تو تم یو کے کو الوداع کہہ کر پاکستان آ جاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

''ضرور آ جاؤں گی۔'' ڈونا نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر کہا تھا۔

''مگر یہاں کارڈیک فزیشن کا کوئی اسکوپ ہے؟'' ڈونا نے سوال کیا۔

''تم آئندہ کے لیے دل کے امراض کی ماہر بننا چاہتی ہو؟'' میں نے کہا اور ڈونا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرا ارادہ کارڈیک سرجری میں پوسٹ گریجویشن کا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرے بہنوئی کا امریکا میں اسپتال ہے وہ بھی کارڈیک سرجن ہیں۔ ہم پاکستان میں اپنا اسپتال بنا لیں گے۔''

''سرمایہ کہاں سے آئے گا؟'' ڈونا نے کہا۔

''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہاری والدہ اور ان کے دوسرے شوہر بہت کچھ چھوڑ کر گئے ہیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''کچھ رقم میں اپنے پاپا سے بھی منگوا سکتی ہوں۔''

''تم سے ملاقات تو اب ہوئی ہے، تم یہ منصوبہ بندی پہلے سے کر چکی تھیں۔''

''سچ کہوں تو لیزا کی موت کے ساتھ ہی میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا۔'' ڈونا نے بتایا۔

''وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی جبکہ میرا میڈیکل میں داخلہ ہو چکا تھا۔''

''لیزا تو رزلٹ آنے سے پہلے ہی حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔ جتنے اچھے اس کے مارکس تھے تو اس کا بھی میڈیکل میں داخلہ ہو جاتا۔''

☆☆☆

ہم واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تو میں نے ڈرائیونگ کرتی ہوئی ڈونا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ایک دن مزید اسلام آباد میں رہ کر میں کراچی واپس آ گیا۔ ڈونا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لندن جاتے ہوئے کراچی میں رکے گی۔ میں نے یہ بات امی کو بتائی تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ ہفتہ بھر بعد ڈونا کراچی آئی تو میں اسے لینے ائرپورٹ گیا۔ میرے کمرے میں اپنی تصویر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ امی اور ابا نے بھی اس کا بھرپور استقبال کیا تھا۔ پھر جس روز اسے لندن جانا تھا، اس نے اسلام بھی قبول کر لیا۔ وہ صبح اٹھ کر فجر پڑھتی تھی اور پھر نماز کے بعد وہ ایک پارہ ضرور پڑھتی تھی۔

امی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ان کی تو جیسے لاٹری نکل آئی ہو پھر یہ خبر اپیا کو بھی دے دی گئی اور انہوں نے کہا۔ ''پہلے ڈاکٹر بن جا پھر شادی کے چکر میں پڑنا۔'' اپیا اپنی عادت سے باز نہیں آئی تھیں لیکن اس کے ساتھ وہ بھی خوش ہوئیں۔ جب امی نے بتایا کہ ڈونا تمام کھانے بڑی مہارت سے بناتی ہے۔

''چلو اب میرا بھائی بھوکا تو نہیں رہے گا۔'' اپیا کا تبصرہ تھا۔

میرے میڈیکل کا رزلٹ آیا تو اپیا اور ارشد بھائی دونوں نے زور دیا کہ میں پوسٹ گریجویشن کے لیے امریکا آؤں۔ ڈونا سے بھی انہوں نے بات کر لی تھی اور ڈونا اس کے لیے تیار بھی تھی۔

مجھ سے پہلے ڈونا کا ایڈمیشن سٹی یونیورسٹی آف سائنسز میں ہوا تھا۔ یہ بات نہیں کہ اس کے مارکس مجھ سے اچھے تھے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ ڈونا کی شہریت برطانیہ کی تھی اور میں پاکستانی تھا۔ ہم دونوں امریکا جانے کے لیے بالکل تیار تھے کہ اچانک اپیا نے ایک نیا پنگا لیا۔

''مجھے ان دونوں کی آمد پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ دورانِ پوسٹ گریجویشن میرے گھر پر قیام بھی کر سکتے ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ شادی کے بعد آئیں۔''

''جس ملک میں مرد اور عورت کے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور اسے لونگ ٹوگیدر کا نام دیا جاتا ہے تو آپ یہ اعتراض کیوں کر رہی ہیں؟'' میں نے اپیا سے کہا تھا مگر اس نقار خانے میں میری ایک ہی آواز تھی۔ اپیا کی بات پر سب سے پہلے امی نے پھر ابا نے تصدیق کی اور ڈونا تو روزِ اول سے اس کے لیے تیار تھی اگرچہ اس تجویز کو سب سے آخر میں اس نے تسلیم کیا۔

ڈونا پاکستان آئی۔ اس کے والد بھی اس کے ساتھ تھے۔ پھر ہم دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ نکاح ہمارا اسلامی طریقے سے ہوا تھا۔ لیزا کی والدہ اور والد جو اس شادی میں شریک ہوئے تھے، انہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔

جس ہفتے ہماری شادی ہوئی اسی ہفتے ہم امریکا روانہ ہو گئے۔ نیویارک ائرپورٹ پر اپیا اُن کے شوہر اور پانچ سالہ فاطمہ نے ہمیں ریسیو کیا۔

نیویارک پہنچنے کے اگلے روز سے ہماری کلاسیں شروع ہو گئی تھیں۔ چار برس بعد جب ہم پاکستان واپس آئے تو ڈونا نے مجھے تیار کر لیا کہ ہمیں اسپتال اسلام آباد میں بنانا چاہیے۔ دو مہینے ہمیں اسپتال کے لیے زمین خریدنے اور نقشہ منظور کروانے میں لگے تھے۔

آٹھ ماہ بعد لیزا میموریل اسپتال کا افتتاح ہوا اور دو ماہ میں ہم... بریک ایون پر آ گئے۔ یعنی نفع نہیں تو نقصان بھی نہیں۔ اسپتال کی تعمیر کے دوران لیزا کے والد نے رقم دینے کی پیشکش کی لیکن ہم نے شکریہ کے ساتھ وہ پیشکش منظور نہیں کی۔

''امی اور ابا سے روزانہ ہی بات ہوتی تھی لیکن اُن کا گلہ تھا کہ میں بیوی کا ہو کر انہیں چھوڑ گیا ہوں مگر دو ماہ بعد ان کا یہ گلہ بھی ختم ہو گیا۔ ہم نے ایف 10 میں ہزار گز کا بنگلا لیا اور اوپر کے کمرے ان دونوں کے نام کر دیے۔

امریکا سے واپسی کے سال بھر بعد مریم ہماری زندگی میں آئی اور اس کے اگلے برس شان آ گیا۔ گزشتہ کئی برسوں سے ہم اسلام آباد میں ہیں۔ ہمارا اسپتال خوب چل رہا ہے۔ ابا نے اسپتال کا اکاؤنٹ سنبھال لیا ہے اور امی کی مصروفیات ان کے پوتا پوتی کے گرد گھومتی ہے۔

کبھی ہمیں کسی کانفرنس میں جانا ہو تو ہم بے فکر ہو کر جاتے ہیں۔ ورنہ صبح سے شام تک اسپتال کی مصروفیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی......

خوب صورت زندگی کا سفر یونہی چل رہا ہے۔

❖❖❖

سرورق کی دوسری کہانی

مہلک رفاقتیں

اسما قادری

فن کی دنیا بڑی چکاچوند والی ہوتی ہے... جو لمحوں میں دل و نظر کو خیرہ کردیتی ہے... کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو نہ تو اتنی تیز روشنی میں دیکھنا پسند کرتے ہیں کہ آنکھیں چکاچوند ہو جائیں... اور نہ ہی اتنے اندھیرے میں کہ کوئی چیز نظر ہی نہ آسکے... اندھیرا اجالا... اور دھوپ چھاؤں والی اس دنیا میں بہت بہت سنبھل سنبھل کے قدم بڑھانا پڑتے ہیں... معمولی سی لغزش زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے... ایسے ہی روگ بن جانے والے کرداروں کے چمکتے چہروں کے پیچھے گھناؤنے عکس... جو ہر ننھی کونپل کو نوچنے کے لیے تیار بیٹھے تھے...

آپ کے پسندیدہ پرل گروپ کی آمد تازہ ترین کارنامے کے ساتھ......

”ونٹر وکیشنز کے لیے کیا پروگرام ہے؟“

”کسی کیمپ وغیرہ کے بارے میں تو بالکل مت سوچنا۔ ہم نے دو بار یہ تجربہ کیا اور دونوں بار گڑبڑ ہوگئی۔ ممی نے پہلے ہی سختی سے آرڈر کر دیا ہے کہ اب ہم ایسی کسی ایکٹیوٹی کے بارے میں نہ سوچیں۔ اگر تم لوگوں نے ایسا کوئی پروگرام بنایا بھی تو وہ مجھے تمہارے ساتھ شامل ہونے کی اجازت نہیں دیں گی۔“ مہ پارہ کے کیے سوال کا جواب سب سے پہلے لبنیٰ نے دیا۔ پچھلی بار واقعی وہ بڑی مشکل میں

پھنس گئی تھی اور صرف قسمت ہی تھی کہ اس کی بچت ہوگئی تھی اس لیے اس کے والدین خصوصاً ممی کو اس کے حوالے سے بہت سے تحفظات لاحق ہو چکے تھے۔

''اکلوتی اولاد رکھنے والے والدین ذرا زیادہ ہی حراساں ہوتے ہیں۔ بہر حال میرا ابھی فی الحال دوبارہ یہ تجربہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ پڑھائی کی لف روٹین نے تھکا دیا ہے اور ان تھوڑی سی چھٹیوں میں کوئی ذمے دارانہ کام اپنے سر لینے کے بجائے آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' روشی نے اپنی ناک کو سکیڑ کر پہلے لبنیٰ کی ممی کے رویے پر تبصرہ کیا پھر اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

''پھر کیا کریں، کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بنائیں؟'' مہ پارہ نے پوچھا۔

''گھومنے کے لیے بھی کہاں جاسکتے ہیں یار! ابھی دو تین دن پہلے ہی تو فلو سے جان چھوٹی ہے اور ڈیڈی نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس سیزن میں مجھے بہت احتیاط کرنی ہو گی۔ تم لوگ گھومنے کے لیے سیدھے مری کا رخ کرتے ہو اور میرے اوپر پہلے ہی پابندی لگ چکی ہے۔ اس بار تو ویسے ہی وقت سے پہلے سیزن شروع ہو گیا ہے۔'' لبنیٰ کے لہجے میں بیک وقت بیزاری اور اداسی تھی۔ وہ خود بھی لگائی جانے والی پابندیوں کی وجہ سے تھوڑی سی جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

''اُف یہ اکلوتی دختر نیک اختر اور اس پر سے اس کے ڈیڈی ڈاکٹر...... اب کوئی بتائے کہ ہم کیا کریں۔'' روشی کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

''مذاق سے ہٹ کر مسئلہ تھوڑا سا سنگین ہے۔ ہمارے اپنے شہر کے حالات بھی زیادہ اچھے نہیں چل رہے۔ آج کل کسی چاقو مار بندے کا بھی شور اٹھا ہوا ہے۔ کل ڈیڈی...... مجھے اور عروج کو نصیحت کر رہے تھے کہ کہیں آتے جاتے ہوئے احتیاط سے کام لیں اور اپنے اطراف سے چوکنا رہیں۔ کیونکہ اس شخص کا ٹارگٹ زیادہ تر ملازمت پیشہ خواتین اور طالبات ہی ہیں۔'' مہ پارہ نے کاجو ٹونگتے ہوئے انہیں اپنے والد سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

''چھوڑ یار! ہم تو بچپن سے ہی اس طرح کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ہتھوڑا مار تو کبھی چاقو مار، کبھی چھلاوا گروپ تو کبھی کفن پوش۔ ہر تھوڑے عرصے بعد لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے ایک کہانی نکل ہی آتی ہے۔ آئے دن کی ہڑتالیں، فائرنگ، دھرنے اور بم بلاسٹ الگ اپنی جگہ ہیں۔ اب اگر ہم ان چیزوں سے ڈرتے رہے تو گھر میں بند ہو کر بیٹھنا پڑے گا جو ظاہر ہے کہ ممکن نہیں ہے۔'' روشی نے کان پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں مہ پارہ کی بات کو کاٹا پھر اخبار میں سر دیے بیٹھی عروج کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

''تمہیں کس لندن پلٹ امیر کبیر، حسین وجمیل اور اکلوتے وکنوارے کا رشتہ نظر آ گیا ہے جو اخبار کی جان ہی نہیں چھوڑ رہی ہو؟''

''بندہ تو واقعی حسین وجمیل اور امیر وکبیر ہے۔ کنوارا ہونے کے بارے میں بھی مجھے معلوم ہے بس اکلوتا ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کرنی ہے۔'' عروج نے اخبار سے سر اٹھائے بغیر جواب دیا تو وہ تینوں چونک گئیں۔

''کیا مطلب، کس کا ذکر کر رہی ہو؟'' ماہ پارہ نے بڑی بہن ہونے کے ناتے سب سے پہلے اس سے باز پرس کی۔

''مودی پروڈکشنز والے مرید عرف مودی کا۔ پچھلے ہفتے اسٹائل ایوارڈ کے شو میں دیکھا نہیں تھا اسے کہ کتنا ہینڈسم اینڈ ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ سارے اہم ایوارڈ بھی اسی کی فلم کی ٹیم کو ملے تھے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مودی کو کیا ضرورت پڑی ہے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دینے کی؟'' اب وہ تینوں اسے مشکوک نظروں سے گھور رہی تھیں۔

''میں نے کب کہا کہ اس نے ضرورت رشتہ کا اشتہار دیا ہے۔ وہ اپنی نئی فلم کی کاسٹنگ کے لیے آڈیشن لینے والا ہے اور اسی کے لیے اشتہار دیا ہے۔'' عروج نے اطمینان سے جواب دیا تو ان تینوں نے بھی سکون کا سانس لیا لیکن پھر عروج کے اگلے جملے نے ان کا اطمینان رخصت کر دیا۔

''میں مودی کی فلم کے لیے آڈیشن دینے کا سوچ رہی ہوں۔''

''کیا کہا......؟ فلم کے لیے آڈیشن...... تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟'' اس بار بھی سب سے پہلے ردِعمل دینے والی مہ پارہ ہی تھی۔

''اس میں دماغ چلنے کی کیا بات ہے؟ ایکٹنگ آج کے دور میں ایک اچھا پروفیشن ہے لوگ اسے ایز آ کیریئر اپنا کر بڑے فائدے میں جا رہے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ پروفیشنل ڈگریاں رکھنے والے بھی اپنے پروفیشن چھوڑ کر یہی کام کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس فیلڈ میں جتنا پیسہ اور شہرت ہے، وہ دوسری جگہ سے ملنا بہت مشکل ہے۔'' عروج نے اپنے ارادے کے حق میں مزے سے دلیل دی۔

"تمہارے خیال میں ڈیڈ تمہیں اس کام کی اجازت دے دیں گے؟" مہ پارہ کو اس کے خیالات جان کر صدمہ ہوا۔ باقی دونوں بھی کچھ سکتے کی سی کیفیت میں تھیں۔

"پہلے آڈیشن میں تو پاس ہو جاؤں پھر اجازت بھی لے لوں گی۔ ویسے بھی قانوناً میں بالغ ہوں اور مجھے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ لینے کا اختیار ہے۔" عروج نے بے نیازی سے شانے اُچکا کر جواب دیا تو وہ تینوں ہی باجماعت بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

"ہوش میں آجائیں میڈم! آپ کوئی امریکا یا یورپ میں نہیں ہیں جو اس طرح کی خودمختاری کی باتیں کریں۔ ہمارے ہاں ایسی باتوں کو بغاوت تصور کیا جاتا ہے۔" آخر کار روشی نے اسے ٹوکا۔

"تم لوگ فضول میں اتنی ٹینشن لے رہی ہو۔ مام اور ڈیڈ براڈ مائنڈڈ ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرے اس شوق کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کریں گے۔ ویسے بھی میں کوئی اس فیلڈ کو پروفیشن بنانے نہیں جا رہی ہوں۔ شوق ہے۔ ایک آدھ فلم میں کام کر کے چھوڑ دوں گی۔" عروج کے اطمینان میں ذرا بھی فرق آکر نہیں دے رہا تھا۔

"اوہو...... تم تو یوں بات کر رہی ہو جیسے مودی تمہیں اپنی فلم میں چانس دینے کی آفر کر چکا ہو اور اب بس تمہیں فیصلہ کرنا ہو۔" اس کی اس قدر خوداعتمادی لبنیٰ کو بھی کھٹکی اور اس نے طنز کا تیر چلایا۔

"فلم نہیں تو ڈرامے میں رول مل جائے گا۔ میں نے سنا ہے فلم کی کاسٹ فائنل ہو جانے کے بعد آڈیشن کے لیے آنے والوں میں سے اچھے ایکٹرز سلیکٹ کر کے انہیں ڈرامے میں چانس دے دیا جاتا ہے۔" وہ جس طرح بات کر رہی تھی اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ صرف اشتہار دیکھ کر جاگنے والا شوق نہیں بلکہ وہ پہلے ہی سے اس بارے میں سوچتی رہی ہے۔

"اوکے، تم دے دو آڈیشن۔ مجھے یقین ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔" اسے اپنے ارادے میں اٹل پا کر مہ پارہ نے دل جلے انداز میں تبصرہ کیا۔ جواب میں عروج محض پُراسرار انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔ اس کے اس انداز پر وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ عروج نے جو شوشہ چھوڑا تھا اس کے بعد وہ آنے والی موسم سرما کی تعطیلات کے لیے کوئی پروگرام بنانے کا خیال قطعی فراموش کر چکی تھیں۔

☆☆☆

"یہ کیسے کیسے نمونوں کو کال کر لیتے ہو یار تم۔ میں فلم کی ہیروئن کے لیے آڈیشن لے رہا ہوں، کسی کوکنگ شو کی میزبان کے لیے نہیں جو ایسی ایسی چیزوں کو برداشت کرتا پھروں۔"

اچھی تراش خراش کے ٹراؤزر اور کرتی میں ملبوس شانے پر دوپٹا لٹکائے عروج جیسے ہی اسپاٹ لائٹ کے نیچے آکر کھڑی ہوئی، کمرے کے نیم روشن حصے میں موجود مودی نے جسے لوگ اکثر "مسٹر موڈی" بھی کہا کرتے تھے بیزاری سے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ عروج نے بھی سُن لی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہاں آڈیشن کے لیے آئی ہوئی لڑکیوں میں سے وہ واحد تھی جو مشرقی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس بات کو اس کی لاکھ مخالفت کے باوجود اس کے ساتھ آنے والی تینوں دوستوں نے پہلے ہی باور کرا دیا تھا۔ مودی کی فلموں کی ہیروئن بلکہ تقریباً تمام فی میل کاسٹ میں یہ قدرِ مشترک تھی کہ انہیں بہت ماڈرن بلکہ بے باک ملبوسات استعمال کروائے جاتے تھے۔ جینز اور ٹی شرٹ کی حد تک تو وہ چاروں بھی مغربی لباس کا استعمال کر لیتی تھیں لیکن ایسی بے باکی کا تصور نہیں تھا جس میں منی اسکرٹ، ٹاپ لیس اور بیک لیس جیسی چیزوں کی گنجائش نکل آتی۔

"نہیں مس سارہ نے ریفر کیا تھا سر۔" اسسٹنٹ نے اپنی جان بچانے کے لیے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی تو مودی نے اس کی تو جاں بخشی کر دی اور براہِ راست سرخ چہرہ لیے کھڑی عروج سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آپ نے سارہ سے سفارش کرائی تھی تو اس سے کوئی ڈھنگ کا لباس بھی لے کر پہن لیتیں۔ سارہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اپنی فلم کی ہیروئن کو کیسے ڈریس اپ کرواتا ہوں۔"

"سوری سر...... مجھے سارہ نے آفر کی تھی لیکن میں نے وہی پہنا جو میں پہن سکتی ہوں۔ ایکچوئلی میں فلم کرنے میں زیادہ انٹرسٹڈ بھی نہیں ہوں بس اس لیے آڈیشن دینے آگئی تھی کہ سنا تھا فلم کی کاسٹ سے بچ جانے والی اچھی ایکٹریسز کو آپ کا پروڈکشن ہاؤس ڈرامے میں چانس دے دیتا ہے۔" دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا کہ اپنے سامنے کھڑے خوب صورت، ہینڈسم اور مغرور مودی کو کچا چبا جائے لیکن اپنی شاندار بے عزتی کو پی کر لہجے کو نرم بلکہ قدرے خوشامدانہ رکھا اور اپنے مطلب کی بات پر آگئی۔

"ہٹاؤ یار اسے یہاں سے اور بوبی کے حوالے کرو۔

خواہ مخواہ میرا ٹائم ویسٹ کررہی ہے۔'' مودی نے اس بار بھی اس کی بے عزتی کرنے میں کسر نہ چھوڑی اور نخوت سے حکم دیا۔ اس ساری بے عزتی میں مثبت پہلو بس یہی تھا کہ وہ اسے دھکے دے کر باہر نکلوانے کے بجائے کسی بوبی کے پاس بھجوا رہا تھا اور ایسا یقیناً صرف اس لیے تھا کہ وہ سارہ کی سفارش کے ساتھ آئی تھی۔ سارہ ڈریس ڈیزائنر تھی اور مودی کی فلموں کا وارڈ روب اسی کے ذمّے ہوتا تھا۔ سننے میں یہاں تک آیا تھا کہ اس کا مودی سے افیئر چل رہا ہے اور وہ اس کی غیر اعلانیہ منگیتر ہے۔ عروج نے بڑی جدوجہد کر کے سارہ کی سفارش حاصل کی تھی اور شکر کررہی تھی کہ وہ اس سفارش کے ساتھ آئی تھی ورنہ وہ مغرور اور اکھڑ شخص تو شاید اسے کھڑکی سے ہی باہر پھنکوا دیتا۔ اس نے کوشش کی کہ اندر ہونے والی بے عزتی کے اثرات چہرے پر ساتھ لے کر باہر نہ جائے پھر بھی رگ رگ سے واقف سہیلیوں اور سگی بہن سے کچھ چھپانا آسان نہیں تھا۔

''کیا ہوا؟ اس نے تمہیں ریجیکٹ کردیا۔'' اس کے باہر نکلتے ہی انہوں نے تاڑ لیا اور خوشی سے چہکیں۔

''کوئی نہیں۔ وہ مجھے اپنے پروڈکشن ہاؤس سے بننے والے ڈرامے میں کاسٹ کرنے میں انٹرسٹڈ ہے اور دو دن بعد مجھے وہاں آڈیشن کے لیے جانا ہے۔'' اس نے مٹھی کھول کر وہ کارڈ ان کے سامنے کیا جو مودی کے اسسٹنٹ نے کچھ ہدایات کے ساتھ اس کے حوالے کیا تھا۔ ان تینوں نے کارڈ پر لکھا نام اور ایڈریس دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور دو دن بعد نئی خواری کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے لگیں۔ عروج کے شوق سے لاکھ اختلاف کے باوجود وہ اس کا ساتھ بہر حال نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ چنانچہ دو دن بعد اس کے ساتھ ایک نئی جگہ پر موجود تھیں۔

''سب سے پہلے آپ سب اپنے موبائل فونز جمع کروا دیں۔ آڈیشن کے دوران موبائل فون الاؤ نہیں ہے۔'' اس بڑے سے ہال میں تقریباً چالیس پینتالیس لڑکیاں موجود تھیں اور آپس میں گپ شپ لگانے کے ساتھ ساتھ گاہے گاہے اپنی نوک پلک بھی سنوارتی جارہی تھیں۔ آنے والے نے فرنٹ پر کھڑے ہوکر بلند آواز میں اعلان کرتے ہوئے حکم دیا تو سب ہی تھوڑی حیرت زدہ نظر آنے لگیں۔

''یہ کیا بات ہوئی بھئی! موبائل جمع کروانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کیوں اپنا موبائل جمع کروائیں؟ کھو گیا تو کون ذمّے دار ہوگا؟ کوئی مسئلہ ہے تو ہم آف کر کے اپنے پرس میں رکھ لیتے ہیں۔'' حیرت کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ لڑکیوں کو اپنے موبائلز جمع کروانے پر بہت سے تحفظات تھے۔

''جس کو اعتراض ہے وہ یہاں سے جا سکتا ہے۔ ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا اصول ہے نو موبائل۔'' آڈیشن تو کیا ہم ریکارڈنگ کے دوران بھی موبائل الاؤ نہیں کرتے اس لیے جو ہمارے ساتھ کام کرنے کی خواہش رکھتا ہے وہ اچھی طرح سوچ لے۔ باقی آپ کے موبائلز کی بحفاظت واپسی کی میں گارنٹی دیتا ہوں اگر بالفرض کسی کا موبائل کھو گیا یا اسے کوئی نقصان پہنچا تو ہم نقصان پورا کرنے کے ذمّے دار ہوں گے۔'' اٹھنے والے اعتراضات کا اس نے نہایت سکون سے جواب دیا۔ اس کے اس اعلان کے بعد لڑکیاں خاموش ہوگئیں پھر ایک ایک کر کے میز کرسی سنبھالے بیٹھے ایک شخص کے پاس اپنے موبائل جمع کروانے لگیں۔ وہ شخص ہر لڑکی کا نام پتا معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے موبائل کی باقاعدہ فوٹو بھی لے رہا تھا تاکہ واپسی کے وقت مشکل نہ ہو۔ عروج نے بھی اپنا موبائل جمع کروا دیا۔ اس سمیت ہر لڑکی نے یہ مطالبہ منظور کرلیا تھا اور ایک بھی واپس نہیں گئی تھی۔

''آپ لوگ بھی اپنے موبائلز جمع کروا دیں۔'' ساری لڑکیاں اپنے موبائل جمع کروا چکی تھیں۔ مہ پارہ، روشی اور لبنیٰ سے بھی مطالبہ کیا گیا۔

''ہم آڈیشن کے لیے نہیں آئے۔ ہم صرف اپنی فرینڈ کے ساتھ ہیں۔'' روشی نے جواب دیا۔

''جو بھی ہے۔ اگر آپ کو یہاں رہنا ہے تو موبائل دینا ہوگا۔'' اس شخص نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''دے دو یار! تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔'' عروج نے یوں عاجزی سے درخواست کی کہ ناچار انہیں اس کی بات ماننی پڑی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر یہ شوق اس انتہا پر موجود ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ انہیں بھی خوار کروانے میں حرج نہیں سمجھ رہی۔

''ان سب کو اندر لاکر میں حفاظت سے رکھ دو اشعر۔ واپسی میں سب کو ایک ساتھ واپس کردینا۔'' جس بندے نے موبائل جمع کروانے کا حکم دیا تھا اسی نے میز کرسی سنبھالے بیٹھے بندے سے کہا تو وہ پلاسٹک کے ایک مضبوط بیگ میں جمع کیے گئے موبائلز لے کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ پانچ منٹ کے اندر ہی اس کی واپسی ہوگئی۔ اس کی واپسی کے ساتھ ہی آڈیشن کے لیے بلائے جانے کا سلسلہ شروع

ہو گیا۔ جس شخص نے موبائل جمع کروانے کا حکم دیا تھا وہ آڈیشن لینے والی ٹیم میں شامل تھا جبکہ اشعر نامی شخص ایک ایک لڑکی کا نام کال کر کے باری باری آڈیشن کے لیے بھیج رہا تھا۔ آڈیشن کے بعد بھی لڑکیوں کو واپس نہیں بھیجا جا رہا تھا۔ بلکہ انہیں یہ کہہ کر انتظار میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا تھا کہ آڈیشن ختم ہونے پر سلیکٹ ہونے والیوں کے نام ایک ساتھ اناؤنس کیے جائیں گے۔ ہال ائرکنڈیشنڈ تھا، نشستیں کشادہ اور آرام دہ تھیں اور اُمیدواروں کے لیے فراغ دلی سے مشروبات اور اسنیکس کا انتظام کیا گیا تھا اس لیے کسی کو انتظار کوفت میں مبتلا نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک دیوار پر لگی پلازما اسکرین پر چلنے والا ڈراما بھی گاہے گاہے دیکھ لیتی تھیں۔ ڈراما مووی پروڈکشنز نے ہی بنایا تھا اور ریکارڈ کے مطابق اس سیزن کا سب سے سُپرہٹ ڈراما تھا۔ گھنٹوں پر محیط اس انتظار کو پرل گروپ کی تین ارکان نے محض اپنی چوتھی ساتھی کے لیے برداشت کیا اور جب اختتام پر آڈیشن میں کامیاب ہونے والی چار لڑکیوں کے ناموں کا اعلان کیا گیا تو یہ جان کر بے حد خوشی محسوس کی کہ عروج کا نام اس فہرست میں شامل نہیں ہے۔ اپنا نام شامل نہ ہونے پر بھی عروج کے چہرے کے تاثرات میں زیادہ فرق نہیں آیا اور وہ یوں بیٹھی رہی جیسے کہہ رہی ہو۔ ”پکچر ابھی باقی ہے دوست۔“

کامیاب اُمیدواروں کے ناموں کے اعلان کے ساتھ ہی موبائل فونز کی واپسی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتی رہیں لیکن آخر میں عروج سمیت پانچ لڑکیاں وہیں رکی رہ گئیں۔ ان پانچ میں سے تین وہ تھیں جن کا انتخاب ہو چکا تھا لیکن رکنے کی وجہ انتخاب نہیں موبائل کا غیاب تھا۔ عروج سمیت ان پانچ لڑکیوں کے موبائل غائب تھے اور اشعر نامی بندے کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے اشعر؟ تم اتنی بے پروائی کا مظاہرہ کیسے کر سکتے ہو؟“ خبر اندر پہنچی تو وہ بندہ جس نے موبائل جمع کروانے کا حکم دیا تھا، پریشان سا باہر آیا اور موبائل جمع کرنے والے پر برسنے لگا۔

”میں نے کوئی بے پروائی نہیں کی سر۔ میں نے موبائلز کا بیگ نہایت حفاظت سے لاکر میں رکھا تھا اور چابی مسلسل میرے پاس رہی تھی۔ اس لیے میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ کیا اس لاکر کی کوئی ڈپلیکیٹ چابی بھی ہے؟“ اشعر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں لیکن اپنے بچاؤ کے لیے وہ خود کو یہ سوال کرنے سے نہیں روک سکا تھا۔

”بکواس بند کرو۔ چابی صرف تمہارے پاس تھی اور تم اپنی غیر ذمّے داری کے لیے کسی اور شخص کو الزام نہیں دے سکتے۔“ وہ شخص آگ بگولا ہوا۔

”میں نے کوئی غیر ذمّے داری نہیں دکھائی۔ میں سارا وقت یہاں سب کے سامنے موجود رہا ہوں اس لیے مجھ پر کوئی چوری کا الزام بھی نہیں لگا سکتا۔ آپ کو مجھ پر چیخنے چلانے کے بجائے اس شخص کا کھوج لگانا چاہیے جس کا یہ کارنامہ ہے۔“ اب اشعر کے انداز میں پریشانی سے زیادہ غصہ تھا۔ خود کو براہِ راست موردالزام ٹھہرائے جانے پر وہ طیش میں آ گیا تھا۔

”مجھے ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ موبائلز کی حفاظت تمہارے ذمّے تھی اس لیے تم ان کا نقصان بھرنے کے ذمّے دار ہو۔“ اس شخص نے فیصلہ سنایا تو پہلے تو حیرت کی زیادتی سے اشعر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا پھر اس نے لڑکیوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر جو مغلظات بکنا شروع کیں وہ یقینی طور پر اگلے بندے کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ ذرا سی دیر میں وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ باقیوں کے ساتھ ساتھ پرل گروپ بھی محوِ تماشا تھا۔

”اسٹاپ۔ اسٹاپ اِٹ! یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟“ اِدھر اُدھر سے دوڑ کر آنے والے ان دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کروا پاتے اس سے قبل ہی اندرونی دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک شخص باہر نکل کر دہاڑا۔ اس شخص نے جینز پر عورت کی بے ہودہ سی تصویر والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور گلے میں پہنی چار عدد سنہری زنجیروں کے علاوہ کان میں چمک دار نگینے والا ٹاپس بھی موجود تھا۔ سر کے بال اس طرح ڈائی کیے گئے تھے کہ وہ آدھے براؤن اور آدھے سنہری تھے۔ اپنے اس حلیے میں وہ سچ مچ شوبز کا کوئی نمونہ دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ بوبی ہے۔“ عروج نے سرگوشی میں سہیلیوں کو معلومات فراہم کیں۔

”سر! اس شخص نے آڈیشن کے لیے آنے والی لڑکیوں کے موبائل غائب کر دیے ہیں۔“

”یہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، یہ میرا نہیں کسی اور کا کام ہے۔“ اشعر نے اپنا گریبان درست کرتے ہوئے الزام کی تردید کی۔

”جو بھی مسئلہ ہے اس سے طریقے سے نمٹو سجاد! مجھے اپنے آفس میں چیخ و پکار پسند نہیں ہے۔ سارے اسٹاف سے

معلومات کرواور اگر کوئی نتیجہ نہ نکلے تو جن کے موبائل غائب ہوئے ہیں ان کا نقصان پورا کرو۔ میں اپنے آفس کی بدنامی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر بات مودی صاحب تک پہنچ گئی تو سب کا بُرا حشر ہوگا۔'' بوبی نے سختی سے حکم دیا اور اپنے آفس میں واپس لوٹ گیا۔ اس کے بعد وہاں ماحول ذرا دھیما ہو گیا لیکن اٹھا پٹخ اور تفتیش چلتی رہی۔ سارا اسٹاف لائن حاضر کیا گیا۔ تلاشیاں لی گئیں اور بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ غائب شدہ موبائل کہیں سے برآمد نہیں ہوئے۔ اس ناکامی کے بعد بوبی کی پیش کردہ آخری تجویز پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سجاد کھڑا ہوا اور شرمندہ سے انداز میں بولا۔

''وی آر سوری لیڈیز! اس قسم کا واقعہ ہمارے ہاں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہم آپ کو پہنچنے والی تکلیف کے لیے آپ کے سامنے شرمندہ ہیں اور تہ دل سے معذرت چاہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ موبائل کی حیثیت پرسنل ڈائری سے بھی کچھ بڑھ کر ہے اور موبائل کا اس طرح غائب ہو جانا ذہنی و جذباتی دھچکے کا باعث بنتا ہے۔ ہم بے حد معذرت خواہ ہیں کہ ہم اس ذہنی اور جذباتی صدمے کی تلافی نہیں کر سکتے لیکن آپ کو مالی نقصان بہرحال نہیں ہوگا۔ آپ سب کو آپ کے گمشدہ موبائل کی پوری پوری قیمت ادا کی جائے گی۔''

''جب آپ حفاظت نہیں کر سکتے تھے تو آپ کو اس طرح سب کے موبائل لینا ہی نہیں چاہیے تھے۔'' عروج نے قصداً خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ جن تین لڑکیوں کی سلیکشن ہوئی تھی، وہ بھی مصلحتاً خاموش تھیں لیکن پانچویں لڑکی کو اس موقع پر تنقید کرنے سے باز رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''یہ ہمارے ہاں کا اُصول ہے مس۔ مسٹر مودی سیٹ پر ہوں تو خود بھی موبائل استعمال نہیں کرتے۔ آج جو کچھ ہوا وہ محض اتفاق تھا جس پر میں پہلے ہی آپ سے اپنے ادارے کی طرف سے معذرت کر چکا ہوں۔'' سجاد نے مہذبانہ لب و لہجے میں اس کے اعتراض کا جواب دیا پھر اس کے اشارے پر اشعر باری باری ہر لڑکی کو بلا کر اسے اس کے موبائل کی قیمت ادا کرنے لگا۔ اس کے پاس تمام موبائلز کا ریکارڈ موجود تھا اس لیے اس بات کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی لڑکی دھوکے سے زیادہ رقم وصول کر لے۔ ویسے وہ لوگ فراخ دلی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور نیٹ پر سرچ کر کے ہر موبائل کی اصل قیمت خرید ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے اس بات کو ایشو نہیں بنایا تھا کہ کون سا موبائل کتنا استعمال شدہ ہے۔ عروج کی باری آئی اور اشعر نے اس کے موبائل کی قیمت سرچ کی تو اس کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ اس نے ابھی چار موبائلوں کی قیمت ادا کی تھی۔ عروج کا موبائل ان کی مجموعی قیمت خرید سے بھی دگنا مہنگا تھا۔ اس نے اس کارروائی کو ملاحظہ کرتے سجاد کی طرف جھک کر سرگوشی میں اسے اس بارے میں آگاہ کیا۔ سجاد بھی تھوڑا سا پریشان نظر آنے لگا پھر عروج کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''جب آپ فنانشلی اتنی اسٹرونگ ہیں تو آپ کو کام کے لیے یہاں خوار ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے ہاں تو زیادہ تر مڈل کلاس کی لڑکیاں ہی کام مانگنے آتی ہیں۔''

''بات پیسے سے زیادہ شوق کی ہے۔ مجھے ایکٹنگ کا جنون ہے۔ اسی لیے میں نے مس سارہ سے بھی سفارش کروائی تھی کہ مجھے کوئی رول دے دیا جائے۔'' موبائل گنوا کر بھی عروج کے لہجے سے خوش اخلاقی ٹپک رہی تھی جو ان تینوں کے لیے حیرت کی بات تھی۔

''مس سارہ نے آپ کے لیے کال کی تھی۔ اوہ...... سوری، ویری سوری۔ مجھ سے نام سننے میں شاید کوئی مغالطہ ہو گیا تھا جب ہی آپ کی جگہ دوسری لڑکی کو سلیکٹ کر لیا گیا۔'' وہ مزید شرمندہ نظر آنے لگا لیکن ان تینوں نے محسوس کیا کہ اس کا انداز مصنوعی ہے۔ عروج کی آنکھوں پر البتہ آج پٹی بندھی تھی اور عقل بھی شاید کہیں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی جو اپنے مہنگے موبائل کی قیمت وصول کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مگن تھی۔

''جو ہوا اسے بھول جائیں اور اب اپنی غلطی کی تلافی کر دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ موبائل کی قیمت اپنے شوق کا مول سمجھ کر فراموش کر دوں گی۔'' عروج کے اس جواب نے تو انہیں چکرا کر ہی رکھ دیا۔

''رول تو سمجھیں آپ کے لیے تیار ہی ہے۔ ہم مس سارہ کو نہ تھوڑی کر سکتے ہیں۔ آپ کل آ جایئے گا۔ میں رائٹر سے کہہ دوں گا کہ جہاں سیریل میں ہیروئن کی تین بہنیں دکھائی ہیں وہاں ایک اور کا مزید اضافہ کر دے۔'' سجاد کے لیے اس کا مطالبہ خوش کن تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ جو لڑکی اپنے مہنگے موبائل کی قیمت طلب نہیں کر رہی ہے، وہ ڈرامے میں کام کرنے کے پیسے کہاں طلب کرے گی۔ اس لیے اگر اسے اس کے لیے کوئی چھوٹا موٹا اضافی رول تخلیق کروانا پڑ رہا تھا تو یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔

''تھینک یو مسٹر سجاد! میں مس سارہ سے آپ کے

اچھے سلوک کا ذکر ضرور کروں گی۔'' عروج اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

''اب تک بھی دو کہ یہ سب کیا ہے؟ ہم نہیں مان سکتے کہ اچانک تمہیں ایکٹنگ کا اتنا زیادہ شوق ہو گیا ہے کہ تم اس کے لیے سفارشیں لگوا رہی ہو اور اپنا اتنا مہنگا موبائل تک اس شوق پر قربان کر دیا ہے۔'' وہ تینوں اسے گھیر کر بیٹھی ہوئی تھیں اور کڑے تیوروں کے ساتھ اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھیں۔

''موبائل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے یار! بڑے دنوں سے گڑبڑ کر رہا تھا۔ میری ڈیڈ سے نئے موبائل کے لیے بات بھی ہو گئی تھی اس لیے میں نے اس کی اتنی کیئر نہیں کی۔'' عروج نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

''ہم سچ سنیں گے۔ سچ کے سوا کچھ کہا تو بالکل بھی اچھا نہیں ہوگا۔'' ان کے انداز ذرا جارحانہ نظر آنے لگے تو عروج نے ہنستے ہوئے ہتھیار ڈال دیے اور بولی۔

''تم لوگوں کو نیہا یاد ہے۔ وہ جو ہائی اسکول میں ہمارے ساتھ تھی اور کلاس میں سب سے خوب صورت لڑکی کہلاتی تھی۔''

''ہاں یاد ہے کہ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ کلاس کی سب سے نکمی لڑکی بھی تھی۔'' لبنیٰ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''نیہا آج کل ٹی وی ڈراموں اور ٹیلی فلمز وغیرہ میں کام کر رہی ہے۔ ایکٹنگ میں اتنی اچھی نہیں اس لیے زیادہ ہٹ نہیں ہوئی ہے لیکن اپنی خوب صورتی کی وجہ سے کام لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے آگے بولو۔'' ان تینوں کو نیہا کے ایکٹنگ کیریئر سے متعلق معلومات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''میرے پاس نیہا کی کال آئی تھی۔ پھر اس نے مجھے ملاقات کے لیے بلا لیا۔ اسے کہیں سے ہمارے کارناموں کی خبریں سننے کو مل گئی تھیں اس لیے جب مصیبت میں پڑی تو ہماری یاد آگئی۔''

''کیسی مصیبت؟'' اب انہیں اس معاملے میں دلچسپی کا پہلو نظر آنے لگا۔

''نیہا کو کوئی بلیک میل کر رہا ہے۔ اس کے مطابق وہ پچھلے چھ ماہ میں لاکھوں روپے بلیک میلر کو دے چکی ہے لیکن اس کے مطالبات کا سلسلہ رکنے میں نہیں آرہا اور اب وہ اسے مزید کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں رہی ہے۔''

''بلیک میلنگ کی وجہ؟''

''وہی کامن پرابلم ہے۔ نیہا کی کچھ سنسنی خیز ویڈیوز اس کے ہاتھ لگ گئی ہیں اور وہ انہیں پھیلانے کی دھمکی دے کر اس سے رقم بٹور رہا ہے۔''

''کیا اس نے نیہا سے رقم کے علاوہ بھی کوئی مطالبہ کیا ہے؟'' مہ پارہ نے پوچھا۔

''ہاں، اور اسی لیے نیہا زیادہ پریشان ہے۔ وہ کہتا ہے اگر نیہا رقم نہیں دے سکتی تو اس کے لیے ایک ویڈیو بنوا دے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ ویڈیو میں اس کا چہرہ نہیں آئے گا اور ویڈیو بنوانے کی صورت میں نہ صرف وہ اسے بلیک میل کرنا چھوڑ دے گا بلکہ ٹھیک ٹھاک معاوضہ بھی دے

گا۔“

”نیہا نے یقیناً انکار کر دیا ہوگا۔“ روشی نے اندازہ لگایا۔

”بالکل۔ وہ تھوڑی سی ماڈرن اور آزاد خیال ہے لیکن لوز کریکٹر نہیں۔ اس کے انکار کے بعد بلیک میلر نے اسے دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے ویڈیو بنوانے کی ہامی نہیں بھری تو وہ اس کی ان ویڈیوز کو پھیلا دے گا جس میں اس کے جسم کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی نمایاں ہے۔ اب وہ رقم بھی لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کافی منت سماجت اور رقم کے عوض نیہا اس سے یہ بہانہ بنا کر مہلت لینے میں کامیاب ہوئی ہے کہ اسے ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار ہونے کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے۔“ عروج نے تفصیل بتائی۔

”ٹھیک ہے، یہ تو ہوگئی نیہا کی کہانی۔ اب تم بتاؤ کہ اس سارے چکر میں مووی پروڈکشنز والے کہاں فٹ ہوتے ہیں؟“ مہ پارہ نے اہم ترین سوال کیا۔

”میں نے نیہا سے کچھ سوال جواب کیے تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ جو بھی گڑبڑ ہوئی ہے وہ سیٹ پر ہی ہوئی ہے۔“

”مطلب اس کا موبائل بھی اسی طرح غائب ہوگیا تھا جیسے آج تمہارا اور باقی لڑکیوں کا غائب ہوا ہے؟“

”نہیں، نیہا کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے نیا موبائل لینے پر پرانا رعایتی قیمت پر ایک اسپاٹ بوائے کو بیچ دیا تھا۔ اسپاٹ بوائے غریب سا لڑکا ہے اور نیہا کو قسطوں میں رقم دے رہا تھا لیکن قسطیں پوری ہونے سے قبل ہی غریب کا موبائل چوری ہوگیا۔ وہ شور بھی نہیں مچا سکا کہ اس نے کسی کو اپنے پاس موبائل کی موجودگی کا نہیں بتایا تھا اور قواعد کے خلاف موبائل اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔“

”نیہا کے خیال میں وہ اسپاٹ بوائے کلیئر ہے؟“

”ہاں، وہ اس پر شک نہیں کر رہی لیکن اسے شک ہے کہ اس کام میں پروڈکشن والوں کا کوئی نہ کوئی بندہ ضرور شامل ہے۔ اس کے خیال کے مطابق وہاں اس کے علاوہ چند اور ایکٹریسز کو بھی بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ ایک جونیئر ایکٹریس نے تو خود دبے لفظوں میں اس سے ذکر کیا ہے جبکہ دو کے بارے میں اس نے خود اندازہ لگایا ہے۔“

”کیسے؟“ وہ اب پوری باریک بینی سے اس کیس پر توجہ دے رہی تھیں۔

”ایک کو فون پر بات کرتے ہوئے اس نے اتفاقاً سن لیا تھا جبکہ دوسری کے بارے میں اسے اطلاع ملی ہے کہ وہ اپنے قیمتی زیورات تیزی سے فروخت کر رہی ہے حالانکہ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے زیورات جمع کرنے کا کریز ہے۔“

”اپنی ان کولیگز کے موبائلز کے بارے میں نیہا کے پاس کیا اطلاع ہے؟“

”ایک کا موبائل سیٹ پر آتے ہوئے راستے میں چھین لیا گیا تھا، ایک کو اتنی جلدی جلدی موبائل خریدنے اور بیچنے کی عادت ہے کہ اسے خود بھی یاد نہیں کہ اس نے کون سا موبائل کب کب اور کسے بیچا تھا جبکہ وہ تیسری جس نے نیہا کو راز دار بنایا ہے اس کے موبائل کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہوا ہے، مطلب نہ خرید و فروخت، نہ اسنیچنگ اور نہ ہی چوری۔ اس کے موبائل سے ڈیٹا چرایا گیا ہے۔“ عروج نے نیہا سے کافی معلومات حاصل کر لی تھیں، اس لیے اب ان کے ہر سوال کا جواب آسانی سے دے رہی تھی۔

”جس طرح آج تمہارا اور دیگر لڑکیوں کے موبائل غائب ہوئے، کیا نیہا کو پہلے بھی اس طرح کے کسی واقعے کا علم ہے۔“ لبنیٰ نے سوال کیا۔

”نہیں، وہاں سے واپس آکر میں نے نیہا سے فون پر پوچھا تھا لیکن اس کے مطابق یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ عام سی چوری کی واردات نہیں ہے۔ موبائلز ان لڑکیوں کے غائب ہوئے ہیں جو آڈیشن کے لیے آنے والیوں میں سے نسبتاً زیادہ خوب صورت تھیں۔“

”یہ تھیوری قابلِ قبول نہیں، کیونکہ چوری ہونے والے موبائلز میں تمہارا موبائل بھی شامل تھا۔“ مہ پارہ نے اس کا پوائنٹ فوراً رد کر دیا۔ باقی تینوں بھی اس کی ہم نوائی کرنے لگیں۔

”جیلس مت ہو۔ جلنے سے انسان کی شکل پر مزید پھٹکار برسنے لگتی ہے۔ پہلے ہی تم تینوں کی شکلیں میرے مقابلے میں خاصی ماٹھی ہیں۔“ ان کی مخالفت کے باوجود وہ اپنے دعوے پر ثابت قدمی سے قائم رہی۔

☆☆☆

”عروج چالاک کو خود تو اپنی بہن کو لے کر ڈرامے کے سیٹ پر مزے کر رہی ہے اور ہمیں یہاں اس فضول کام میں پھنسا دیا ہے۔“ ریسٹورنٹ میں موجود گاہکوں اور عملے کے افراد کی ویڈیو بناتے ہوئے روشی نے لبنیٰ کے کان میں سرگوشی کی۔

”یہ کانا پھوسی بعد میں کر لینا پہلے کام پر توجہ دو۔“ لبنیٰ

نے بھی اسے سرگوشی میں ڈپٹا۔

''آپ دیکھ سکتے ہیں ویوورز کہ یہ ریسٹورنٹ کتنا زبردست ہے۔ یہاں کا ماحول کتنا نیٹ اینڈ کلین ہے۔ فوڈ آئٹمز بھی بہت ٹیسٹی اور فنٹاسٹک ہیں اور جب اتنا سب کچھ اچھا ہو تو تھوڑا مہنگا بھی پڑے تو چلتا ہے۔'' اس وقت انہوں نے یوٹیوبرز کا روپ دھارا ہوا تھا اور یوٹیوبرز کے ہی لب و لہجے میں بول رہی تھیں۔ یہ ویڈیو بنانے کے لیے انہوں نے باقاعدہ ریسٹورنٹ کے منیجر سے اجازت لی تھی اور ظاہر ہے اسے اعتراض نہیں تھا کہ اس طرح بلا معاوضہ ریسٹورنٹ کی تشہیر ہو رہی تھی۔

''یہاں آکر کھانا کھانے میں ایک پلس پوائنٹ یہ بھی ہے کہ آپ امید کر سکتے ہیں کہ مسٹر مراد عرف مودی صاحب کے درشن ہونے کے ساتھ ساتھ ان سے آٹوگراف لینے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔'' لبنیٰ نے اپنا چوکھٹا کیمرے میں فکس کرتے ہوئے شوخ لہجے میں لقمہ دیا۔

''بالکل ویوورز بلکہ آپ چاہیں تو ان کے ساتھ سیلفی بھی بنوا سکتے ہیں۔'' روشی نے مزید فوائد گنوائے۔ ایک جانب کھڑا یہ سب ہوتا دیکھتا منیجر ان باتوں پر اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نوجوانوں میں مقبول مودی کا حوالہ کام کرے گا۔ حقیقتاً اس حوالے کی وجہ سے ہی انہوں نے اپنا کام بنا رکھا تھا اور ریسٹورنٹ نے اپنے آغاز سے ہی اچھی ساکھ قائم کر لی تھی لیکن اگر کسی یوٹیوبر کی وجہ سے ریسٹورنٹ کی مزید مشہوری ہو رہی تھی تو کاروباری اعتبار سے یہ اچھا ہی تھا۔

''اب ہم آپ کو اوپر والے فلور پر لے چلتے ہیں۔ دیکھیں کتنی خوب صورت اور شاندار اسٹیئرز ہیں۔ اسٹیپس بہت اچھے بنے ہوئے ہیں۔ چڑھنے میں بالکل مشکل پیش نہیں آرہی ہے۔ ڈیکوریشن کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ جو لینڈنگ کے ساتھ والی دیوار پر شیر اور ہرن کی پینٹنگ لگی ہے اس کے بارے میں تو میں شیور ہوں کہ یہ مسٹر مودی اپنے کسی فارن ٹور سے واپسی پر ساتھ لائے ہوں گے۔'' روشی کے جو منہ میں آرہا تھا انٹ شنٹ بولتی جا رہی تھی اور لبنیٰ بھی اس کارِ فضول میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ یونہی بولتی ہوئی آخر کار وہ اوپر پہنچ گئیں۔ یہاں اوپن ہال کے بجائے کیبنز بنے ہوئے تھے۔

''یہ دیکھیے یہاں فیملیز کے لیے اچھا سیٹ اپ ہے۔ جو لوگ بنا کسی انٹرپشن کے پُرسکون ماحول میں کھانا پینا چاہتے ہیں وہ تھوڑے ایکسٹرا چارجز دے کر اس فیسلیٹی کو

ابھی اوئیل کر سکتے ہیں۔''

''اور وہ لوبرڈز بھی جو دنیا سے چھپ کر کچھ پل ساتھ بتانے کی چاہ رکھتے ہیں۔'' لبنیٰ نے ہنس کر روشی کی بات میں گرہ لگائی اور ایک خالی کیبن کا دروازہ کھولا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ کون ہیں یہ اور یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' ابھی وہ کھلے دروازے کی دہلیز پر کھڑی کیبن کے اندرونی حصے کی ویڈیو بنا ہی رہی تھیں کہ ایک دہاڑ نما آواز نے چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہینڈسم اور ڈیشنگ مودی تھا جو آنکھوں میں برہمی لیے کبھی ان دونوں کو اور کبھی ان کے پیچھے ہی اوپر چلے آنے والے منیجر کو دیکھ رہا تھا۔

''دیکھیے، میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہاں آنے میں چانس ہے کہ آپ کا مسٹر مودی سے ٹاکرا ہو جائے تو دیکھیے ویوورز یہ خوش قسمتی ہمارے حصے میں بھی آگئی ہے۔ آئیے چل کر مسٹر مودی سے بات کرتے ہیں۔'' روشی کو خود کو سنبھالنے میں بس ایک لمحہ ہی لگا تھا اور اس نے اسی ٹون میں دوبارہ بولنا شروع کر دیا تھا۔

''ہیلو سر! آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ جتنے آپ خود خوب صورت اور ویل ڈریسڈ ہیں، اتنا ہی آپ نے اپنے ریسٹورنٹ کو مینٹین کر کے رکھا ہوا ہے۔'' وہ مراد کے الفاظ بھی سن چکی تھی اور اس کے چہرے کے بگڑتے زاویے بھی ملاحظہ کر رہی تھی پھر بھی کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے مخاطب تھی۔ اس موقع پر اس نے دیکھا کہ ایک جانب کھڑا منیجر چپکے سے مراد کے آگے ہاتھ جوڑتا اس سے اشاروں میں غصہ کنٹرول کرنے کی درخواست کر رہا ہے۔

''بہت شکریہ جی۔ یہ سب تو بس اوپر والے کی مہربانی اور آپ لوگوں کی محبت ہے۔ میں تو بس کوشش کرتا

ہوں کہ جو بھی کام کروں اس میں اپنا بیسٹ دوں۔'' وہ ایک اداکار تھا اس لیے اپنے خراب موڈ کو نہایت خوب صورتی سے چھپا کر چہرے پر خوب صورت سی مسکراہٹ سجانے میں کامیاب ہوگیا۔

''سنا ہے آپ اپنے نئے پروجیکٹ کی کچھ شوٹنگ اس ریسٹورنٹ میں بھی کریں گے۔ کیا ایسا آپ ریسٹورنٹ کی تشہیر کے لیے کر رہے ہیں؟'' مسکرا کر کیا گیا سوال مراد کو چبھا تھا لیکن وہ سوشل میڈیا پر اپنے خلاف محاذ نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا اس لیے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''ریسٹورنٹ میں شوٹنگ، کہانی کی ڈیمانڈ ہے اور جب میرا اپنا ریسٹورنٹ اتنے اچھے معیار کا ہے تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔''

''بالکل سر مگر......''

''ایکسکیوزمی! مجھے ایک امپورٹنٹ میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے اس لیے میں آپ کو مزید ٹائم نہیں دے سکتا۔'' ابھی اس کے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ مودی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے وہاں سے پلٹ گیا۔

''اوکے مس! آپ لوگوں کا کام ہوگیا۔ اب آپ جائیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے چکر میں میری نوکری چلی جائے۔'' ساری صورتِ حال پر گھبرایا ہوا منیجر مودی کے جاتے ہی ان سے مخاطب ہوا۔

''ایسے کیسے جائیں جناب! ابھی تو آپ نے ہماری کوئی خاطر مدارت ہی نہیں کی۔'' لبنیٰ نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''سوچیے اگر ہم نے یہ ویڈیو بغیر ایڈٹ کیے سوشل میڈیا پر ڈال دی تو آپ کے مسٹر موڈی کا عوام پر کیا امپریشن پڑے گا۔ مسٹر موڈی کی دہاڑ اور آپ کے جڑے ہوئے ہاتھ سب ریکارڈ کیا ہے ہمارے کیمروں نے۔'' روشی نے بھی نہایت معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''آپ مجھے دھمکیاں دے رہی ہیں؟'' وہ ناراض ہوا۔

''بالکل نہیں، بس گزارش کر رہے ہیں کہ اپنے ریسٹورنٹ کے ذائقوں سے آشنا کروائیں تاکہ ہم اپنی سوشل میڈیا فیملی کو بھی ان کے بارے میں آگاہ کریں۔''

''آپ جانتی ہیں کہ میں چاہوں تو ابھی سب کچھ آپ سے چھین کر ڈیلیٹ بھی کر سکتا ہوں۔'' منیجر نے انہیں رعب میں لینا چاہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ ساری ویڈیو ہمارے گوگل اکاؤنٹ پر سیو ہو چکی ہے۔'' ان کے اطمینان میں فرق نہیں آیا۔

''اوکے چلیں۔ آپ دونوں چل کر نیچے ہال میں بیٹھیں اور آرڈر کریں لیکن یاد رکھیے گا کہ میں مس سارہ کو اس بدتہذیبی سے ضرور آگاہ کروں گا۔'' فیشن ڈیزائنر سارہ ایک فیملی فرینڈ تھی جسے انہوں نے سفارش کے لیے استعمال کیا تھا اور اب منیجر اسی کا حوالہ دے رہا تھا۔

''ہم ہال میں نہیں، یہاں فیملی کیبن میں بیٹھ کر کھائیں گے۔'' منیجر کی بات پر بے نیازی کا مظاہرہ کرتی وہ دونوں ایک قریبی کیبن میں گھس گئیں۔ یہ کافی آرام دہ اور سجا ہوا کیبن تھا۔ دونوں نے نشستیں سنبھالتے ہوئے غور سے کیبن کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ ہر شے کی تعریف بھی کرتی گئیں۔

''میڈم آرڈر۔'' اس دوران ویٹر ان کا آرڈر لینے بھی آ گیا۔ اسے ایک بڑا آرڈر نوٹ کروانے کے بعد روشی نے کیبن کا دروازہ اندر سے بند کیا اور دیوار پر نازک سے جالی کے اسٹینڈ کے ساتھ ٹکائے گئے آرائشی پھولوں کی طرف بڑھی۔ پھولوں کو اِدھر اُدھر کرنے پر وہ خفیہ کیمرا سامنے آ گیا جس کی وہ پہلے ہی توقع کر رہی تھیں۔ لبنیٰ نے کیمرے کی دریافت کا یہ سارا منظر ایک ویڈیو کی شکل میں محفوظ کر لیا۔

''بس آجاؤ اب چلتے ہیں۔'' ان کا مقصد پورا ہو گیا تھا چنانچہ رکنا بیکار تھا۔

''میڈم آپ کا آرڈر؟'' وہ باہر نکل کر سیڑھیاں اتر رہی تھیں کہ آرڈر نوٹ کر کے لے جانے والا ویٹر مل گیا۔

''ہمارے گھر سے کال آئی ہے۔ کوئی ایمرجنسی ہے اس لیے ہمیں فوراً جانا ہے۔'' لبنیٰ نے اسے جلدی سے جواب دیا اور دونوں پھرتی سے باہر... نکل گئیں۔

☆☆☆

''اس کا مطلب ہے مودی ڈائریکٹ اس سارے چکر میں انوالو ہے۔ اس کے پروڈکشن ہاؤس اور ریسٹورنٹ دونوں جگہ پر یہ گھٹیا کام ہو رہا ہے تو وہ معصوم تو نہیں ہو سکتا۔'' مہ پارہ نے ان کی بنائی ہوئی ویڈیو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ یہ اطلاع بھی انہیں نیہا ہی نے دی تھی کہ مودی کے ریسٹورنٹ کے فیملی کیبنز میں خفیہ کیمرے نصب ہیں اور وہاں آنے والے جوڑوں کی نازیبا حرکات کی ویڈیو بنا کر

انہیں بلیک میل کیا جاتا ہے۔

''لوگ کتنے ناشکرے ہوتے ہیں یار! دولت، شہرت، عزت کس چیز کی کمی ہے مودی کو پھر بھی وہ دولت کے لالچ میں ایسے گھٹیا اور دو نمبر کام کر رہا ہے۔'' لبنیٰ نے افسوس کا اظہار کیا۔

''انسان ہوس کا پجاری بن جائے تو صحیح اور غلط کی پہچان بھلا بیٹھتا ہے۔'' عروج نے بھی تبصرہ کیا۔

''تم وہاں شوٹنگ پر گئی تھیں، تو مزید کچھ سن گن ملی؟'' روشی نے اس سے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں۔ بس سارا دن بیٹھ کر اور بور ہو کر واپس آ گئے۔'' عروج نے منہ بنایا۔

''بور ہونے کے بجائے ان چار لڑکیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرو جن کے موبائل پہلے روز تمہارے ساتھ چوری ہوئے تھے۔ وہ اشعر نام کا بندہ اس دن آڈیشن کے لیے آنے والی لڑکیوں کے نام، ایڈریس اور فون نمبرز نوٹ کر رہا تھا۔ لڑکیوں کے نام تو ہمیں معلوم ہی ہیں۔ تم کسی طرح ایڈریس اور فون نمبر حاصل کرلو۔'' روشی نے اسے مشورہ دیا۔

''یہ تو کوئی بڑا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اشعر اکثر کسی نہ کسی کام سے سیٹ چھوڑ کر ادھر اُدھر جاتا رہتا ہے۔ میں موقع دیکھ کر یہ کام کرلوں گی۔'' عروج نے یقین سے جواب دیا۔

''بس تو یہ کام نمٹاؤ، پھر آگے کی کارروائی کرتے ہیں۔''

''میرے خیال میں تو اس کی اتنی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ہم جو ثبوت حاصل کر چکے ہیں ان کی مدد سے بھی ڈیڈی سے کہہ کر مودی کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے۔'' مہ پارہ نے اپنی رائے دی۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، لیکن احتیاطاً مزید کچھ ثبوت حاصل کر لیے جائیں تو کوئی برائی بھی نہیں ہے۔'' روشی نے مشورہ دیا۔

''اوکے، جیسے سب کی مرضی۔'' مہ پارہ نے شانے اچکا کر گرین سگنل دے دیا۔ وہ گروپ کی غیر اعلانیہ لیڈر تھی اس لیے کسی بھی کام کے لیے اس کی رائے کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔

☆☆☆

''اچھی بھلی شہرت تھی بندے کی۔ دو نمبری کے چکر میں خود کو برباد کرلیا۔'' بڑی سی ایل ای ڈی اسکرین پر چلتے مناظر دیکھتے ہوئے مہ پارہ نے تبصرہ کیا۔ اسکرین پر مراد عرف مودی پولیس کی تحویل میں نظر آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کے دفتر اور ریسٹورنٹ میں پولیس کے چھاپے کے مناظر بھی چل رہے تھے اور اینکر حسب روایت ہیجان زدہ لہجے میں تفصیل بتا رہی تھی کہ کیسے شوبز کا چمکتا دمکتا ستارہ لڑکیوں کو بلیک میل کرنے کے مکروہ دھندے میں ملوث تھا۔

''تم نے اتنی جلدی کیوں دکھائی؟ ابھی تو میں نے ان لڑکیوں سے ملاقات بھی کرنی تھی جن کے موبائل فون میرے ساتھ چوری ہوئے تھے؟'' عروج نے ناخوشی کا اظہار کیا۔ مہ پارہ نے اس کے علم میں لائے بغیر اپنے والد سہیل مرزا کو اس معاملے سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہوں نے پہلے عروج کے آئی فون کی آئی کلاؤڈ آئی ڈی اور دیگر معلومات کے ذریعے سی پی ایل سی کو ملوث کر کے اس کے فون کی لوکیشن نکلوائی تھی اور یہ کنفرم ہونے پر کہ فون مودی کے دفتر میں ہی تھا بیک وقت اس کے دفتر اور ریستوران پر پولیس کا ریڈ کروا دیا تھا۔ نتیجتاً اب مودی پولیس کی تحویل میں تھا اور ہر طرف سے اسے لتاڑنے اور پھٹکاریں پڑنے کا سلسلہ جاری تھا۔

''میں نے سوچا خواہ مخواہ معاملے کو لمبا کر کے ساری چھٹیاں اس کام میں برباد کرنے کے بجائے سیدھا ایکشن لیا جائے۔ اب پولیس خود اس سے اس کے باقی کے کرتوت اگلوا لے گی۔'' مہ پارہ نے بے نیازی سے اپنے عمل کے حق میں دلیل دی۔

''لیکن یہ گروپ رولز کے خلاف ہے۔ کسی کو بھی تمہاری یہ حرکت اچھی نہیں لگے گی۔'' عروج اس کی دلیل سے قائل نہیں ہوئی۔

''چلو میں سب سے سوری کرلوں گی۔'' مہ پارہ نے کاجو ٹونگتے ہوئے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

''تم......'' عروج نے کچھ کہنا چاہا لیکن موبائل کی رنگ ٹون نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔

''نیہا۔'' اس نے اسکرین پر روشن ہونے والا نام دیکھا اور کال ریسیو کرلی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد فون بند کیا تو مہ پارہ نے اس سے پوچھا۔

''کیا کہہ رہی تھی نیہا؟''

''نیوز دیکھ لی ہیں۔ شکریہ ادا کر رہی تھی کہ میں نے اس کا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔''

''نیہا کو مودی کا نام بلیک میلر کے طور پر سامنے آنے سے حیرت نہیں ہوئی؟''

''حیرت کیوں ہو گی؟''

''بھئی اسے معلوم تو نہیں تھا نا کہ اسے بلیک میل کرنے والا کون ہے؟''
''ہوسکتا ہے تھوڑا بہت اندازہ ہو لیکن اس نے ڈائریکٹ نام لینا مناسب نہ سمجھا ہو۔ ہم نے بھی اندازوں کی بنیاد پر ہی اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔'' عروج نے دلیل دی۔
''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' مہ پارہ نے اس کی تائید کی لیکن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔
''تم کس سوچ میں پڑی ہو؟'' عروج نے اسے گھورا۔
''سوچ رہی ہوں۔ روشی اور لبنیٰ سے کیسے نمٹوں گی۔ وہ دونوں بھی میرے خود سے فیصلہ لے لینے پر خفا ہوں گی۔''
''یہ کون سا اتنا بڑا مسئلہ ہے۔ کہیں اچھی سی جگہ لنچ کروا کر ہرجانہ بھر دینا ناراضی دور ہو ہی جائے گی۔'' عروج نے مزے سے تجویز پیش کی۔
''تھوڑا مہنگا مشورہ ہے لیکن بُرا نہیں۔'' مہ پارہ نے بنا کسی ردوکد کے اس کی تجویز کو قبول کرلیا۔

☆☆☆

''مزہ آگیا یار! سچ کسی کنجوس کے پیسوں سے کھانے پینے کا جو مزہ ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہے۔'' لبنیٰ نے آئسکریم سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔ وہ چاروں ایک اچھے ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کے بعد مہ پارہ کی تجویز پر موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تفریحی پارک میں آگئی تھیں اور اب مہ پارہ کے خرچ پر ہی آئسکریم بھی اڑائی جارہی تھی۔
''ایسا کرتی ہوں تمہاری آئسکریم کھاتے ہوئے ویڈیو بنا کر تمہارے والد صاحب کو بھیج دیتی ہوں۔ اس موسم میں آئسکریم کھانے پر اپنے ڈاکٹر اباجی سے جو لیکچر سننا پڑے گا وہ اس سارے کھائے پیے کا لطف دوبالا کردے گا۔'' مہ پارہ نے دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا تو وہ ہنس پڑی اور بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔
''تم کچھ بھی کرلو، یہ جو آج کا مزہ ہے اُسے میں نہیں بھولنے والی۔''
''مت بھولو۔ وہ تو یہ میری شرافت ہے کہ ایک معمولی سی بات پر اتنا بڑا جرمانہ بھرنے کے لیے تیار ہوگئی ورنہ دیکھا جائے تو میں نے کچھ ایسا غلط کام بھی نہیں کیا۔ ایک سیدھا سیدھا حل ہوجانے والا معاملہ تم لوگ اپنی افلاطونیت میں نجانے کتنے دن الکائے رکھتیں اور اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی خوار کرتیں۔''
''ہاں بھئی، یہ احسان تو تم لوگوں کو ماننا پڑے گا میری بہن کا کہ اس نے ہم سب کو خوار ہونے سے بچالیا۔'' عروج کی خواہرانہ محبت جاگی۔
''لیکن سنا ہے مودی نے اب تک جرم قبول نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میرے دفتر میں ایک اجنبی موبائل کیسے آیا اور ریسٹورنٹ میں خفیہ کیمرے کس نے نصب کیے۔''
''دنیا میں آج تک کسی مجرم نے اپنا جرم آسانی سے قبول کیا ہے؟'' لبنیٰ نے منہ بنایا۔
''کوئی بات نہیں ہماری پولیس قبول کروالے گی۔ وہ تو ہاتھی سے کہلوا لیتے ہیں کہ میں ہرن ہوں، مودی ان کے سامنے کیا شے ہے۔'' روشی کہہ کر ہنسنے لگی تو باقی سب نے بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دیا۔ اسی وقت مہ پارہ کے موبائل نے گنگنانا شروع کیا۔ اس نے کال ریسیو کرکے ایک آدھ لفظ ادا کیا اور پھر یہ کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کردیا کہ ''اوکے، میں بس پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''
''کہاں جارہی ہو تم؟'' عروج نے اس سے استفسار کیا۔
''کسی سے ملنا ہے۔ تم ان لوگوں کے ساتھ انجوائے کرو۔ میں جلدی گھر آجاؤں گی۔'' اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔
''روشی پلیز، عروج کو ڈراپ کردینا۔'' جاتے جاتے اس نے روشی سے درخواست کی اور جواب کا انتظار کیے بغیر روانہ ہوگئی۔ پیچھے وہ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

''اب کیسی ہے وہ؟''
''شکر ہے زندگی بچ گئی۔ ذہنی حالت بھی آہستہ آہستہ معمول پر آجائے گی۔ اگر بہتری محسوس نہ ہو تو کسی سائیکاٹرسٹ سے کانٹیکٹ کرلیجیے گا۔''
''دیکھیں، جو بھی ہوا سب سے پہلے آپ لوگوں کو اس سب کو بھولنا پڑے گا۔ تب ہی آپ لوگ اسے اس ٹراما سے باہر لاسکیں گے۔ ایسے حالات میں گھر والوں کی سپورٹ سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔''
''جی جی بے فکر رہیں۔ میں اس پرابلم کو سولو کرنے میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گی۔''
مہ پارہ فون پر بات کررہی تھی اور عروج اس کی یک

طرفہ گفتگو سنتی، وقفے وقفے سے ادا کیے جانے والے جملوں سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے باوجود کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ ایسے کیوں گھور رہی ہو؟'' مہ پارہ کال سے فارغ ہوئی تو اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر ٹوکا۔

''تم کچھ مشکوک نہیں ہوتی جا رہیں؟''

''تم کب سے پولیس میں بھرتی ہوگئیں کہ ہر بندے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگی ہو۔'' مہ پارہ نے اسے ٹالا اور پھر وقت دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ آج تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئی ہو۔ شوٹنگ پر نہیں جانا ہے؟''

''نہیں۔'' عروج کہہ کر آرام سے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

''کیا مطلب نہیں؟ کل تو تمہارے پاس کال آئی تھی کہ آج شوٹ ہے۔''

''مٹی ڈالو شوٹ پر۔ جس چکر میں، میں اس کام میں الجھی تھی وہ تو حل ہوگیا پھر کیا ضرورت پڑی ہے خوار ہونے کی۔ ہم اپنا کوئی پروگرام بناتے ہیں۔ ویکیشنز اسٹارٹ بھی ہو چکی ہیں اور اس بار ہمارے پاس ان کے لیے کوئی پلان ہی نہیں ہے۔''

''لیکن تمہیں شوٹ پر جانا چاہیے۔ تمہاری کمٹمنٹ ہے ان لوگوں کے ساتھ۔'' مہ پارہ ابھی تک اسی موضوع پر اٹکی تھی۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا تو ویسے بھی بھرتی کا ہی رول ہے۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ میرے نہ جانے پر شکر ہی ادا کریں۔'' عروج کے اطمینان میں فرق نہیں آیا اور ہنوز بستر پر نیم دراز پڑی رہی۔

''فضول باتیں مت کرو۔ اس رول کو حاصل کرنے کے لیے تم نے سارہ سے سفارش کروائی تھی اور اپنے موبائل کی قربانی بھی دی تھی۔ اب تم ایک دم سے اسے کیسے چھوڑ سکتی ہو؟'' مہ پارہ کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے اس کا فیصلہ قطعی پسند نہیں آرہا تھا۔

''میں نے کہا نا کہ یہ سارا چکر نیہا کا مسئلہ حل کرنے کے لیے تھا۔ اب جبکہ مسئلہ حل ہوگیا ہے تو میں کیوں وہاں جاؤں۔ سارہ سے میں معذرت کرلوں گی اور رہی موبائل کی بات تو، وہ تو کیس ختم ہونے کے بعد مجھے واپس مل ہی جائے گا ورنہ ڈیڈی نیا دلوا دیں گے۔'' عروج ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

''تمہیں وہاں جانا ہوگا۔ فٹافٹ اٹھو اور تیاری کرو۔ میں بھی تیار ہو رہی ہوں۔''

''عجیب زبردستی ہے۔ میں کہہ رہی ہوں مجھے نہیں کرنا کوئی ڈراما شراما تو پھر تم کیوں میرے پیچھے پڑی ہو۔'' عروج نے خفگی کا اظہار کا۔

''اس لیے پیچھے پڑی ہوں کہ اس سارے چکر.... میں، ایک لڑکی موت کے منہ میں چلی گئی ہے اور اسے اس دلدل سے نکالنے کے لیے ہمیں ہاتھ بڑھا کر اس کی مدد کرنی ہوگی۔'' مہ پارہ کے لہجے سے بیک وقت غم و غصہ جھلک رہا تھا۔

''کس لڑکی کی بات کر رہی ہو تم؟'' عروج نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نتاشا۔''

''کون نتاشا؟''

''وہی جس کا موبائل فرسٹ ڈے تمہارے ساتھ چوری ہوا تھا۔''

''اس سے تمہارا کیا تعلق؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ موت کے منہ میں ہے۔ آئی تھنک، فرسٹ ڈے کے بعد تو دوبارہ ہماری اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔''

''میری ہوئی تھی۔'' مہ پارہ نے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا۔

''کب، کیسے اور کیوں؟''

''میں نے تمہارے موبائل سے اس کا بلکہ ان چاروں لڑکیوں کے ایڈریس لیے تھے جن کے موبائل اس روز تمہارے ساتھ چوری ہوئے تھے۔'' مہ پارہ نے اعتراف کیا۔ (عروج آج کل اپنے ایک پرانے موبائل سیٹ سے گزارا کر رہی تھی)

''تمہیں اس سب کی ضرورت پیش کیوں آئی؟''

''اصل مجرم تک پہنچنے کے لیے۔''

''کیا مطلب؟ تم نے خود ڈیڈی سے کہہ کر مودی کو ثبوتوں سمیت گرفتار کروایا اور اب شاید یہ کہنے کی کوشش کر رہی ہو کہ مودی اصل مجرم نہیں ہے۔'' عروج کو اس کی بات سے برقی جھٹکا سا لگا تھا۔

''جرم جاری ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ابھی ہم اصل مجرم تک نہیں پہنچ سکے۔''

''پہیلیوں میں بات کرنے سے بہتر ہے تفصیل سے سب کچھ بک دو۔'' عروج جھلا سی گئی۔

''میں ان چاروں لڑکیوں سے ملاقات کے لیے گئی

تھی۔ باقی تین کی طرف تو حالات نارمل تھے لیکن نتاشا کے بارے میں پتا چلا کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے اور اسے اس کے گھر والے اسپتال لے کر گئے ہوئے ہیں۔ میں اسپتال جا کر ان لوگوں سے ملی۔ بہت مشکل سے اس کا بھائی بات کرنے پر راضی ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ نتاشا نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔ گھر میں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں تھا کہ ایسی نوبت آتی۔ ہاں نتاشا خود کچھ دن سے الجھی ہوئی اور چپ چپ دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کی وجہ بھی یہ سمجھی گئی کہ چونکہ وہ آڈیشن میں کامیاب نہیں ہو سکی اس لیے اُداس ہے۔ ناکامی پر اداسی نارمل ہے لیکن خودکشی کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔''

''لوگ ناکامی کی صورت میں بھی خودکشی کر لیتے ہیں۔ آئے دن ایسے کیسز رپورٹ ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' عروج نے ساری بات سُن کر اس سے اختلاف کیا۔

''ایسا عموماً وہاں ہوتا ہے جہاں فیملی سپورٹ نہ کرتی ہو۔ نتاشا کی فیملی بہت زیادہ سپورٹ کرنے والی ہے۔ اس دن آڈیشن کے لیے بھی اس کا بھائی اسے ڈراپ کر کے گیا تھا۔''

''پھر...... پھر کیا وجہ بنی اس کی خودکشی کی؟'' عروج حیران ہوئی۔

''میں نتاشا کے بھائی کی مدد سے اس کی ایک قریبی سہیلی تک پہنچی، اس سہیلی کو کریدنے پر انکشاف ہوا کہ نتاشا کو بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ بنیادی طور پر نتاشا اپنے ہی حسن سے عشق کرنے والی لڑکی تھی اور اس عشق میں اس نے اپنی کچھ ایسی ویڈیوز بنا رکھی تھیں جنہیں نازیبا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سہیلی کے مطابق اس کی وہ ویڈیوز کسی کے ہاتھ لگ گئی تھیں اور ان کی بنیاد پر اسے بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے پاس روپیا پیسا تو کچھ ایسا خاص تھا نہیں اس لیے اس سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ وہ بلیک میلر سے ملاقات کرے۔ نتاشا بچی نہیں تھی کہ اس ملاقات کے نتائج نہ سمجھ پاتی اس لیے جب اس پر حد سے زیادہ دباؤ بڑھا تو اس نے خودکشی میں اپنی نجات ڈھونڈی۔'' مہ پارہ نے اسے مکمل تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''پھر اب آگے کا کیا پلان ہے؟''

''نتاشا تھوڑی سی اور بہتر ہو جائے پھر اسے ہی چارہ بنا کر مجرم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''نیہا سے بات کریں، ہو سکتا ہے اس سے کوئی مدد مل جائے۔'' عروج نے تجویز پیش کی۔

''اس کو رہنے دو۔ اس نے خود تمہیں بتایا تھا کہ سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ جب سب ٹھیک ہے تو ہم اس کے ذریعے بلیک میلر تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہمیں فی الحال نتاشا کو ہی فوکس کرنا ہوگا۔ نتاشا کا بھائی بتا رہا تھا کہ اس کے فون پر کئی بار ان نون نمبرز سے کالز آئی ہیں۔ وہ کال ریسیو کرتا ہے تو دوسری طرف سے کال کاٹ دی جاتی ہے۔ میں نے اس سے وہ سارے نمبرز لے کر ڈیڈی کے حوالے کر دیے ہیں۔ بہت زیادہ امید تو نہیں لیکن شاید وہ نمبرز ٹریس ہو جائیں۔'' مہ پارہ نے اس کی تجویز رد کرتے ہوئے وجوہات بھی بتائیں۔

''تم تو بڑی چھپی رستم نکلیں۔ بالا ہی بالا اتنا کچھ کر گئیں اور ہم میں سے کسی کو خبر نہیں ہونے دی۔'' عروج نے اس سے شکوہ کیا۔

''میں تو بس ایویں اپنا شک دور کرنے کے لیے انوالو ہوئی تھی۔ اندازہ بھی نہیں تھا کہ اتنا کچھ نکل آئے گا اس کیس میں۔'' مہ پارہ نے صفائی پیش کی۔

''مطلب یہ ہے کہ ہمیں باقی ماندہ وکیشنز بھی اس کیس پر کام کرتے ہوئے ہی گزارنی ہیں اس لیے اگر کسی کے ذہن میں کوئی اور خیال ہے تو وہ اسے پوری طرح سے نکال دے۔''

''ہاں جی، بالکل یہی مطلب ہے۔'' مہ پارہ نے زور شور سے اس کی تائید کی۔

☆☆☆

''کی تو تم نے گروپ کے رولز کے خلاف حرکت ہے لیکن تمہاری نیت نیک تھی اس لیے ہم تمہیں معاف کر رہے ہیں۔''

''بہت شکریہ ملکہ عالیہ ورنہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ اس جرم پر مجھے دیواروں میں نہ چنوا دیں۔'' لبنیٰ کی طرف سے معافی کا اعلان سن کر مہ پارہ نے انارکلی جیسی ٹون میں اس کا شکریہ ادا کیا تو سب ہنس پڑیں۔

''مسخرہ پن چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ آگے کیا کرنا ہے؟ کیا نتاشا اور اس کے گھر والے تعاون کے لیے تیار ہیں؟''

''بالکل تیار ہیں۔ اس کے سوا ان کے پاس آپشن ہی نہیں ہے۔ تعاون نہیں کریں گے تو بیٹی کی جان اور عزت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' مہ پارہ نے سنجیدہ لہجے میں روشی کے سوال کا جواب دیا۔

''اور وہ مسٹر مودی...... وہ کیا کہتا ہے؟ اس کے بیان میں کوئی تبدیلی آئی؟''

''نہیں۔ وہ اب تک اسی بات پر اڑا ہوا ہے کہ کسی نے اسے پھنسانے کی کوشش کی ہے اور اس پر جو بھی الزامات لگائے جا رہے ہیں، وہ سب جھوٹے ہیں۔''

''موجودہ حالات میں وہ سچا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ یقیناً اس کے لوگوں میں کوئی کالی بھیڑ ہے جس نے اسے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔'' مہ پارہ نے رائے دی۔ کسی کی طرف سے اس رائے کی تائید یا تردید ہوتی اس سے قبل ہی عروج کے موبائل کی رِنگ ٹون سنائی دینے لگی۔

''نیہا کالنگ۔''

''لاؤ مجھے دو، میں بات کرتی ہوں۔'' کالر کا نام سنتے ہی مہ پارہ نے اس سے فون جھپٹ لیا۔

''ہیلو، ہاں نیہا، میں مہ پارہ بات کر رہی ہوں۔ عروج شاور لے رہی ہے تو میں نے سوچا میں تمہاری کال پک کرلوں۔''

''کیسی ہو پارو؟ بہت دن ہوئے تم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' نیہا نے بڑے اخلاق سے پوچھا۔

''بھئی تم نے کبھی یاد ہی نہیں کیا۔''

''ہاں، وہ بس شوبز کی مصروفیت نے سب پرانے دوست چھڑوا دیے۔'' نیہا نے جھینپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''بزرگ کہتے ہیں نا اولڈ از گولڈ...... تو دیکھو مشکل وقت میں پرانے دوست ہی کام آئے۔''

''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم لوگوں نے میری جتنی بڑی مشکل حل کی ہے اس کے لیے میں تمہارا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔'' اس نے عاجزی کا اظہار کیا۔

''دوستوں کا شکریہ تھوڑی ادا کرتے ہیں یار! دوستوں پر تو حق ہوتا ہے۔'' مہ پارہ نے اپنایت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ بھی بس تم لوگوں کا اخلاق ہے کہ مجھ نکمی کو اب بھی اپنا دوست مانتی ہو۔ ورنہ میں تو تم لوگوں سے رابطہ تک نہ رکھ سکی۔'' وہ شرمندہ سی تھی۔

''اِٹس او کے یار! ہم تمہاری پرابلم سمجھتے ہیں۔ شہرت کے لیے انسان کو قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور پرانے دوست چھوڑ کر نئے دوست بنانے پڑتے ہیں۔'' مہ پارہ نے اسے تسلی دی۔

''شکر ہے کہ تم نے اس بات کو سمجھا ورنہ عام طور پر لوگ طعنے ہی دیتے ہیں۔ خیر جانے دو اس بات کو اور یہ بتاؤ کہ کچھ پیش رفت ہوئی؟ اس مودی خبیث نے اپنا جرم قبول کیا یا نہیں؟''

''پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ آج نہیں تو کل تسلیم کر ہی لے گا۔''

''میں جلد از جلد اسے اس کے انجام تک پہنچتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ جس طرح اس نے میرے دن رات کا سکون حرام کر رکھا تھا، میرے پاس اس کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔''

''جرم ثابت ہو گیا تو اسے سخت سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ڈیڈی اس کیس میں پرسنلی انٹرسٹ لے رہے ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ انکل سے کہنا کہ اسے چھوٹنے نہ دیں ورنہ جانے اور کس کی زندگی دوبھر کر دے گا۔'' اس کے لہجے میں مودی کے لیے شدید غصہ تھا۔

''کیا تمہیں اس پر پہلے سے شک تھا کہ وہی تمہیں بلیک میل کر رہا ہے؟''

''پہلے تو نہیں تھا لیکن جب ایک سورس سے اس کے ریسٹورنٹ میں خفیہ کیمروں کا پتا چلا تو لگا کہ جب کوئی شخص ایک گندا دھندا کر سکتا ہے تو دوسرا اس کے لیے کون سا مشکل ہے۔''

''اپنے سورس کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟'' مہ پارہ نے پوچھا۔

''سوری یار، نہیں بتا سکتی۔ میں نے پرامس کیا تھا اس سے کہ اس کا نام کہیں نہیں آئے گا۔'' نیہا نے معذرت کرلی۔

''اِٹس او کے، کوئی زبردستی نہیں ہے۔'' مہ پارہ نے اصرار نہیں کیا۔

''اچھا تو اب مجھے اجازت دو لیکن خیال رکھنا کہ کیس کے متعلق مجھے اپ ڈیٹ دیتی رہو۔'' نیہا نے تاکید کی اور ایک آدھ مزید رسمی گفتگو کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

''میں نے سوچا کہ کہیں تم اسے نتاشا کے بارے میں کچھ نہ بتا دو اس لیے خود اس سے بات کرنا مناسب سمجھا۔'' عروج کو اس کا موبائل واپس کرتے ہوئے مہ پارہ نے اس کی الجھن دور کی۔

''کیا تم نیہا پر شک کر رہی ہو؟'' روشی نے فوراً سوال اٹھایا۔

''شک کے دائرے سے مودی سمیت کوئی بھی باہر نہیں ہے۔ جب تک اصل مجرم پکڑا نہیں جاتا ہر شخص مشکوک ہے۔''

''ایڈی تو وڈی جسوسن...... بند کر دو یہ شرلاک ہومز کا فی میل ورژن اور اچھی مشرقی بیبیوں کی طرح ہماری کچھ

خاطر تواضع کرو۔" روشی نے اسے شرم دلائی۔

"عروج ذرا تم زحمت کرو۔ مابدولت تو فی الحال صرف غور وخوض کریں گے۔" اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور صوفے کی پشت گاہ سے کمر اور سر ٹکا کر ایسے آنکھیں موند کر بیٹھ گئی کہ پوز میں محض سگار کی کمی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"خیال رکھنا، وہ کسی صورت نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور نہ ہی کسی کو اندازہ ہو کہ ہم اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔"

"ڈونٹ وری۔ سب اچھی طرح چل رہا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی تعاقب کا اندازہ بھی لگا سکے۔ میں اگلے سگنل سے مڑنے لگی ہوں۔ میری جگہ لینے کے لیے لبنیٰ ریڈی ہے۔" روشی نے اسے تسلی دی۔

انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا اور نتاشا کے پاس بلیک میلر کی کال آگئی تھی۔ ان کی ہدایت کے مطابق پہلے اس نے بلیک میلر کی خوب منت سماجت کی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی خودکشی کی کوشش سے بھی آگاہ کر دیا تھا پھر اس کی دھمکیوں کے بعد ملاقات کے لیے راضی ہو گئی تھی۔ اب وہ ایک آن لائن پرائیویٹ ٹیکسی کے ذریعے ملاقات کے لیے جا رہی تھی۔ یہ ملاقات کہاں ہونی تھی، اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا اور صرف اتنی ہدایت کی گئی تھی کہ اپنا موبائل ساتھ رکھو، ملاقات کے مقام سے راستے میں آگاہ کر دیا جائے گا۔ ملنے والی ہدایات پر عمل کیا جا رہا تھا اور ٹیکسی نتاشا کو لیے شہر کی سڑکوں پر دوڑی جا رہی تھی۔ جس طرح ٹیکسی کو ادھر اُدھر گھمایا جا رہا تھا۔ اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ تعاقب کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے وہ چاروں بھی چوکس تھیں اور الگ الگ گاڑیوں میں تعاقب کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھیں۔ یہ پولیس چور کا کھیل قریباً سوا گھنٹے بعد اس وقت ختم ہوا جب ٹیکسی نتاشا کو ایک مشہور ہوٹل کے سامنے اتار کر آگے بڑھ گئی۔ اس وقت روشی اس کے قریب موجود تھی۔ اس نے باقی تینوں کو ڈراپنگ پوائنٹ کے بارے میں آگاہ کیا اور خود قدرے حیرت سے نتاشا کی طرف دیکھا جو ابھی تک باہر ہی کھڑی تھی اور ہوٹل کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھایا تھا۔

"نتاشا کے بالکل قریب رہنا روشی! ایسا نہ ہو کہ وہ اندر جا کر کسی روم میں غائب ہو جائے اور ہمیں پتا بھی نہیں چلے۔" یہ مہ پارہ تھی جو اسے ہدایت دے رہی تھی۔

"لیکن وہ تو اندر جا ہی نہیں رہی۔ ایک جگہ گم صم اور ساکت کھڑی ہے۔" روشی نے الجھن زدہ لہجے میں اسے جواب دیا اور نتاشا کی طرف غور سے دیکھا۔ اس بار اسے احساس ہوا کہ نتاشا نارمل نہیں ہے۔ اس کی پھٹی پھٹی سی آنکھیں، سرخ ناک اور لرزتے ہونٹ کسی انہونی کا پتا دے رہے تھے۔ لباس بھی کچھ مسلا ہوا اور بے ترتیب تھا۔ روشی سے برداشت نہیں ہوا اور یک دم ہی دروازہ کھول کر گاڑی سے اتری۔ یہ وہ لمحہ تھا جب سڑک پر ایک دیوہیکل ٹرک نمودار ہوا اور تیزی سے اس طرف آنے لگا۔ ٹرک کو آتے دیکھ کر نتاشا کے گم صم وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور قدم تیزی سے آگے بڑھے۔ روشی نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کا ارادہ بھانپ لیا اور اتنی تیز دوڑی کہ اپنی زندگی میں بھی اس رفتار سے نہ دوڑی ہو گی۔ نتاشا خود کو ٹرک کے آگے ڈالتی اس سے قبل ہی وہ اس سے ٹکرائی اور اسے اپنے ساتھ لیتی ہوئی سڑک کے کنارے گر پڑی۔ کئی راہ گیروں نے یہ منظر دیکھا اور تیزی سے ان کے گرد ہجوم جمع ہونے لگا۔ اس ہجوم سے بے نیاز نتاشا زور زور سے چیخنے اور روشی کو دھکیلنے لگی۔

"ہٹیں، سب پیچھے ہٹ جائیں۔ کیوں تماشا لگا کر کھڑے ہو گئے ہیں یہاں۔" مہ پارہ جو دور سے سارا منظر دیکھ چکی تھی، گاڑی روک کر تیزی سے ہجوم کے درمیان پہنچی اور لوگوں کو جھاڑا۔

"تماشا ہم نے نہیں، ان لڑکیوں نے لگا رکھا ہے بی بی!"

"اور نہیں تو کیا، میں تو کہتا ہوں پولیس کو بلاؤ۔ پولیس معلوم کرے گی کہ یہ کیا چکر ہے۔" ہجوم مردوں پر مشتمل تھا اس لیے ایک لڑکی کی بھڑک پر منتشر ہونے کے بجائے دھمکانے پر اتر آیا۔

"شوق سے بلاؤ لیکن یاد رکھنا کہ خود تمہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہاں آنے والے کسی بھی پولیس والے کے لیے صرف میرے باپ کا نام کافی ہو گا۔ اس کے بعد میں تم میں سے جس کی طرف اشارہ کروں گی اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی نظر آئے گی۔" مہ پارہ ڈرنے کے بجائے دبنگ انداز میں جواب دینے کھڑی ہو گئی۔ اس دوران عروج اور لبنیٰ بھی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے سہارا دے کر روشی اور نتاشا کو کھڑا کیا اور ہجوم سے نکال کر لے گئیں۔ مہ پارہ کے دبنگ انداز کے بعد کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان کی راہ روکتا۔ کچھ دیر میں ہی وہ وہاں سے نکل کر واپس گھر

پہنچ چکی تھیں۔ نتاشا کی حالت کے پیشِ نظر اسے اس کے گھر نہیں لے جایا گیا تھا اور مہ پارہ نے اس کے بھائی کو فون کر کے بہانا بنا دیا تھا کہ وہ معلومات کے حصول کے لیے اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔

''اب بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟'' گھر پہنچ کر بہت دیر بعد نتاشا کے حواس بحال ہوئے تو مہ پارہ نے اس سے پوچھا۔ اتنا اندازہ البتہ وہ لگا چکی تھی کہ جو بھی ہوا ہے بات آخری حد تک نہیں گئی ہے اور نتاشا محفوظ ہے۔

''میں ٹیکسی میں بیٹھی تو دیکھا وہاں ایک طرف کمبل پڑا ہوا ہے اور اس کے نیچے شاید کوئی سامان ہے۔ مجھے عجیب لگا لیکن ڈرائیور سے کچھ نہیں کہا۔ گاڑی روڈ پر آئی تو یک دم اس کمبل کے نیچے سے ایک آدمی نکل کر سیٹ پر میرے برابر آ بیٹھا۔ میں ڈر کے مارے چیخنے لگی تھی لیکن اس نے پسٹل دکھایا اور بولا کہ آواز نکالی تو گولی مار دوں گا۔ پھر وہ میرے ساتھ دست درازی کرنے لگا۔ گاڑی کے شیشے ٹنٹڈ تھے، کسی کو کیا پتا چلتا کہ میرے ساتھ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ میرے ساتھ بے ہودہ حرکات کرتا رہا اور بتایا کہ یہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے۔ پورے سفر میں وہ میرے ساتھ کھیلتا رہا اور میری بے بسی پر قہقہے لگاتا رہا۔ اتارنے سے پہلے دھمکی دی کہ آئندہ بلانے پر نہ آئی تو موجودہ اور سابقہ ساری ویڈیوز سوشل میڈیا پر اَپ لوڈ کر دوں گا۔ میں روز روز یہ ذلت سہنے کو تیار نہیں تھی اس لیے مرنے کی کوشش کی لیکن آپ لوگوں نے ایک بار پھر مجھے اس ذلت بھری زندگی کے لیے بچا لیا۔'' وہ اپنی بات کے اختتام پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''خودکشی میں نجات ڈھونڈنا بے وقوفی ہے نتاشا! تمہیں بہادری سے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ تم ڈٹ کر کھڑی رہو گی تو ہی ہم تمہاری مدد کر سکیں گے۔'' ایک بار پھر ان سب نے مل کر اسے سنبھالا اور سمجھانے لگیں۔

''اچھا بتاؤ کہ اس شخص اور ٹیکسی ڈرائیور کے حلیے کیسے تھے۔ ہماری عروج بہت اچھے اسکیچز بنانا جانتی ہے۔ تم تفصیلی حلیہ بتا کر اسکیچز بنوا دو تو ہم پولیس کی مدد سے انہیں گرفتار بھی کروا سکتے ہیں۔'' اس نے رونا بند کیا تو نتاشا سے اس نے پوچھا۔

''حلیے کیسے بتاؤں، ڈرائیور نے ماسک پہن رکھا تھا۔ سر پر پی کیپ اور آنکھوں پر ڈارک گلاسز تھے جبکہ اس دوسرے آدمی نے سر سے لے کر گردن تک موزے کی طرح کھینچ کر پہننے والا کپڑے کا نقاب پہن رکھا تھا۔ اس نقاب میں آنکھوں، ناک اور ہونٹوں کی جگہ سوراخ تھے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اس کا نقاب نوچ کر اتار سکوں۔ اس کوشش میں اس کی گردن پر خراشیں بھی آ گئیں لیکن میں کامیاب نہیں ہو سکی اور اس نے غصے میں مجھے دو تین تھپڑ بھی مارے۔'' نتاشا کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''اٹھو، چلو میرے ساتھ۔'' مہ پارہ نے اس کی بات سنی اور کھڑی ہو کر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''لیکن کہاں؟'' نتاشا حیران و پریشان ہوئی۔

''چلو گی تو خود ہی پتا چل جائے گا۔'' مہ پارہ نے اس کی کلائی تھام کر اسے کھڑا کر دیا۔ سوال اس کی ساتھیوں کی نظروں میں بھی تھا لیکن وہ جواب دینے کے بجائے کسی کا نمبر ڈائل کرنے میں مصروف تھی۔

☆☆☆

بڑھی ہوئی شیو، متورم سرخ آنکھیں، بے ترتیب بال اور ملگجے کپڑے...... یہ تھا شوبز کی دنیا کا وہ چمکتا دمکتا ستارہ جسے دنیا مراد سے زیادہ مودی اور مسٹر مودی کے نام سے پکارتی تھی۔ ہمیشہ ٹک سک سے تیار رہنے والے لاکھوں دلوں کی دھڑکن مودی کو اگر اس کا کوئی پرستار اس حال میں دیکھ لیتا تو اس کے دل پر چھریاں چل جاتیں۔

''کم بخت اس حلیے میں بھی غضب ڈھا رہا ہے۔'' روشی نے عروج کے کان میں سرگوشی کی۔

''بالکل کسی ٹریجک مووی کے ہیرو کی طرح۔'' عروج نے اس کی تائید میں تبصرہ جاری کیا۔

وہ آج سہیل مرزا کی خصوصی سفارش کے ساتھ مودی سے ملنے وہاں آئی تھیں لیکن طے یہ پایا تھا کہ صرف مہ پارہ مودی سے براہِ راست ملاقات کرے گی اور وہ تینوں دوسرے کمرے میں رہ کر محض مشاہدہ کریں گی۔ مہ پارہ صحافی کے روپ میں مودی سے مل رہی تھی اور اس وقت ناک پر نازک سے فریم کا چشمہ لگائے نہایت سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔

''مجھے آپ جیسی مشہور و معروف شخصیت کو یہاں دیکھ کر افسوس ہوا مسٹر مراد!'' باقاعدہ سوال جواب کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے اس نے مراد سے اظہارِ ہمدردی کیا۔

''افسوس تو مجھے بھی ہے کہ فن کی دنیا میں میری اتنی خدمات کو بھلا کر مجھے ایک جھوٹے الزام میں یہاں قید کر دیا گیا ہے اور مجھے میرے دفاع کے لیے بالکل بھی موقع نہیں دیا جا رہا۔'' اس نے فوراً دکھی تاثرات کے ساتھ شکوہ داغا۔

"کیا مطلب؟ کیا آپ کو قانونی جنگ لڑنے کے مواقع فراہم نہیں کیے جارہے؟ آپ کو اپنے وکلا سے ملنے کی سہولت حاصل نہیں یا کوئی اور مسئلہ ہے؟" مہ پارہ نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے اس کے شکوے کی وجہ دریافت کی۔

"یہ مسئلہ نہیں لیکن یہ لوگ مجھے میڈیا سے دور رکھ رہے ہیں۔ مجھے موقع نہیں دیا جارہا کہ میں اپنے فینز کو اپنی صفائی پیش کروں۔ یہ جانتے ہیں کہ اگر میں اپنے فینز سے رابطے میں آگیا تو ان پر دباؤ بڑھ جائے گا اور یہ اس طرح مجھے یہاں رکھ کر ذہنی و جسمانی اذیت نہیں دے سکیں گے۔" وہ بولتے بولتے جوش میں آگیا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگی تھی۔

"آپ بے فکر رہیں۔ آپ پر پابندی کے باوجود آپ کے فینز آپ کے لیے فکرمند ہیں اور آپ کے وکیل کی سرپرستی میں سوشل میڈیا پر آپ کے حق میں مہم چلائی جارہی ہے۔" مہ پارہ نے اسے تسلی دی۔

"میری برسوں کی عزت خاک میں مل گئی ہے۔ دس حمایتی ہیں تو چار لوگ انگلیاں بھی اٹھا رہے ہیں۔ میرے کردار پر طرح طرح کی باتیں بنائی جارہی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں گہرے دکھ کی ترجمانی کرتی نمی امڈ آئی۔ دوسرے کمرے سے خفیہ طور پر اسے دیکھتی وہ تینوں دکھ سے "ہائے" کر کے رہ گئیں۔ نم بخت اسکرین پر ہی نہیں حقیقت میں بھی دلوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"میں آپ کا دکھ سمجھ رہی ہوں مسٹر مراد لیکن اس بات کو تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ یہ سب بے وجہ نہیں ہے۔ پولیس نے آپ کو ثبوتوں کے ساتھ گرفتار کیا ہے۔ آپ اپنے دفتر اور ریسٹورنٹ سے ملنے والے ثبوتوں سے خود کو بری الذمہ تو نہیں ٹھہرا سکتے۔ آپ کے ریسٹورنٹ کے بیسمنٹ میں سارا سیٹ اپ موجود ہے اور کئی قابلِ اعتراض ویڈیوز پکڑی گئی ہیں۔"

"وہاں جو سسٹم نصب ہے وہ صرف اور صرف ریسٹورنٹ کی سیکیورٹی کے لیے ہے۔ اس سسٹم میں کس نے نقب لگائی اور اپنے مذموم مقاصد کے لیے اس کا غلط استعمال کیا، میں اس بارے میں بالکل نہیں جانتا۔" اس نے اضطرابی کیفیت میں اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں سنوارنے کی کوشش کی۔

"اندر کے آدمی کے بغیر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ پولیس نے اس کیس میں آپ کے ساتھ آپ کے ریسٹورنٹ کے منیجر اور دیگر عملے کو بھی گرفتار کیا ہے۔ کیا آپ کو ان میں سے کسی پر شک ہے؟ اسپیشلی منیجر کے بارے میں بتائیں کہ وہ کیسا آدمی ہے اور کیا آپ اس پر مکمل بھروسا کر سکتے ہیں؟"

"منیجر میرے ساتھ ریسٹورنٹ کے آغاز سے ہی موجود ہے۔ میں اس پر اعتماد کرتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس کی نیت میں فتور آجائے۔ پیسا بڑے بڑوں کا ایمان ڈگمگا دیتا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی ایسا دشمن جس پر آپ کو شک ہو کہ اس نے آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ سازش تیار کی ہے؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے؟ شوبز کی دنیا میں بظاہر سب دوست بن کر ملتے ہیں لیکن کسی کا کچھ پتا نہیں ہے کہ کب آپ کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دے۔" وہ حقیقت بیان کررہا تھا۔

"پھر بھی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ کسی سے آپ کا باقاعدہ جھگڑا، اختلاف یا منہ ماری وغیرہ ہوئی ہو اور اس نے آپ کے خلاف یہ سازش تیار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہو۔ آپ ویسے بھی انڈسٹری کے ایسے فرد ہیں جنہیں بہت نازک مزاج افراد میں شمار کیا جاتا ہے۔" مہ پارہ نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

"ایسے تو کئی لوگ ہیں۔ میں اپنے منہ سے کسی کا نام کیا لوں۔ آپ خود صحافی ہیں اور ریکارڈ پر موجود ایسے جھگڑوں کی ڈیٹیل نکلوا سکتی ہیں۔" اس نے کھل کر کسی کا نام لینے سے گریز کیا۔ مہ پارہ نے اس کے بعد بھی اس سے چند ایک سوال کیے اور تسلی تشفی دے کر باہر نکل آئی۔

"کیا کہتی ہو تم لوگ؟" وہاں سے نکل کر اس نے ان کی رائے جاننی چاہی۔

"ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ مودی اپنے بیان پر ڈٹا ہوا ہے تو دوسری طرف پولیس ریسٹورنٹ کے منیجر سے بھی کوئی ایسی بات نہیں اگلوا پائی جس سے ثابت ہو کہ منیجر اس سارے دھندے میں انوالو تھا۔" روشی نے رائے کا اظہار کیا اور باقی نے اس کی تائید میں سروں کو جنبش دی۔

"میرے خیال میں ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ نیہا کا ماضی میں مودی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس نے مودی سے ماضی کا کوئی بدلہ لینے کے لیے اس کے خلاف سازش تیار کی ہو۔" لبنیٰ نے اچانک ہی مشورہ دیا تو پہلے سب حیران رہ گئیں پھر عروج نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر نیہا کا اس سے کوئی جھگڑا تھا بھی تو وہ اتنی بڑی سازش تیار نہیں کرسکتی تھی کہ اس کے خلاف ثبوت بھی تخلیق کردیتی۔''

''ثبوت کوئی اتنے زیادہ ٹھوس بھی نہیں ہیں۔ مودی کے دفتر سے ملنے والا تمہارا اور دیگر چار لڑکیوں کے موبائل یا ریسٹورنٹ کے بیسمنٹ میں موجود ایک کمپیوٹر جس میں وہاں کیبنز میں ریکارڈ ہونے والی کچھ ویڈیوز موجود ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہے کہ مودی بلیک میلنگ پلس ڈارک ویب وغیرہ کا کوئی دھندا چلا رہا تھا۔ یہ سب ثابت کرنے کے لیے پولیس کی تفتیشی ٹیم کو کچھ اور مواد ملنا چاہیے جو کہ نہیں ملا اس لیے تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب سازش ہی تھی۔'' لبنیٰ اپنی رائے پر قائم تھی۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پولیس ابھی تک اصل شواہد تک رسائی حاصل نہ کرسکی ہو۔ جو کچھ نتاشا کے ساتھ پیش آیا اسے نظرانداز نہ کرو۔ آن لائن ٹیکسی منگوانے پر مجرموں کے ہرکاروں کا وہاں پہنچ جانا معمولی بات نہیں ہے۔ یقیناً ان میں کوئی ایسا ماہر ہیکر رہا ہوگا جس نے یہ سارا بندوبست کیا کہ جب نتاشا ٹیکسی منگوائے تو اس کا رابطہ مخصوص بندے سے ہو اور وہ اسی کی ٹیکسی میں سفر کرے۔'' مہ پارہ نے نشاندہی کی۔

''پارو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم لوگ یہ بھی دیکھو کہ نتاشا کو اتنے اصرار کے بعد بلانے کے بعد وہ اسے کہیں لے کر نہیں گئے اور سارے شہر میں گھما کر صرف ٹیکسی میں مینٹلی ٹارچر کرنے پر اکتفا کیا۔ یعنی انہیں شک ہوگیا تھا کہ کوئی نتاشا کی نگرانی کررہا ہے اس لیے اپنی جان بچا کر نکل گئے۔'' روشی نے بھی ایک دلیل دی۔

''تو بس اب تو یہی حل رہ گیا ہے کہ ڈی این اے میچنگ ہوجائے اور اصل مجرم سامنے آجائے۔''

''یہ حل نہیں صرف ایک امید ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم نے جن مشکوک افراد کی لسٹ پولیس کو دی ہے ان میں وہ فرد بھی شامل ہو جس کی گردن پر نتاشا نے اپنے ناخن سے خراشیں ڈالی تھیں۔ وہ کوئی ایسا فرد بھی ہوسکتا ہے جو منظر پر موجود ہی نہ ہو۔'' مہ پارہ نے لبنیٰ کی بات پر زیادہ امید ظاہر نہیں کی۔ نتاشا کی زبانی یہ سن کر کہ اس نے ٹیکسی میں خود پر دست درازی کرنے والے شخص کو نوچا تھا اس کے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا تھا کہ نتاشا کے ناخنوں سے خون اور کھال کے ریشوں کا سیمپل لے کر ڈی این اے ریکارڈ حاصل کرلیا جائے اور پھر تمام مشکوک افراد کے سیمپل لے کر میچنگ کرلی

جائے۔ آج کل یہی کام ہو رہا تھا اور انہیں شدت سے رزلٹ کا انتظار تھا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجرم کا نام لسٹ میں شامل ہو اور ڈی این اے کے لیے سیمپل لینے پر وہ چونک کر فرار ہونے کی کوشش کرے۔“

”پولیس سارے مشکوک افراد کا نام ای سی ایل میں ڈلوا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نگرانی بھی ہو رہی ہے اس لیے کسی کو فرار کا موقع ملنا مشکل ہے۔“ مہ پارہ نے تسلی دی اور پھر مسلسل موبائل پر مصروف عروج سے مخاطب ہوئی۔ ”تم کیا کھوج رہی ہو؟“

”جو کھوج رہی تھی، وہ مل چکا۔ یہ دیکھو دو سال پہلے نیہا اور مودی میں ہونے والے جھگڑے کی خبریں۔ دونوں سیٹ پر ہی ایک دوسرے سے بری طرح الجھ پڑے تھے اور کئی دن تک ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی کرتے رہے تھے لیکن پھر بعد میں کسی نے ان کے درمیان صلح کروا دی اور جب مودی نے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنایا تو نیہا اس کے ساتھ کام کرنے لگی۔“ عروج نے خبر سے منسلک مختلف ویڈیوز کا خلاصہ ان کے سامنے رکھا۔ شوبز میں زیادہ دلچسپی نہ رکھنے کے باعث ان میں سے کسی کو ان واقعات کا علم نہیں تھا۔

”مطلب یہ کہ بات ختم ہو کر بھی ختم نہیں ہوئی تھی اور نیہا نے مودی کے خلاف دل میں کینہ رکھا ہوا تھا اس لیے موقع پاتے ہی اسے پھنسا دیا۔“ لبنیٰ نے جلدی سے نتیجہ اخذ کیا۔

”معاملہ کیا تھا۔ یہ تو اب نیہا ہی سے اگلوانا پڑے گا۔“ مہ پارہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو یہ طے ہو گیا کہ اب نیہا کا سچ سامنے آ کر ہی رہے گا۔

☆☆☆

اجلی رنگت والی نازک سی نیہا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کسی اعترافی مجرم کی طرح ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے ان کے سامنے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی تھی اور اعتراف کر لیا تھا کہ آڈیشن والے دن عروج سمیت باقی لڑکیوں کے موبائل اسی کے اشارے پر غائب کیے گئے تھے۔ نتاشا کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ بھی اس کے علم میں تھا اور اس نے ان دو افراد کے نام بھی اگل دیے تھے جو ٹیکسی میں نتاشا کے ساتھ سفر کرتے رہے تھے۔

”انسپکٹر صاحب! مودی پروڈکشن ہاؤس سے اشعر اور بوبی کو گرفتار کر لیں۔ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ دو افراد بلیک میلرز کے اس گینگ کے اہم ارکان ہیں۔“ کچھ دیر نیہا کو تاسف بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد مہ پارہ نے متعلقہ پولیس افسر کو فون کیا اور اس سے کہا۔

”بوبی کے خلاف ثبوت تو ہمارے پاس بھی آ گیا ہے۔ اس کا ڈی این اے میچ کر گیا ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم نے اسے اندرون سندھ جانے والی ایک ڈائیوو میں چڑھتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔“ دوسری طرف سے انسپکٹر نے چہک کر رپورٹ دی۔

”اشعر کو بھی گرفتار کرنا ہے۔ بظاہر وہ ایک عام سا کمپیوٹر آپریٹر ہے لیکن اصل میں ایک کمپیوٹر ایکسپرٹ اور شاطر ہیکر ہے جس کی مدد سے مودی اپنا مکروہ دھندا جاری رکھے ہوئے تھا۔“

”مودی...... آپ کا مطلب ہے کہ مودی اس دھندے سے الگ نہیں ہے۔“ انسپکٹر حیران ہوا۔

”بالکل بھی نہیں۔ اصل میں تو وہی سرغنہ ہے جو اس گینگ کو نہایت ہوشیاری سے چلا رہا تھا اور شوبز کے ذریعے اپنی بلیک منی کو وائٹ کرتا جا رہا تھا۔ آپ اشعر کو اریسٹ کریں اور ایک ایڈریس نوٹ کریں۔ وہاں سے آپ کو سارے ثبوت مل جائیں گے۔ ہم اس کہانی کے ایک اہم کردار کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ رہے ہیں۔“ مہ پارہ نے فون بند کیا اور نیہا کی طرف رخ کر کے بولی۔

”کیا تم ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو؟“

”میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا آپشن ہی نہیں ہے۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

”آپشن نکل سکتا ہے نیہا، ہم کوشش کریں گے کہ پولیس تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لے۔“ عروج نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔

”ایسا نہ بھی ہو سکا تو میں تم سے شکایت نہیں کروں گی۔ میں اپنا بوجھ ہلکا کرنے نکلی تھی۔ اس عمل میں جو بھی خسارہ ہاتھ آیا اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کروں گی۔“ اب وہ خاصی حد تک پُرسکون ہو چکی تھی۔ تھانے تک کا سفر اس نے اسی سکون اور خاموشی کے ساتھ کیا۔

تھانے پہنچ کر معلوم ہوا کہ بوبی کے ساتھ ساتھ اشعر کو بھی گرفتار کر کے لایا جا چکا ہے۔ اشعر کے حلیے سے ظاہر تھا کہ گرفتار ہوتے ہوئے اس نے مزاحمت کی تھی جس کے نتیجے میں پولیس کے ہاتھوں خوب تواضع ہوئی تھی۔ بوبی کا ظاہری حلیہ بہتر تھا لیکن چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ناقابلِ تردید ثبوت کے ساتھ گرفتار ہوا ہے اس لیے

اسے اپنا انجام بالکل سامنے نظر آرہا تھا۔ ان دونوں نے نیہا کو تھانے میں دیکھا تو ان کی اتری ہوئی صورتیں مزید اتر گئیں۔

''میں نے آپ کو جو ایڈریس دیا تھا اس کا کیا ہوا انسپکٹر صاحب؟'' مہ پارہ نے وہاں ترتیب دی گئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے تفتیشی افسر سے دریافت کیا۔

''ہماری ٹیم وہاں پہنچ چکی ہے اور کارروائی جاری ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا اور نیہا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''فی الحال تو اسے ملزمان کی قطار میں ہی بٹھادیں۔ کیس میں اس کے خلاف کیا دفعات لگانی ہیں یہ آپ بعد میں ساری تفصیل سن کر فیصلہ کیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے پھر، جب ساری برات ہی جمع ہوگئی ہے تو دولھے راجا کو بھی بلوا لیتے ہیں۔'' انسپکٹر بشاشت سے بولا اور ایک ماتحت کو اشارہ کیا۔ اگلے چند منٹوں میں مودی کو وہاں حاضر کردیا گیا۔ اشعر، بوبی اور نیہا کو وہاں دیکھ کر ایک پل کے لیے اسے سانپ سونگھ گیا پھر خود کو سنبھال کر قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''یہ میرے اسٹاف اور مس نیہا کو یہاں کیوں اکٹھا کر رکھا ہے آپ نے؟'' سوال کرنے کے ساتھ اس کی نظریں مہ پارہ اور باقی تینوں کے چہروں پر بھی بھٹک رہی تھیں۔ یقیناً اس نے ان چاروں کو شناخت کرلیا تھا اور اندر ہی اندر مضطرب تھا کہ ایک صحافی، ایک ایکٹنگ کی شوقین لڑکی اور دو عدد یوٹیوبرز اس موقع پر وہاں کیوں موجود تھیں۔

''ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ ایک اچھے ایکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی ہیں۔ ہمارے پاس ایک اچھی کہانی موجود تھی تو ہم نے سوچا اسے اس کے کرداروں سمیت آپ کے سامنے پیش کردیا جائے۔ ہوسکتا ہے آپ اسے اپنی نیکسٹ سیریل یا ٹیلی فلم کے لیے پسند کرلیں۔'' اسے جواب دیتے ہوئے مہ پارہ کا لہجہ زہر خند تھا۔

''بہت ہی عجیب بات کررہی ہیں آپ مس۔ میں یہاں پولیس کی کسٹڈی میں اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوں اور آپ مجھے کہانی سنانے پہنچ گئی ہیں۔ پہلے مجھے یہاں سے نکلنے تو دیں پھر یہ کام بھی کرلیں گے۔'' فضا کی سنگینی محسوس کرلینے کے باوجود وہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو انجان اور معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''مسئلہ یہ ہے مسٹر موڈی کہ انسپکٹر صاحب آپ کو یہاں سے باہر نکال کر معاشرے میں ایک پاگل کتے کو آزاد چھوڑنے کے حق میں نہیں ہیں۔ آپ یہاں سے نکلیں گے تو سیدھے بڑے گھر جائیں گے اس لیے کہانی آپ کو یہیں پر سننی پڑے گی۔'' اس بار رمشی اس پر غرائی۔

''یہ کیا بکواس ہے انسپکٹر! آپ نے یہاں کیا تماشا لگا رکھا ہے۔'' مودی بھڑک کر بولا لیکن وہاں موجود لوگ محسوس کرسکتے تھے کہ اس کے بھڑکنے میں ایک خوف سا چھپا ہوا ہے۔

''اوئے چپ کر کے بیٹھ طرم خان! صاحب کے سامنے آواز اونچی کی تو تیرا ٹینٹوا دبا دوں گا۔'' ایک سپاہی نے مودی کی گردن دبوچ کر اسے کرسی کی طرف دھکیلا تو وہ خاموشی سے وہاں دبک گیا۔

''چلو نیہا، تم شروع کرو تاکہ انسپکٹر صاحب کو بھی پتا چل سکے کہ خوب صورت چہروں اور بڑے ناموں کے پیچھے کیسے بدصورت کردار چھپے ہوتے ہیں۔'' مہ پارہ نے نیہا کو مخاطب کیا تو اس نے تھوک نگل کر پہلے اپنا حلق تر کیا اور پھر مشینی انداز میں بولنا شروع کردیا۔

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں اپنا پہلا سیریل ریکارڈ کروا رہی تھی۔ مودی اس سیریل کا ہیرو تھا۔ سیٹ پر کسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوگیا اور جھگڑا اتنا بڑھا کہ ڈائریکٹر کے لیے شوٹنگ جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ سیریل آن ایئر تھا اس لیے ڈائریکٹر نے کسی نہ کسی طرح ہماری صلح کروائی اور کام دوبارہ شروع ہوگیا۔ صلح کے بعد میں نے اپنے دل میں کوئی بغض نہیں رکھا تھا لیکن مودی کا معاملہ اس سے الٹ تھا۔ اس نے دل میں کینہ رکھ کر مجھ سے ظاہری دوستی قائم رکھی اور اس دوستی کی وجہ سے ہی جب اس نے اپنا پروڈکشن ہاؤس قائم کیا تو میں اس کی ٹیم کا حصہ بن گئی۔ اعتبار اور دوستی کی اس فضا کا فائدہ اٹھا کر اس نے مجھے ایک روز شکار کرلیا اور میری نازیبا ویڈیو کے سہارے مجھے اپنے اشاروں پر نچاتا رہا۔''

''بکواس کررہی ہے فاحشہ! یہ خود دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لیے ہر حد سے گزرنے کے لیے تیار تھی۔'' نیہا کا الزام سن کر مودی نے اپنی خاموشی توڑی اور شور مچانے لگا۔

''تجھے کہا تھا نا کہ اپنی زبان بند رکھ کر بیٹھ لیکن تیرے جیسے لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔'' پہلے مودی کی گردن دبوچنے والا سپاہی حرکت میں آیا اور تابڑتوڑ اس کے منہ پر تین چار گھونسے رسید کرڈالے۔ گھونسے کھانے کے بعد وہ بھیگی بلی بن کر بیٹھ گیا۔

''یہ سچ ہے کہ مجھے دولت اور شہرت کی چاہ تھی لیکن میں اس شخص جتنی حریص نہیں تھی کہ اس خواہش میں کچھ بھی کر

گزرتی۔ اس کی حرص نے اسے اچھی بھلی انکم کے باوجود بلیک ریب کے دھندے میں ڈال دیا اور یہ ایکٹنگ کے شوق میں خود تک پہنچنے والی لڑکیوں کو شکار کرنے لگا لیکن طریقۂ کار ایسا تھا کہ کبھی کسی لڑکی کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس کا شکاری کون ہے۔ میں ڈیڑھ سال تک خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے اس کی آلۂ کار بنی رہی لیکن دو لڑکیوں کی پے در پے خودکشی کے بعد میرے دل کا بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ میں نے اس شخص اور اس کے ساتھیوں کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔'' نیہا بول رہی تھی اور ملزمان کی قطار میں بیٹھے تینوں مرد اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ اگر ان کے سروں پر مسلح سپاہی نہ کھڑے ہوتے تو یقیناً وہ اس کی بولتی بند کرنے کے لیے اس پر ٹوٹ پڑتے۔

''فیصلہ کرلینے کے بعد میں نے اپنی اسٹوڈنٹ لائف کی دوست عروج سے رابطہ کیا اور ایک فرضی داستان سنا کر اسے اور اس کی ساتھیوں کو اس دھندے کی طرف متوجہ کر دیا۔ یہ میری ہی وجہ سے تھا کہ اشعر نے آڈیشن والے دن عروج اور چار مزید لڑکیوں کے موبائل غائب کرلیے۔ میں نے اشعر کو یقین دلایا تھا کہ بڑے گھر کی لڑکی ہونے کی وجہ سے عروج سے بڑا مال سمیٹا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے شکایت بھی نہیں کرے گی کہ ان کی اجازت کے بغیر شوبز کا رخ کیا ہے۔ اشعر میری چال نہیں سمجھ سکا اور یوں معاملہ یہاں تک پہنچا کہ مودی گرفتار ہوگیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد بوبی اور اشعر کچھ عرصہ خاموشی اختیار کرلینا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں راضی کیا کہ کام جاری رکھو۔ اتفاق سے نتاشا کے موبائل سے ایسا مواد مل گیا جس کی بنیاد پر اسے بلیک میل کیا جاسکتا تھا چنانچہ یہ کام شروع کر دیا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ چاروں مودی کی گرفتاری کے باوجود چین سے نہیں بیٹھیں گی اور ان چاروں لڑکیوں پر نظر رکھیں گی جن کے موبائل عروج کے ساتھ چوری ہوئے تھے۔ ابتدا میں مجھے مایوسی ہوئی اور نتاشا کی خودکشی کی کوشش نے بوجھ مزید بڑھا دیا لیکن پھر آخرکار یہ لوگ متحرک ہو ہی گئیں۔ جس آدمی کے ذریعے نتاشا کی نگرانی کروائی جارہی تھی وہ پہلے مجھے رپورٹ دیتا تھا اور میں اس رپورٹ میں سے جتنی چاہتی تھی اتنی اطلاعات اشعر اور بوبی تک پہنچا دیتی تھی۔ جس روز انہوں نے نتاشا کو اس کے گھر سے نکلوایا، یہ اس کے ساتھ بہت کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن میں نے راستے میں کال کر کے یہ خبر دی کہ نگرانی کرنے والے کا خیال ہے کہ ٹیکسی کا پیچھا کیا جارہا ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ لڑکی کو اپنے کسی ٹھکانے پر لے جانے کے بجائے چھوڑ دیا جائے۔ یوں وہ بے چاری ان کے پنجوں سے نکلنے میں کامیاب ہوسکی۔''

''اس روز واقعی ہم نتاشا کے پیچھے تھے اور اس کے ذریعے تم لوگوں کے ٹھکانے پر پہنچنا چاہتے تھے۔'' عروج نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے نیہا کو آگاہ کیا۔ نیہا اس کی بات سن کر اداسی سے مسکرائی اور بولی۔

''مجھے اس بات کا علم نگرانی کرنے والے آدمی سے ہوگیا تھا اور میں پچھتائی بھی تھی کہ کیوں نتاشا کو ٹھکانے پر پہنچنے نہیں دیا کہ اس کے پیچھے پیچھے تم لوگ اور پولیس بھی وہاں پہنچ جاتی۔ بہرحال میں نے باقی بہت سی باتوں کی طرح یہ بات بھی اشعر اور بوبی سے چھپا لی اور یوں تم چاروں کو کھل کر کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔''

''ہمیں تمہارے کردار پر فخر ہے نیہا! تم نے مشکل سے سہی اپنے خوف پر قابو پایا اور دوسری بہت سی لڑکیوں کی عزتیں اور زندگیاں بچانے کا وسیلہ بن گئیں۔'' عروج نے بھیگی پلکوں سے اپنی پرانی سہیلی کو سراہا۔ جواباً وہ بھی بھیگی آنکھوں سے مسکرادی۔

''مجھے اُمید ہے انسپکٹر صاحب کہ آپ نیہا کے ساتھ اس کیس میں خاص رعایت کریں گے۔'' لبنیٰ کا دل بھی نیہا کے لیے موم ہوا اور اس نے باقاعدہ انسپکٹر کو مخاطب کر کے سفارش کی۔

''قانون میں جتنی گنجائش نکل سکی، میں ضرور نکالوں گا۔'' انسپکٹر نے یقین دہانی کروائی اور لیڈی کانسٹیبل کو بلانے کا آرڈر جاری کیا۔ یہ ایک ایسا موقع تھا جب سب کی توجہ ذرا سی ہٹ گئی۔ مودی نے اس موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور جھپٹ کر نیہا کے قریب پہنچ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ دو سپاہی فوراً ہی اس کی طرف لپکے اور رائفلوں کے بٹ مار مار کر اسے نیہا سے دور ہٹا کر فرش پر گرا لینے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کی اس حرکت پر چراغ پا انسپکٹر اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور اس کے قریب پہنچ کر اپنی ایک ٹانگ بھاری جوتے سمیت اس کے سینے پر رکھ کر غرایا۔

''ابھی تک تو ہم نے تجھے بہت عزت سے رکھا ہوا تھا بچو لیکن اب دیکھنا کہ ریمانڈ کے یہ جو دو دن بچے ہیں اس میں کیسے تیری ہیروگیری نکال کر تجھے ہیرو سے زیرو بناتے ہیں۔''

انسپکٹر کی ٹانگ تلے دبے ہیرو میں ہمت نہیں تھی کہ دم مار سکے۔ اس کے حواری بھی دم سادھے پھٹی پھٹی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

❖❖❖